شام رنگ سیاہ

ایمل رضا



شام رنگ سیاہ

ایمل رضا

نوٹ:۔

پہلا باب

الماس برادہ

گل و گلزار کو کم جانا،حرص پہ تھا آمادہ
کیا چاہنے کا سوال سادہ، سب پانے کا جواب مادہ
حدت اشک رضا سے نکھارا تھا جس کو
ٹوٹا جو الماس وہی تو بکھر گیا ہر سو برادہ

شام کے رنگ شہابی دکھتے ہیں یا شیامی۔۔۔حقیقتاً وہ سیاہ ہوتے ہیں۔گزرتے سچے لمحوں اور آتے پکے موسموں کے درمیان جھولتے رنگ۔۔۔ پل صراط پر کھڑے، ادھار لیے گئے سسکتے لرزتے ٹھٹھراتے سانیوں اور قید ہوا میں ڈگمگاتے رنگ۔۔۔ یہ نہ تاباں ہوتے ہیں نہ ناریک یہ تو بس پل بھر کی نظر کا سامان ہوتے ہیں۔

زندگی بھی ایسی ہی ہے۔شام رنگی۔۔۔یہ نہ شہاب رنگی ہے اور نہ ہی شیام رنگی۔۔۔ساکت سانسوں کی ڈوری جب ٹوٹتی ہے تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تو سب سیاہ ہے۔شام کے کچے رنگ کی طرح ہر صورت سیاہ اور سیاہ بھی وہ جسے کسی اور رنگ میں نہیں رنگا جاسکتا۔سیاہ رنگ سارے رنگوں کو نگل لیتا ہے۔

☆......☆......☆

دوپہر کی تیکھی دھوپ میں سہ پہر ہوجانے کے باوجود کاٹ موجود تھی۔ جو بن کا چولا پہنے وہ کسی مجھول کی طرح رقص کر رہیتھی اور سیدھ میں لگے پام کے درختوں میں سے انی کی طرح نکل رہی تھی۔ آرٹ کالج کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس نے ہاتھ میں دبی فائل کو اپنے سر پر ٹیڑھا کر کے رکھ لیا اور دھوپ سے بچنے کی لاحاصل کوشش کی۔اس کوشش نے اس کے چہرے کے نقوش کو مزید سختی فراہم کی تھی۔

آرٹ کالج کی سڑک کا موڑ مڑتے ہی وہ ایک گلی میں داخل ہوگئی۔ جہاں پہنچتے ہی منظر یک لخت بدل گیا۔ درخت غائب ہوگئے اور دھوپ نتھر کر مزید قہر باری کرنے لگی۔اس نے ناگواری سے لمبی سنسان گلی کو دیکھا۔اطراف کے قدیم گھروں کی

منحوسیت معمول کی طرح اپنے عروج پر تھی۔ موٹی دیواریں، برادہ جھلکاتی کھڑکیاں، اکھڑے فرش، رنگ وروغن سے عاری، ٹوٹے پھوٹے گھر، گندے ٹاٹوں اور بند کواڑوں کے پیچھے سے بھی برہنہ تھے۔ اس کے دائیں بائیں دو کھلی نالیاں بہہ رہی تھیں جن کا سیاہ پانی بھی اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اس نے نخوت سے پانی کی اس رفتار کو خود سے ریس لگاتے ہوئے دیکھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اسے نفرت سے دیکھے یا نظر اندازی سے پانی کا کام تو بس بہتے جانا ہوتا ہے۔

کچھ اس کا موڈ یہاں آ کر مزید تپ جاتا تھا۔ ذہن میں یہ علاقہ، یہاں کی غربت کچھ اس طور بیٹھ گئی تھی کہ اس کا دل کرتا کہ وہ کالج میں ہی رہے۔ اس کا بس چلتا یا کالج والے اسے اجازت دے دیتے تو وہ یقیناً ایسا ہی کرتی۔

ایک اور موڑ مڑ کر وہ اپنی گلی میں داخل ہو گئی تھی۔ چہرے پر پھیلی ناگواری نے اب کریہہ صورت اختیار کر لی تھی۔ اپنی گلی میں داخل ہونا اس کے لیے پل صراط پر چلنے کے مترادف تھا۔

اس گلی میں دائیں بائیں پانچ، پانچ گھر تھے۔ بالکل سامنے سبین کا گھر تھا۔ دیار کی سیاہ لکڑی کے پرانے کواڑوں والا۔۔۔ جس پر دس سال پہلے سبین نے اپنی چھوٹی بہن زویا کے ساتھ مل کر بچا کھچا پیلے رنگ کا پینٹ کیا تھا۔ جسے سب پیار سے ''چھوٹی'' کہتے تھے۔ دروازہ رنگ کرتے سمے انہیں احساس ہی نہ رہا کہ پینٹ کو انہوں نے کس مقدار سے استعمال کرنا ہے۔ جب ایک کواڑ پر رنگ ہو گیا تو انہیں اندازہ ہوا کہ پینٹ دوسرے کواڑ کے لیے ناکافی ہے۔ ابا سے پینٹ کے نئے ڈبے کے لیے کہنا ہی عبث تھا یہ پینٹ بھی ابا اپنے ''طغروں'' کے لیے لائے تھے لیکن نا جانے کیوں استعمال نہ کر سکے تھے اس لیے انہوں نے دوسرے دروازے کو بنا رنگے ہی رہنے دیا تھا۔ اب اس کے گھر کا دروازہ دورنگی تھا۔ سیاہ پیلا اور سیاہ کالا۔۔۔ جو دیار کا اصلی رنگ ہوتا ہے اس سے بھی زیادہ سیاہ۔۔۔ بیرونی آہنی زنجیر اور کواڑ کھولنے اور بند کرنے والی جگہوں سے تو دروازہ اس قدر غلیظ ہو چکا تھا کہ وہاں سے چھونے پر اسے احساس ہوتا تھا کہ اس کے ہاتھ گندے ہی نہیں بلکہ ناپاک ہو چکے ہیں۔ وہ لاکھ ہاتھ دھوتی پھر بھی یہ احساس کافی سمے تک اس کے ساتھ رہتا تھا۔ اس جگہ سے تو پیلا پینٹ بھی سیاہ ہو چکا تھا۔ اب اس کا کوئی حل نہیں تھا سوائے پینٹ کا ایک اور کورٹ کرنے کے یا برداشت کرنے کے۔۔۔ پہلا کام مشکل تھا اس لیے وہ دوسرا کر رہی تھی۔

ناگواری سے دیکھتے ہوئے وہ آگے بڑھنے لگی۔ ہر گھر سے حسب معمول چکی چلنے کی آواز آ رہی تھی گھوگھو۔۔۔ گھوگھو۔۔۔ مدہم آواز اسے اتنی واضح سنائی دے رہی تھی کہ اس کا دماغ چٹخنے لگا تھا۔ یہ آواز اس کے اندر ایسے جذبے جگاتی تھی جو نفرت کی حدود سے کہیں زیادہ تجاوز کیے ہوئے ہوتے تھے۔ اگر کوئی اس آواز کی گونج میں اسے جنگیں لڑنے کو کہے تو وہ یقیناً نفرت سے سب دشمنوں کو مار گرائے۔

ہر گھر سے آٹا اُڑ رہا تھا۔ باریک باریک جو ہوا کا ہی حصہ لگتا تھا۔ یہاں آ کر گلی کسی روسی تنگ گزرگاہ جیسی دکھائی دیتی

جہاں برف کے ننھے ننھے گالے گر رہے ہوں۔ دیکھنے میں یہ منظر خوب صورت تھا۔ دودھیا منظر۔۔۔ایسے لگتا تھا جیسے گلی تیز دھوپ میں بھی کہر میں لپٹی ہوئی ہو۔ گمان نہیں ہوتا تھا کہ یہ گندم کا برادہ ہے۔ ایسے معلوم ہوتا تھا گویا کوئی رحمت، ذرات کی شکل میں زمین پر اتر رہی ہے۔لیکن اسے اس آٹے سے اتنی نفرت ہو چکی تھی وہ اس رحمت کو زحمت سمجھنے جتنی اہمیت بھی نہیں دیتی تھی اس آٹے کے برادے کو وہ گرد کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اس کے گھر سے تو اس گرد کے دو بادل اٹھ رہے ہوتے تھے۔ آٹے کا اور ایک چونے کا۔۔۔ جسے بابا ''الماس برادہ'' کہتے تھے اور وہ اسے صرف ''گند'' سمجھتی تھی۔

جس وقت وہ اپنے گھر میں داخل ہوئی اسے اس وقت سخت بھوک لگ رہی تھی۔ امتحان دوپہر کو تھا۔ ناشتے کے بعد پیپر کی پریشانی کی وجہ سے اس سے کچھ کھایا ہی نہیں گیا تھا۔ تین گھنٹے کا پیپر اس کے بعد اسٹاپ پر بس کا انتظار۔۔۔ جو بس بھی آتی تھی پیچھے سے ہی بھری ہوئی آتی تھی۔ خالی بس کا انتظار کرتے کرتے اور گھر آتے آتے اسے کافی وقت لگ گیا تھا۔ تیز دھوپ نے جسم کی نمی بھی سینچ لی تھی۔ آتے ہی اس نے فائل کو صحن میں بچھی چارپائی پر پٹخ دیا۔ اماں کونے میں جا بجا پھٹے ہوئے ٹاٹ کی کھولی کے اندر چکی چلا رہی تھی۔ بابا دوسرے کونے میں دیوار کے سائے میں سکڑ کر بیٹھے اپنے چونے کے طغروں پر تیزی تیزی سے ریگ مال پھیر رہے تھے۔ سفید گرد کے دو بادل ان ہی دو کونوں سے اٹھ رہے تھے۔

''اماں! جلدی سے کھانا دے دو بہت بھوک۔۔۔''

دروازے کی آہٹ پر اماں نے اپنی ٹاٹ کی کھولی سے ٹاٹ کا پردہ سرکا کر اسے دیکھا اور بابا بھی کام کرتے کرتے ہاتھ روک کر مڑے دونوں ایسے گھبرا گئے تھے جیسے جوان اولاد کے سامنے کوئی ڈاکا ڈالتے پکڑ لیے گئے ہوں۔ سبین کے چہرے پر ناگواری تھی ویسی ہی جسے وہ دیکھنے کے عادی تھے پھر بھی گھبراتے تھے بھوک کے آگے کے الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے۔ تو اس کو گھر میں اتنی اہمیت بھی نہیں دی جاتی کہ اس کی بات کو مان لیا جائے۔ فائل چارپائی پر پھینک کر وہ پیر پٹختی ہوئی اندر چلی گئی۔

''کتنی بار کہا ہے اس کے آنے سے پہلے کام ختم کر لیا کرو۔'' اماں نے چپ والی رازداری سے بابا کی سرزنش کی۔

''پتا تو ہے کہ اسے اس گرد سے کتنی چڑ ہو گئی ہے۔'' ان کا اشارہ بابا کے طغروں کی طرف تھا۔ جن پر وہ ریگ مال مار رہے تھے اور جہاں سے سفید برادہ اڑ رہا تھا۔

''تو میں کیا کروں؟'' بابا جھنجلائے۔

''کام کا زور ہے۔ رات سے لگا ہوا ہوں۔ کام نہ کروں تو کھائیں گے کہاں سے۔ تم ہی چکی نہ چلاتیں، اسے اس سے بھی تو چڑ ہے۔'' بابا اماں کی طرف پلٹے دونوں ایسے موقعے پر ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہراتے تھے۔

''آج بوری دینی ہے ہر صورت کمپنی کی گاڑی آنے والی ہے۔ مجبوری میں بیٹھی ہوں میں۔'' اماں نے اپنی طرف کی

وضاحت دی۔ بابا نخوت سے جھنجھلائے کہ بس اب مزید تاویلیں مت دو۔

''اچھا۔۔۔اب اس کے لیے روٹی بنا۔بھوک لگی ہے اس کو بھوکی ہے بے چاری صبح کی۔''

''بناتی ہوں۔'' اماں کہتی ہوئی ٹاٹ کی کولی سے باہر نکل آئی۔اس پیڑھی سمیت ہی جس پر وہ بیٹھی ہوئی تھی۔جب سے اماں کے جوڑوں میں درد رہنے لگا تھا۔اس نے اپنی پیڑھی کے پایوں کے نیچے پہیے لگوا لیے تھے۔گھر کی صفائی وہ اسی پیڑھی پر بیٹھ کر کرتی تھی۔جھاڑو ہاتھ میں پکڑ کر وہ پیڑھی پر پہیوں کے بل ہی گھومتی رہتی تھی پوچا بھی ایسے ہی لگتا تھا اور کپڑے بھی اسی پیڑھی پر بیٹھ کر دھلتے تھے۔کھانا بھی وہ اسی پیڑھی پر بیٹھ کر بناتی تھی۔اس سے کافی آسانی رہتی تھی۔کھانے کے دوران نمک،مرچ کے ڈبے پکڑنے،صفائی کے دوران جھاڑو پھیرنے،پوچے کو بار بار نل کے پاس جا کر گیلا کرنے میں اور کپڑے دھوتے ہوئے بھی۔اب اسی پیڑھی کو گھسیٹتی ہوئی وہ کچن میں چلی گئی۔

دو سال پہلے ڈاکٹر نے الٹی میٹم دے دیا تھا کہ اس کے گھٹنے کا آپریشن بے حد ضروری ہو گیا ہے۔اس کے باوجود اس نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی تھی اور آپریشن کروانے سے انکار کر دیا تھا ایک تو آپریشن پر لاگت بہت زیادہ آ رہی تھی۔دوسرا چکی چلنے میں یقیناً کافی دن کا ناغہ پڑ جانا تھا اور ایسا وہ ہرگز نہیں چاہتی تھی۔پھر کسی پڑوسن کے مشورے پر اس نے اپنی پیڑھی کے نیچے پہیے لگوا لیے تھے اور دونوں ٹانگیں ہوتے ہوئے بھی وہ اپاہج ہو گئی تھی۔اماں اس دن اپنی شادی کے دن کی طرح خوش تھی جس دن اس کی پیڑھی کے نیچے پہیے لگے تھے۔اس کی لاتعداد مشکلات کا حل چار پہیوں نے نکال دیا تھا۔

صحن کے تیسرے کونے میں چھوٹی زویا کسی ٹوٹے ہوئے کھلونے وغیرہ سے کھیلنے میں مصروف تھی اور ایسے مصروف تھی کہ اسے نہ تو سبین کے گھر میں آنے کے بارے میں کچھ پتا چلا اور نہ ہی اماں بابا کی ایک دوسرے کو سرزنش کرنے کا۔وہ اپنے کھلونے سے کھیلنے میں اس طرح مگن تھی جیسے وہ ہی اس کی کل متاع ہو۔وہ ہمیشہ سے ہی ایسی تھی۔وہ بہت کم بولتی تھی اور اس سے بھی کم کھاتی تھی اس کے ذہن میں کوئی مسئلہ رہ گیا تھا۔اماں کہتی تھی کہ ایک دن خود ہی بولنے لگے گی۔زویا اس وقت چودہ سال کی تھی۔اس ایک دن کا انتظار کرتے کرتے چودہ سال بیت چکے تھے۔

اماں پیڑھی گھسیٹتی ہوئی باورچی خانے میں چلی گئی۔سالن تیار تھا۔جلدی سے اس نے روٹی توے پر ڈالی۔اندر سبین کپڑے بدل کر گرمی میں سست پنکھے کے نیچے خاموشی سے لیٹی تھی۔پنکھا ہوا کم اور تسلی زیادہ دے رہا تھا۔اماں نے جا کر کھانا اس کے سامنے رکھ دیا۔وہ ہانپتی کانپتی خود چل کر آئی تھی۔کمرے کے آگے لکڑی کی موٹی دہلیز تھی۔اس کی پیڑھی اندر نہیں آ سکتی تھی۔ایک دوبار اس نے کوشش کی تھی اور بری طرح سے گری تھی۔پھر اس نے ایسا کرنا چھوڑ دیا۔وہ سبین کو آواز بھی نہیں دیتی تھی۔اسے پتا تھا کہ وہ نہیں آئے گی۔اسے ہی جانا پڑتا تھا۔

سبین کے آگے کھانا رکھ کر وہ پنکھا تیز کرنے لگی لیکن پنکھا تیز نہیں ہوا۔۔۔ڈیمر فل اسپیڈ پر ہی تھا۔جس کے نتیجے میں وہ اپنے پرزوں کے ساتھ ساتھ تھوڑے بہت پر بھی ہلا رہا تھا۔ چہ چہ کا افسوس کرتی ہوئی وہ پھر سے سبین کے پاس کھڑی ہوگئی۔ جیسے اسے آج ہی تو پتا چلا تھا کہ پنکھے میں نئے بیرنگ پڑنے ہیں۔

سبین نے نظروں ہی نظروں میں چھابی کو دیکھا۔ پھر منتظر کھڑی اماں کو۔۔۔رومال میں لپٹی روٹی کے اوپر آلو گوبھی سے بھری ہوئی کٹوری رکھی تھی۔ پانی کا گلاس اماں نے ساتھ پڑے صندوق پر رکھ دیا۔

''کھالو۔۔۔'' اماں منت بھرے لہجے میں بولی۔

سبین اٹھ کر بیٹھ گئی۔ روٹی کا ایک ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھا۔ اماں اس کے طرف بغور دیکھ رہی تھی۔ وہ اس بات کے انتظار میں تھی کہ وہ کیا کہتی ہے۔ جیسے آج انہوں نے ڈش تیار کی ہو اور وہ جاننا چاہتی ہو کہ سبین کو وہ کیسی لگی۔

''ٹھیک ہے ناں؟'' اماں نے کسی حد تک خوشامدی سے پوچھا۔

''کیا خاک ٹھیک ہے۔'' اس نے لقمہ فرش پر تھوکا۔

''چونا چونا۔۔۔ہر جگہ چونا۔ چونا کھانے کو، چونا پھانکنے کو کیا چونا ہی رہ گیا ہے اس گھر میں۔'' وہ بری طرح سے چلائی۔

''نہیں تو۔۔۔کہاں۔۔۔'' اماں فوراً وضاحت دینے پر تل گئیں۔ میں نے ہاتھ اچھی طرح سے دھوئے تھے۔ برتن، توا۔۔۔سب اچھی طرح سے دھویا ہے۔ ابھی بھی چونا کہاں سے آ گیا اس میں۔۔۔''

''لیں خود چکھ کر دیکھ لیں۔'' غصے سے اس نے چھابی اماں کے آگے کی۔ اماں نے روٹی توڑ کر سالن کے ساتھ کھائی۔ پتا نہیں واقعی اسے بھی چونا محسوس ہوا یا وہ سبین کو جھٹلانا نا چاہتی تھی۔

''میں بازار سے کچھ منگوا دیتی ہوں یا ایسا کرتی ہوں کہ سکینہ کے گھر جا کر پیاز والا انڈہ ابنا دیتی ہوں۔''

''رہنے دیں۔۔۔روز کی طرح میں اپنے ہی آنسو کھا لیتی ہوں آج بھی۔۔'' وہ اونچی آواز میں بولی اور پھر چادر اپنے اوپر تان کر لیٹ گئی۔ اماں جانتی تھی کہ اب اگر اسے سو بار بھی کہہ لو تو وہ کھانا نہیں کھائے گی۔ منہ بسور کر وہ باہر آ گئی۔

''ٹھیک ہے، رات کے کھانے کے لیے کچھ اچھا بنا لیتی ہوں۔ لیکن کیا اچھا۔۔۔جو سبین کو پسند تھا، وہ اس گھر میں روز روز نہیں بن سکتا تھا۔ باہر نکلتے نکلتے اماں دکھی ہو گئی۔

نہیں وہ کچھ بھی کر لے گی۔ لیکن آج کچھ بنا دے گی اسے وہ صبح سے بھوکی ہے۔ امتحان بھی ہو رہے ہیں اس کے پڑھائی کا بھی بوجھ ہے۔

''کیا ہوا نہیں کھایا کھانا اس نے۔۔'' بابا نے اماں کی اتری ہوئی شکل اور ہاتھ میں چھابی دیکھی تو پوچھا۔

''نہیں۔۔۔اس منحوس کام کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ پورے گھر میں چونا، چونا ہو رہا ہے حالانکہ میں نے سارے برتن اچھی طرح دھوئے تھے۔'' اماں بابا پر بولنے لگی۔ ایسے وقت میں میاں بیوی ایک دوسرے پر بول کر اپنی پریشانی کم کر لیا کرتے تھے۔

''کیا کروں پھر۔۔۔ساری زندگی یہی تو کرتا آرہا ہوں۔ اب ایک دم سے کچھ اور کیسے کروں۔'' اس نے اسی خوشبو میں سانس لی ہے یہیں پلی بڑھی ہے وہ۔۔۔کہیں اور سے تو نہیں نہ اٹھا کر لے آئے ہم اسے یہی کھانا کھاتی رہی ہے جو ہم بھی کھاتے رہے ہیں۔ پہلے تو کبھی ایسا نہیں کرتی تھی اب ایک دم سے اسے کیا ہو گیا ہے؟ بابا سدا کی بے چارگی سے بولے جس پر اماں کو شرمندگی ہوئی۔ تاسف میں گردن ہلاتی خاموشی سے باورچی خانے میں چلی گئی۔ وہ جانتی تھی کہ بابا جو کہہ رہے ہیں ٹھیک کہہ رہے ہیں جانتی وہ بھی تھی جو اندر چادر تان کر بھوکی ہی لیٹی ہوئی تھی۔

بابا غربت والی بے بسی سے سر جھٹک کر پھر سے اپنے کام میں مگن ہو گئے خشک ماڈل پر پھر سے ریگ مال پھرنے لگا۔ سفید برادہ اڑنے لگا۔

☆......☆......☆

پہلے پہل یہ گھر صرف اور صرف ضرورت کے مطابق چل رہا تھا۔ یہ ایک ایسا گھرانہ تھا جس میں باہر کی دنیا کا اثر معدوم تھا اور ابھی نئی اور پرانی روایتوں میں جنگ نہیں چھڑی تھی۔۔۔پھر بہت بعد میں اس میں خواہشات کا عمل دخل شروع ہوا۔ پرانے زمانے کے بنے اس گھر میں ماضی کا جلال شکست کھا کر بھٹکتا ہوا نظر آتا تھا گھر میں بابا تھے اماں تھیں اور ایک چھوٹی بہن زویا۔۔ جس کا وجود گھر میں نہ ہونے کے برابر تھا۔

اماں چکی چلاتی تھیں ملک کی ایک مشہور کمپنی پتھر کی چکی کا آٹا بھی الگ سے بیچتی تھی۔ پہلے پہل اماں فیکٹری جا کر یہ کام کرتی تھی۔ وہ صبح جاتی تھی اور شام میں آتی تھی۔ بابا اپنا کام گھر پر ہی کرتے تھے اور ان کے فیکٹری جانے کے بعد اسے اسکول چھوڑنے اور لانے کے علاوہ دوپہر کا کھانا بھی وہی دیتے تھے اس نے بچپن کو ایک الگ ہی رنگ میں گزارہ تھا غیر فطری لیکن مسحور کن احساس تلے۔

اماں کی عدم موجودگی نے اس کے اندر کسی طرح کا کوئی احساس محرومی پیدا نہیں کیا تھا۔ وہ اماں کی فیکٹری جانے اور آنے پر بہت خوش ہوا کرتی۔ وہ اس دن بھی بہت خوش ہوئی جس دن اماں نے گھر میں چکی لگا لی تھی۔

اماں سمیت محلے کی اور بھی بوڑھی عورتوں کو، ان کے ہی مطالبے پر، فیکٹری والوں نے ان کے گھروں میں چکیاں لگا کر دے دی تھی۔ اس شرط پر کہ صفائی کا خاص خیال رکھا جائے گا۔۔ اماں اسی شرط کی وجہ سے چکی کو ٹاٹ کی بنائی کھولی کے اندر بیٹھ کر چلاتی تھی۔ اب بھی کبھی کبھی ٹیم صفائی کی صورت حال چیک کرنے آجایا کرتی اور سبین کا دل کرتا کہ اس دن گھر میں خوب ساگند

ڈال دے تاکہ اماں کی چکی سے تو اس کی جان چھوٹے۔

سبین سے چھوٹی بہن زویا تھی جو دن بھر میں ایک ہی جملہ ''اماں بھوک لگی ہے'' بولتی تھی۔

امّاں کا کہنا تھا کہ بچپن کا بخار اس کے سر پر چڑھ گیا ہے۔ ڈاکٹرز کہتے تھے کہ اسے مہنگے علاج کی ضرورت ہے۔ اس کے تالو کا آپریشن ہونے والا ہے۔ دائی کہتی تھی کے اسے روز نہار منہ کشتے کھلائے جائیں ورنہ یہ لڑکی ساری زندگی ایسی ہی رہے گی۔

حکیم کہتے تھے کہ اسے کم از کم پانچ سال لگاتار پھکیوں کی ضرورت ہے۔ اور تعویز گنڈے والے بابا کہتے تھے کہ اس کے نام کے دو بکرے صدقے کے طور پر دیے جائیں۔ یہ سارے حل ایسے تھے جو پورے نہیں کئے جا سکتے تھے۔ بات جو بھی تھی۔ اب نتیجہ یہ تھا کہ زویا سال بھر میں ''اماں بھوک لگی ہے'' کے علاوہ بس چار پانچ لفظ ہی نئے بول سکتی تھی۔ اور اماں ''بھوک لگی ہے''۔ بھی وہ دن میں بس ایک بار ہی کہتی۔ اگر اسے روٹی مل جاتی تو ٹھیک ورنہ رات تک خاموش رہتی تھی۔ اس کا مستند علاج اس کے تالو آپریشن تھا۔ باقی سب مسئلے نفسیاتی تھے جو بعد میں ٹھیک ہو سکتے تھے۔ لیکن اماں نہیں چاہتی تھی کہ اس کے گلے یا چہرے پر آپریشن کا کوئی داغ پڑھیں۔ اس طرح اس کی شادی ہونے میں مسئلہ ہوگا۔ بیچاری سیدھی سادی اماں۔۔۔ اس کی شادی کے مسئلے کا سوچ کر ایک بڑے مسئلے کو فراموش کر رہی تھی۔ اس کے گونگے ہونے کا۔

چھوٹی سارے محلے میں ''گونگی'' کے نام سے مشہور تھی۔

بابا سالوں سے چونے کے کام سے وابستہ تھے۔ چونے میں پانی ڈال کر پہلے آمیزہ بنانا، پھر اس آمیزے کو سانچوں میں ڈال کر طغرے بنانا۔ ''طغرے'' جن کے بہت سے نمونے تھے۔ کسی پر یاسین لکھی ہوئی تھی۔ کسی پر کلمہ، کسی پر لوح قرآنی اور کسی پر صرف اللہ، محمد۔۔

طغرے کے علاوہ بھی بابا بہت سے نمونے بنانے میں ماہر تھے۔۔۔ تاج محل بادشاہی مسجد شاہی قلعہ، شیشے جڑے گل دان، سر پر گھڑا رکھی عورت، ببر شیر، عقاب، آپ گھوڑے، جڑواں ہاتھی، اونٹ اور بڑے گملے۔۔۔ کچھ چیزیں سانچوں میں بنتی تھیں ربڑ کے سانچوں میں یا آہنی سانچوں میں، کچھ چونا گوندھ کر گھومتے چاک پر بنتی تھیں۔ جیسے گل دان، گملے وغیرہ۔ کچھ کو سانچوں میں سے نکال کر ان کے اوپر پھر ہاتھ سے بھی بھرپور محنت ہوتی تھی۔ تاج محل، مسجد، عقاب، شیر۔۔۔ یہ ایسے نمونے تھے جن پر پھر نوک دار اوزاروں کی مدد سے سانچوں کی کشیدہ قاری کو مزید بہتر کیا جاتا تھا۔

بابا بیحد باریک بینی سے ہر ہر ماڈل پر کام کرتے تھے۔ ریگ مال سے ماڈلوں کی سطح کو ہموار کیا جاتا۔ پھونکیں مار کر برادہ پیچھے کیا جاتا۔

کچھ نمونوں کو ہاتھ سے بنانا پڑتا تھا۔ جن میں زیادہ تر آرڈر کا مال ہوتا تھا۔ بنانے والے اپنی مطلوبہ چیز کا نمونہ، تصویر یا

خیال اپنے ساتھ لاتے تھے۔

اب اس چیز کا سانچہ تو بابا کے پاس ہوتا نہیں تھا۔اس لئے پھر وہ بابا کو ہاتھ سے ہی بنانی پڑتی تھیں جیسے سال پہلے ایک گاہک بابا کے پاس ایک خاص آرڈر لے کر آیا تھا۔وہ سیر کرنے کسی پہاڑی علاقے میں گیا تھا۔وہاں کی ایک مسجد اسے اتنی پسند آئی کہ وہ اسے ماڈل بنوا کر اپنے گھر میں رکھنا چاہتا تھا۔اس نے بابا کو مسجد کی لی گئی بہت سی تصاویر دکھائی تھیں اور بابا نے ایک دن کے اندر اندر مسجد کی ہو بہو نقل چونے کے ذریعے بنا دی تھی۔وہ امیر گاہک اتنا خوش ہوا تھا کہ اس نے بابا کو اضافی پیسے دینے چاہیئے تھے لیکن بابا نے اپنی محنت کے علاوہ باقی اضافی پیسوں کو لینے سے انکار کر دیا تھا۔

''میرے فن کی قیمت ہے لیکن اتنی ہی جتنی میں محنت کرتا ہوں۔میرے اندر لالچ کے جذبات مت جگایئے ورنہ پھر میں ایک سیدھی سادی تھالی بھی بنانے کے قابل نہیں رہوں گا۔'' گاہک بابا کے جذبات کی قدر کرتا ہوا خاموشی سے چلا گیا۔

پہلے کی بات اور تھی لیکن اب وہ بابا کے ان اصولوں پر لعنت بھیجتی تھی۔

ایسا نہیں تھا کہ اسے بچپن سے ہی اس سب سے بیر تھا۔بابا کے ظروف سے تو وہ بہت دل کے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔جو ماڈل ٹوٹ جاتے تھے وہ سب اس کی جاگیر ہو جاتے تھے۔اسے یہ کام ہمیشہ سے بہت پسند رہا تھا۔بچپن میں وہ اپنی چھٹی بابا کے پاس ہی گزارتی تھی۔صبح صبح اٹھ کر بابا کے پاس آنا اسے اچھا لگتا۔بابا فجر کے بعد سے کام کرنے لگ جاتے تھے۔اماں اٹھ کر ناشتا بنانے لگ جاتی ہے اور وہ پیاری پیاری باتوں سے بابا کا دل بہلاتی رہتی بابا کے ماڈلوں پر وہ ریگ مال مارتی تھی بابا کام کرتے جاتے اور اس کی میٹھی میٹھی باتیں سنتے رہتے ساتھ ساتھ وہ اسے بتاتے بھی جاتے تھے کہ اس ماڈل کا کیا نقشہ ہے۔اسے کس طرح بناتے ہیں۔اس کی کیا خاصیت ہے۔چونا کیا ہوتا ہے۔چونے کی گھٹی اس کی نس نس میں تھی۔بابا چونے کو' 'الماس برادہ''۔کہتے تھے اور ہمیشہ اس کے نہ سمجھنے پر اسے سمجھاتے تھے کہ الماس برادے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔

پتھروں میں الماس کو ''کورا پتھر'' کہا جاتا ہے بیٹی۔الماس کی کوئی خاصیت نہیں ہوتی۔اس کے باوجود یہ ہی سب سے زیادہ خاصیت رکھتا ہے۔یہ ویسا ہی اثر اپنا لیتا ہے۔جیسا ہم اس سے چاہتے ہیں۔یہ بد کے پاس بد ہوتا ہے اور نیک پاس نیک۔یہ منفی پکار کو منفی جواب دیتا ہے اور مثبت پکار کو مثبت۔یہ ہر اک کی انگلی میں اسکی جنم گھٹی چکھ لیتا ہے۔یہ فطرت کے مطابق چلتا ہے جس کے تحت ہم اسے چلانا چاہتے ہیں۔نہ یہ باغی ہے اور نہ سرکش۔۔۔یہ اپنے اثر پر حرف آنے نہیں دیتا ہے۔

چونا بھی الماس کی ہی قسم ہے۔سالم حالت میں یہ بھی پتھر ہوتا ہے۔الماس زمین کی آگ میں جل کر الماس بنتا ہے۔چونا انا میں ٹوٹ کر چونا بنتا ہے۔

لیکن یہ اسی لیے ٹوٹتا ہے کہ ہم اسے اپنی پسند کے کسی بھی قالب میں ڈھال سکیں۔یہ الماس سے بھی کم انا پرست ہے۔

اس کے برادے میں عجز ہے اور الماس جیسی خاصیت ہی ہے۔ یہ بھی اس رنگ میں رنگ جاتا ہے جس میں ہم چاہتے ہیں۔ مشاق ہاتھ اسے اپنی مرضی سے موڑ کر الماس سے بھی زیادہ قیمتی بنا دیتے ہیں۔ اسی لیے میں اسے الماس برادہ کہتا ہوں۔''

وہ سمجھ کر بھی انجان رہتی۔ ابھی اس کے ذہن نے اتنی وسعت نہیں اختیار کی تھی کہ وہ ان کے پیچیدہ لفظوں کے مطلب سمجھ سکتی۔ پھر بھی اتنا تو وہ جان ہی گئی تھی کہ الماس اور چونے کی نسبت یقیناً کوئی بہت کی خاصیت رکھتی ہے اور بابا کی بات میں یقیناً بہت دم ہے یہ کوئی عام بات نہیں ہے۔

بابا کا ہاتھ بٹاتے بٹاتے وہ ان کاموں میں اتنی اچھی ہوگئی کہ بابا کی ہی طرح کام کرنے لگی۔ اسے یہ کام اچھا لگنے لگا۔ اس کا، اس کام میں دل لگ گیا تھا بابا بھی آہستہ آہستہ ماڈلوں پر ریگ مال مارنا چھوڑتے گئے۔ وہ باقی سارا کام خود کر لیتے اور ریگ مال مارنے کا کام اس کے لئے چھوڑتے تھے۔ وہ بابا کو شکایت کا موقع نہیں دیتی تھی۔ پہلے بابا اس کے ریگ مل مارے نمونے پر ہلکے سے پھر سے ہاتھ مار دیا کرتے تھے۔ جہاں کہیں کمی رہ گئی ہوتی اسے دور کر دیا کرتے تھے لیکن پھر بابا سارے کا سارے اس پر ہی انحصار کرنے لگے۔ اس کے کام کا ایک حصہ مکمل ہو گیا تھا۔ ابھی اس نے بہت کچھ مزید سیکھنا تھا۔ یہ بات وہ بھی جانتی تھی۔

اس کے اندر یہ سب شوق صرف بابا کی وجہ سے ہی نہیں آیا تھا۔ اس میں کچھ عمل دخل اس آرٹ کالج کا بھی تھا جسے وہ اپنے گھر کی کھڑکی سے دیکھا کرتی تھی۔ کسی زمانے میں ان کا گھر آرٹ کالج کے سرونٹ کوارٹرز کا حصہ تھا۔ جب آرٹ کالج کی اراضی کا کچھ مسئلہ ہوا تو ان کا گھر سرونٹ کوارٹرز سے باہر کر دیا گیا۔ نئی دیواریں بنا دی گئیں اور گھر میں تاریکی چھا گئی۔ تایا ابا تب ساتھ رہتے تھے۔ دونوں نے مل کر گھر کا ایک نیا راستہ نکال نکالا تھا۔ گھر کی دوسری طرف سے۔۔۔ بابا کے کہنے پر کالج کی انتظامیہ نے دیوار میں ایک کھڑکی کھلی رکھنے کی اجازت دی تھی یہ کھڑکی سبین کے کمرے کی تھی جو آنے والے دنوں میں اس کی ذات کے اندر بہت سی تبدیلیاں لائی تھی۔ ایسی تبدیلیاں جنہوں نے اسکے طفلانہ خیالات اور غیر مستحکم سوچ کو نئی دلیری بخشی تھی۔

وہ پہروں اس کھڑکی میں بیٹھ کر باہر کی دنیا کو دیکھا کرتی۔ جو ان کے گھر سے اور ان کی گلی سے یکسر مختلف تھی۔ ایک دیوار کے فرق میں دو الگ الگ دنیا آباد تھیں وہ بچپن سے ہی سوسائٹی کے اس فرق کو سمجھ چکی تھی۔

اسکول سے واپسی پر وہ اکثر اس کھڑکی کے پاس بیٹھ جایا کرتی تھی اور پھر اداس بھی ہو جاتی۔ یہ گھر کے اندر ماڈل بنانے کے بعد اس کی واحد ایسی تفریح تھی جو اس کو بیک وقت خوش بھی کرتی تھی اور اداس بھی۔۔۔ کالج کے پارک میں امیر لڑکے اور لڑکیاں خوش گپیاں کرتے نظر آتے تھے۔ کوئی مصوری کر رہا ہوتا، کوئی مجسمہ سازی، کچھ گروپس عجیب عجیب طرح کا کام کرتے نظر آتے، رنگین کاغذوں، کپڑوں اور مختلف طرح کی چیزوں سے، جسے وہ کسی بھی صورت سمجھ نہیں پاتی۔ کس کس طرح کا کام تھا جو وہاں نہیں ہو رہا تھا۔

ان سب کے چہروں پر دولت کا سکون ہوتا، خوش حالی کا اطمینان اور فراوانی کی طمانیت۔۔۔وہ پارک کی گھاس میں بیٹھے ہوتے اور اس وقت سبین کو دنیا کے سب سے خوش قسمت لوگ لگتے۔اس کی نظر میں وہ گھاس بھی خوش قسمت ہوتی جس پر وہ بیٹھے ہوتے تھے۔وہ سنگی بینچ بھی، ہاتھ میں پکڑی ان کی فائلیں بھی۔۔۔وہ سب خوش باش چہرے اس کا من اداس کر دیتے۔اماں بابا نے اس کی تربیت ایسی تو نہیں کی تھی۔پھر نہ جانے کیوں وہ ان کو خود سے بہتر محسوس کرنے لگی اس کا ذہن خود کے لئے ملامتی ہونے لگا۔جس نے اس کا اندر باہر مجرمانہ کر دیا۔وہ تھوڑی وسعت سے پرکھتی تو جان جاتی کہ دکھ تو ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ سیری، امیری میں بھی اور فاقوں، غریبی میں بھی۔اماں اسے وہاں بیٹھنے سے روکتی تھی۔پھر انہوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔اس گھر میں اور تھا ہی کیا۔اب کیا وہ اسے نظر کی تفریح سے بھی محروم رکھتی۔

یہ کھڑکی جب کبھی بند بھی ہوتی تو تب بھی وہ اس پر سحر طاری کیے رکھتی تھی۔وہ ان لڑکے لڑکیوں کی باتیں سنا کرتی جو آسانی سے بند کھڑکی کے چوبے تختے کے پار سے سنی جا سکتی تھیں۔کچھ جو اپنے ہی استادوں کی برائیاں کر رہے ہوتے، ہنستے ہنستے ان کی چغلیاں کرتے ان کے پڑھانے کے انداز کی نقل اتارتے کچھ کھیل، تعلیم اور کالج میں ہونے والی نئی سرگرمیوں کو ڈسکس کرتے اور کچھ ''راز و نیاز'' اس بات سے انجان کہ پرانی معدوم کھڑکی کے پیچھے ایک گم صم بیٹھی لڑکی ان کی راز دار بن چکی ہے اور ان کی باتیں سن کر اس کی آنکھوں میں ایک دلچسپ چمک عود آئی ہے۔

دل ہی دل میں اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ بھی اسی کالج میں پڑھے گی۔وہ یہاں پر بابا کے کام کو جدید بنیادوں پر سیکھے گی۔اسے دنیا میں نئی جہت سے متعارف کروائے گی اور یقیناً تب وہ اپنی کلاس کی سب سے لائق اسٹوڈنٹ ہو گی اس کے استادوں کو اس پر فخر ہو گا جو ایک کام کو اتنی مہارت سے کرتی ہے اسی سوچ کے پیش نظر وہ بابا کے کام کو مزید دل جمعی سے سیکھنے لگی تھی بابا کو اس کے خیالات کا ذرہ برابر بھی احساس ہوتا تو وہ اس کو کام کرتے ہوئے دیکھنے کی بھی اجازت نہ دیتے۔کہاں کام کرنے کی۔۔۔جن گھروں میں ایک وقت کی روٹی چکی کی مرہون منت ہو وہ ایسے کالج میں داخلے کا کیسے سوچ سکتے ہیں جہاں کی کینٹین کی چائے ہی اتنی مہنگی ہو کہ جس سے ان کے گھر دو دن کی ہانڈی آرام سے بن جائے۔

یہ بات سبین بھی جانتی تھی ایسا نہیں تھا کہ وہ کسی جادو کی چھڑی کے خواب دیکھ رہی تھی یا وہ ابھی سے ایک ایک روپیہ جوڑنے لگی تھی۔وہ تو بس اس کالج کی اسکالرشپ حاصل کرنا چاہتی تھی وہ دن رات پڑھنے لگی اور بابا کے ساتھ کام سیکھنے لگی اس کے نمبر کم آ بھی گئے تو کیا جب وہ پرنسپل کو اپنا بنایا ہوا ماڈل دکھائے گی تو وہ اسے فوراً ایڈمیشن دے دیں گے۔وہ جانتی تھی لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ خواب حقیقت کا روپ نہ دھاریں تو بھالے کی طرح دل میں اتر جاتے ہیں۔

☆......☆......☆

اس کے نمبر ٹھیک آئے تھے نہ اتنے کم تھے کہ اسے داخلہ نہ مل سکتا اور نہ اتنے زیادہ کے پورے ملک کی یونیورسٹیز اسے بلاوے بھجواتیں۔ بابا اس کے لیے کوپر روڈ کے کالج کا پراسپیکٹس لے آئے تھے اور اس نے چپکے سے آرٹ کالج کا پراسپیکٹس خرید لیا تھا۔ اس نے اسے فل کیا اور جمع کروا دیا۔ دونوں کالجز کی میرٹ لسٹ میں اس کا نام آ گیا تھا۔ کوپر روڈ والے اسلامیہ کالج میں بھی اور پاس والے آرٹ کالج میں بھی۔ اب مسئلہ فیس کا تھا کوپر روڈ کی فیس آسانی سے ادا ہو سکتی تھی اور آرٹ کالج والے کی فیس گھر بک کر بھی ادا نہ ہو سکتی تھی اسے یقین تھا کہ اگر وہ پرنسپل کو کسی طرح اپنے ''شاہکار'' دکھا دے تو وہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ اسے آسانی سے بنا فیس کے بھی داخلہ مل جائے گا۔ چپڑاسی کو اپنے نمونے دکھا کر وہ پرنسپل تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

''یہ سب کیا ہے؟'' پرنسپل صاحب اپنے بڑے سے لش پش آفس میں بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔

''یہ سب میں نے بنائے ہیں۔'' وہ بابا کے بنائے ہوئے ماڈل لے گئی تھی جو وہ خود بھی اب آسانی سے بنا سکتی تھی۔۔

''اچھا'' پرنسپل نے ایسے کہا کہ تو پھر ہم کیا کریں۔

''میں ایک لائق اسٹوڈنٹ ثابت ہوں گی آپ کو مایوس نہیں کروں گی۔'' اتنا اعتماد اس کے اندر نہ جانے کیسے آ گیا تھا۔

''بنا فیس کے کچھ نہیں ہو سکتا۔'' اس کی ظاہری حالت اور چہرے کی بے چارگی سے اصل بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔

''آپ کو ٹیلنٹ نہیں چاہیے کیا؟'' اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔ ''شاہکار۔۔'' دیکھ کر بھی اسے رد کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات تو اس کے سان و گمان میں بھی نہیں تھی۔

''ٹیلنٹ پہلے سے ہی اس ملک کے اندر بہت موجود ہے۔ ہم اپنے کالج کے نام پر اسے باہر نکالتے ہیں۔'' پرنسپل نے فخر جس میں غرور کی چاشنی بھی تھی سے کہا۔

''فیس جمع کروانے کی آخری ڈیٹ پرسوں کی ہے میں تمہیں ایک ہفتے کا اور وقت دے دیتا ہوں۔''

''لیکن میرے پاس فیس۔۔۔''

''اپنے یہ ماڈل اٹھاؤ اور۔۔۔ جاؤ۔۔۔''

اس دوران چپڑاسی بھی اندر آ گیا تھا اور میز پر چائے لگاتے ہوئے ترس بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگا اس کی ضد پر اس نے اسے اندر تو بھیج دیا تھا لیکن شاید وہ جانتا تھا اندر اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔

''میں اپنے کلاس فیلوز کی مدد بھی کر دیا کروں گی۔''

''یہاں مدد کسی کو نہیں چاہیے سب کو ڈگری چاہیے تمہیں کس نے کہا کہ ہم یہاں کام سکھاتے ہیں۔

''لیکن۔۔۔ آپ میری بات۔۔۔''

''میرے چائے پینے کا وقت ہو گیا ہے۔''

پرنسپل نے ہاتھ سے باہر کا اشارہ کیا۔ یہ دفع ہو جانے کا سب سے مہذب اشارہ تھا۔ وہ یک ٹک پرنسپل کو دیکھنے لگی۔ کیا وہ ''کالج'' کا ''پرنسپل'' ہی تھا۔ اپنے رویے سے تو اسے کسی دکان کا ملازم بھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کیا اللہ اتنا ہی فیاض ہے۔ اس کے اندر سے شکوہ پھوٹا جو اس کے پورے چہرے پر چھا گیا۔

''صرف فیس کی بات ہوتی تو میں کسی طرح بندوبست کر بھی لیتی لیکن یہاں آنے کے لیے مجھے بد تہذیب بھی ہونا پڑتا جو میں نہیں ہو سکتی تھی۔'' اس کا اشارہ پرنسپل کی طرف تھا جس کے جواب میں پرنسپل نے ساکت آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سگریٹ کا دھواں چھوڑا تھا۔ وہ اپنے ماڈل اکٹھے کرنے لگی۔ اس کا دل بری طرح سے ٹوٹا تھا تب ہی باہر جاتے چپڑاسی سے نہ جانے کہاں کوتاہی ہوئی یا اس نے ہی میز پر ماڈل ٹھیک سے نہ رکھے ہوئے تھے کہ ان میں سے ایک شیر کا ماڈل ٹوٹ کر نیچے گر گیا۔

''اوہ۔۔۔ یہ کیا کر دیا آپ نے۔۔'' چلانے سے زیادہ وہ دکھ بھری آواز میں بولی۔

''زیادہ چلاؤ نہیں۔۔۔ یہ لو پیسے اور چلی جاؤ یہاں سے۔۔'' پرنسپل نے اپنے کوٹ کی پاکٹ سے ایک سو کا نوٹ نکالا اور اس کی طرف اچھال دیا پرنسپل کے بعد اس نے گرے ہوئے سو روپے کے نوٹ کو دیکھا اور دیکھتی رہی۔

''کیا یہ کم ہیں؟ میں اور بھی دے سکتا ہوں لیکن اگر یہ تمہیں کم لگ رہے ہیں تو جان لو کہ۔۔۔ یہ بہت زیادہ ہیں اس ماڈل کی حیثیت سے بھی اور تمہاری اوقات سے بھی۔'' تلخ بات تلخ دھوئیں کی طرح کمرے میں پھیلی۔ پرنسپل نے بدلہ لے لیا تھا۔

''آپ مجھے داخلہ نہ دیتے۔۔۔ پر میری قیمت بھی نہ گراتے۔'' روتی ہوئی وہ باہر آئی اور کالج کے باغ میں بیٹھ کر ہی نجانے کتنی ہی دیر روتی رہی تھی۔ اس کے باقی سارے ماڈل اندر پرنسپل کے آفس میں ہی رہ گئے تھے اسے اب ان کی ضرورت بھی نہیں تھوڑی دیر بعد اس نے دیکھا کہ ایک ملازم ان ماڈلز کو باہر لا کر کوڑے کے ڈرم میں پھینک رہا تھا۔ کڑواہٹ اس کے رگ و پے میں اتر گئی۔

اس کی حیثیت اس کی اوقات خزاں کے برہنہ درخت کی طرح اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ وہ ایک شاخ پر اپنی بھدی اصلیت دیکھ سکتی تھی۔ یہ ہی وہ دن تھا جب اس نے بابا کے ہنر پر لعنت بھیجی اور ان وقتوں کو کوسا جب وہ خود بھی یہی کام کرتی رہی تھی۔ وہ کوپر روڈ والے اسلامیہ کالج میں آ گئی۔ ایک عام سے کالج۔۔۔ لیکن وہاں جا کر اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ تو اس عام سے کالج سے بھی زیادہ عام ہے۔ کم حیثیت، اوسط، غیر اہم۔۔۔ وہ اپنے جیسی لڑکیوں میں تھی جو کہ کسی صورت اس جیسی نہیں تھیں۔ وہ سب اس سے اتنی بہتر تھیں کہ سبین کو لگنے لگا وہ دنیا کی سب سے قابل رحم مخلوق ہے وہ لڑکیاں کم دولت مند تھیں پر پھر بھی خوش تھیں آلو کی ٹکی اور نان ایسے کھاتی تھیں جیسے فائیو اسٹار سے آرڈر منگوا کر کھا رہی ہوں بوتل کو بڑی عیاشی سمجھتی تھیں اماں سبین کو اتنے پیسے تو دیتی ہی تھی

کہ وہ روز یہ عیاشی کر سکے دونوں میاں بیوی کے اپنے تو کوئی خرچ رہ نہیں گئے تھے جو تھا وہ اسے دے دیتے تھے پھر بھی نجانے کیا بات تھی کے اس کے اندر کا احساسِ کمتری بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

وہاں عام سے گھرانوں کی لڑکیاں وہ وہ فیشن کرتی تھیں کہ سبین دنگ رہ جاتی۔ وہ ہنستی تھیں بولتی تھیں خوش ہوتی تھیں چہچہاتی تھیں یہاں پہنچ کر اسے اندازہ ہوا تھا کہ اس کی تو مسکراہٹ بھی کسی کام کی نہیں ہے اس کے پاس کوئی ایک بھی چیز ایسی نہیں جس پر وہ اترا سکتی۔۔۔اس کی خوبصورتی بھی یہاں پہنچ کر زیرو ہوگئی جب اس نے اپنے سے بھی عام سی شکل وصورت کی لڑکیوں کو خود سے زیادہ اعتماد میں دیکھا تو اس کا سارا اعتماد خاک میں مل گیا اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا نہ شاندار ماضی نہ ہی روشن مستقبل۔۔۔

جوان ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا انتشار بھی بڑھتا ہی گیا۔خلفشار کج روی پر آمادہ تھا وہ کب تک اس سے جنگ کرتی۔ اس کی بہت سی باتیں بدلنے لگیں۔اس کے جنم کا ستارہ عقرب۔۔۔زہریلا عقرب اس کے اندر پرورش پانے لگا۔وہ بات بات پر لڑنے لگی چڑنے لگی۔زویا گھر میں اس سے سب سے زیادہ قریب تھی لیکن کالج میں داخل ہونے کے بعد اس کا اس سے بھی خدا واسطے کا بیر ہوگیا وہ ہر وقت اس پر بھی پھنکارتی رہتی۔۔۔زویا اس کے قریب آتی تو وہ اسے پرے دھکیل دیتی۔۔۔اس سے پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا اس کے ہر کام میں زویا حصے دار ہوتی تھی لیکن اب جیسے گلوں کی رت بدل چکی تھی۔زویا نے بھی جان لیا تھا کہ سبین اب پہلے والی سبین نہیں رہ گئی وہ اب خود ہی اس کے قریب نہیں آتی تھی۔

چونا، چونا، چونا۔۔۔اس گھر میں سانس لینے کے لیے صاف ہوا بھی نہیں ہے۔الماس برادہ۔۔ہونہہ وہ نخوت سے سوچتی۔۔۔یہ تو وہ کوئلہ تھا جس نے اس کی زندگی بھی کوئلے کی ہی طرح سیاہ کر دی تھی ابا کی بات کو وہ اب سمجھی کالج جانے کے بعد اس کا ذہن واقعی وسعت اختیار کر گیا تھا وہ چڑ چڑی ہو رہی تھی اماں جانتی تھیں لیکن وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ جوڑ جوڑ میں بھری بس کے بعد اس کے بس میں کچھ نہ رہا تھا ہاں وہ اتنا کر دیا کرتی تھی کہ اس کے کالج سے آنے سے پہلے پہیوں والی پیڑھی گھسیٹ گھسیٹ کر فرش دھو دیا کرتی اور قطب الدین کو کہہ دیتی کہ کام ختم کر لے۔۔۔لیکن بابا کا تو کام ہی یہ تھا۔اب اگر وہ یہ نہ کرتے تو اور کیا کرتے۔۔۔ساری زندگی یہ کام کرنے کے بعد وہ ایک دم سے کیسے کسی اور کام میں خود کو جذب کر لیتے۔

اسے چونے، اڑتے ہوئے آٹے، زویا، اس گھر سے، اپنے کمرے سے۔۔۔ایک ایک چیز سے مسئلہ پیدا ہو گیا تھا۔اسے چکی کی گھوگھو سے نفرت ہوگئی تھی اکثر وہ سوتے میں چلا اٹھتی۔

”اماں بند کر دو چکی مجھے سونا ہے۔“

”چکی تو بند ہے میں تو باورچی خانے میں ہوں۔“ اماں کی آواز آتی۔

کبھی اسے محسوس ہوتا کہ بابا ریگ مال طغروں پر نہیں بلکہ اس کے کانوں پر رگڑ رہے ہیں۔سب چیزیں اس کے

اعصاب پر سوار تھیں۔اسے کس چیز سے زیادہ نفرت تھی وہ فیصلہ نہیں کرسکی ماں باپ اس کے پیار کے ہاتھوں چپ تھے۔اور وہ ایسے پیار کونہیں مانتی تھی جومنہ بند کر دیتا ہے۔وہ پیار میں منہ بند کروانا جان گئی تھی۔

☆......☆......☆

کالج میں کوئی فنکشن تھا اس نے اماں سے ایک ہفتہ پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اسے اتنے پیسے چاہئیں اماں نے جیسے تیسے کر کے اسے اتنے ہی پیسے دے دیے تھے جتنے اس نے مانگے تھے یہ پیسے اس نے اسے اپنی جوڑی ہوئی رقم میں سے دیے تھے۔جو دونوں اس کی شادی کے لیے جوڑ رہے تھے۔پہلے کے دن ہوتے تو اماں اسے پیار سے سمجھا دیتی۔۔۔فنکشن پر نہ جانے کا کہہ دیتی پرانے کپڑے پہن لینے کوکہتی یا پڑوس کی کسی لڑکی کا کوئی لباس منگوا دیتی۔۔۔جیسا کہ وہ اکثر شادی پر ارد گرد سے مانگ ہی لیتی تھی اور سب ایک دوسرے کی مدد کر دیا کرتی تھیں عید وغیرہ کے کپڑے لڑکیاں بڑی آسانی سے ایک دوسرے کو آفر کرتی تھیں خاص کر ایسے حالات میں جب انھیں پتا چلتا کہ فلاں کے خاندان میں کوئی شادی آ گئی ہے یا کوئی خاص تقریب ہے۔

وہ ایسے ہی حالات میں تو پلی بڑھی تھی اس نے کتنی بار اپنی پڑوسنوں کے کپڑے پہنے تھے اور انہیں بھی پہننے کو دیے تھے لیکن اب اسے اس محلے سمیت محلے کا ایک ایک فرد بھی برا لگنے لگا تھا۔کہاں ان کے جسموں کے اترے ہوئے کپڑے پہننا۔۔۔ اس کا موڈ اس طرح کا ہو چکا تھا کہ اسے بابا اماں کچھ بھی نہیں کہتے تھے۔وہ ایسے ہی چلنے لگے جیسا سبین چاہتی تھی۔

پیسے لے کر وہ اکیلی بازار سے جا کر شاپنگ کر آئی اس بار زویا کو بھی نہیں لے کر گئی تھی۔اس نے اپنی پسند کی چیزیں لی تھیں ایک لمحے کو بھی نہیں سوچا کے اسے کچھ پیسے بچا لینے چاہئیں بلکہ لباس کے بعد جو پیسے بچ گئے تھے اس نے انہیں بھی چھوٹی موٹی فضول کی چیزوں پر خرچ کر دیا تھا اماں نے تمام چیزیں دیکھ کر اسے کچھ بھی نہیں کہا یہ بھی نہیں کہ بالوں پر لگانے والی پن اتنی مہنگی لینے کی کیا ضرورت تھی۔ٹاپس ضرورت سے زیادہ مہنگے ہیں چوڑیاں بھی اتنی قیمت کی نہیں تھیں جتنی ان پر لکھی ہوئی تھی وہ چاہتی تھی کہ وہ کسی طرح خوش ہو جائے اب اگر اس نے یہ سب لے ہی لیا ہے تو وہ فنکشن پر خوش ہو کر جائے۔

لیکن پھر پتا نہیں اسے کیا ہوا نہ تو اس نے وہ چیزیں پہنیں اور نہ ہی فنکشن پر گئی۔

اماں نے صبح اسے جگاتے ہوئے کہا تھا کہ آج اسے فنکشن پر جانا ہے وہ اٹھ کر تیاری کر لے وہ سمجھی تھی کہ اس کی آنکھ نہیں کھل پائی یا اسے یاد ہی نہیں کے آج اس کے کالج میں فنکشن ہے جب کہ اماں کہ خیال کے برعکس وہ جسم پر تنی ہوئی چادر کے نیچے جاگ رہی تھی اماں کی آواز پر اس نے آنکھوں سے ہاتھ ہٹائے بنا کہا تھا کہ اسے کہیں نہیں جانا۔۔۔اس نے اس انداز میں کہا کہ اماں چارپائی پر اس کے سر پر کھڑے کھڑے کافی دیر تک تو کچھ سوچتی رہیں اور پھر باہر نکل گئی۔

فنکشن سے ایک دن پہلے وہ اپنی سہیلی کے گھر چلی گئی تھی۔اس نے اس کی تیاری دیکھ لی تھی اور تب ہی اس نے فیصلہ کر لیا

تھا کہ وہ کالج کے فنکشن پر نہیں جائے گی۔ یہ بات اماں بھی جانتی تھیں وہ کل سے ہی خاموش تھی جب سے اپنی سہیلی کے گھر سے آئی تھی لیکن وہ اسے اس بات پر کرید نہ سکی تھی کہ ان کی اتنی ہمت ہی نہ ہوئی۔

سارا دن اس نے کچھ نہیں کھایا چارپائی پر پڑی وہ سونے کا فریب کرتی رہی۔ گھر میں بھی آج خلافِ معمول خاموشی تھی بابا سامان دینے شاہ عالمی گئے تھے اور آج چکی بھی بند تھی جب کہ آج تو جمعرات کا دن تھا آج تو چکی پہلے کی نسبت زیادہ چلتی ہے کیوں کہ گاڑی آٹا لینے آتی ہے لیکن آج خاموشی تھی۔

''نہیں آنا ہوگا آج کسی وجہ سے گاڑی نے۔۔'' چارپائی پر لیٹی وہ ایسے ہی بے معنی باتیں سوچتی رہی۔

''نیلم تو آج خوب چہک رہی ہوگی اس قیمتی سوٹ میں۔ اس کی اونچی ایڑھی والی جوتی ہی کس قدر مہنگی تھی اتنے پیسے تو مجھے اماں نے سوٹ سمیت ہر چیز کے دیے تھے جتنے کی اس نے صرف جوتی لی ہے۔''

جلنے اور کڑھنے سے اگر رنگ بدلتا تو وہ سیاہ ہو چکی ہوتی۔

اماں نے دوپہر میں اسے کھانے کے لیے بھی نہیں جگایا وہ چادر کے اندر صبح سے ٹس سے مس نہیں ہوئی سارا دن وہ چارپائی پر زویا صحن کے کونے میں اور اماں اپنے کمرے میں بند رہی۔

شام میں زویا اس کے لیے روٹی لے کر آئی تھی دوپہر کے کھانے کی غیر حاضری کے بعد اس نے رات کا کھانا کھانے میں دیر نہیں کی۔ کافی دن سے کھانے میں سے چونے کی بو نہیں آتی تھی اماں ساتھ والوں کے گھر جا کر روٹی سالن بنا آتی تھی۔ صرف اس کو خوش کرنے کی غرض سے۔۔۔ کہ کسی طرح وہ راضی ہو جائے۔۔۔ اکثر وہ سوچتی تھی کہ وہ ماں بابا کے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ وہ سب محنت اسی کے لیے تو کر رہے ہیں۔ وہ احساس ندامت کا شکار ہوتی لیکن پھر اگلے ہی لمحے پرانا سورج پھر سے طلوع ہو جاتا۔

''تو ابا اماں کو کچھ سوچ کر اولاد کو پیدا کرنا چاہیے تھا کہ جب یہ اولاد بڑی ہوگی تو وہ اسے کیا مستقبل دیں گے۔۔'' وہ نخوت سے سوچتی۔

ابھی اس نے کھانے کا پہلا لقمہ ہی منہ میں رکھا تھا کہ بڑے دنوں کے بعد پھر سے جانی پہچانی سی مہک اس کے نتھنوں میں گھسی۔ چونے کی مہک۔۔۔ کچھ فنکشن پر نہ جانے کا دکھ، کچھ زندگی کی حسرتیں، کچھ نامکمل آرزوئیں۔ غصے سے پاؤں پٹختے ہوئے۔ چھابی ہاتھ میں پکڑے ہی وہ اماں کے کمرے کی طرف گئی اور دھڑام سے دروازہ کھولا۔

''کھا کر دیکھیں ذرا یہ۔ آج پھر۔۔۔'' اس نے چلاتے ہوئے کہا اور اندر تک پہنچتے پہنچتے اس کا فقرہ اسی کے منہ میں گھٹ کر مر گیا۔

اماں اپنی چارپائی پر لیٹے، دہری ہوئی ہچکولے کھا رہی تھی اور بری طرح کھانس رہی تھی۔ ایک لمحے کو وہ سارے شکوے بھول گئی۔

''اماں؟'' وہ اماں کی طرف لپکی۔

''کیا ہوا؟'' وہ بری طرح گھبرا کر بولی اور دیوار کی طرف سے اس نے اس پتھر وجود کا رخ اپنی طرف کیا۔

''کچھ نہیں۔۔۔'' اماں نے بری طرح سے کھانستے ہوئے کہا تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ کچھ سے کہیں زیادہ کچھ ہو گیا ہے۔ اماں جس چادر کو منہ میں ڈھونس رہی تھی وہ خون سے تر بتر تھی۔

☆......☆......☆

کہر نے برشگال کا روپ دھار رکھا تھا۔ ماورالنہر آسمان کی نیلی بے کراں چھتری تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی کھڑکی پھلانگ کر وہ آرٹ کالج کے باغ میں ننگے پاؤں ہی نکل آئی تھی سردیوں کا باغ اوس سے تر تھا اور چاروں اور کہر تھی۔ اتنی کے ہاتھ برابر کے فاصلے پر کی چیز نظر نہ آتی تھی۔ وہ بھاگتی ہوئی نجانے کس طرف جا رہی تھی۔ اس کے پیروں کی کوئی سمت نہ تھی کوئی منزل ہوتی تو سمت ہوتی وہ تو دیوانگی میں یہاں نکل آئی تھی۔ جیسے اکثر نکل آتی تھی۔

عین درمیان میں ہی اس کی ہمت جواب دے گئی تو وہ وہیں کھڑی ہو گئی اس نے اپنے اردگرد پھیلی خاموش فضا کو دیکھا اور ایک چیخ پوری طاقت سے بلند کی۔۔۔ ایسی دیوانگی سے چلانے پر بھی اس کا غم کم نہ ہوا تھا۔ وہ پھر سے چلائی تھی اور اب کے اور زور سے چلائی۔ بے جھجک ہو کر، بے خوف ہو کر، اس کی چیخ اتنی بلند تھی کہ سوئے ہوئے پورے شہر میں سنی جا سکتی تھی۔

وہ پھر چلائی اور لگاتار چلاتی رہی وہ اپنا غصہ کس پر نکال رہی تھی۔ کہر پر، اوس پر، سوئے ہوئے بے خبر لوگوں پر یا یہ وہ اضطراب تھا جو اس کے جسم میں سے اسی آہ و بکا کے ذریعے سے ہی نکل سکتا تھا چلانے کے بعد جب وہ تھک گئی تو اس پر اپنی بے بسی عیاں ہوئی۔ اس سب کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہونے والا تھا وہ وہیں نیچے گر گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اماں بابا نے اسے سالوں سے کبھی رونے نہیں دیا تھا۔ اسے تو شاید رونے کا اصل طریقہ بھی نہیں آتا تھا آج جیسے وہ پہلی بار رو رہی تھی یہ آواز اتنی بھیانک تھی کہ اسے خود بھی اس کے بھیانک ہونے کا پورا پورا اندازہ تھا۔

اس کے ساتھ ہی یہ سب کیوں ہو رہا تھا۔ اس کی زندگی میں اتنے شکوے کیوں بھر دیے گئے تھے اس نے محرومیوں میں آنکھ کھولی یا وہ محرومیاں اس پر بعد میں عیاں ہوئیں۔ اسے وہ سب قبول تھا اب وہ خدا سے کبھی کوئی شکوہ نہیں کرے گی کبھی ناشکری نہیں کرے گی۔ کبھی اماں سے نہیں لڑے گی اور نہ ہی بابا پر بولے گی وہ سب کے لیے تیار ہو گئی تھی لیکن اس کے لیے نہیں جو ہونے جا رہا تھا۔

بابا بھی کھڑکی پھلانگ کر اسے ڈھونڈتے ہوئے باہر نکل آئے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ ہمیشہ کی طرح یہاں ہی ہوگی لیکن آج اتنی کہر تھی کہ وہ اسے ڈھونڈ ہی نہیں پا رہے تھے۔ وہ چلاتے ہوئے اسے پکار رہے تھے۔ اس کے کانوں میں اپنی ہی آواز کے بھیانک اثرات عمر قید نہ پا چکے ہوتے تو وہ یقیناً بابا کی آواز سن لیتی۔

دھند کے باعث انہیں کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا پھر ان کے کانوں میں اس کے رونے کی آواز پہنچی آواز جو آری کی طرح تیز دھار تھی اسی آواز کا تعاقب کرتے کرتے ہی وہ اس کے پاس پہنچے اور وہ انہیں ایک جگہ مل گئی۔ زمین پر گری ہوئی ان کا دل کٹ کر رہ گیا۔ انہوں نے اس کے پاس پہنچ کر اسے کندھوں سے اٹھایا۔

''اتنی جلدی گھبرا گئیں۔'' وہ پیار سے پوچھ رہے تھے۔ وہ پگھل کر ان کے سینے کے ساتھ لگ گئی۔ آج جیسے وہ سارے اگلے پچھلے شکوے بھول گئی تھی۔ دکھ نے اسے سن کی ڈوری کی طرح مروڑ کر رکھ دیا تھا۔

''میں پہلے بھی اتنا کون سا مضبوط تھی بابا۔'' آج اس نے بڑے عرصے کے بعد بابا سے اتنے پیار سے بات کی۔

''کچھ نہیں ہوگا تمہاری ماں کو۔'' کہتے ہوئے بابا اداس ہو گئے۔ جیسے انہیں خود بھی یقین نہ ہو کہ جو وہ کہہ رہے ہیں سچ کہہ رہے ہیں۔ اور جیسے وہ بھی کوئی ایسی ہی جھوٹی آس چاہتے تھے۔

''ڈاکٹرز نے کہا ہے کہ کچھ نہیں ہوگا اسے۔۔۔ بہت امید دلوائی ہے انہوں نے۔''

''مت جھوٹ بولیے مجھ سے بابا! اور مت جھوٹ بولیے اپنے آپ سے۔ آپ اماں کو نہیں دیکھ رہے وہ لمحہ لمحہ مر رہی ہیں۔ ہم ایک انسان کو موت کے منہ میں جاتا ہوا دیکھ رہے ہیں اور کچھ نہیں کر پا رہے۔''

''ایسا کچھ نہیں ہے۔ تم اتنی جلدی کیوں گھبرا گئی ہو۔'' انہوں نے جلدی سے اس کی بات کی تردید کی۔

''یہ سب ہمارے ساتھ ہی کیوں ہو رہا ہے بابا۔۔۔ اگر انہیں کچھ ہوا تو میں مر جاؤں گی۔'' اس پر بابا کی کسی بھی تسلی کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

''کچھ نہیں ہوگا۔۔۔ نہ تمہیں نہ اسے۔۔'' بابا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے وہ تو سمجھتے تھے کہ وہ بڑی ہو گئی ہے لیکن وہ ابھی بھی بچی ہی تھی ایک ننھی سی چھوٹی بچی یا جیسے اس کا بچپن پھر سے لوٹ آیا تھا۔ اس سے اچھی تو زویا تھی جو خاموشی سے سب دیکھ رہی تھی اور تحمل سے بیٹھی تھی۔ اسے آنے والے وقت کا پہلے سے ہی اقرار تھا۔

''گھر چلو۔۔۔ خدا سے دعا کرو۔۔۔ کچھ نہیں ہوگا۔'' وہ اسے اپنے ساتھ لگائے گھر کی طرف بڑھے تھے۔

لیکن کچھ ہونے والا تھا اور یہ بات دونوں ہی جانتے تھے۔ سبین ہر وقت روتی رہتی کالج جانا اس نے فی الحال بند کیا ہوا تھا اور گھر کا کام سنبھال لیا تھا اماں مہینے بھر سے ہسپتال میں ہی ایڈمٹ تھی۔ بابا اماں کا اچھے سے اچھا علاج کروا رہے تھے۔ وہ زندگی

میں کسی کی جان کا شکوہ نہیں رکھنا چاہتے تھے۔۔بابا نے اماں کو سرکاری ہسپتال سے پرائیویٹ ہسپتال میں منتقل کروا دیا تھا۔وہ کسی بھی طرح کی کوتاہی نہیں چاہتے تھے سبین نے ایک دوبار ان سے پوچھا تھا کہ وہ اتنے پیسے کہاں سے لے کر آ رہے ہیں لیکن بابا اسے کوئی خاطر خواہ جواب نہ دے پائے۔

دن بھر بابا کی ہسپتال میں ڈیوٹی کے بعد رات میں وہ اماں کے پاس رہتی اور ساری رات تقریباً جاگ کر گزارتی۔وہ ایک لمحے کے لیے بھی اماں کو جدا نہیں کر رہی تھی۔اماں خاموش تھی اماں کے پاس اس کے لیے کوئی نصیحتیں نہیں تھیں اور نہ ہی پیار۔نجانے وہ ہسپتال کے بستر پر لیٹی چھت کو گھورتی کیا کیا سوچتی رہتی تھی آنسوؤں کی ایک موٹی لکیر ان کی آنکھ سے پھسل کر گال تک جیسے ثبت ہو کر رہ گئی تھی انہیں اپنی آنے والی موت کا یقین ہو گیا تھا۔

ڈاکٹر کبھی امید دلاتے اور کبھی مایوسی سے گردن ہلانے لگتے۔کھانا بازار سے آ رہا تھا جسے زویا کے علاوہ کوئی بھی نہیں کھا رہا تھا۔گھر میں کیا ہو رہا تھا اور کیا نہیں۔۔۔زویا کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔وہ کمرے یا صحن کے ایک کونے میں پڑی رہتی اور باری باری بابا اور سبین کو ہسپتال سے آتے جاتے دیکھتی رہتی۔

ایک رات سبین معمول کے مطابق ہسپتال میں اماں کے پاس ہی بیٹھی تھی۔اماں سو رہی تھی اور وہ ہسپتال کی خاموش وحشت میں خود کو تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔اماں نے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تھا وہ سو نہیں رہی تھی اسے جاگتا دیکھ کر اماں نے اسے پکارا تھا۔

''سبین؟''اس آواز میں اس قدر پیار تھا کہ سبین کو لگا اماں نے ساری زندگی اسے اس ملائم لہجے میں نہیں پکارا ہے۔

''جی اماں۔۔۔''وہ ایک دم سے سیدھی ہوئی اور اماں کے پاس آئی۔

''اب آپ کیسا محسوس کر رہی ہیں؟''

وہ اماں کے منہ سے سننا چاہتی تھی کہ وہ اب ٹھیک ہیں اور انہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی۔

''میں اب ٹھیک ہوں سب تکلیفیں ختم ہونے والی ہیں۔''اماں نے کہہ دیا جو وہ سننا چاہتی تھی لیکن یہ الفاظ اس طرح ادا ہوئے کہ اس کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو کیا۔

''سبین۔۔۔''

''جی اماں۔۔۔''اس نے اپنے آنسوؤں کو بمشکل روکا تھا۔

''کیا تمہارے دل میں کوئی ہے؟''

اس نے چونک کر اماں کی طرف دیکھا یہ سوال غیر متوقع تھا اور بے موقع بھی۔۔۔

''مجھے بتاؤ سبین۔۔۔میری بیٹی۔۔۔؟''اماں نے اصرار سے پوچھا۔دور کہیں ایک آواز بادلوں کے رتھ پر سوار اس تک پہنچی۔

''میرا نام میران ہے۔''

''میں تمہاری ماں ہوں سبین۔۔۔مجھ سے کچھ مت چھپاؤ۔''

آواز پھر آئی۔۔۔''لڑکی اپنا نام تو بتا جاؤ۔پھر کبھی ملاقات ہوئی تو تمہیں کس نام سے پکاروں گا۔'' وہ اس آواز کے طلسم میں کھونے لگی تھی۔اماں نے اس کے ہاتھ کو ہلکے سے دبایا تھا۔

''نہیں۔۔کوئی نہیں۔۔۔اس نے اتنی مدہم آواز میں کہا تھا جیسے خود بھی اس بات کا یقین نہ کرنا چاہتی ہو کہ کوئی نہیں ہے۔

''تمہارے بابا کہاں ہے؟''

''وہ باہر لاؤنج میں سو رہے ہیں'' جب سے اماں کی طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی تھی بابا دن رات ہسپتال میں ہی گزارتے تھے زویا ان دنوں پڑوس کے گھر میں رہ رہی تھی۔

''انہیں بلا کر لاؤ۔۔''اماں نے کہا تو وہ فوراً باہر نکلی بابا کو اٹھا کر اس نے انہیں اماں کا پیغام دیا۔بابا فوراً اماں کے کمرے کی طرف لپکے۔

''تم یہاں ہی رہو۔۔''بابا نے اندر جانے سے پہلے اس سے کہا تو اس کے قدم رک گئے تھے اندر دونوں کیا بات کر رہے تھے وہ نہیں جانتی تھی لیکن کسی کے رونے کی گھٹی گھٹی آواز باہر آرہی تھی وہ جانتی تھی یہ آواز کس کی ہے جو باہر آکر بھی رونے لگ گئے۔

''کیا کہہ رہی ہیں اماں؟''بابا کے باہر نکلنے پر اس نے ان سے پوچھا۔

''اس کی۔۔۔اس کی آخری خواہش ہے کہ وہ تمہاری شادی کر دے۔''بابا کا ضبط جواب دے گیا تھا اور وہ وہیں راہداری میں بیٹھ کر رونے لگے۔

☆......☆......☆

چندن کے درخت خزاں کی لپیٹ میں تھے۔زمردی گھاس پیلے پتوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔افق شب کی تاریکی میں گم ہو رہا تھا کالج میں شاید چھٹیاں چل رہی تھیں ہر طرف گرد اور ویرانی تھی دیکھنے کے لیے کچھ نہیں تھا پھر بھی وہ صبح سے یہیں بیٹھی ہوئی تھی ڈومنی چڑیوں کا ایک غول بھرا مار کر اڑتا ہوا دور جا رہا تھا اپنے اپنے گھونسلوں میں۔

وہ بھی تو ایک ایسا ہی موسم تھا۔

''میرا نام میران ہے۔''الائچی کی خوشبو جیسی ایک آواز صبح سے اس کے کانوں میں رس ٹپکا رہی تھی۔اور یہ آواز ایسی تھی کہ وہ اتنے غم میں بھی مسکرا اٹھی۔

یہ بقر عید کے دنوں کی بات تھی۔ ہر طرف عید کی تیاریاں تھیں۔ بابا کی طبیعت خراب تھی مال بنا ہوا پڑا تھا۔ بابا نے اسے کہا تھا کہ وہ اسے شاہ عالمی چچا کریم کے پاس لے جائے اور پیسے بھی لے آئے مال کا جانا بھی ضروری تھا اور گھر میں پیسوں کا آنا بھی۔۔۔دونوں کام جلد ہونے لازمی تھے اس لیے بابا کو اسے زویا کے ساتھ بھیجنا پڑا تھا تانگے پر سامان لاد کر وہ چچا کریم کے پاس چلی گئی۔ چچا کریم کے لڑکے تانگے پر مال دیکھ کر خود ہی مال اتار اتار کر اندر کارخانے میں منتقل کرنے لگے اس کے ہاتھ میں نازک ماڈل کا ایک کارٹن تھا جس کے بارے میں بابا نے ہدایت کی تھی کہ وہ اسے بہت احتیاط سے وہاں تک پہنچائے اور جس کو تانگے میں بھی ہاتھ میں پکڑے بیٹھی رہی تھی۔

جب اس کے اردگرد کا مال اتر گیا جس کے درمیان وہ مشکل سے سیٹ ہو کر بیٹھی تھی تو وہ بھی تانگے سے نیچے اتری۔۔۔کارٹن اس کے ہاتھ میں تھا اترتے سمے اس کی شال الجھ گئی۔ ایک ہاتھ میں کارٹن پکڑے وہ شال اپنے سر پر جمانے کی کوشش کر رہی تھی جب کوئی بے دھیانی میں اس سے ٹکرا گیا۔ غلطی کس کی تھی کوئی نہیں جان سکا لیکن سبین کے ہاتھ میں پکڑا ہوا کارٹن نیچے گر گیا تھا۔ جس نے سامنے والے کو بوکھلا دیا۔

''اوہ۔۔۔میں معذرت خواہ ہوں۔'' وہ جان گیا تھا کہ کارٹن کے اندر موجود کوئی چیز ٹوٹ گئی ہے جس کا ہلکا سا شور بلند ہوا تھا سبین نے اجنبی کو دیکھا۔ اس کا دارچینی جیسا کھر درا لیکن نفیس لہجہ اس بات کا غماز تھا کہ وہ کسی دوسرے خطے کا باشندہ ہے۔

اس کے خدوخال دیکھتے ہوئے وہ کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں چلی گئی۔ اس کے چہرے سے اس کا لاابالی پن نمایاں تھا۔ اس کی آنکھیں بڑی اور چاندنی کی طرح روشنی پھیلاتی ہوئی تھیں۔ اس کے بال جدید کٹ کے تھے اور اس پر بہت جچ رہے تھے۔ اس کے ہونٹ سرخ تھے گل مہر کے پھولوں کی طرح دہکتے ہوئے اور نمی والے سرخ۔۔۔جیسے وہ ابھی ابھی کوئی مشروب پی کر ہونٹ صاف کرنا بھول گیا ہو۔ وہ ابھی کم عمر تھا لیکن اس کا جسم بتا رہا تھا کہ وہ چند ہی سالوں میں ایک بھرپور مرد بن کر ابھرے گا اس کی ذات کی تکمیل یقیناً بہت نفیس پس منظر میں ہوئی تھی۔

اس نے جیکٹ کو اپنی کلائی پر دھرا ہوا تھا اور اس وقت آدھی آستین کی شرٹ میں تھا۔

ایسے عالم میں جب ان لوگوں کے لیے سردیاں شروع ہو چکی تھیں وہ خود ایک موٹی شال میں تھی اور اردگرد بھی سب نے سوئٹر جیکٹ پہن رکھی تھی۔ ایسے میں ایک ایسے لڑکے کو دیکھنا جو آدھی آستین پہنے ہوئے تھا ایک عجیب خوش گوار کھلا ڈھلا سا احساس تھا۔

''مجھے لگتا ہے میں نے آپ کا کافی نقصان کر دیا ہے۔''

''نہیں کوئی بات نہیں۔۔۔'' کیا خاک کوئی بات نہیں تھی اس نے اس کا نقصان کر دیا تھا اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کیا وہ تب بھی یہ ہی کہتی۔۔۔لیکن اب اسے کہاں اندازہ تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ اس کا دل اس کے بس سے فرار پا کر بھاگنے لگا تھا۔

لڑکے کو جیسے خیال آیا کے اسے جھک کر کم از کم کارٹن کو تو اٹھا لینا چاہیے۔اس نے اس کارٹن کا کور پیچھے کیا تاج محل کے چھ میں سے تین ماڈل ٹوٹ چکے تھے۔تین ثابت تھے۔

"وہ۔۔۔میرے خدایا۔۔۔"لڑکا بولا اس نے اپنے سر کو تھام لیا تھا۔

"یہ تو بہت قیمتی معلوم ہوتے ہیں۔"اس نے اس انداز سے کہا کہ سبین کا دل کیا کہ وہ زمین پر بیٹھ کر ٹانگیں مار مار کر ہنسے۔

"میرے بابا اسے دوبارہ بنا لیں گے۔"

"یہ تمہارے والد نے بنایا ہے؟"اب وہ کسی قدر اشتیاق سے پوچھنے لگا۔

"جی۔۔"وہ مشرقی دلہنوں کی طرح تمیز سے بولی اور"جی۔۔۔"سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکی۔سامنے والے نے اسے گنگ کر دیا تھا۔

"کیا تمہارے والد ایک انسانی چہرہ بنا سکتے ہیں۔مجھے میرے بابا۔۔۔"

"میرے بابا انسانی چہرہ نہیں بناتے۔۔"

اس نے ایک دم سے اس کی بات کاٹی سامنے والے نے اسے تلخی خیال کیا اور اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے اس نے اپنے والٹ سے پیسے نکالنے چاہے اسے لگا تھا کہ اس کے نقصان کی وجہ سے اس کے لہجے کا اتار چڑھاؤ بدلا ہے جس میں غلطی صرف اس کی نہیں تھی۔

جب وہ اپنی پینٹ کی ہپ پاکٹ سے پیسے نکال رہا تھا تو سبین نے دیکھا تھا کہ آدھی آستینوں میں سے جھانکتے اس کے بازو بہت مضبوط تھے اور ان پر کسرت کے ابھار تھے۔

"کتنے کے تھے یہ سب۔۔۔؟"اب وہ قیمت پوچھ رہا تھا۔

"فن کی قیمت ہوتی ہے۔؟"اب وہ بھی خود اعتمادی سے دوبدو بولی۔

"یہ مشین سے نکلے ہوئے ماڈل نہیں ہیں ہاتھوں سے بنے تھے اور کافی محنت سے بنے تھے۔"

"تو کیا تم انہیں بازار میں سجانے کے لیے لائی تھیں۔کیا بیچنے کے ارادے سے نہیں لائی تھیں۔"اس کی بات نے اسے لاجواب کیا۔سبین بلا ارادہ ہی مسکرائی تھی۔

"میری غلطی کا ازالہ بتاؤ۔"اس نے پوچھا۔

سبین کا دل چاہا کہ اسے کہہ دے وہ یہاں ہی کھڑا رہے۔جب،جب وہ یہاں سے گزرے تو اسے یہاں ہی کھڑا پائے یہ ہی تھا اس کی غلطی کا ازالہ اور اس کے نقصان کا مداوا۔

''بولو۔۔۔'' وہ لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔

''کوئی بات نہیں اٹس اوکے۔۔'' اس کی بات پر سامنے والے کا دل ''اوئے ہوئے'' کرنے کو چاہا۔

''کیا واقعی؟'' سبین نے ہلکے سے سر ہلا دیا۔

اس کی انگلیاں جو شال سے کھیل رہی تھیں وہ اس نے ہونٹوں میں دبالیں۔ سامنے والے کے لیے یہ کھیل بھی انجانا اور خوشگوار تھا۔

''پھر میرے ساتھ ایک کپ کافی پی لو ازالے کی صورت میں۔''

سبین نے حیرت سے اسے دیکھا ایک دم سے اتنی بے تکلفی؟

''جوس؟'' اسے لگا شاید اسے کافی پسند نہیں۔

وہ اب اس کے سامنے اطمینان سے کھڑا تھا اور کلائی پر دھری جیکٹ کو اس نے کالر سے پکڑ کر گھما کر پیچھے اپنے کندھوں پر کیا تھا۔ ایسا کرتے سے اس کے بدن کی خوشبو اور کلون کی مہک سبین تک پہنچی اور وہ پرے نہیں ہو پائی۔

''وہ پیچھے دکان ہے میں خود بھی پینا چاہ رہا تھا لیکن میرے ساتھ کوئی ساتھی ہی نہیں تھا اور مشروب کو تب تک طلب نہیں کرنا چاہیے جب تک آپ کے ساتھ کوئی ساتھی نہ ہو۔۔۔ اکیلے انسان کے لیے خدا نے دنیا میں بہت سا سادہ پانی رکھا ہوا ہے۔''

وہ اس کی بات سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکی۔

''دیکھو تمہیں بھی ضرورت ہے تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔''

وہ صرف تھکی ہوئی تو نظر نہیں آرہی تھی وہ تو ٹوٹی ہوئی بھی لگنے لگی تھی۔

''پائن ایپل۔۔۔ یا اورنج؟''

''کچھ بھی نہیں۔۔''

''تم روڈ ہو رہی ہو؟''

''میں تم سے بچ رہی ہوں۔''

''اوہ۔۔'' وہ بے اختیار ہنسا۔

''لیکن کیوں۔۔؟''

''مجھے دیر ہو رہی ہے گھر والے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

''کیا مشرقی لوگوں کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کہ وہ اپنے گھر سے گئی ہوئی لڑکیوں کا انتظار کریں۔''

''مغربی لڑکوں کے پاس اور کوئی کام نہیں کہ وہ مشرقی لڑکیوں کے راستے روکیں۔''

''مغربی لڑکے بے چارے کیا کریں مشرقی لڑکیاں اتنی خوبصورت جو ہوتی ہیں۔''اس نے آنکھ دبا کر شرارت سے کہا تھا۔

شرم سے سبین کے گال سرخ ہو گئے۔وہ ایک دم سے آگے بڑھی۔وہ جلدی سے چچا کریم کی دکان میں گھس جانا چاہتی تھی۔

''لڑکی اپنا نام تو بتا جاؤ۔۔پھر کبھی ملاقات ہوئی تو تمہیں کس نام سے پکاروں گا۔''اس کے پیچھے اس نے صدا لگائی۔

''ویسے میرا نام میران ہے۔''اس نے پلٹ کر دیکھا۔جیسا وہ خود تھا ویسا ہی اس کا نام بھی تھا۔۔۔میران۔۔۔خدا کی رحمت۔۔۔

خدا کی رحمت کوئی انسانی روپ لیتی تو وہ یقیناً اس جیسی ہی ہوتی۔۔۔

نا چاہتے ہوئے بھی اس نے دکان کے اندر جانے سے پہلے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر دیکھا وہ لڑکا جو مسکرا رہا تھا اس کے پلٹ کر دیکھنے پر اونچی آواز میں ہنسنے لگا۔

وہ گھر آئی اور اس نے بابا کو بتایا کہ اس سے تین ماڈل ٹوٹ گئے ہیں۔

''میں نے تمہیں احتیاط کرنے کو کہا تھا۔''بابا کی آواز میں دکھ تھا۔وہ ان سنی کرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

بعض کتابوں کو پڑھنے اور بعض انسانوں کو سوچنے کے لیے تنہائی اور خلوت کی ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ ان کا کوئی بھی جُز و چھوڑا نہیں جا سکتا اور مکمل جزئیات سے جاننے کیلئے یکسوئی درکار ہوتی ہے۔وہ اس خلوت میں ساری رات مگن رہی اس منظر کو بار بار اپنے ذہن میں دہراتی رہی ایک ایک جزو کے ساتھ اسے یاد کرتی رہی اس لڑکے کا خیال جاہ وجلال والے قلعے کی مانند تھا جس کی مضبوط فصیلوں کے اندر وہ قید ہو چکی تھی۔اب بھی وہ یہ ہی کر رہی تھی اس واقعے کے ایک ایک لمحے کو پھر سے دہرا رہی تھی۔

میران۔۔۔میران۔۔۔میران۔۔۔کھڑکی سے باہر خشک پتے گرداب زدہ چکر کاٹ کر زمین پر گر رہے تھے۔ہوا شاخوں پر مضراب بجانے لگی تھی یہ نوید تھی کہ بہار دور ہے لیکن آمد ہو گی ضرور۔

''تمہاری کیا مرضی ہے سبین؟''بابا اس سے پوچھ رہے تھے اور کل سے تیسری بار پوچھ چکے تھے۔کھڑکی سے ہٹ کر اس نے بابا کو دیکھا۔وہ اتنی بے حس کب سے ہو گئی تھی کیا وہ نہیں دیکھ رہی تھی کہ بابا کس قدر پریشان ہیں اور اماں کی خواہش کو کسی فرض کی طرح پورا کرنے کے لیے کتنے بے چین ہیں۔

میران۔۔۔خدا کی رحمت۔۔۔وہ کیوں اس رحمت سے محروم کر دی گئی۔

''تم اپنی ماں کو مزید پریشان نہ کرو۔۔۔اگر تم اپنی ماں کو مرتے ہوئے خوش دیکھنا چاہتی ہو تو اس کی بات مان لو۔''

اس کے پاس انکار کرنے کا اختیار تھا پھر بھی وہ انکار نہیں کر سکتی تھی۔وہ کس کے سہارے انکار کرتی ایک اجنبی کے خیال

کے سہارے جو آیا اور چلا گیا اس کے پاس سوائے ہاں کہ اور آپشن ہی کیا تھا وہ ماں کو خوش دیکھنا چاہتی تھی اور خود کو بھی۔۔۔لیکن خود کی خوشی کے اسباب موجود نہیں تھے۔

رشید اس کا تایا زاد تھا جو میٹرک بھی بمشکل ہی پاس کر سکا تھا اس کے بال گھنگھریالے تھے اور آگے اور پیچھے تمام سر کے پاس برابر تھے سر پر ہر وقت تیل لگا کر رکھتا اور پان اس کی پسندیدہ غذا تھی۔خاندان میں جتنے بھی لڑکے رہ گئے تھے وہ ان میں سب سے بہتر تھا۔

"جیسے آپ اور اماں مناسب سمجھیں۔۔"دل میں کہیں چپکے سے خنجر اتارتے ہوئے اس نے اپنی رضامندی دے دی۔ اماں کو خوش کرنے کے چکر میں اس نے اداسی اپنے حصے میں ڈال لی تھی۔

اس کی رضامندی کے بعد بابا نے تایا ابا سے بات کی اور جلدی ہی بات پکی ہوگئی۔جمعے والے دن دونوں کا نکاح کر دیا گیا۔

تائی اس رشتے سے زیادہ خوش نہیں تھیں سبین کو نکاح کے وقت ان کا موڈ دیکھ کر اس بات کا اندازہ ہوا کہ وہ اپنے شوہر اور اماں کی خراب طبیعت کی وجہ سے اس نکاح پر آمادہ ہوئی تھیں ان کے کہنے پر ہی رخصتی کا وقت کچھ عرصے بعد طے کیا گیا تھا جس پر کسی کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔

نکاح کے بعد وہ ساری رات کھڑکی سے باہر تاریک رات کو دیکھتی رہی ستارے نوچتی رہی چاند کو پھٹکارتی رہی تھی۔

سنسان بے مہر رات ہر ظلم سے بے بہرہ تھی۔جامد ہوا میں جھنجھناہٹ تھی شاید وہ آنسو جو اس کے دل میں قید تھے باہر کی تازہ ہوا میں آزاد ہو کر اسی پر مسکرانے لگے تھے۔

"میران۔۔۔"آواز کہیں دفن ہوگئی تھی۔

"میران۔۔"اس نام کی قبر اس کے دل میں بن چکی تھی۔محبت کے دیوتا کا خوش حال بت اس کے من کے مندر میں سج گیا تھا۔

بھولی لڑکی۔۔۔کیا آس پالی تھی اس نے۔۔۔

☆......☆......☆

کہتے ہیں کائنات میں کہیں بھی اندھیرا نہیں ہے۔بلکہ وہاں روشنی کی عدم موجودگی ہے جسے ہم اندھیرا سمجھتے ہیں وہ تو خالی پن پے کھوکھلا پن ہے کورا پن ہے یہ تو ہم ہیں جو اپنی عقل میں اس قدر کوتاہ ہیں جو روشنی کی غیر حاضری کو اندھیرا خیال کرتے ہیں۔

شاید اسی طرح اداسی اور غمی بھی کچھ نہیں ہے یہ بھی محض خوشی کی عدم موجودگی کا نام ہے۔کیا ان معاملات میں بھی ہم کوتاہ ہیں؟ یا حد سے زیادہ جدت پسند ہیں؟ کیا کسی کی موت کا غم اصل میں اس کی سانسوں کی عدم موجودگی کا نام ہے؟ یا یہ باتیں

کائنات کے اندھیرے تک ہی اچھی لگتی ہیں۔؟

کائنات کے اندھیرے میں تو ہم کسی بھی طرح روشنی کی عدم موجودگی کا حل نکال سکتے ہیں یا ہم اس کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے لیکن کسی کی موت کے غم کے حل کے لیے ہم اس کی سانسوں کو پھر سے کیسے رواں کر سکتے ہیں یہاں عدم موجودگی کا نظریہ کارفرما ہے یا ہماری بے بسی کا؟

☆......☆......☆

دوپہر کی تیکھی دھوپ میں سہ پہر ہو جانے کے باوجود کاٹ موجود تھی۔نومبر ختم ہو جانے کے باوجود بھی وہ جوبن کا چولا پہنے کسی مجہول کی طرح رقص کر رہی تھی اور سیدھ میں لگے پام کے درختوں میں سے انی کی طرح نکل رہی تھی۔آرٹ کالج کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس نے ہاتھ کا چھجا بنا کر ماتھے پر رکھا اور دھوپ سے بچنے کی لاحاصل کوشش کی۔۔۔اس کوشش نے اس کے چہرے کے نقوش کو مزید سختی فراہم کی تھی۔ناگواری سے دیکھتے ہوئے وہ آگے بڑھ رہی تھی اپنی گلی میں پہنچی تو ہر گھر سے حسب معمول چکی چلنے کی آواز آ رہی تھی۔

''گھوگھو۔۔۔گھوگھو۔۔''مدہم آواز اسے اتنی واضح سنائی دے رہی تھی کہ اس کا دماغ چٹخنے لگا تھا۔

جس وقت وہ اپنے گھر میں داخل ہوئی اسے اس وقت سخت بھوک لگ رہی تھی صبح بابا اور زویا کے لیے ناشتہ بناتے بناتے اسے کالج سے دیر ہو گئی تھی خود وہ ناشتہ کر ہی نہیں سکی تھی پھر اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ وہ کالج میں ہی کچھ کھا سکتی۔گھر آتے ہی بیگ کو اس نے سائیڈ پر ڈال دیا۔اماں کی کونے پر ٹاٹ کی کھولی خالی تھی۔چکی خاموش تھی بابا دوسرے کونے میں اپنے چونے کے ماڈلوں پر اوزار سے نقش نگاری کر رہے تھے وہ گھر کے اندر داخل ہوئی تو بابا ایک لمحے کو اپنے کام سے رک گئے اس سے نظریں چار ہوئیں اور وہ نظریں پھیر بیٹھے۔

سبین کو سخت بھوک لگ رہی تھی بھوک ختم کرنے کے لیے روٹی ضروری تھی اور روٹی کے لیے آٹا لازمی تھا جیسا کے اماں کہا کرتی تھی اس نے کھولی کا ٹاٹ سرکایا اور جھک کر بیٹھ گئی اماں کو مرے ہوئے ہفتہ گزر چکا تھا چکی کے پاٹ جامد تھے۔

''گھوگھو۔۔۔''چکی کے وسط میں گندم کی مٹھ ڈال کر اس نے قطب گھما دیا پاٹ گھومنے لگے۔

''گھوگھو۔۔۔گھوگھو۔۔۔''ارض وسما میں آواز صور اسرافیل کی مانند پھیلنے لگی تھی۔

☆......☆......☆

امریکا کا مصروف ترین شہر۔۔۔نیویارک۔

پرشکوہ گنبد قدح کی مانند وسیع اور گہرا تھا جس پر نفیس ایرانی نقش و نگاری کی گئی تھی۔اسلامی آرٹ کے اندر''خطِ درباری''

میں آیتیں رقم تھیں گنبد کے وسط میں ہزار ہندسوں والا عظیم فانوس جھلمل کر رہا تھا۔اس ہزار ہندسوں والے فانوس میں لاتعداد عکس جھلملا رہے تھے۔جھول رہے تھے۔سرخ ترکی ٹوپیاں اوران کے اوپر لگے سیاہ پھندنے بھی گھوم رہے تھے سفید براق پہناوے جن میں ہوا بھر چکی تھی فانوس کے شیشوں میں ایسے نظر آرہے تھے جیسے ساکت جھیل کے وسط میں کوئی سوکھا پتا گر جائے۔

یہ صوفیانہ رقص تھا،رقصِ درویش بڑے ہال کے موزیک فرش پر ہر کوئی انفرادی اور اجتماعی ہر انداز سے چکرا رہا تھا چھوٹے چھوٹے دائرے بناتے سب بڑے دائرے میں گھوم رہے تھے۔''درویش چکر'' چھت کے گنبد سے بھی زیادہ وسیع ہو چکا تھا مہیب اندھیرے میں فریب نظر بکھرا ہوا تھا نزدیک ہی موسیقی بج رہی تھی سازنواز ساز بجا رہے تھے۔موسیقار مدھم سُر بکھیر رہا تھا۔اس کی شاعری کے بول صوفیانہ تھے۔

''چمن ہا زاں جنوں ویرانہ گردو

کہ از ہنگامہ ہا ہنگامہ گردو''

صوفیانہ موسیقی ہرسو اپنے جلوے بکھیر رہی تھی۔دف بج رہا تھا ستار کے تار ہل رہے تھے۔رقص اپنے عروج پر تھا یہ عروج چکا چوند نہیں تھا ہوا میں روشنی کے ذرات تیرنے جیسا تھا۔ہر کوئی ایک وجد میں تھا اپنے اندر کے وجد میں۔۔۔

''ازاں ہوئے کہ افگند دریں شہر

جنوں ماند و لے فرزانہ گردو''

موسیقی سے حال کھیلا جا رہا تھا۔درویشانہ وصف پیدا کیا جا رہا تھا۔خود کو دنیا کے لیے تیا گا جا رہا تھا۔تزکیہ نفس کیا جا رہا تھا خود کی روح کو جاننے کی کوشش کی جا رہی تھی۔اپنے اندر جھانکا جا رہا تھا۔روحیں پاک ہو رہی تھیں۔

''چناں پابندگی در ساختم من

نہ گیرم گر مرا بخشی خدائی''

یہ تین روزہ اجتماع تھا جس میں بہت خاص خاص لوگوں کو شرکت کی اجازت ملی تھی۔دن کم تھے اور ترکی سے آئے حاجی صاحب کے دیوانے بہت زیادہ تھے جو سب ہی ان سے ملنا چاہتے تھے ان کی صدارت میں ہونے والے ''درویش چکر'' اور ''صوفی رقص'' کا شرف حاصل کرنا چاہتے تھے ان ہی میں سے ایک ''ایڈم'' بھی تھا۔اس وقت صوفیانہ رقص میں محو اس کی آنکھیں بند تھیں سفید اجنبی پہناوا جس کے لیے اس کا جسم عادی نہیں تھا اس پر پاکیزہ چولا چڑھا چکا تھا وہ پہناوا جیسے اس کے لیے ہی بنا تھا۔۔اگرچہ اس نے کبھی عام سی ٹوپی بھی نہیں پہنی تھی لیکن ترکی ٹوپی اس وقت اس کے سر پر کسی تاج کی طرح سجی ہوئی تھی اور انسانوں کے ہجوم میں وہ کوئی نیک و پارسا دیوتا دکھائی دیتا تھا۔لوگوں کے ہجوم میں خوبرو رعنا اور منفرد دیوتا۔۔۔

وہ اس قدر پرسکون نظر آ رہا تھا کہ ہال میں موجود کوئی بھی شخص اس کی پرسکونی میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔اس کے ہر عضو میں صداقت کا نور تھا۔رقص میں اس کی رفتار مدہوش کن تھی وہ تذکیہ کی گہرائیوں میں بری طرح گر چکا ہے اور اب جیسے وہاں سے خود کو پاک کروا کر ہی واپس آنا چاہتا ہے۔

موسیقار شاید اسی کی وجہ سے اپنے نغمے کو اختتام پذیر نہیں کر پا رہے تھے۔وہ جو سدھ بدھ سے بیگانہ تھا اسے اس حال سے جگانے کے لیے مزید وقت درکار تھا اسی باعث موسیقار ایک دو بار اپنا نغمہ ختم کرتے کرتے رک گئے تھے اور پھر سے آغاز کر چکے تھے۔ ایڈم کی حالت ایسی تھی جیسے وہ انسانیت کا درس دیتا انسانیت پر فنا ہو جانا چاہتا ہو لیکن اسے فنا ہو جانے کا موقع نہ فراہم کیا جا رہا ہو۔ہر آنکھ اسے دیکھ رہی تھی۔اس کی نیکی،اس کی پاک روح سب کے سامنے نکل کر آ گئی تھی۔بلاشبہ وہ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے زندگی میں کوئی ایک بھی برائی نہیں کی ہے پرنور چہرہ۔۔۔عجز سے جھکی آنکھیں۔۔۔دل میں خوف خدا۔۔۔خدا کی قرب کا متلاشی چہرہ۔۔۔وہ سراپا رضامندی تھا۔

ایڈم اپنے نام کے ساتھ ”راہل۔۔۔“ کا لقب لگاتا تھا۔

”راہل۔۔۔“ گوتم بدھ کے بیٹے کا نام۔۔۔



ناول **شام رنگ سیاہ** ابھی جاری ہے۔اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **20** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 2

زندگی پرانی ڈگر پر چل رہی تھی اور پچھلی سے مزید بری حالت میں چل رہی تھی۔ یک فرد کی عدم دستیابی کی بھیانک تبدیلی کے باوجود گھر کا سارا ماحول حسبِ معمول تھا۔ڈال کے پتے جامد تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

کالج میں سبین اور زیادہ چپ چپ رہنے لگی تھی۔لڑکیوں نے اس کی احساس کمتری میں مبتلا طبیعت کا علم ہونے کے باوجود اسے اس کی بدمزاجی جانا تھا صرف اس کی ایک دو دوستیں ایسی تھیں جو اس کی حالت سے واقف تھیں اور کسی حد تک اس کے غم سے بھی۔وہ اسے رحم کی نگاہوں سے دیکھا کرتی تھیں۔

اپنے گروپ میں شامل کر کے اسے ہنسانے کی کوشش کیا کرتی تھیں۔اس کا دل لگانے کے لیے جتن کیا کرتی تھیں اور وہ ان سب میں ایسے رہتی تھی جیسے کوئلوں کی ڈار میں کوا۔ان کی ساری کوششیں عبث گئی تھیں۔

خود بابا کی کمر بھی ٹوٹ گئی تھی۔غموں نے انہیں ادھ موا کر دیا تھا اور شاید تنہائی نے بھی۔جس عورت کے ساتھ انہوں نے زندگی کے پچیس سال گزارے تھے وہ ایک دم سے انہیں چھوڑ کر چلی گئی۔آدھے راستے میں دو دو ذمہ داریوں کے ساتھ۔وہ اپنا غم کس کے کندھے پر سر رکھ کر ہلکا کرتے۔سبین کو دیکھ دیکھ کر وہ مزید بوڑھے ہوتے جا رہے تھے۔

''میں چکی کو گھر سے اٹھوا رہا ہوں۔'' ایک دن بابا نے اس سے کہا تھا۔اسے بتانے میں پوچھنے کا عنصر بھی پوشیدہ تھا کہ اگر وہ چکی چلانے میں سہولت محسوس کرتی ہے تو پھر وہ اپنا لچک دار ارادہ بدل بھی سکتے ہیں۔وہ خاموش رہی تھی اسے نہ سہولت محسوس ہوتی تھی اور نہ درد۔۔۔وہ ان دنوں پتھر ہو چکی تھی۔ٹھوکروں کی زد میں آیا ہوا پتھر۔۔۔جو ٹھوکروں کے باعث اپنے کونوں کھدروں سے جتنا مرضی ہموار ہو جائے اس کے باوجود ہیرا نہیں بن سکتا۔

لیکن چکی گھر سے نہیں اٹھ سکی تھی۔انہیں بعد میں پتا چلا اماں اس کے جہیز کے لیے کمپنی والوں سے کافی پیسے لے چکی تھیں۔ وہ کس چیز کی تیاری کر رہی تھیں؟ انہیں اپنی موت کی پہلے سے خبر ہو گئی تھی یا موت کے فرشتے نے چپکے سے ان کے کان میں کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے فرائض پورے کر لیں۔ان کے پاس بہت کم مہلت رہ گئی ہے،اور انہوں نے اس آواز کو اچھا یا برا شگون سمجھتے ہوئے پورا کیا تھا۔ کیا فائدہ ہوا تھا اس سب کا۔۔۔اسے اماں کے ہاتھوں جوڑی ہوئی کسی چیز کو نئے گھر لے جانے کی خواہش نہیں تھی۔لیکن کمپنی والوں کو پیسے کی واپسی کی طلب ضرور تھی۔جس کی ادائیگی وہ آٹے کی صورت میں ہی کر سکتی تھی اور آٹا بنا چکی کے پس نہیں سکتا تھا۔

رات گئے تک وہ چکی چلاتی رہتی۔ دو وزنی پتھروں کے باہم تصادم سے پیدا ہونے والی گھوگھو کی آواز کی سماعتوں پر کاری وار کرتی رہتی، ٹھوس ٹھوس قطب اس کے ہاتھ کی ہتھیلی میں گڑ جاتا، وہ جتنی تکلیف محسوس کرتی اتنی ہی مزید شدت سے اسے گھمانے لگتی۔ دانوں کا برادہ اچھل اچھل کر دائیں بائیں گرتا رہتا اور وہ دیوانگی میں تیز تیز ہاتھ چلاتی اس برادے میں اپنے آنسو بھی شامل کرنے لگتی۔

زویا بھی اکثر چکی پر بیٹھ جاتی وہ اس کی مدد کروانا چاہتی تھی۔ وہ چکی کو سستی سے ہی سہی لیکن چلا لیتی تھی۔ وہ اپنا فرض نبھانا چاہتی تھی گھر کی خاموش کال کوٹھری جیسی فضا میں اپنا کردار ادا کرنا چاہتی لیکن زویا کے چکی پر بیٹھنے میں ایک قباحت تھی۔ وہ چکی پر بیٹھ جاتی تھی لیکن دانے اس کے ساتھ بیٹھ کر خود ڈالنے پڑتے تھے کیونکہ زویا چکی کی ہلکی ہوتی آواز سے یا اس کے آرام سے چلنے پر بھی اندازہ نہیں لگا سکتی کہ اس میں دانے ختم ہو گئے ہیں اور اب اسے چکی میں نئے دانے ڈال لینے چاہئیں اب پاس بیٹھ کر دانے ڈالنے سے بہتر تھا کہ سبین خود ہی چکی چلا لیتی۔۔۔ زویا کا کام احسان لینے کے مترادف تھا۔

چکی سے بمشکل فراغت کے بعد وہ بابا کا ہاتھ بھی بٹا دیا کرتی۔ کھانے کو ایک فرد کم ہو گیا تھا پھر بھی گھر کے اخراجات تھے کہ بڑھتے ہی جا رہے تھے۔

"میں کر لوں گا۔" بابا اسے اپنے قریب بیٹھنے سے روکتے۔

"کیا کر لیں گے آپ۔ صحت دیکھئے کتنی گر چکی ہے آپ کی چونا پھانک پھانک کر۔۔۔" چونے کا نام آتے ہی اس کے لہجے میں نفرت در آتی۔ یہ بات بابا کو بری لگتی۔ وہ جانتی تھی لیکن وہ اس کو چھپانے سے بھی قاصر تھی۔ وہ ڈھیٹوں کی طرح بابا کے پاس بیٹھ جاتی۔ چونے کے ڈھیر میں گڑھا نکال کر پانی ڈالتی، ڈوئی گھما کر اسے یکجا کرتی، پھر سانچوں میں ڈالتی اور کبھی خاموشی سے مال پر ریگ مال مارنا شروع کر دیتی۔ اڑتا برادہ اس کی نفرت انگیز سانسوں سے پرے ہٹتا جاتا اور بابا خاموشی سے اسے دیکھتے جاتے۔

وہ دونوں وہ والے کام کر رہی تھیں جن سے وہ بارہا نفرت کا اظہار کر چکی تھیں۔ چکی اور چوٹا چکی کی گھوگھو اسے ناپسند تھی اور چونا۔۔۔ اس سے منسلک اسے کوئی ایک ذرہ بھی پسند نہیں تھا۔ اسے سب سے ابکائی محسوس ہوتی تھی۔ ڈوئی سے، بڑے قدح نما پیالے سے جس میں چونے کا آمیزہ بنایا جاتا تھا۔ سانچوں سے خاص کر ربڑ کے سانچوں سے، جو بار بار کے استعمال سے تعفن زدہ سے ہو گئے تھے۔ اسے ان سب سے گھن آتی تھی۔ لیکن شاید وہ اس طرح خود سے کوئی بدلہ لے رہی تھی۔ اپنی تقدیر سے، اپنی قسمت سے۔۔۔ بابا سے یا شاید مری ہوئی اماں سے۔۔۔

"تم مت کرو یہ کام کچھ اور کر لو۔۔۔ بچوں کو ٹیوشن پڑھا لو" بابا چارپائی پر کھانستے ہوئے کہتے۔۔ وہ ایسے کھانستے تھے کہ ان کے ساتھ ساتھ ان کا پورا وجود بھی کھانسنے لگتا۔

''جس محلے میں ہم رہ رہے ہیں یہاں کے بچے اسکول پڑھنے ہی بہت مشکل سے جاتے ہیں۔ میرے پاس ٹیوشن پڑھنے کون بھیجے گا اپنے بچوں کو۔۔''

''تو پھر کسی سکول میں استانی لگ جاؤ۔۔''

''میں پتا کر آئی ہوں اسکول میں بھی۔۔۔وہ اتنے ہی پیسے دے رہے ہیں جتنے چکی چلنے سے آسانی سے مل جاتے ہیں۔بس وہاں قطب نہیں گھمانا پڑتا، ذہن گھمانا پڑتا ہے۔''

''کسی مہنگے اسکول میں پتا کرنا تھا تم نے۔۔۔تم ایک لائق اسٹوڈنٹ ہو۔اپنی سند دکھاؤ ان کو۔۔۔'' بابا کے لیے باہر کی دنیا کیا تھی۔وہ تاسف سے سوچ کر رہ گئی۔ پتا نہیں ساری زندگی وہ کس جنگل میں دھونی رمائے بیٹھے رہے تھے۔

''مہنگا اسکول کسے کہتے ہیں آپ جہاں بچوں کی فیس زیادہ ہوتی ہے۔وہ مہنگا اسکول ہوتا ہے۔لیکن وہاں کی استانیوں کی تنخواہوں کے حساب سے اسکول کو نام دیا جائے تو وہ اسکول کم یتیم خانہ زیادہ لگے گا۔''

بابا لاجواب ہو گئے تھے۔ جوان ہوتی اولاد کا تجربہ اور مشاہدہ ان سے کہیں زیادہ تھا۔

''بچپن سے اس کام کو ہی دیتی آ رہی ہوں۔اس میں ہی چار پیسے کما سکتی ہوں۔'' اس نے بابا کا دل رکھنے کو کہہ دیا تھا۔یہ سوچے بنا کہ یہ دونوں کام کرتے وقت اس کا خود کا دل کس قدر دکھی ہو جاتا تھا۔

''چونا سفید ہوتا ہے اس کے لیے دل کا سفید ہونا بھی ضروری ہے۔تم کون سفید کر کے بیٹھی ہو اس طرح سے تم یہ کام نہیں سیکھ سکو گی یہ بے ضرر پتھر کیسے تمہارے لیے اپنی انا کو توڑ کر تمہیں کسی قالب میں ڈھالنے کی اجازت دے گا۔''

وہ بابا کی منطق سمجھنے کے موڈ میں نہیں تھی اور نہ ہی انہیں اپنی سمجھانے کے موڈ میں تھی۔ وہ کیا بتاتی کہ گھر کی چوکھٹ سے باہر زمانہ بدل گیا ہے۔کام کے بدلے ہی اناج ملتا ہے۔کوئی فلسفوں کو سن کر پیٹ بھر سکتا ہے اور نہ ہی پیٹ بھرنے کے لیے کچھ دیتا ہے۔اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا چونے کے لیے من صاف کرنے کا۔۔۔وہ تو صرف اس لیے یہ کام کر رہی تھی کہ چار ہاتھ مل کر یقیناً کام کو آسان بھی کر سکتے تھے اور زیادہ بھی۔۔۔اسے اب زویا کا آپریشن بھی کروانا تھا۔اپنی شادی کا انتظام بھی کرنا تھا۔اتنے بہت سے خرچے منہ کھولے کھڑے تھے۔اس کے آٹھ ہاتھ بھی ہوتے تو تھک جاتے جتنا کام وہ ان دنوں کر رہی تھی۔

''آپ اس کام کو جدید طریقے سے کریں اب۔۔۔منفرد رنگوں کا استعمال کریں۔جیسا دوسرے لوگ کرتے ہیں۔

''رنگوں سے میرے ہاتھ جلنے لگتے ہیں۔ایک بار پہلے بھی میں نے کوشش کی تھی۔''

''تو میں کر لیا کروں گی۔''

''مجھے اس کی بو سے الرجی ہے۔''

''پھر گولڈن سلور پتی یا نگ لگانے کا کام کر لیتے ہیں۔''

''وہ سب کام ڈائی سے نکلے ہوئے مال پر ہوتا ہے۔ ہمارے سانچے پرانے ہیں ڈائی لگانے کے لیے کافی سرمایہ چاہیے اور نئے سانچے بھی بہت مہنگے ہیں۔''

''لیکن ہم افشاں تو اسی مال پر لگا سکتے ہیں ناں۔ میں نے چچا کریم کی دکان پر دیکھا ہے۔لوگوں نے اسی مال پر افشاں لگائی ہوئی ہے۔''

''افشاں سانسوں کے لئے نقصان دہ ہوتی ہے۔اس کا کام میں تمہیں ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔ وہ لوگ کاریگروں سے کام کرواتے ہیں۔''

''ہونہہ۔۔ جو فائدہ مند تھا اس نے کیا فائدہ پہنچا دیا تھا ان سب کو۔۔'' وہ نخوت سے سوچتی اور ایک بار پھر سے پرانے سانچوں میں گاڑھا آمیزہ ڈال دیتی۔

شاید بابا اس کے کام کو ہاتھ لگانے کے انتظار میں ہی تھے۔ وہ جو اپنی کمزوری کو لپیٹ لپیٹ کر کام پر بیٹھتے تھے اب بالکل ہی چارپائی سے لگتے جارہے تھے۔ایک دن انہوں نے وہ پیڑھی سنبھال لی تھی جس پر کبھی اماں بیٹھا کرتی تھی۔ کیونکہ اب بابا سے بھی نہیں چلا جاتا تھا۔ پھر ایک دن اس نے بابا کو بھی اماں کی طرح ہی بری طرح کھانستے ہوئے دیکھ لیا۔اس دن اسے اندازہ ہوا تھا کہ اسے تیز تیز ہاتھ چلانے پڑیں گے ورنہ وہ پھر سے کچھ کھو دینے کے لیے خود کو تیار کر لے۔ دولت کی کمی کیسے سانسیں کم کر دیتی ہے یہ اس نے ایک بار دیکھ لیا تھا۔ دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

☆......☆......☆

''مال لے کر کریم کے پاس چلی جاؤ، اس سے پیسے بھی لے آنا۔''

بابا نے ایک دن اس سے کہا تھا اور اس کا دل بگولے کی زد میں آئی چڑیا کی طرح کانپ کر رہ گیا تھا۔ وہ کوئی پہلی بار تو نہیں جارہی تھی چچا کریم کے پاس۔ ایک بار پہلے بھی جا چکی تھی پھر اس کے دل کی دھڑکن کیوں زنجیروں سے اکھڑنے لگی تھی؟ اسے وہاں جانے سے ڈر لگا تھا یا اکیلے بازار جانے سے؟ یا وہ اس راستے پر دوبارہ نہیں جانا چاہتی تھی جہاں ایک دن اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ ایک اجنبی سے، جو کسی ملک کا بھٹکا ہوا شہزادہ لگتا تھا۔

''میرا نام میران ہے۔'' آواز اس کی ساعتوں میں قید تھی۔ اس کا خیال ہی جیسے اس کی کل متاع بن گیا تھا۔ وہ اب نکاح شدہ تھی اور اس راستے پر پھر سے جا کر اس محرم کو غیر محرم نہیں کرنا چاہتی تھی۔

چادر اوڑھ کر ایک بہت لمبا چکر کاٹ کر وہ دوسرے راستے سے چچا کریم کی دکان پر پہنچی تھی۔

''قطب الدین کو کیا ہوا ہے۔''

''ان کی طبیعت زیادا اچھی نہیں ہے۔''

''تب ہی تو میں بھی کہوں کہ مال اتنا خراب کیوں آ رہا ہے۔اس نے پچھلے بیس سالوں میں اتنا برا کام نہیں کیا جیسے وہ اب کر رہا ہے۔وہ تو چونے کو الماس برادہ کہتا ہے۔جانتا ہے کہ اس برادے کو پھر سے الماس کیسے بنانا ہے۔'' چچا کریم اس کے سامنے اس کے باپ کی تعریف کر رہے تھے اسے کوئی سروکار نہیں تھا کہ بابا چونے کو کیا کہتے ہیں اور لوگوں کے لیے یہ بات کسی حد تک باعث فخر ہے۔

''کیا مال زیادہ خراب ہے؟''

''بہت۔۔۔'' چچا کریم افسوس سے سر ہلانے لگے۔

''بہت زیادہ شکایتیں آ رہی ہیں۔ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔میں نے سوچا تھا کہ اس بار آئے گا تو اسے کہوں گا۔طغرے ٹیڑھے ہوتے ہیں یا اندر کے الفاظ کی اچھی تراش خراش نہیں ہوئی ہوتی، چونا کبھی صحیح پکا ہوا نہیں ہوتا، اس کے پچھلے مال کے بہت سے طغرے تو دکان میں پڑے پڑے اپنے ہی وزن سے ٹوٹ گئے تھے جب کہ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا وہ چونے کو پتھر کر دیتا ہے۔ پانی کی مقدار اور دھوپ کی آنچ کا اس سے زیادہ کس کو پتا ہوگا۔''

''کیسی عجیب بات ہے۔اپنے فن میں اتنی مہارت بھی بابا کو آسودہ حال نہیں کر سکی۔'' وہ دکھ سے بڑبڑا کر رہ گئی تھی۔

''جو لوگ فن کو ایمان بنا لیتے ہیں ان کے لیے ذریعہ معاش اتنی اہمیت نہیں رکھتا بیٹی!'' چچا کریم نے شاید اس کی بڑبڑاہٹ سن لی تھی۔ان کی بات نے اسے شرمندہ کر دیا۔چچا کریم نے اسے پیسے پکڑا دیئے تھے۔اس نے پیسے گنے تھے۔جو اس کی توقع سے بہت کم تھے۔

''کیا اتنے ہی بنتے ہیں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔چچا کریم نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''کیا میں تمہارے ساتھ بے ایمانی کر سکتا ہوں بیٹی؟''

''نہیں۔میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' وہ شرمندہ ہوئی۔

''یہ دیکھو۔'' چچا کریم نے اپنا دراز کھول کر وہاں سے ایک کیش میموز کالی اور اسے پچھلے مہینوں کی رسیدیں دکھانا شروع کیں۔

''ہمیشہ تقریباً اتنے ہی پیسے جاتے ہیں میری بچی۔''

اس کا دماغ کھولنے لگا۔اس کام کے اتنے کم پیسے ملتے رہے ہیں بابا کو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔اسے چچا کریم پر غصہ نہیں تھا اسے تو۔۔۔کس بات کا غصہ تھا اسے آخر؟

پچھلی بار جب چچا کریم نے اسے پیسے دیئے تھے تو ساتھ یہ بھی کہہ دیا تھا کہ باقی حساب کتاب میں قطب الدین سے خود کرلوں گا۔وہ سمجھی تھی کہ عید کی وجہ سے چچا کے پاس پیسوں کی کمی ہے لیکن اب؟

اس نے مال پر بابا سے زیادہ خود محنت کی تھی۔اسی لیے اتنے زیادہ مال پر اتنے کم پیسوں کو وہ اپنی ہتک محسوس کرنے لگی تھی۔تین ماہ سے بجلی، گیس کے بل جمع نہیں ہوئے تھے۔باورچی خانے میں راشن کے خالی برتن اس کا منہ چڑا رہے تھے۔وہ سوچ رہی تھی کہ آج چچا کریم سے جو پیسے ملیں گے ان سے وہ یہ یہ کام کرے گی۔اور اب اپنے دوپٹے کے پہلو میں پیسے باندھتے ہوئے اس کا دل کر رہا تھا کہ وہ گھر جانے کے بجائے سیدھا دریائے راوی چلی جائے اور چپکے سے چھلانگ لگا دے۔

گھر آتے آتے اس کا دماغ آتش فشاں کی طرح کھولنے لگا تھا۔اس کی نس نس میں سوئیاں سی چبھنے لگی تھیں اور اس کا روم روم نفرت انگیز غضب کا شکار ہو چکا تھا۔

☆......☆......☆

''ایڈم راہل۔'' وہ نہ ہندو تھا، نہ مسلمان نہ سکھ نہ پارسی، نہ یہودی اور نہ ہی عیسائی، بلکہ وہ ان سب مذاہب کی پیروی کرتا تھا۔ان کی عزت کرتا تھا۔اس نے اپنے نام کے آگے راہل کا اضافہ بھی اسی وجہ سے کیا تھا۔

''اس نام کو مسلمان بھی رکھتے ہیں اور ہندو بھی۔۔۔ بدھ کے لیے یہ مقدس نام ہے۔پارسی، عیسائی اور یہودی بھی اسے رکھتے ہیں۔لامی لوگ بھی اسے پسند کرتے ہیں۔اس لیے میں آج سے اس نام کا اضافہ کر رہا ہوں۔میں تمام مذاہب کی پیروی کرتا ہوں۔عزت کرتا ہوں۔میرے دل میں تمام مذاہب کا احترام ہے۔میں تمام مذاہب کی اکائی بننا چاہتا ہوں۔''

اس نے بیس سال کی عمر میں یہ اعلان کرتے ہوئے اپنے نام کے آگے ''راہل'' کا اضافہ کیا تھا۔یہ وہ وقت تھا جب اس کی سوتیلی ماں، جس نے اسے یتیم خانے سے لے کر پالا تھا، کے بعد اس کے سوتیلے باپ کا انتقال بھی ہو چکا تھا۔دونوں کی موت نے اسے غم زدہ کر دیا تھا اور اس نے زندگی کو اکیلے اور ایک نئے انداز میں گزارنے کا تہیہ کیا تھا۔زندگی کی وہ محرومیاں جو اپنا بچپن ایک یتیم خانے میں گزارنے کے بعد اس کے چہرے پر ثبت تھیں غائب ہو گئی تھیں۔اسے کتابیں پڑھنے کا بچپن سے ہی شوق تھا۔کسی تحریر کا نجانے اس پر کیا اثر ہوا تھا کہ اس نے اپنا مذہب چھوڑ دیا تھا اور تمام مذاہب اپنا لیے تھے۔شاید اس کی وجہ دنیا میں مذہب کے نام کی وہ شدت پسندی اور انتشار تھا جو بہت سے فساد کا باعث بن رہا۔

ویسے اس کا خود کا پیدائشی مذہب کیا تھا اس کے بارے میں بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔یتیم خانے کے فارم میں اس کے پیدائشی مذہب کا خانہ خالی تھا۔اور وہاں سیکولر لکھا ہوا تھا۔لیکن وہ سیکولر نہیں تھا۔وہ غیر مذہبی ہوتے ہوئے بھی سارے مذاہب کے ماننے والوں کا پسندیدہ شخص تھا۔کیونکہ آج تک اس کے ساتھ کوئی ایک بھی تنازع منسلک نہیں ہوا تھا۔

رفتہ رفتہ اس نے تمام مذاہب کی عزت کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے کام کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔انتھک محنت کے بعد وہ معاشی لحاظ سے بھی آسودہ تھا۔ایڈم راہل ایک معروف ادارے ''آل تیر یلیجن'' (تمام مذاہب کا مالک) تھا۔اور جیسا کہ نام سے میں ظاہر ہے یہ ادارہ دنیا بھر کے سارے مذاہب کے لیے کام کرتا تھا۔اس ادارے کے تحت تمام مذاہب کی مقدس کتابیں شائع کی جاتی تھیں۔اس کے علاوہ مقدس کتابوں کی آڈیو کیسٹ ترجمے اور ہر وہ کام جو کسی بھی مذہب سے منسلک تھا وہ یہاں سے نکلتا تھا۔جیسا اس نے اپنے بچپن میں کہا تھا ویسا کر دکھایا تھا۔وہ تمام مذاہب کی ترویج کی واحد اکائی بن چکا تھا۔تعصب سے پاک بغض سے پرے۔

آل ریلیجن مذہبی نقطہ نظر سے بہت وسیع پیمانے پر کام کر رہا تھا۔جس کے باعث ایک عالم ایڈم راہل کا دیوانہ تھا۔جن میں زیادہ تعداد لڑکیوں کی تھی وہ اس حسن کے دیوتا کے چرنوں میں بیٹھ کر اس کی سیوا کرنا چاہتی تھیں لیکن یہ اس کی فطرت کی کجی تھی یا عدم دلچسپی کہ کوئی بھی لڑکی ابھی تک اس کے التفات کی مستحق نہیں ٹھہری تھی۔عجز کے بہتے جھرنے میں ابھی اسے کسی فریق کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی تھی۔

ایڈم کی اپنی ایک این جی او بھی تھی جو یتیم اور بے سہارا بچوں کے لیے کام کرتی تھی۔اس کے لیے وہ فنڈ ریزنگ میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا۔دنیا بھر میں ہونے والی مختلف مذہبی تقریبات میں وہ بذات خود شریک ہو کر چندہ مانگا کرتا تھا۔

اپنی ساری دولت جو اس وقت اس کے پاس تھی اور جو آنے والے وقت میں کما سکتا تھا اس نے ابھی اسے اپنی این جی او کے نام کر دی تھی۔ایسا درویشانہ فیصلہ یقیناً بہت کم لوگ ہی کر پاتے ہیں۔ایڈم ان ہی کمیاب لوگوں میں سے ایک تھا۔اخبارات اس کے بارے میں آئے دن کچھ نہ کچھ شائع کرتے ہی رہتے تھے۔اس کی پچھلی زندگی سے متعلق اور اس کی آنے والی زندگی کے ارادے۔۔۔جو کہ زیادہ تر تجزیئے اور پیش گوئیوں پر بھی ہوتے تھے۔

اگر وہ تمام مذاہب کی عزت کر رہا تھا اور ان کے لیے کام کر رہا تھا تو بدلے میں اسے بھی اتنی ہی عزت مل رہی تھی ہر ہر قوم سے اور ہر ہر فرد سے۔۔۔یہ ہی وجہ تھی کہ آج حاجی صاحب کی محفل میں شریک ہونے کے لیے بھی اسے بخوشی اجازت دے دی گئی تھی۔

''میرے لیے یہ بہت اعزاز کی بات ہے کہ حاجی صاحب نے مجھے اپنی محفل میں شرکت کی اجازت دی ہے۔مجھے پتا چلا تھا کہ ان کے سماع سے چیدہ چیدہ لوگ ہی مستفید ہو سکتے ہیں۔جو کہ پہلے سے ہی طے شدہ تھے۔لیکن میری درخواست کو بھی عزت بخشی گئی۔اس کے لیے میں حاجی صاحب کا تہہ دل سے ممنون ہوں۔'' باہر نکل کر وہ پریس والوں کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا اس کی جھکی آنکھیں اور نرم لہجہ اس بات کا غماز تھا جیسے وہ ابھی بھی ''صوفی رقص'' میں موجود ہو۔

''آپ کے لیے اس محفل میں شرکت کرنا اتنا ضروری کیوں تھا؟'' ایک صحافی نے پوچھا تھا۔

''جیسا کہ آپ سب ہی جانتے ہیں کہ میرے دل میں تمام مذاہب کا احترام موجود ہے۔اسی لیے میں ہر مذہب کی تمام چیزوں کو فالو کرتا ہوں۔ میں نے عمرہ بھی کیا ہوا ہے، میری کانوویناا بھی ہے، میں بدھ دانت کے مندر بھی جاتا ہوں اور پگوڈا بھی ۔۔۔اس لیے میری لیے یہ محفل بھی اتنی ہی اہم تھی۔ کسی بھی مذہب کو جاننے کے لیے ان کے تہواراوران کی مقدس محفلوں کو جاننا بھی بے حد ضروری ہوتا ہے۔''

''لیکن سر کچھ لوگ تو آپ پر یہ بھی الزام لگاتے ہیں کہ آپ یہ سب دکھاوا کرتے ہیں۔ درحقیقت آپ کچھ اور ہیں۔'' ایک صحافی نے چبھتا ہوا سوال کیا تھا۔ایڈم نے مسکرا کر اس کے سوال کی تلخی کو برداشت کیا تھا۔غصے میں آنا اس کی شخصیت کا خاصا نہیں تھا۔

''جولوگ مجھ پر یہ الزام لگاتے ہیں وہ بھی درحقیقت کچھ اور ہیں۔اور مجھے اپنے دشمنوں کو کچھ نہیں کہنا۔۔۔ مجھے ان کو معاف کرنا ہے۔خدا یہ ہی سکھاتا ہے۔ ہماری دنیا میں مذہب کی گنجائش کم ہوتی جارہی ہے۔کچھ لوگ مذہب کو ماننے والوں کے ہی خلاف ہیں۔ایسے میں مجھ جیسے آدمی کا وجود جو سارے مذاہب کی ترقی کا کام کررہا ہے۔جس کے ادارے سے ہر ہر مذہب کی ترقی ہو،انہیں کیسے برداشت ہوگا۔

ایڈم کے بارے میں شک کی صرف ایک ہی بات پچھلے دنوں سامنے آئی تھی جب اس کی ایک ایسی فوٹیج منظر عام پر آ گئی جس میں اسے کچھ مجرمانہ لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا دکھایا گیا تھا۔ یہاں صحافی نے اسی کے بارے میں بات کی تھی۔ یہ قصہ شروع ہو کر ایڈم کے جواب کے بعد فوراً ختم بھی گیا تھا لیکن اس صحافی کی جیسے ایک بار میں تسلی نہیں ہوئی تھی۔

''لوگ اگر اپنی اصلاح کے لیے میرے پاس آتے ہیں تو میں ان کا ماضی نہیں دیکھتا کیونکہ خدا بھی توبہ کے بعد ہمارے ماضی کو نظر انداز کر دیتا ہے۔اب جولوگ خود کو بہتر کرنا چاہتے ہیں ان کا تعلق منافقوں کے قبیلے سے ہو یا مومنوں کی صفوں سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔وہ لوگ مجرم تھے۔ گناہگار، قاتل، مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا، وہ میرے پاس اصلاح کے لیے آئے تھے اور ان کی اصلاح کرنا مجھ پر میری ذات کا قرض تھا جسے میں نے ادا کیا۔اس لیے میں خود پر الزام لگانے والوں کو معاف کرتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ محشر خدا مجھ پر الزام لگانے کی وجہ سے انہیں دوزخ میں ڈالے۔۔ مجھے خدا پر یقین ہے کہ وہ میری بے گناہی ثابت کرے گا کیونکہ خدا خود کہتا ہے کہ وہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔''

''لیکن آپ تو خود کسی مذہب کو نہیں مانتے سر۔آپ کیسے کسی کی اصلاح کر سکتے ہیں؟''

''میں کسی ایک مذہب کو نہیں مانتا ورنہ تو میں سب مذاہب کو مانتا ہوں۔ خدا کے وجود سے میں کیسے انکار کرسکتا ہوں جو شہہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ ہاں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ میں مسلمان نہیں ہوں، نہ عیسائی، نہ ہندو اور نہ یہودی۔'' اس نے

اثبات آلودہ مسکراہٹ جس میں صرف اور صرف خلوص تھا سے جواب دیا۔ وہ بہت سہولت سے ہر بات کا جواب دیتا رہا تھا۔ حاجی صاحب سماع سے باہر نکلے تو سب کی توجہ ان کی طرف مبذول ہوئی۔ ایڈم حاجی صاحب سے مصافحہ کر کے، پشت سے ان کے ہاتھ کا بوسہ لے کر کار میں بیٹھ کر اپنے آفس کے لیے نکل پڑا تھا۔

☆......☆......☆

''بابا یہ دیکھئے یہ ٹھیک بنا ہے؟''

بابا سو رہے تھے یا شاید سونے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب وہ تاج محل کا ایک ماڈل لے کر ان کے پاس آئی تھی۔ یہ تاج محل سارا کا سارا اس نے خود ہی بنایا تھا۔ چونے کو سانچے میں ڈالا تھا۔ اسے سکھایا تھا۔ پھر سانچے میں سے بڑی احتیاط کے ساتھ باہر نکالا تھا۔ اس کی باریکیاں بنائی تھیں۔ نیا چونا گھول کر اس کی اس جگہ سے لیپا پوتی کی تھی جہاں سے ماڈل سانچے سے صحیح نہیں نکل سکا تھا۔ باریک باریک اوزاروں سے اس کی تراش خراش کی تھی۔ پھونکیں مار مار کر اس کا گلا خشک ہو گیا تھا۔ وہ تھک گئی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ اب تو وہ اس کام کو ٹھیک سے سیکھ ہی گئی ہے۔

بابا نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹا کر اسے اور پھر تاج محل کے ماڈل کو دیکھا۔ پہلے وہ مدد کرتی تھی اب خود یہ سارا کام سنبھالنا چاہتی تھی۔ کیا وہ بھی قطب الدین بننا چاہتی تھی۔ بابا اسے کتنی بار تو منع کر چکے تھے لیکن وہ باز نہیں آ رہی تھی۔ وہ جان بوجھ کر وہی کام کیے جا رہی تھی جو اس سے نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اس کام کے لیے بنی ہی نہیں تھی۔ وہ صرف بابا کو تنگ کر رہی تھی کیونکہ جب وہ بابا کو کہا کرتی تھی اس کام کو چھوڑ دیں تو وہ بھی نہیں سنا کرتے تھے۔ اب وہ بھی نہیں سن رہی تھی۔

''دیکھیے۔۔۔ کیسا بنا ہے؟''

بابا کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اسے کس طرح منع کریں اور کس طرح بتائیں کہ اس کا بنایا ہوا ماڈل ٹیڑھا ہے اور اس میں خوب صورتی نام کو نہیں۔ تاج محل کے مقبرے کی تصویر کشی ے کو نظر انداز کر کے جیسے صرف اس کے اندر کی قبر کی وحشت کو ابھارا گیا ہے۔

''سانچے کے پیچ ٹھیک سے کسے تھے تم نے؟''

''ہاں بہت اچھے سے۔۔''

''نقش چھوٹی چھینی سے ابھارے ہیں؟''

''جی۔'' اس کی آواز مدھم ہو گئی تھی۔ اسے پتا تھا کہ اتنے سوال کیوں پوچھے جا رہے ہیں۔ ماڈل ٹھیک نہیں تھا یقیناً بابا نے اس کی آواز کی مایوسی پرکھ لی تھی۔

''تم مت کرو یہ کام بیٹی!''

''کیوں؟'' نظریں اٹھا کر اس نے بابا کی طرف دیکھا۔اس کے سوال میں طنز تھا۔بابا کے چہرے کے تاثرات بدلے تھے۔

''آپ کو پتا ہے بابا! اماں کی جان کس نے لی ہے؟'' اس نے پوچھا۔بابا اس اچانک سوال سے چونکے اور سٹپٹا گئے۔

''ان کی بیماری نے نہیں آپ کے اس کام نے۔ہماری زندگی پتا ہے کس نے خراب کی ہے؟ ہمارے حالات نے نہیں آپ کے اس کام نے اور اب آپ کہہ رہے ہیں کہ میں یہ کام چھوڑ دوں۔۔۔کیوں کیا باقی رہ گیا ہے پیچھے؟''

اس نے تاج محل کا ماڈل پوری طاقت سے زمین پر دے مارا۔ایک شور اٹھا تھا کمرے میں اور ٹوٹے ہوئے تاج محل سے سفید چونے کا ایک ننھا سا بادل بلند ہوا۔یہ بادل دونوں کے درمیان لمحے بھر کو حائل رہا۔بابا خاموش تھے۔اس کی صورت دیکھ رہے تھے۔بادل ہٹا تو وہ پھر سے پھٹ پڑی۔

''اماں کو آپ سے بہت محبت تھی بابا! آپ پر کبھی اس گھر کا بوجھ پڑنے ہی نہیں دیا انہوں نے۔۔۔آپ یہ سمجھتے رہے کہ آپ کے ان نمونوں اور طغروں نے گھر کو چلایا ہے۔اس کے کتنے پیسے ملتے ہیں یہ تو مجھے آج چچا کریم کے پاس جا کر پتا چلا ہے۔''

نفرت سے کہتے ہوئے اس نے دوپٹے کے پلو سے پیسے نکالے تھے۔

''یہ پیسے دیئے ہیں انہوں نے مجھے ان ڈھیر سارے ماڈلز کے۔'' اس نے چند تڑے مڑے سے نوٹ نکال کر بابا کے سامنے پھینکے۔وہ غصہ جو صبح سے اس کے سر پر سوار تھا وہ اس نے پیسوں کو زمین پر نخوت سے پھینک کر نکالا تھا۔

بابا کچھ نہیں بول سکے تھے۔وہ جانتے تھے کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔وہ سب سچ کہہ رہی تھی۔ان کا فن بس اتنی ہی قیمت رکھتا تھا۔آج ان کے ماڈل سمیت ان کی قیمت بھی عیاں ہو چکی تھی۔انہوں نے دو ایک آنسو بہائے تھے۔آنسو بین کی آنکھوں سے بھی نکل آئے تھے۔

کالج کے پرنسپل نے سو روپے کا نوٹ دیتے ہوئے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ ''اگر یہ تمہیں کم لگ رہے ہیں تو جان لو کہ یہ بہت زیادہ ہیں۔اس ماڈل کی حیثیت سے بھی اور تمہاری اوقات سے بھی۔'' آج اس نے جان لیا تھا۔بعض جان کاریاں اس قدر سفاک کیوں ہوتی ہیں وہ یہ نہیں جان سکی تھی۔

''اس چونے نے ہماری زندگی تباہ کر دی ہے بابا! اس چونے نے،آپ کہتے ہیں کہ اس کے لیے دل کا سفید ہونا ضروری ہے۔دل کیسے سفید رہے جب اس سے روح کو سیاہ غم لگ چکے ہوں۔'' وہ بھی رونے لگی تھی۔

ساری رات روتے اور سوچتے ہوئے اسے یہ احساس کھاتا رہا تھا کہ وہ بابا کا بھرم ہی رکھ لیتی جو اسے ایک بات پتا چل ہی گئی تھی تو اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ وہ اسے بابا کے سامنے عیاں ہی کرتی۔زندگی کی تلخیوں کا بابا سے بدلہ لینا ضروری تو نہیں تھا۔اگر وہ ساری زندگی اپنے کام سے خوش رہے تھے تو اسے کیا ضرورت تھی اس عمر میں ان کی خوشی اور راحت ان سے چھیننے کی۔

صبح وہ بابا کے کمرے میں گئی تھی۔ بابا اسی حالت میں تھے جس حالت میں وہ رات انہیں چھوڑ کر گئی تھی۔ شاید انہوں نے رات سے کروٹ بھی نہیں بدلی تھی۔ اس کے دل سے ایک ہوک سی اٹھی۔

''مجھے معاف کر دیں بابا! میں نے آپ کا دل دکھایا ہے۔'' ایک دم سے وہ کہتے ہوئے بابا کے سینے پر گری تھی۔

''مجھے معاف کر دیں۔ اپنی بیٹی کو معاف کر دیں۔'' بے بسی سے اسے کچھ بھی تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اب کیا کر رہی ہے اور اس نے کل رات کیا کیا ہے۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں آج ہی اس کام سے جان چھڑا لوں گا۔ اپنا سارا سامان باہر پھینک دوں گا۔'' بابا خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولے۔

''میں نے تم سب کی زندگی برباد کر دی ہے۔ اب مزید نہیں کرنا چاہتا۔''

لیکن سبین جانتی تھی کہ بابا کا اس کام سے چھٹکارے کا مطلب تھا جان سے ہاتھ دھونا۔ چونے کی مالا جپتے جپتے وہ خود کو مٹی کے بجائے چونے کا انسان سمجھنے لگے تھے۔ ان کے لیے وہ ہوا بھی مضر تھی جس میں چونے کی خوشبو نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے سبین نے چونے کے پیالے میں پانی ڈال کر ایک بار پھر سے آمیزہ تیار کر لیا۔

''آپ فکر نہ کریں۔۔۔ آپ نہ سہی لیکن میں آپ کو اس کام میں ترقی کر کے دکھاؤں گی۔'' اس نے ایک عزم سے کہا تھا۔ بابا اسے دیکھتے رہ گئے تھے۔

آنے والے دنوں میں وہ پہلے سے زیادہ دل جمعی سے کام کرنے لگی تھی۔ اس کے سر پر گھر کے اخراجات کا بھوت سوار تھا۔ وہ جلدی میں معیار کو نظر انداز کر کے تعداد کا اصول اپنائے ہوئے تھی۔ آمیزہ بنا کر وہ انہیں سانچوں میں ڈالتی پھر اگلے دن بڑی احتیاط کے ساتھ سانچوں میں سے نکال کر دھوپ میں سوکھنے کے لیے رکھتی۔ ساری احتیاط کے باوجود بھی کتنے ماڈل ٹوٹ جاتے تھے۔ کچھ وہ غصے سے مزید توڑ دیتی تھی۔ بابا اسے دیکھتے رہتے اور کچھ نہیں کہتے۔

مہینے بھر بعد کافی ماڈل بن گئے تو وہ پھر چچا کریم کے پاس گئی تھی۔ اس نے اور بابا نے مل کر اس بار بہت سا کام کیا تھا۔ مال اتنا زیادہ تیار ہو گیا تھا کہ اسے دو تانگے کروانے پڑے تھے۔ وہ کافی سارے پیسے مل جانے کا سوچ کر آئی تھی۔

''مال بہت خراب آ رہا ہے میری بٹیا! مجھے بتاؤ میں کیا کروں۔'' چچا کریم بے بسی سے بولے۔

''آپ اس دفعہ والا کام دیکھئے۔ آپ کو شکایت نہیں ہو گی۔''

لڑکا جو کارٹن لے کر گودام میں جا رہا تھا اس نے اسے روک کر کارٹن وہاں ہی میز پر کھلوا لیا۔

''میری بیٹی! تم تو صرف ہلکان ہو رہی ہو۔ یہ دیکھو۔۔۔ مجھے یہاں سے ہی بلبلہ نظر آ رہا ہے۔'' چچا کریم نے کہہ کر

ماڈل پر ہلکے سے ہاتھ مارا تھا۔ان کا شک ٹھیک تھا۔چاک کے نیچے بلبلہ تھا۔جہاں ہاتھ مارنے سے گڑھا پڑ چکا تھا۔وہ زمین میں گڑ جانے کی حد تک شرمندہ ہوئی۔زیادہ مال بنانے کے چکر میں وہ پیشے کا ایمان بھول گئی تھی۔

''میں معافی چاہتی ہوں چچا۔۔۔اگر میں دوبارہ ایسا مال لائی تو بے شک آپ ہم سے کام لینا ہی بند کر دیجئے گا۔''

''گھر میں ڈائی لگا لو میری جان۔۔۔لیکن تم اسے نہیں چلا سکتیں۔تمہارے کمزور ہاتھ ڈائی کو نہیں چلا سکیں گے۔اب سب اردگرد کے لوگوں نے ڈائی ہی لگا لی ہے۔جتنا کام تم مہینے بعد لائی ہو لوگ ایک ہفتے کے اندر اندر کر لیتے ہیں۔لوگ اسی کام سے زیادہ کما رہے ہیں اور ایک قطب ہے کہ اس نے کبھی میری بات نہیں مانی۔خیر اس کے باوجود قطب کی بات اور تھی۔اس کے ہاتھ میں کافی مہارت تھی۔وہ ایک دن میں کافی کام کر ہی لیتا تھا۔لیکن تم۔۔'' انہوں نے فقرہ درمیان میں ہی چھوڑ دیا تھا۔اسے احساس ہوا کہ بابا ٹھیک کہتے تھے۔چونے کے لیے اس کا خون سفید ہو چکا تھا۔بے ضرر پتھر نے اپنی انا کو توڑ کر اسے کسی قالب میں ڈھالنے کی اجازت نہیں دی تھی۔اور بابا سے اب اتنا کام ہوتا نہیں تھا۔

چچا کریم نے افسردگی سے سر ہلاتے ہوئے دراز میں سے پیسے نکال کر اسے تھما دیئے۔وہ پیسے بنا گنے ہی دکان سے باہر نکل آئی۔اسے سخت شرمندگی ہو رہی تھی۔اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمایاں تھے اور پیاس سے اس کی جان نکلی جا رہی تھی۔

تھوڑی دور آنے کے بعد اپنی چھٹی حس کے الارم پر اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تھا۔اس کا شک ٹھیک تھا۔کوئی اس کا پیچھا کر رہا تھا۔

وہ ایک جوانی اور بڑھاپے کے درمیان میں جھولتا ہوا تھا۔یا شاید اس کی صحت ہی ایسی تھی کہ وہ جوانی میں بھی بوڑھا دکھ رہا تھا۔اس نے خاکی رنگ کی انتہائی تنگ پینٹ پہن رکھی تھی۔جسے دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ وہ پینٹ پہنی نہیں گئی بلکہ جسم کے ساتھ کسی گوند سے چپکائی گئی ہے۔شرٹ کی رنگت اور چستی بھی پینٹ سے مطابقت رکھتی تھی اور اس کے سر پر کالے رنگ کی سولہ ہیٹ تھی۔وہ لڑکا چلتا پھرتا کھیتوں کا باگڑ بلا لگ رہا تھا۔اس لڑکے کو وہ دکان میں بھی دیکھ چکی تھی۔جب وہ چچا کریم کو وضاحت دے رہی تھی۔یہ ہی لڑکا شیلفوں پر پڑی چیزیں دیکھتے ہوئے اسے ترچھی نظروں سے گھور رہا تھا اور انتہائی برا لگ رہا تھا۔اگر وہ اس چیز کو اپنے حسن میں اضافے کی کوئی مانے ہوئے تھا تو سبین اسے اچھی طرح سمجھا سکتی تھی کہ وہ یہ حرکت کرتا ہوا کتنا اوچھا لگتا ہے۔

اب وہ اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل آیا تھا اور سبین کا پیچھا کرنے لگا تھا۔پیچھے پلٹ کر اسے اپنے سامنے دیکھ کر سبین کے چہرے پر ناگواری پھیل گئی۔

لڑکا کمال کا ڈھیٹ تھا۔اسے رکتا دیکھ کر اس کے پاس چلا آیا تھا۔سبین اچھنبے سے اسے دیکھنے لگی۔اس کی آنکھوں میں سوال تھے۔

''معاف کرنا میں دکان کے مالک کے ساتھ تمہاری گفتگو سن چکا ہوں۔''

''تو۔۔۔؟'' وہ سوالیہ گویا ہوئی۔

''وہ۔۔میں۔۔۔'' اس کے ہونٹوں اور دانتوں میں دبی ہوئی ماچس کی تیلی دائیں سے بائیں کنارے کو چھونے لگی۔ اگر یہ ماچس کی تیلی بھی اس کی کوئی ادا تھی تو۔۔۔وہ غلیظ لگ رہا تھا۔

''مجھے لگتا ہے وہ تم پر ناحق بول رہے تھے''

''وہ میرے چچا ہیں۔ جو کہہ رہے تھے ٹھیک کہہ رہے تھے۔'' اس نے صاف گوئی اور درشتی سے کہا۔

''میں کہنا چاہتا ہوں کہ اگر۔۔۔اگر تم برا نہ مانو تو مجھے اپنے ماڈل دکھا سکتی ہو۔ میں تمہیں اس کام کے زیادہ پیسے دوں گا۔''

''یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرا کام زیادہ اچھا نہیں ہے۔'' اس نے ابرو اٹھائے۔

''ہاں۔''

''ٹھیک ہے تو دکان میں جا کر دیکھ لو۔'' وہ مڑنے لگی۔

''نہیں۔'' اس نے اسے پکارا۔

''مجھے تمہارے سارے ماڈل دیکھنے ہیں۔ جو کام میں تمہیں دوں گا۔ اس کے لیے پیسے اس سب سے کہیں زیادہ ہیں۔ جتنا تم کماتی ہو۔ بلکہ اس کام کے اتنے پیسے اس پورے شہر میں کوئی نہیں کما سکتا۔ اتنے میں تمہیں دوں گا۔''

بات کچھ ایسی تھی کہ سبین کو پلٹنا پڑا۔ لڑکا طمانیت سے مسکرایا۔

''بس تم پہلے میری تسلی تو کرو کہ تم یہ کام کر سکتی ہو۔''

سبین نے کچھ لمحے سوچتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ کوئی فیصلہ کرنے لگی تھی۔ خود کے ساتھ جوڑ توڑ۔۔ باورچی خانے اور راشن کے ڈبوں کے ساتھ میل ملاپ۔۔ کام ہی تو کرنا ہے۔ پھر یہ کیوں دیکھنا کہ کروانے والا کیسا ہے۔ بھلا مزدور کو اس سے کیا کہ اسے کمائی دینے والے ہاتھ کالے ہیں کہ گورے۔۔۔ اسے تو مزدوری سے مطلب ہے۔

''ٹھیک ہے۔ میرے گھر چلو یہاں قریب ہی ہے۔۔۔ پیدل کی مسافت پر۔'' اس نے کہا۔

اسے پیسوں کی ضرورت تھی۔ وہ سہارے ڈھونڈ رہی تھی۔ نہیں جانتی تھی کہ اس وقت اس اجنبی کو اپنے گھر لے کر جانا اس کی آنے والی ساری زندگی تباہ و برباد کر کے رکھ دے گا۔ اس کے پاس کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ کچھ بھی تو نہیں۔

☆......☆......☆

''یہ دیکھو۔۔یہ سب میرے بابا نے بنائے ہیں۔'' وہ اس اجنبی کو گھر لے آئی تھی۔''یہ دیکھو۔۔۔یہ بھی۔۔۔یہ بھی ۔۔۔'' وہ صحن میں بکھرے سوکھے ہوئے وہ ماڈل اسے دکھانے لگی جو ابھی پوری طرح تیار نہیں ہوئے تھے۔

''پہلے ہم بس سادے ماڈل بناتے تھے لیکن اب میں نے بابا سے کہہ دیا ہے کہ ہم رنگوں والے ماڈل بھی بنائیں گے۔ انسانی شکلوں والے بھی، گولڈن اور سلور پتی کے کام والے بھی نگینے اور افشاں والے بھی۔ پہلے اتنا سرمایہ نہیں تھا نا ہمارے پاس۔ تم تو جانتے ہی ہو گے کہ آج کل یہ سب چیزیں کس قدر مہنگی ہوگئی ہیں۔ گولڈن پتی تو جیسے واقعی میں گولڈ کی بننے لگی ہے۔ سلور پتی کے نرخ بھی آسمانوں سے باتیں کرنے لگے ہیں۔ لیکن میں نے چچا کریم سے بات کی ہے۔ وہ ہمیں ادھار رقم دیں گے۔ جسے وہ ہر ماہ مال کی رقم سے ہی کاٹ لیا کریں گے۔ میں آج ہی جا کر گولڈن سلور پتیاں، مور پنکھ نگ اور افشاں خرید لاؤں گی۔ میرے بابا وہ کام بھی بڑی آسانی سے کر لیں گے۔''

تیزی سے بولتی دراصل وہ چاہتی تھی کہ اجنبی کی کسی بھی طرح ان کے کام سے تسلی ہو جائے۔

''یہ سب کام تم بھی کر سکتی ہو؟''

''ہاں۔۔۔میں بھی تو بچپن سے ہی کرتی چلی آرہی ہوں۔ یہ دیکھو یہ میں نے بنایا ہے۔'' وہ نئے ماڈل اس کو دکھانے لگی ۔جو واقعی اس نے بنایا تھا اور کسی حد تک لاجواب بنایا تھا۔

لیکن وہ لڑکا ماڈل سے زیادہ اس کو دیکھ رہا تھا۔ کھوجتی نظروں سے۔۔۔اسے جیسے ماڈل دیکھنے میں تو کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیوں میں کسی جرم کی چمک تھی جسے گھر کی غربت میں دھنسی سبین نہیں دیکھ پا رہی تھی۔

''کون ہے بیٹی۔۔؟'' اندر سے بابا کی کھانستی ہوئی آواز آئی تھی۔

''بابا کسٹمر ہیں۔ مال بنوانا چاہتے ہیں کسی نئی دکان سے آئے ہیں۔'' اس نے وہاں سے ہی تیز آواز سے کہا تھا۔ بابا نے مزید کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

''لگتا ہے تمہارے بابا بیمار ہیں۔'' اس نے شاید بابا کی کھانستی آواز سے اندازہ لگا لیا تھا۔

''ہاں۔۔'' اس کے پاس اس بے محل سوال کا یہ ہی جواب تھا۔

''یہ چھوٹی بہن ہے تمہاری۔۔۔'' اس نے صحن کے ایک کونے میں بیٹھی ہوئی زویا کی طرف اشارہ کیا۔ جو آسمان کو دیکھ رہی تھی۔

''ہاں۔۔۔۔''

''یہ ٹھیک ہے؟'' اس نے اس کی ظاہری حالت دیکھ کر ہی اندازہ لگا لیا تھا جو کہ کوئی بھی لگا سکتا تھا۔

''نہیں۔۔۔'' یہ بول نہیں سکتی۔اس کا آپریشن ہونے والا ہے۔''اس نے صاف گوئی سے کہا۔اجنبی کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔

''اور امی؟''اس نے ایک اور سوال کیا۔

''کیا تم کچھ خریدنا چاہتے ہو۔کوئی کام کروانا چاہتے ہو؟ اسے اس کا سوال پر سوال پوچھنا برا لگا تھا۔

''ہاں۔۔۔'' وہ پھر بھید بھری مسکراہٹ سے مسکرایا۔

''کروانا تو چاہتا ہوں۔لیکن صرف تم سے،تمہارے بابا سے نہیں۔''

''میں کردوں گا۔میں بھی کافی ماہر ہوں۔بولو۔کیا کیا بنوانا ہے تمہیں،کس طرح کا مال چاہیے؟''

''تو سنو تمہیں ان ہی ماڈل میں سے ایک ایسا ماڈل بنانا ہے جس میں تم سب سے زیادہ ماہر ہو اور۔۔۔''

لڑکا آگے بولتا جارہا تھا اور وہ آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھتی جارہی تھی۔ایک دومنٹ بعد کا منظر تھا۔وہ اسی لڑکے کو دھکے مار کر گھر سے باہر نکال رہی تھی۔لڑکے کے چہرے پر ابھی بھی ویسی ہی مسکراہٹ تھی۔

''سوچ لو سودا مہنگا نہیں ہے۔۔۔اور اتنا برا بھی نہیں ہے۔'' وہ مہنگا اور برا کو کھینچتے ہوئے بولا۔

''دفع ہو جاؤ یہاں سے خبیث۔۔۔'' وہ غصے سے چلائی تھی اور اس نے اس پر تھوک دیا تھا۔

رشید اس کا ہونے والا شوہر جو گھر کے کافی فاصلے پر کھڑا اب تماشا دیکھ رہا تھا۔وہ بھی گھر کے دروازے کے پاس آ گیا تھا۔

''کیا ہوا ہے؟'' رعب جو اس پر جچتا نہیں تھا۔اس نے اسی رعب سے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔۔'' وہ دروازہ بند کر کے اندر جانا چاہتی تھی۔اجنبی وہاں ہی کھڑا تھا۔اسے رشید نامی لڑکے سے ذرا برابر خوف نہیں تھا۔

''اگر پھر بھی تمہارا ارادہ بدلے تو میرا کارڈ رکھ لو۔۔۔''اس نے جیب سے کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔سبین نے رشید کے سامنے کارڈ پکڑ لیا اور اندر آ کر پھاڑ کر نالی میں بہادیا۔

''کون تھا یہ؟'' رشید بھی اندر آ گیا تھا۔

''کوئی نہیں مال خریدنے آیا تھا۔چچا کریم نے بھیجا تھا۔لیکن کم پیسے دینے لگا۔تو مجھے غصہ آ گیا۔''

رشید کے چہرے سے ظاہر تھا کہ اس نے سبین کی بات پر یقین نہیں کیا ہے۔

''آئندہ کے بعد تم چچا کریم کے پاس نہ جانا۔مجھے مال دینا میں دے کر آیا کروں گا۔''

''اچھا۔۔'' وہ بس یہ ہی کہہ سکی تھی۔

''کتنی بار کہہ چکا ہوں تم اچھا کہہ کر پھر خود ہی چلی جاتی ہو مجھے نہیں پسند کہ میری ہونے والی بیوی اس طرح گھر سے باہر نکلے۔۔۔'' رشید غصے سے کہہ کر چلا گیا۔

سبین اس لیے خود ہی ہر بار چچا کریم کے پاس چلی جاتی تھی کیونکہ اسے پچھلا تجربہ یاد تھا۔ جب اس نے رشید کو مال دے کر چچا کریم کے پاس بھیجا تھا۔ واپسی پر جو پیسے رشید نے اسے پکڑائے تھے وہ دیکھ کر اس کا خون جل گیا تھا۔ وہ جانتی تھی اتنے کم پیسے چچا کریم نے نہیں دیئے ہیں۔ وہ جا کر ان سے پوچھنا بھی نہیں چاہتی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ رشید کا ہی کام ہے۔

دن سے شام اور پھر شام سے رات تک وہ اس اجنبی لڑکے کی بات پر جلتی رہی تھی۔ آخر اس کی ہمت کیسے ہوئی تھی اس سے اس طرح کی بات کرنے کی۔۔ اور پھر اوپر سے وہ اسے اپنا کارڈ دے رہا تھا کہ اگر اس کا ارادہ بدلے تو۔۔۔ ہونہہ۔۔ تھو۔

چولہے کے پاس بیٹھی وہ روٹیاں بناتے ہوئے خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ پھر بھی دسترخوان پر کھانے کے دوران اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ ساری روٹیاں جلا چکی ہے۔

☆......☆......☆

''تمہارے تایا تمہاری رخصتی کا مطالبہ کر رہے ہیں۔'' بابا نے ایک دن کھانے کے دوران اس سے کہا۔ نوالہ اس کے ہاتھ سے منہ میں نہیں جا سکا تھا۔ بابا نے اس کا تاثر دیکھ لیا تھا۔ انہوں نے گہری سانس چھوڑی۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

''پھر آپ نے کیا کہا؟''

''ابھی کوئی جواب نہیں دیا۔''

''پھر ابھی آپ انہیں منع کر دیں ابھی مجھے زویا کا آپریشن کروانا ہے اور یہ گھر پھر۔۔۔''

''اس گھر کی اتنی فکر مت کرو۔ اور تم کون سا دوسرے شہر چلی جاؤ گی۔ پچھلی گلی ہی تو ہے۔''

''ٹھیک ہے پھر جو آپ مناسب سمجھیں۔۔۔'' اس کی اس عام بات میں غصہ تھا کہ ٹھیک ہے پھر سب جہنم میں جائیں۔ وہ کیوں سب کی فکر کرے۔

''میں آج ہی بھائی کے گھر جا کر بات کرتا ہوں۔ اس فرض سے جتنی جلدی سبک دوش ہو جاؤں بہتر ہے۔''

رات میں بابا، تایا ابا کی طرف گئے تھے اور وہ کھڑکی کے پاس بیٹھ کر اس ٹھہر چکی خزاں کو دیکھ رہی تھی جو آ کر جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ اندھیاری میں چاند چمک رہا تھا اور اس کی چاندنی کسوف لرزاں تھی۔ دن کے پرندے، درختوں کی بے برگ اور بے پتا شاخوں پر دن کے اجالے کی گرمی کو اپنے اندر سموئے ہوئے آرام کر رہے تھے۔ اور رات کے شب بے دار چرند کا کا مود راگ الاپ رہے تھے۔ ''کا مود راگ'' جو اداس کو اداس دبیز کر دیتا ہے اور خوش کو خوش کن۔۔۔ اور اس کا دل اس وقت غم ناکی

سے پھٹنے پر آ گیا تھا۔ نیند کے بجائے اس کی آنکھوں میں رتجگے کی کمک بھر دی گئی تھی۔ زویا سو چکی تھی اور اسے نیند نہیں آنے والی تھی۔ بابا واپس گھر آئے تو وہ تب بھی جاگ رہی تھی۔

''کیا ہوا ہے؟ کیا کہہ دیا ہے انہوں نے'' اس نے بابا کا اترا ہوا منہ دیکھا تو پوچھے بنا رہ نہیں سکی تھی۔

''تائی نے یقیناً جہیز کا مطالبہ کر دیا ہوگا۔''

''کاش جہیز کا مطالبہ ہی کر دیا ہوتا۔۔'' بابا غمگین تھے۔

''مجھے کچھ بتائیں گے۔''

''کچھ نہیں۔۔۔سو جاؤ۔'' اسے سونے کا کہہ کر وہ خود ساری رات جاگتے رہے تھے۔

اگلے ایک دو دن بھی اسی طرح گزرے تھے۔ تایا ابو آتے تھے، بولتے تھے، لڑتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ کیا ہو رہا تھا وہ کچھ نہیں جان پا رہی تھی۔

''کیا کہتے ہیں تایا ابو۔؟'' وہ مختلف طریقوں سے انہیں کریدنے لگتی تھی۔

''وہ چاہتے ہیں کہ میں یہ گھر رشید کے نام لگا دوں'' بابا نے ایک دن ہار مان لی۔ سبین دھک سے رہ گئی۔

''یہ کیسا مطالبہ ہے۔''

''تمہاری تائی ایسا ہی چاہتی ہیں۔ ورنہ۔۔۔'' بابا خاموش ہو گئے۔

''ورنہ کیا؟'' اس نے پوچھا کس بات کی تصدیق چاہتی تھی وہ۔۔۔ جبکہ وہ جانتی تھی کہ تائی کی مرضی اس نکاح میں نہیں ہے اور وہ اپنی ضد کی کس حد تک پکی ہیں۔ اگر اس کی شادی رشید سے ہو چکی ہوتی اور ان کے دو تین بچے بھی ہو چکے ہوتے اور تب تائی یہ مطالبہ کرتی تو تب بھی بابا کو اتنا ہی پریشان ہونا تھا۔ کیونکہ تائی اپنی ضد میں انتہا تک جانا جانتی تھیں۔

''ورنہ وہ رخصتی نہیں لیں گے۔'' بابا کہہ کر چارپائی پر گر گئے۔

''مجھے ایسے لالچی لوگوں میں جانا بھی نہیں۔ ان کے ذہن میں یہ بات آئی ہی کیوں۔ کیسے؟ آپ انکار کر دیں۔''

''پاگل مت بنو تمہارا صرف رشتہ نہیں طے ہوا۔۔ جو میں انکار کر دوں نکاح ہو چکا ہے۔۔ مجھے کچھ کرنا ہوگا۔ کر لوں گا میں کچھ۔۔۔''

''آپ یہ گھر ان کے نام نہیں لگائیں گے بابا۔۔۔'' اس نے تنبیہہ کی۔ اس کی آواز میں استقلال تھا۔

''میں آگے ہی بہت پریشان ہوں سبین مجھے مزید پریشان مت کرو۔''

وہ پیر پٹختی اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔

شادی کی تاریخ بھی اسی الجھن میں رکھی گئی تھی۔تایا ابو وقفے وقفے سے گھر کے چکر لگانے لگے تھے۔ایک طرف شادی کی تیاری تھی اور دوسری طرف یہ پریشانی۔۔۔اس کا دل کوئی بھی چیز خریدنے کو نہیں کر رہا تھا۔پھر بھی بابا کے کہنے پر وہ اپنا جہیز مکمل کر رہی تھی۔کچھ چیزیں تو اماں ہی اس کے لیے چھوڑ کر گئی تھیں۔باقی وہ لے رہی تھی۔اپنے اور زویا کے کپڑے تیار کر رہی تھی۔پڑوس کی سہیلیاں بھی آ جاتی تھیں۔سب مل کر کام کرتی تھیں۔رضائی، گدوں میں نگندے ڈالنا، چاول صاف کرنا، اس کے داج کے کپڑے ٹانکنا، بیڈ شیٹوں پر کڑھائی کرنا کمرے میں بند کر کے اسے ابٹن لگانا ایسے ہی اور بہت سے چھوٹے موٹے کام تھے جو سب ہنستے ہنستے کیا کرتی تھیں۔شادی کی عجیب سی خوشی تھی جو گھر کی پریشان فضا میں بھی اس پر چھانے لگی تھی۔

''اتنا بھی برا نہیں ہے رشید جتنا میں سوچتی ہوں۔ٹھیک ہے اسے اس پر ہی گزارا کرنا ہوگا۔اب اس پرانے مندر میں کوئی شہزادہ تو آنے سے رہا۔۔۔''اس نے کسی اور ہی نظر سے رشید کو دیکھا تو سلوٹ زدہ سی شرما گئی۔اب وہ کسی حد تک مطمئن تھی۔

لیکن تایا ابا مطمئن نہیں تھے۔

''دیکھ قطب الدین۔۔۔شکیلہ کا مطالبہ کچھ ایسا بھی برا نہیں۔شادی کے بعد تم بھی ہمارے ساتھ ہی رہنا۔تمہیں اور کس نے سنبھالنا ہے۔ہانڈی روٹی خود تو کرنے سے رہا، زویا بھی ہمارے ساتھ ہی رہے گی۔اس گھر کو کرائے پر چڑھا دیں گے۔رشید کو اپنا بیٹا کہا ہے تو اب بنا کر بھی دکھا۔۔آخر اس میں برائی کیا ہے۔بھرجائی مرنے والی تھی۔شکیلہ نے احساس کیا۔جب کہ رشید کی بات وہ اپنی بہن کے گھر کر چکی تھی۔اب تم بھی اس کی لاج رکھو۔اس کی ضد پوری کر دو۔''

''یہ نہیں ہوسکتا۔۔۔''

''میں سب گھر والوں کی دشمنی مول نہیں لے سکتا قطب۔۔۔سب بچے ماں کے ساتھ ہیں۔میں نے تیرا ساتھ دیا بھی تو کچھ نہیں ہوگا۔سب میرے خلاف ہوں گے۔کیونکہ سب اس وقت یہی سمجھ رہے ہیں کہ وہ سب ٹھیک ہیں۔میں نے شکیلہ سے ابھی کچھ نہیں کہا۔یہی کہا ہے کہ قطب پیپر بنا رہا ہے۔''

تایا ابو روز آتے تھے اور چلے جاتے تھے۔سین نے اس معاملے میں مداخلت کرنا چھوڑ دی تھی۔اس نے یہ معاملہ بابا کے ہاتھ میں دے دیا تھا کہ وہ جو مناسب سمجھیں کر دیں۔اب وہ بھی تایا ابا کی طرح ہی سوچنے لگی تھی کہ تائی کا مطالبہ اتنا بھی برا نہیں ہے۔

اسے اندازہ ہی کہا تھا کہ یہ معاملہ جسے وہ صرف مطالبہ سمجھ رہی ہے کتنا سنگین ثابت ہوگا۔

☆......☆......☆

یہ اس کی مہندی کا دن تھا۔گھر قمقموں سے روشن تھا۔صحن میں دریاں بچھی تھیں جہاں تھوڑی دیر کے بعد اسے بٹھایا جانا

تھا۔ ہر طرف گلاب کے پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ گھر سے باہر دال چاول کی دیگیں بن رہی تھیں۔ کم مہمان ہونے کے باوجود بھی ہر طرف افراتفری سی تھی۔ اس کی ساری محلے کی اور ایک دو کالج کی سہیلیاں بھی آئی تھیں۔ زویا پاس بیٹھی اس کے گجروں سے کھیل رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی۔ تمام باتیں بھول کر اور نظر انداز کر کے وہ بھی مسکرا رہی تھی۔ پیا گھر جانے کے سپنے کون سی لڑکی نہیں دیکھتی۔ وہ تو اس لیے بھی مطمئن تھی کہ اس کا سسرال گھر کے قریب ہی ہے۔ وہ جب دل کرے گا، یہاں آجایا کرے گی۔

تائی اس کی مہندی لے کر آئی تھیں اور اب ساتھ والے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ رشید بھی آیا تھا جسے اس کی سہیلیاں کھڑکی سے جھانک کر دیکھ رہی تھیں اور آپس میں ہنس رہی تھیں۔ اسے بھی اس کا نام لے لے کر چھیڑ رہی تھیں۔ اسے آج کچھ بھی برا نہیں لگ رہا تھا۔

اچانک ہی ساتھ کے کمرے سے تائی کی تیز آواز آنے لگی۔ اس کی سہیلیاں جو پہلے ہی سے کھڑکی میں کھڑی چہک رہی تھیں ایک دم سے چپ ہوئیں۔ تائی کی آواز بڑھنے لگی۔ پریشانی نے اسے ایک دم سے آن گھیرا۔ لباس سمیٹ کر وہ دروازے کی طرف بڑھی اور جھری سے دوسرے کمرے میں جھانکنے لگی۔

''جب تک یہ گھر میرے بیٹے کے نام نہ لگ جائے یہ شادی نہیں ہو گی۔'' تائی امی وہی بات کہہ رہی تھیں جو تایا ابو بارہا دفعہ کہہ چکے تھے۔ لیکن تایا کے کہنے میں اور تائی کے کہنے میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ اندر تک کانپ کر رہ گئی۔ تائی اپنے مطالبے پر اس بری طرح سے ڈٹی ہوئی ہوں گی اسے اندازہ ہی کہاں تھا۔

بابا سب کے درمیان خاموش بیٹھے تھے۔

''ابھی تک پیپرز ہی تیار نہیں ہوئے۔ آپ تو کہہ رہے تھے کہ سب تیار ہیں۔'' وہ اب تایا ابا پر برس رہی تھیں۔ تایا ابا امید بھری اور بھیگی نظروں سے بابا کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''پیپرز تیار نہیں ہیں قطب الدین۔۔۔؟ انہوں نے آنسو بھری آواز سے اپنے بھائی سے پوچھا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں کے سامنے بے بس تھے۔

''نہیں۔۔۔ اور نہ ہی ہوں گے۔'' ابا نے سر جھکائے دوٹوک کہا تھا۔

''کیوں نہیں ہوں گے؟ میرا بیٹا کوئی گرا پڑا نہیں ہے۔ جسے میں کسی بھی یتیم مسکین کے ساتھ بیاہ دوں گی۔۔۔ آپ کی بیٹی میں ہے ہی کیا؟'' تائی امی نے اپنا ظرف بالائے طاق رکھ چھوڑا تھا۔ انہیں اس بات کا بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔ سبین کمرے سے باہر نکل کر اس کمرے میں چلی آئی تھی جہاں سب بیٹھے تھے۔ تائی نے اس کی طرف دیکھا تھا اور پھر منہ پھیر لیا تھا۔

''صرف سفید رنگ کے گن پر میں اپنے بیٹے کو قربان نہیں کر سکتی۔۔۔میری اپنی بھانجی ڈاکٹر کا امتحان دینے والی تھی لیکن میں نے اسے چھوڑ کر ایک باسی روٹی کھانے کو ترجیح دی۔۔۔ ایک مرتے ہوئے بندے کا خیال کر کے۔۔'' تائی امی نے اس کی ماں کا ذکر جس نخوت سے کیا تھا اس کا دل کیا وہ تائی کا منہ نوچ لے یا خود پنکھے سے لٹک جائے۔

''بابا!'' تائی چپ ہوئیں تو اس نے بابا کی پکارا۔ بابا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''گھر رشید کے نام کر دیں۔'' اس نے اس طرح کہا کہ بابا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ چاہے اب رشید سے شادی کرتی یا نہ کرتی لیکن وہ چاہتی تھی کہ اب یہ گھر رشید کے نام لگ جائے۔ تائی نے اسے اور اس کی اماں کو گالی دی تھی۔

''یہ گھر رشید کے نام نہیں لگ سکتا کیونکہ۔۔۔ کیونکہ یہ گھر بک چکا ہے۔۔۔ سال پہلے۔'' بابا نے خاموشی میں وہ دھما کا کیا جسے وہ کافی دنوں سے چھپاتے چلے آ رہے تھے۔ یہ دھما کا سیدھا تائی امی کے سر پر جا کر گرا تھا۔

''کیا۔۔کب۔۔کس کو؟'' وہ مخبوط الحواسی میں بولیں۔ ''ہاں'' کے علاوہ اس جواب کی انہیں توقع ہی کب تھی۔

''کریم کو جب خدیجہ بیمار ہوئی تھی۔'' بابا نے سچائی بتا دی تھی۔ کمرے میں کوئی ایسا نہیں تھا جو اس بات پر یقین نہ کرتا۔۔۔ سب جانتے تھے کہ جو وہ سن رہے ہیں سب سچ ہے۔ سبین کی سب سہیلیاں بھی اسی کمرے میں آ گئی تھیں۔ سارے مہمان بھی۔ تایا ابا نے بھی آنکھوں سے بابا کو دیکھا تھا۔ اور تائی۔۔۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں اور کیا کہیں۔ محفل سے شکست لے کر گھر جانا انہیں منظور نہیں تھا۔ ان کی لومڑی صفت آنکھوں میں بال آ گیا تھا۔ ابر ماتھے تک جا لگے تھے۔

''چونکہ رخصتی کے بدلے گھر نام کرنے کی بات طے پائی تھی اور اب گھر بک چکا ہے تو رخصتی بھی نہیں ہو سکتی۔'' تائی امی بابا سے بھی بڑا دھما کا کرنے کی ٹھان چکی تھیں۔

''رشید۔۔'' تائی امی نے رشید کی طرف دیکھ کر آواز لگائی۔ یہ آواز اشارہ تھی، حکم تھا۔

آنے والے لمحوں کو سوچ کر سبین کی روح تڑپ اٹھی۔ کیا رشید وہ ہی کہنے والا تھا جس کا اشارہ اس کی ماں نے اسے کیا تھا۔ اس کی آنکھیں خطرے کو بھانپ کر پھٹنے پر آ گئی تھیں۔

''میں رشید ولد صلاح الدین۔۔۔ سبین قطب الدین کو تین بار طلاق دیتا ہوں۔'' رشید نے ایک لمحہ سوچے بنا طوطے کی طرح رٹا ہوا جملہ تین بار دہرایا تھا۔

بجلی کی کڑک سے سارا آسمان پھٹ گیا تھا۔ دھرتی کا سینہ چاک کر کے سارا لاوا اُبل کر باہر کو آ گیا۔ دنیا کا کوئی افق ایسا نہیں تھا جہاں اس دن بجلی نہیں کڑکی تھی اور یہ تمام بجلیاں سبین پر آ کر گری تھیں۔ جل کر وہ لمحوں میں راکھ ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

حاجی صاحب کی محفل سے ایڈم راہل سیدھا اپنے آفس میں آیا۔اس کے سیکرٹری نے اسے بتایا کہ جن لوگوں سے اس کی آج میٹنگ طے تھی وہ لوگ آفس میں موجود ہیں۔اس نے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی۔شام کے چار بجنے میں ابھی پانچ منٹ باقی تھے۔ملاقات کا وقت چار بجے ہی طے تھا۔اس کا مطلب کہ وہ لیٹ نہیں ہوا تھا۔

سادگی میں نفاست سے سجے وہ اپنے آفس میں پہنچا تو چار افراد وہاں پہلے سے موجود تھے۔وہ چاروں نسلی ایشین تھے اور مذہبی طور پر بدھ مت کے پیروکار،اسی لیے ایڈم ان سے ان کے انداز میں ملا تھا۔پہلے اس نے اپنے ہاتھ جوڑے اور پھر جڑے ہوئے ہاتھوں کو ماتھے تک لے گیا۔یہ مشرقی انداز اس پر اتنا جچ رہا تھا کہ وہ جونسل در نسل کے لامہ تھے مرعوبیت سے اسے دیکھنے لگے تھے۔

''آپ سب کو انتظار تو نہیں کرنا پڑا۔۔۔مجھے لگتا ہے کہ میں وقت کا پابند ہوں۔۔۔'' دیر جو اس سے ہوئی نہیں تھی وہ اس کی شرمندگی کے تحت بولا۔اسے ان لوگوں سے پہلے آفس میں موجود ہونا چاہیے تھا۔یہ بات اس کے اصولوں کے خلاف تھی کہ مہمانوں کی آمد کے وقت میزبان موجود نہ ہو۔

''بالکل نہیں۔ہمیں انتظار کی کوفت نہیں ہوئی۔ہم نے امریکا میں ہونے والی سرگرمیوں سے دل لگائے رکھا ہے۔''ایک نے جواب دیا۔اس کا اشارہ سائیڈ کی دیوار پر چلتی ٹی وی اسکرین کی طرف تھا۔جہاں نیوز چل رہی تھی۔

اپنی گھومنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے ایڈم نے دیکھا ان کے آگے پڑے مشروب کے گلاس خالی ہو چکے تھے۔مطلب اس کی غیر موجودگی میں انہیں اچھے سے خوش آمدید کہہ دیا گیا تھا۔اسے خوشی ہوئی اس کے ملازم اس کی ہدایات نہ صرف سنتے تھے بلکہ ان پر بڑی دلجمعی سے عمل بھی کرتے تھے۔

''ہم سب نے ایک این جی او بنانے کا سوچا ہے۔آپ کے پاس ہم اس لیے حاضر ہوئے تھے کہ۔۔۔''ایک نے اصل بات پر آتے ہوئے کہا تھا۔شاید وہ ایڈم کا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ایڈم نے ہاتھ کے اشارے سے اسے درمیان میں ہی روک دیا۔ان کی آمد کی کیا وجہ تھی اسے معلوم تھا۔وہ اپنے آفس میں آنے والے ہر فرد کے بارے میں پہلے سے جان جاتا تھا۔اس میں کچھ تو اس کے سیکرٹری کی معلومات کا عمل دخل ہوتا تھا اور کچھ اس کی قیافہ شناسی۔۔۔جس میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔وہ دیکھ کر ہی بتا سکتا تھا کہ سامنے والے کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔ان لامہ لوگوں کی آمد سے پہلے بھی اس کے سیکرٹری نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ یتیم بچوں کی سرپرستی کرنے کے لیے ایک این جی او کھولنے کا ارادہ رکھتے ہیں اور یہاں بیٹھ کر اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ اس کے پاس فنڈز کے لیے آئے ہیں تاکہ این جی او کھلنے کی افتتاحی تقریب میں شرکت کی دعوت دے کر۔

''میں جانتا ہوں۔مجھے خوشی ہوگی اگر میں بھی یتیم اور بے سہارا بچوں کے لیے کچھ کر سکوں۔''اس نے کہا اور سامنے

والوں کے چہروں پر حیرت آئی تھی۔ ایڈم کو یہ حیرت سب سے زیادہ پسند ہوتی تھی۔ خصوصاً تب جب وہ سارے اندازے اپنی مضبوط قوت کے زور پر ہی لگاتا تھا۔ اسے لوگوں کو حیران کرنا پسند تھا۔

''یہ آپ کی نوازش ہے۔'' ان میں سے کسی ایک نے سنبھلتے ہوئے کہا تھا۔ ان کا مدعا ان سے پہلے ہی ایڈم تک پہنچ چکا تھا۔ کس ذریعے سے؟ انہیں اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

''آپ بتائیں میں اس کام میں کتنا شریک ہوسکتا ہوں۔''

''جتنا آپ مناسب سمجھیں۔''

ایڈم نے ایک چیک بک نکالی تھی اور خاصی بڑی رقم کا چیک لکھ دیا۔ لامہ کے ہاتھ چیک پا کر کانپ اٹھے۔ انہیں امید نہیں تھی کہ انہیں اتنی بڑی رقم مل جائے گی۔

''خدا آپ کو اس کا اجر دے گا۔''

''مجھے آپ سے بس جنت کی دعا کی طلب ہے۔'' ایڈم نے رقت سے کہا۔ لامہ جیسے اسی وقت اس کے لیے دعا کرنے لگے۔

''اب ہمیں اجازت دیں۔''

''نہیں یہاں آتا ہر کوئی اپنی مرضی سے ہے۔ مگر جاتا میری مرضی سے ہے۔'' اس نے فلموں کے ڈان کے سے انداز میں کہا تھا۔

''مطلب؟'' لامہ نے حیرانی سے پوچھا۔ ایڈم کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''میں صرف مشروب کو آپ کی خاطر مدارت نہیں سمجھتا۔ آپ کو میرے ساتھ کھانا کھا کر مجھے اعزاز بخشنا پڑے گا۔''

ایڈم نے پیار بھرے کچھ اس انداز سے کہا کہ چاروں نے بنا ایک لمحہ سوچے رضامندی دے دی۔

ایڈم فون پر کھانے کی ہدایت دینے لگا۔ آفس میں ایک لمحے کو خاموشی ہوئی تھی اور تب ہی اس خاموشی میں ٹی وی کی آواز پھیلی تھی۔

''جرائم پیشہ گروپ ''پی تھری سکس زیرو'' (P.360) کے ایک مرکزی ڈان کا نام سامنے آیا ہے جو اپنے گروپ میں ''ڈان پیٹرسن کے نام سے پکارا جاتا ہے۔'' اسکرین پر نیوز اینکر نے چلاتے ہوئے کہا تھا۔ خبر کچھ اس انداز سے سنائی جارہی تھی کہ ایڈم سمیت باقی چاروں لامہ بھی خبر کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔

''ڈان پیٹرسن بہت سے جرائم میں ملوث ہے۔ اسمگلنگ، بردہ فروشی، انسانی اسمگلنگ، جوا، شراب کے کارخانے، بھتہ خوری، یہ سب تفصیل پولیس کو ڈان پیٹرسن کے ہی ایک آدمی نے نام اور شناخت نہ ظاہر کرنے پر بتائی ہے تاہم ابھی پولیس کو مختلف

جرم میں ملوث ڈان کا صرف نام ہی پتا چل سکا ہے وہ ڈان پیٹرسن تک پہنچنے میں ناکام رہی ہے۔''

''خدا ان لوگوں کو جہنم میں جلائے۔'' ایڈم نے تیز آواز سے کہا۔ چاروں لامہ پھر سے ایڈم کی طرف متوجہ ہوئے۔

''یقیناً۔۔۔اور خدا بے شک ایسا ہی کرے گا۔''

''دولت کی ہوس ان لوگوں پر اتنی چڑھ چکی ہے کہ یہ لوگ یہ بات بھول گئے ہیں کہ معصوم جانوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔''

''بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔۔'' لامہ کو اس بات کی خوشی تھی کہ ایڈم کے خیالات بالکل ایسے ہی تھے جیسے کسی بھی نیک انسان کے ہونے چاہئیں۔ کون کہتا ہے کہ ایڈم کا کوئی مذہب نہیں۔۔۔ایڈم کے پاس ہی تو سب مذاہب موجود ہیں۔

''سوچیں جس آدمی کا نام ہی اس قدر دہشت ناک ہے وہ خود کس قدر دہشت انگیز ہوگا۔۔۔ڈان پیٹرسن۔۔'' ایڈم بھول گیا تھا کہ وہ اس طرح کی اور اس انداز میں گفتگو نہیں کرتا ہے۔ وہ کسی کو بھی برائی کا ایک لفظ نہ کہتا تھا۔ بددعا دینا تو بہت دور کی بات تھی۔ شاید اس پر اس وقت ''ڈان پیٹرسن'' سے نفرت کا غبار کچھ زیادہ ہی چڑھ گیا تھا۔ جو وہ یہ سب کہنے لگا تھا۔

کھانے کے سارے وقت کے دوران وہ ہی نیوز چلتی رہی تھی۔ ''ڈان پیٹرسن'' کے متعلق ایک جامع رپورٹ تھی جو پیش کی جا رہی تھی۔ اسی مجرمانہ خبر نے فضا کو بوجھل کر دیا تھا۔ ایڈم نے چینل نہیں بدلا تھا بلکہ کھانے سے کہیں زیادہ اس کی توجہ اس رپورٹ پر ہی مرکوز رہی تھی۔

کھانے کے بعد چاروں افراد نے اس سے اجازت چاہی۔ ایڈم نے ایک بار پھر سے اپنے ہاتھ جوڑے اور پھر جڑے ہوئے ہاتھوں کو ماتھے تک لے جاتے ہوئے انہیں الوداعی سلام پیش کیا تھا۔ وہ چاروں پھر سے ایڈم کو مرعوبیت سے دیکھنے لگے۔

ان کے جانے کے بعد ایڈم آفس سے منسلک واش روم میں آیا۔

سفید توپ کو اس نے جلدی سے اتار دیا تھا۔ یہ حاجی صاحب کی محفل والی توپ تھی۔ توپ اتار کر اس نے ایک بھرپور آزادی والا سانس لیا۔ ان غیر مانوس لباس نے اس کا جسم تھکا دیا تھا۔ اپنے ہی جسم کی خوشبو میں گہرا سانس لیتے اس نے خود کو آرام پہنچانے کی کوشش کی۔

سفید اور پیلی روشنیوں والے چمکتے واش روم کے آئینے میں اس کا جسم نمایاں تھا۔ اس کی چھاتی چوڑی اور اٹھی ہوئی تھی، گردن قدرے موٹی اور مضبوط، اس کا کسرتی بدن نوجوانی کی بھرپور نمائش تھا۔ چوڑا دہن، جبڑے کی ہڈی کا نمایاں پن، گلابی ہونٹ، رنگ بدلنے والی آنکھیں۔۔۔ان سب عوامل نے مل کر اس کی شخصیت کو مزید نکھار دیا تھا۔ اس کے سینے کا سنہری رواں پیلی روشنی میں چمک رہا تھا۔ بھنویں اور پلکیں سونے کے تاروں جیسی تھیں اور اس وقت وہ یونانی دیوتا ''اپالو'' لگ رہا تھا۔

اس کی کرنجی آنکھوں میں کسی کو بھی اپنے قریب کھینچ لینے کی پوری طاقت موجود تھی اور یہ بات وہ بہ خوبی جانتا تھا۔حسن کے معاملے میں اگر اسے پرکھا جاتا تو ایک لمحے میں بنا کسی حجت کے وہ دنیا کا خوب صورت ترین مرد شمار کیا جا سکتا تھا۔ایسا مرد جو اپنی خوب صورتی سے غافل بھی ہو۔۔۔اور اس کی یہ غفلت اس کے حسن کو مزید جلا بخشتی ہو۔

وارڈ روب میں سے ایک گرے رنگ کا سوٹ نکال کر اس نے اپنے سامنے پھیلایا۔وائٹ شرٹ اپنے بدن پر چڑھا کر وہ اس کے بٹن بند کرتے ہوئے بھی بدستور خود کو دیکھ رہا تھا۔پھر اس نے شرٹ پر گولڈن نفیس ٹائی کی گرہ باندھی،شرٹ کے کفوں پر کف لنک لگائے جو کہ بیش قیمت ہیرے سے مزین تھے۔ٹائی پن خالص سونے کی تھی۔گردن کے اطراف میں ''ٹام فورڈ'' پرفیوم کا اسپرے کر کے اس نے اپنی ہی گردن پر کسی نازم اندام حسینہ کی طرح ہاتھ پھیرا تھا اور خود کو آئینے میں دیکھ کر مسکرا اٹھا۔نجانے کس بات پر۔

دراز کھول کر اس نے ''رائل اوک'' کی قیمتی گھڑی نکال کر پہنی اور سگار کیس نکالا۔سگار کیس سونے کا تھا جس کے اندر ''کنگ آف ڈنمارک'' کے انتہائی مہنگے سگار موجود تھے۔اس نے ''برلوٹی'' کے لائیٹر سے سگار سلگایا اور ایک لمبا کش لے کر دھواں آئینے میں نظر آتے اپنے ہی عکس پر چھوڑا۔اس کی آنکھیں پرسوچ تھیں،وہ کوئی بہت ہی گہری بات سوچ رہا تھا۔سگار کے انتہائی باریک سے شعلے اس کی آنکھوں میں جل رہے تھے۔اس کی آنکھوں کی پتلیاں ایک غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں اور سوچ اتنی گہری جس نے اس کا باقی جسم ساکت کر کے رکھ دیا تھا۔

جیفرسن۔۔۔اس کا سوتیلا بھائی جو باہر سے اسے ایک دو بار آواز دے چکا تھا اور جسے ایڈم نے سن کر بھی ان سنی کر دیا تھا اسے تلاش کرتا ہوا اندر آیا تھا۔

''آپ یہاں ہیں؟''توقع ہونے کے باوجود بھی وہ ایڈم کو اندر پا کر پوچھ بیٹھا۔ایڈم نے آئینے پر سے اپنی نظریں ہٹائیں اور اس کی طرف دیکھا۔اس کی نیچے والی پلک نے ذرا سی جنبش کی۔اتنی سستی سے کہ جیسے ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا نہیں سمجھ سکتا تھا یہ جنبش سوال تھی کہ سوال کیا ہے؟

''چارلس آپ سے فوری بات کرنا چاہتے ہیں۔انہوں نے پیغام دیا ہے کہ ایڈم راہل آئے تو اس سے کہنا کہ۔۔۔''

جینفرسن کے الفاظ اس کے منہ میں ہی قید ہو گئے تھے۔ایڈم نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔جینفرسن کا منہ دوسری طرف کروٹ بدل گیا تھا۔

''پیٹرسن۔۔۔''اس نے پیٹرسن کے ایک ایک ہجے پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''ڈان پیٹرسن نام ہے میرا۔۔۔صرف پیٹرسن کہا کرو مجھے۔۔۔یہ بات تم بھی سمجھ لو اور چارلس کو بھی سمجھا دینا۔''

''او کے ڈان پیٹرسن ۔۔۔''جینفرسن نے ہلکے سے مسکرا کر کہا - وہ اس کا سوتیلا بھائی تھا۔اسے اس کی مار میں بھی پیار محسوس ہوتا تھا۔

''نفرت ہے مجھے ایڈم راہل کہلوائے جانے سے۔'' ڈان پیٹرسن نے ایک اور کش لگا کر آئینے پر دھواں چھوڑا۔اس کا عکس دھویں میں تحلیل ہونے لگا تھا۔

☆......☆......☆

زندگی ایک فریب کی مانند ہے جس کے دام میں ہم جان بوجھ کر عقل وشعور رکھتے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔یہ نازک شاخ پر جھولا جھولنے کی خواہش کا نام ہے۔اپنے شوق کی سر بلندی میں ہم اس خطرے کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ یہ جھولا ہمیں منہ کے بل گرا بھی سکتا ہے۔ہم صرف تکمیل چاہتے ہیں۔آرزوؤں کی خواہشات کی، مانگ کی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ زندگی بھی ہر لمحہ اپنی تکمیل ہی چاہتی ہے۔

تقدیر اپنے ظرف میں جو کچھ ہمارے لیے رکھتی ہے ہم اسے یک مشت حاصل کر لینا چاہتے ہیں۔وہ سب ہمارا ہے۔ہم آگاہ ہیں اور بے صبرے بھی۔۔۔ہم حق جتاتے ہیں اور حقوق سے محروم کر دیئے جاتے ہیں۔

زندگی ہمارے ایسے لمحوں میں خوب فائدہ اٹھاتی ہے۔جس روشنی کو ہم نیا آغاز سمجھتے ہیں زندگی اس سے اپنی آخری رات طے کر لیتی ہے۔ہمارے اصل آغاز پر زندگی ختم ہو جاتی ہے۔فریب پورا ہوا۔۔۔ہمارا خود سے اور زندگی کا آپ سے۔

☆......☆......☆

دھرتی سے بادِسموم کے بھبھوکے اٹھ رہے تھے۔چھن کر آتی تپش بھی اتنی لرزہ خیز تھی کہ مردہ گھاس پر دھرے اس کے گال جلنے لگے تھے۔پردہ ظلمت چاک ہو چکا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں جیسے جلی ہوئی قلعی پھیر دی گئی تھی۔وہ آنکھیں کھول کر بھی اندھی تھی۔

''اٹھو لڑکی۔۔۔''اسے اپنے بازو کے پہلو میں کسی چھڑی کی چبھن کا احساس ہوا جس نے اس کے ماس میں گڑھا ڈال دیا تھا۔

آفتابی چھتری کھلی تھی اور تھوڑی دیر کے لیے وہ سمجھ ہی نہیں سکی کہ وہ کہاں ہے۔

''کدھر سے آئی ہو تم۔۔۔کیا یہاں پر پڑھتی ہو؟''اس کے سر پر کھڑا کالج کا گارڈ اس سے پوچھ رہا تھا۔اپنے اوپر ایک ڈھلتی عمر کے آدمی کو جھکے دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔رات وہ باغ میں نکل آئی تھی۔جیسا کہ وہ ہر بار کرتی تھی۔اپنے اوپر ہوئے ظلم کو آہوں اور چیخوں سے نکالنے کے بعد وہ یہاں ہی ڈھیر ہو گئی تھی۔وہ مر کیوں نہیں گئی تھی اتنی سردی میں؟

''لڑکی کہاں کی ہو تم۔۔۔''

اس نے ارد گرد دیکھ کر نظر ڈالی۔

آرٹ کالج کے لڑکے، لڑکیاں اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ کالج اوپن ہو چکا تھا۔ سورج چڑھ آیا تھا۔ انہوں نے باغ میں لیٹی ایک لڑکی کو دیکھا تو گارڈ کو بلالیا۔ اب وہی گارڈ اس سے سوال کر رہا تھا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اٹھ کر اس نے چادر کو اپنے گرد لپیٹا اور ارد گرد سے نظریں بچا کر سرونٹ کوارٹر کی طرف چلی گئی۔ لڑکے، لڑکیاں عجیب اور ترس بھری نظروں سے اسے جاتا ہوا دیکھنے لگے تھے۔

کھڑکی پھلانگ کر وہ اپنے گھر میں واپس آ گئی تھی۔

زویا دیوار کے ساتھ لگی صحن کے فرش کے اس حصے کو دیکھ رہی تھی جہاں چونے کے مسلسل کام کے باعث بڑے بڑے سفید داغ پڑ چکے تھے اور جو رگڑ رگڑ کر دھونے سے بھی نہیں جاتے تھے۔ بابا گودام والے کمرے میں چارپائی پر اپنا سر پکڑے بیٹھے تھے۔ اس کے قدموں کی آہٹ پا کر انہوں نے اسے دیکھا تھا۔ اس کی حالت اجڑی ہوئی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور ان میں تنکے پھنسے ہوئے تھے۔ بابا کا دل کٹ کر رہ گیا۔ وہ کہاں تھی، کہاں سے آ رہی تھی؟ وہ جانتے تھے۔

''سبین۔۔۔'' انہوں نے پیار اور درد بھری آواز میں اسے پکارا تھا۔ وہ اسے اپنے گلے سے لگانا چاہتے تھے لیکن اس نے انہیں دور سے ہی پرے رہنے کا کہہ دیا، شیش ناگوں نے اس وقت اس کی آنکھوں میں آسن جمائے ہوئے تھے اور اس کے نتھنوں سے پھنکار نکل رہی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اپنے باپ کی قاتلہ کے نام سے شہرت پائے۔

''آپ نے گھر کیوں بیچا؟'' وہ بے حد ضبط کر کے پوچھ رہی تھی۔ اس کا روم روم کانپ رہا تھا۔ بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی آواز آنسوؤں، بے بسی، دکھ اور غصے کے باعث اس قدر ڈھمگاہٹ کا شکار تھی کہ بابا کو کتنے لمحے اس کا سوال سمجھ میں ہی نہیں آیا۔

''تمہاری ماں کو بچانے کے لیے۔'' بابا جانتے تھے کہ ان کے حساب کا وقت آ پہنچا ہے اور یہ حساب کتاب روزِ محشر کے حساب کتاب سے بھی کہیں زیادہ اذیت ناک ثابت ہونے والا ہے۔

''ماں تو نہیں بچ سکی مجھے بچانے کے لیے کیا تھا آپ کے پاس؟''

بابا خاموش رہے۔

''بولیے۔۔۔'' وہ ایک دم سے چلائی تھی۔

''کیا ہے آپ کے پاس۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ چونا۔۔۔ یہ چونا۔۔۔ جواب میری قبر پر لیپٹ دیجیے گا آپ۔۔۔ اس سے مقبرہ بنائیے گا میرا۔۔۔ یہ ہی چونا پھانک پھانک کر اماں مر گئیں اسی نے میری جان لی اور اب آپ مریں گے۔۔۔'' وہ پرانے آتش دان کی چوبی شیلف کی طرف بڑھی تھی اور اس نے ایک جھٹکے میں شیلف کو نیچے گرا دیا۔ ماڈل جو ایک کے اوپر ایک کر کے بڑی ترتیب سے شیلف پر رکھے گئے تھے دھڑام کی آواز کے ساتھ نیچے گرے۔ چونے کا ایک بادل اٹھا۔ سفید۔۔۔ جس نے اسے سیاہ کر دیا تھا۔

''ان ہی ٹکڑوں کی طرح ٹوٹ چکی ہوں اب میں بھی۔۔۔ان ہی ٹکڑوں کی طرح آپ کو فن عزیز تھا۔۔۔دیکھئے آپ کے فن نے کیسا شاہکار بنایا ہے۔ایک اجڑی ہوئی دلہن کا۔جس کے دلہا نے اسے شادی سے ٹھیک بارہ گھنٹے پہلے طلاق دے دی تاکہ وہ بھی اپنی ماں کی طرح کسی گم نام بیماری سے مر جائے۔'' وہ کمرے کی دوسری چیزوں کی طرف بڑھی اور اس نے انہیں بھی توڑ دیا۔مال جو اس کی شادی کی وجہ سے ایک کمرے میں رکھ دیا گیا تھا اب سب اس کے ہاتھوں ٹوٹنے والا تھا۔بڑے گل دان، ہاتھی گھوڑے،،عقاب، گملے وہ سب کو گراتی جا رہی تھی اور چیختی جا رہی تھی۔ چونے کی بوری جو آدھی کھلی ہوئی تھی ،اس نے اسے بھی زمین پر اوندھا گرا دیا تھا۔بابا نے اسے نہیں روکا تھا۔وہ چیزیں توڑ کر نارمل ہو سکتی تھی تو ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی لیکن وہ جانتے تھے کہ اسے یہ سب توڑ کر بھی صبر نہیں آئے گا۔

''بانس میں سوراخ کر کے آپ بانسری بنانے کی کوشش کرتے رہے۔شاہکار بنانا ہی تھا تو اپنی زندگی کا بناتے۔۔۔مجھ پر آپ کا کوئی حق نہیں تھا۔'' وہ چیزیں توڑتی جا رہی تھی، روتی جا رہی تھی، چیختی جا رہی تھی اور بددعائیں دیتی جا رہی تھی۔خود کو اور نجانے کس کس کو۔۔۔اور جب سب چیزیں ٹوٹ گئیں تو وہ زمین پر ڈھے گئی اور ان ٹوٹی ہوئی چیزوں پر ہی بیٹھ کر رونے لگی۔پوری طاقت سے۔۔۔حلق پھاڑتے ہوئے اتنی بلند آواز سے کہ اس کی چیخ و پکار تائی بھی سن سکتی تھیں اور رشید بھی۔۔۔لیکن شاید خدا نہیں۔

بابا نے اسے چپ نہیں کروایا تھا۔زویا سہم کر دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔کمرے میں ایک سفید بادل بن گیا تھا جو باہر نکلنے کی راہ مانگ رہا تھا۔رفتہ رفتہ چونے کا برادہ گرتے ہوئے نیچے بیٹھ رہا تھا۔سبین کے اوپر ہی۔۔۔اس برادے کو اپنے اوپر گرتا محسوس کرتے ہوئے وہ جیسے کسی تیزابی بارش میں جلنے لگی۔

اس کی طاقت نے جواب دے دیا تو آنسو بھی خشک ہو گئے اور آواز بھی بند ہو گئی۔زرد دھوپ جھجک جھجک کر اندر داخل ہونے لگی۔برادہ جو باہر نہیں نکل پایا تھا زمین پر سبین کے ساتھ ہی بیٹھ گیا تھا۔مٹی کا فرش سفید ہونے لگا تھا۔وہ ساکت آنکھوں سے اس سفید ہوتے فرش کو دیکھنے لگی۔وہ اس وقت بالکل بے حس و حرکت تھی۔

تب ہی ایک سازشی سا جھونکا کمرے میں آیا تھا۔سفید برادہ اٹھ کر اس کے پاؤں پر ایسے اچھلا تھا جیسے کسی جادوگر نے وہاں پھونک ماری ہو۔کسی نے جیسے اسے کوئی تنبیہہ کی تھی۔کوئی راز کی بات بتانے کی کوشش کی تھی۔کان میں سرگوشی کرتے ہوئے آنے والی زندگی کی پیشین گوئی کی تھی۔سبین کی آنکھوں کی پتلیاں تباہ کن حد تک سکڑیں۔

یہ فیصلہ کرنے کی گھڑی تھی۔وہ جانتی تھی۔اس کی تقدیر، اس کی تدبیر، قدرت، ہوا۔۔۔سب جیسے اس کی مرضی جاننے کے منتظر تھے۔وہ اس بار کسی کو بھی مایوس نہیں کرنا چاہتی تھی۔کسی ایک کو بھی نہیں۔۔۔اور خود کو تو ہر گز نہیں۔

''الماس برادہ۔۔۔'' اس نے دو بار اس لفظ کو ذہن میں دہرایا تھا۔پھر تیسری بار جیسے اس نے فیصلہ کن کہا تھا۔

''الماس برادہ۔۔۔''اس کی آنکھوں میں الاؤ سا روشن تھا۔جہنم کی آگ سے بھی زیادہ بڑا۔وہ جان گئی تھی کہ برادے کو پھر سے الماس میں کیسے بدلنا ہے۔''چنتا متی الماس''میں، جو ساری خواہشیں پوری کر دیتا ہے۔

ایک بڑا غم اٹھانے کے بعد۔۔۔ہاں۔۔۔اب وہ جان گئی تھی بالآخر۔

☆......☆......☆

''ہم میں سے۔۔۔کون سے وہ۔۔۔؟''''ہم'' کے لفظ پر خاصا زور دیتے ہوئے بالآخر پیٹرسن بولا تھا۔وہ صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ جرأت کس نے کی ہے اور کیوں؟

یہ ایک نیا آفس تھا۔پہلے والے آفس سے یکسر مختلف۔۔۔یہاں لگژری سادگی کی حدود سے تجاوز کر چکی تھی۔تین چار لوگ دائیں بائیں کھڑے تھے۔بلوری سطح والی میز کے پیچھے ایڈم بیٹھا تھا۔جو ٹیبل کی سطح پر پیپر ویٹ کو گھما رہا تھا۔پیپر ویٹ گھومتا تھا، رکنے لگتا تھا اور پیٹرسن اسے پھر سے گھما ڈالتا تھا۔

گرے نفیس ٹائی سوٹ پہن کر وہ اس آفس میں آیا تھا۔وہ اب وہ والا ایڈم ہرگز نہیں تھا جو آج صبح ہی حاجی صاحب کی محفل میں موجود تھا اور جھوم جھوم کر صوفیانہ رقص کر رہا تھا۔یا وہ جس نے صحافی کے تیکھے سوال کا مسکرا مسکرا کر جواب دیا تھا۔نہ ہی وہ جو چار معزز لامہ کے ساتھ بیٹھا ٹی وی پر اپنے نام کی ہی چلتی خبر سن کر۔۔۔خود پر لعنت بھیج رہا تھا۔

اب وہ وہ والا ایڈم تھا جو امریکا کے ایک تیزی سے ترقی کرتے مجرمانہ گروپ پی تھری سکس زیرو کا بانی تھا۔پی تھری سکس زیرو(P.360) کے کارندے ملک میں پھیلے بہت سے غیر قانونی کاموں میں ملوث تھے۔اس گروپ کا نام سن کر پولیس آفیسرز بھی لمحے بھر کو اپنی کپکپاہٹ قابو میں نہیں رکھ پاتے تھے۔

پیٹرسن پچھلے دس سال سے ڈان پیٹرسن تھا اور بیک وقت ایڈم راحل بھی۔۔۔وہ دونوں پہچانوں کو بہت خوبی سے لے کر آگے بڑھ رہا تھا۔جیسا اس کے گرینڈ فادر چاہتے تھے۔

صرف دس لوگ جانتے تھے کہ ایڈم راحل ہی اصل میں ڈان پیٹرسن ہے۔یہ دس لوگ اس کے اردگرد کے خصوصی لوگ تھے۔ان دس میں صرف پانچ جانتے تھے کہ وہ کہاں سے آیا ہے۔ان پانچ میں سے صرف ایک جیفرسن یہ جانتا تھا کہ اس کے ماں باپ کون تھے اور صرف ایک پیٹرسن خود یہ جانتا تھا کہ خود کیا ہے اور اس کا ماضی کیا ہے؟

ان ہی دس خاص میں سے کسی ایک نے پولیس کے پاس جا کر پیٹرسن کے بارے میں تفصیل دی تھی۔ڈان پیٹرسن کو دلچسپی نہیں تھی کہ اس کے بارے میں کس حد تک پولیس کو بتا دیا گیا ہے۔اگر کسی نے اس کے بارے میں ایک ایک بات بھی پولیس کو بتا دی تھی تو اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ابھی امریکا کی پولیس اتنی مضبوط نہیں ہوئی تھی کہ ڈان پیٹرسن اور ایڈم راحل پر بیک وقت

ہاتھ ڈال سکے۔۔۔دوسرا اس کے خلاف کوئی بھی ثبوت نہیں تھا۔اسکارٹ لینڈ یارڈ کو بھی بلوا لیا جاتا تو پولیس اس کے خلاف کوئی ثبوت اکٹھے نہیں کر سکتی تھی۔پیٹرسن نام کے کسی شخص کا کوئی وجود نہیں تھا اور ایڈم کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ہی پیٹرسن ہے۔پیٹرسن کو تلاش کرنے کی غرض سے اگر پولیس کو ایک ایک آدمی کو شک کی نظر سے دیکھنا پڑتا تو وہ امریکا کے ایک ایک بندے سے پوچھ پڑتال کر سکتی تھی لیکن ایڈم سے نہیں۔شک کے معاملے میں اس کا نام کروڑوں کی آبادی میں سب سے آخری نمبر پر ہی آ سکتا تھا۔یہ ہی تو ''گرینڈ فادر'' نے اسے سکھایا تھا۔

تمام مذاہب کو اپنانے میں بھی اس کی شاطرانہ سوچ شامل تھی۔وہ جانتا تھا کہ سادہ لوگ مذہب کے نام پر کس قدر جذباتی ہو جاتے ہیں۔اس کے خیال کی اس کی موجودہ حیثیت تصدیق کر رہی تھی۔

اس وقت اس کے چہرے کا نور کہیں کافور ہو گیا تھا اور اب وہ خالص ایک کاروباری شخص تھا۔اس سے عام حالات میں ملنے والے اگر اسے اس روپ میں دیکھ لیتے تو کسی بھی صورت یقین نہ کرتے کہ یہ وہ ہی رائل ہے جسے وہ میڈیا پر دیکھتے ہیں۔اس کی ساکت آنکھوں میں بہت سے سوال تھے۔جسے کچھ تو سامنے بیٹھے پہلے سے ہی جانتے تھے کہ آج ان سے کیا پوچھا جائے گا اور انہیں کیا کہنا ہے۔پیٹرسن کے عتاب سے بچنے کے لیے انہوں نے پہلے ہی سے اس کے جوابات ڈھونڈ رکھے تھے۔

''ہم میں سے۔۔۔کون ہے وہ۔۔۔؟''

''ہم'' کے لفظ پر خاص زور دیتے ہوئے بالآخر پیٹرسن بولا تھا۔وہ صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ یہ جرأت کس نے کی ہے اور کیوں؟

''اولیور'' چار میں سے کسی ایک نے بتایا۔

''اولیور'' پیٹرسن کو جیسے یقین نہیں آیا۔بلوری سطح پر اس نے جھٹکے سے گھومتے ہوئے پیپر ویٹ کو روکا۔اس کے ہاتھوں کی شدت شیشے کے اس پیپر ویٹ پر اتنی سختی سے پڑی تھی کہ وہ پیپر ویٹ مضبوط شیشے کا نہ ہوتا تو یقیناً ٹوٹ چکا ہوتا۔

''لیکن فکر کرنے کی بات نہیں ہے ڈان پیٹرسن۔۔۔اولیور نے صرف پیٹرسن کی معلومات دی ہیں۔پولیس کو یہ نہیں بتایا کہ ایڈم راہل ہی اصل میں ڈان پیٹرسن ہے۔وہ یہ غلطی نہیں کر سکتا تھا۔اسے بے شک اپنی جان عزیز نہ ہو مگر اپنے پیاروں کو اپنی آنکھوں کے سامنے بے دردی سے مرتا ہوا دیکھنا کون پسند کرتا ہے۔'' پیٹرسن کو نارمل کرنے کے لیے وضاحت دی گئی۔

''اولیور تو چٹانی یاقوت تھا۔کیا وہ یہ بھول گیا کہ میں نے اسے کتنی محبت سے تراشا ہے۔اس نے یہ کیوں ثابت کیا کہ وہ ابھی بھی کانٹے دار ہے۔مجھے بتاؤ میرا ہنر ٹھیک نہیں یا اس کے اندر جڑ دار کانٹے ہیں۔جو پھر سے نکل آئے ہیں۔''

کوئی کچھ نہیں بول سکا تھا۔خاموشی چاروں طرف پھیل کر بین کرنے لگی تھی۔

''خیر اب کیا کیا جا سکتا ہے۔لالچ یا مجھ سے جلن۔۔۔جس کے باعث بھی اولیور نے یہ کیا ہے ثابت کر دیا ہے کہ اب

وہ ہمارے کسی کام کا نہیں۔۔۔اور جو ہمارے کسی کام کا نہیں وہ دنیا کے بھی کسی کام کا نہیں ہوتا۔"

ایڈم نے برنابی کو اشارہ کیا تھا۔ جسے وہ خوب سمجھتا تھا۔

"جو آپ کہیں۔۔۔" برنابی کہہ کر آفس سے باہر چلا گیا تھا۔باقی سب کے لیے یہ ہی فیصلہ متوقع تھا۔پھر بھی انہیں امید تھی کہ پیٹرسن اولیور کے معاملے میں نرمی برتے گا۔وہ سب آپس میں ساتھی تھے۔نہیں چاہتے تھے کہ ان کا ایک ساتھی کم ہو جائے۔

پیٹرسن نے جیسے سب کی آنکھوں میں اپنے فیصلے کے خلاف تاثرات پڑھ لیے تھے وہ ایسا ہی چاہتا تھا۔اب سب ٹھیک رہے گا کوئی دوبارہ ایسی جرأت نہیں کرے گا سب جان لیں گے کہ P.360 میں بغاوت کی گنجائش نہیں تھی۔

"کارزل کہاں ہے؟" ڈان نے سگار کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے پوچھا اور سوگوار آفس کا ماحول یکسر بدل دیا۔

☆......☆......☆

اگلے دن شاہ عالمی میں سبین ایک ایک بندے سے پوچھتی پھر رہی تھی۔ایک لڑکے کا حلیہ بتا کر جو اونچے لمبے قد کا ہے۔انتہائی تنگ پینٹ شرٹ پہنتا ہے سر پر سولہ ہیٹ ڈالتا ہے اور دانتوں میں ماچس کی تیلی پھنسائے رکھتا ہے لیکن کسی نے بھی اس کی مدد نہیں کی۔تمام دکانداروں نے بھی اس طرح کے حلیے کے کسی آدمی کے بارے میں لاعلمی ظاہر کر دی تھی۔اس نے اپنی یادداشت پر لعنت بھیجی تھی کہ وہ اس کا مختصر سا نام نہ یاد کر سکی اور اس نے اس کا وزیٹنگ کارڈ بھی پھاڑ کر نالی میں پھینک دیا تھا۔

اسے اس اجنبی کو ہر صورت میں ڈھونڈنا تھا لیکن وہ ناکام ہوئی تھی۔اگر اس اجنبی کو ڈھونڈنے کے لیے اسے روز بھی بازار جانا پڑتا تو وہ جا سکتی تھی۔ایک سال مسلسل بھی جانا پڑتا تو وہ اب جانے والی تھی۔ہرگز تھکنے والی نہیں تھی۔گھر واپس آنے سے پہلے وہ چچا کریم کے پاس بھی گئی۔

"چچا کریم! آپ نے ہمارا گھر ہم سے ہتھیا لیا ہے۔" وہ چچا کریم پر جا کر چیخی۔اس طرح جس طرح ایک دن پہلے بابا پر جا کر چیخی تھی۔

"بیٹی! میں نے کون سا گناہ کر لیا ہے۔تمہارا باپ آیا تھا جب تمہاری ماں کی طبیعت خراب تھی اس نے اپنی مرضی سے اپنا گھر بیچا ہے میں نے کون سا زبردستی کی ہے پھر بھی میں نے تم لوگوں کو وہاں رہنے کی اجازت دی ہوئی ہے۔یہ کیا کم ہے تم الٹا مجھ پر ہی چلا رہی ہو۔" چچا کریم نے وضاحت دی۔وہ جھاگ کی طرح بیٹھ گئی تھی۔اس کی بربادی میں وہ شامل نہیں تھے۔

"میرا وہ مطلب نہیں تھا چچا کریم۔اس گھر کے ساتھ میری ماں کی یادیں جڑی ہوئی ہیں۔"

"تو بیٹی پھر سے خرید لو۔۔۔اسی قیمت پر خرید لو۔میں حلال کھانے کا عادی ہوں قیمت بڑھ چکی ہے۔پھر بھی میں تمہیں

اسی قیمت پر دوں گا۔'' چچا کریم نے پیشکش کی۔ وہ چند لمحے ان کو دیکھتی رہی۔

''ٹھیک ہے میں جلد ہی یہ گھر آپ سے واپس خرید لوں گی۔ آپ یہ گھر کسی اور کو مت بیچئے گا۔'' اس نے ایک عزم سے کہا۔ وہ جانتی تھی وہ ایسا واقعی کرے گی اور ہر صورت کرے گی۔

اگلے دن پھر شاہ عالمی جانے کا پروگرام بنا کر وہ واپس گھر آ گئی تھی۔

شام کے قریب جب وہ کچن میں خاموش بیٹھی ہوئی جلتے ہوئے چولہے کی بڑھتی لپکتی شعاعوں کو دیکھ رہی تھی تو باہر دروازے پر دستک کی آواز سن کر وہ اپنے خیالات سے چونکی۔ دروازہ کھولا تو سامنے وہی اجنبی کھڑا مسکرا رہا تھا۔ سبین وہیں بت بن گئی۔

''خادم ۔۔کو ڈینی کہتے ہیں ۔۔'' اس نے اپنی سولہ ہیٹ سر سے اتار کر تعظیم کے سے انداز میں نیچے کی اور سر کو جھکایا۔ سبین نے دیکھا اس کے سر پر بالوں کی تعداد خاصی کم تھی۔ شاید اسی لیے وہ ہر وقت سولہ ہیٹ پہنے رہتا تھا۔

''اب ایسے کیا دیکھ رہی ہو ۔۔۔ اندر آنے کو نہیں کہو گی۔ شاہ عالمی میں ایک ایک سے میرا ہی تو پوچھتی رہی ہو آج تم ۔۔۔'' ڈینی نے توقف کیا۔ ''جن کو تم نے میرا حلیہ بتایا میں نے ان سے تمہارا حلیہ پوچھ لیا۔''

اس نے اس کی آنکھوں کے آگے چٹکی بجائی۔ سبین چونکی۔ خاموشی سے دروازے کے آگے سے ہٹ کر اس نے اسے اندر آنے کی جگہ دی۔ ڈینی سیٹی بجاتا ہوا مطمئن انداز میں اندر داخل ہو گیا۔

''کون ہے؟'' اندر سے بابا کی آواز آئی تھی۔ سبین نے جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔

☆......☆......☆

کارزل آ گیا تھا۔ باہر ہوتی بارش اور اس کی کار کی خرابی نے اسے لیٹ کر دیا تھا۔ ورنہ عموماً سب سے پہلے وہ ہی اس آفس میں موجود ہوتا تھا۔ اسے اندازہ تھا پیٹرسن کو وقت کی پابندی کرنے والے اپنے ورکر کس قدر پسند ہیں اور وہ تو ویسے بھی پیٹرسن کے التفات حاصل کرنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

کارزل کے ذمے اسمگلنگ کا کام تھا اس کے حصے میں ایشیاء کا خطہ تھا۔ ایشیاء سے جو جو لوگ چرس، افیون، ہیروئن اور دوسری غیر قانونی اشیاء لے کر آتے تھے۔ کارزل کے پاس سب کا ریکارڈ موجود ہوتا تھا۔ اس نے ہی ان ممالک میں اپنے ورکر پھیلائے ہوئے تھے۔ ورنہ پہلے یہ کام صرف یورپی اور افریقی ممالک تک ہی محدود تھا۔ اس کی کوشش سے کاروبار کو وسعت ملی تھی اور اس کی اس محنت کے صلے کے طور پر اس کا ''رتبہ'' بھی بڑھایا گیا تھا۔ اب وہ ہی سب پاس کرتا تھا لیکن سب پاس کرنے سے پہلے ڈان پیٹرسن کی اجازت لینا ضروری تھا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں ٹیب تھا جہاں پر اس کی ساری رپورٹ مرتب تھی۔

''ایران سے کیا خبر ہے؟''

''سر! وہاں سے ایک آدمی آ رہا ہے۔تقریباً چالیس برس کا۔۔۔وہ قالینوں کے دھاگوں کے ذریعے ہیروئن کی اسمگلنگ کرے گا۔''

''نہیں۔۔'' پیٹرسن نے کہا۔''یہ قالینی طریقہ اب بہت پرانا ہو چکا ہے۔جمادی سے کہو کوئی اور انتظام کرے۔اولیور نے معاملے کو سنگین بنا دیا ہے۔پولیس اب پیٹرسن کی بو لیتی پھر رہی ہے۔کسی بھی طرح کی بے احتیاطی نہیں چلے گی۔''

کارزل نے تائید اور تعمیل میں سر ہلایا۔''جو آپ کہیں۔''

''بنگلہ دیش۔۔۔؟''

''وہاں سے دو بھائی آ رہے ہیں دونوں جادو کا کام کرتے ہیں۔وہ اپنے جادوئی گیجٹس کے ذریعے''حشیش'' کی اسمگلنگ کریں۔

''کیا عمر ہے دونوں کی۔۔؟'' پیٹرسن نے پوچھا تو کارزل ٹیب پر تفصیلات چیک کرنے لگا۔

''ایک کی سولہ سال اور ایک کی اٹھارہ سال۔''

''ہرگز نہیں۔۔ڈیل کینسل کر دو۔اتنی عمر میں جادو نہیں سیکھا جا سکتا۔کم عمر لڑکے دولت کی ہوس میں ہوتے ہیں۔وہ نہیں جانتے کہ ایسی دولت کے انجام کو بھگتنا کتنا مشکل ہے۔بعد میں وہ ہمارے لیے مشکلات کا باعث بن سکتے ہیں۔''

''جو آپ چاہیں۔'' کارزل پھر ٹیب پر اگلی معلومات چیک کرنے لگا۔

''اور سر پاکستان سے ایک لڑکی آ رہی ہے۔۔''

''لڑکی؟ کیا واقعی میں۔۔۔؟ اس کا مطلب ہے پاکستان واقعی ترقی کر رہا ہے۔''ایک خفیف سی مسکراہٹ پیٹرسن کے لبوں پر مچلی تھی۔

''جی سر۔۔۔ڈینی نے زیادہ تفصیل نہیں دی مگر کہا ہے کہ کام مکمل گارنٹی والا ہے۔وہ لڑکی لائم (چونے) سے بنے ڈیکوریشن پیسز کے ذریعے اسمگلنگ کرے گی۔ڈینی نے کہا کہ ائیر پورٹ انتظامیہ کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہونے پائے گی کہ لڑکی اصل میں اسمگلر ہے۔''

''عمر کیا ہے؟''

''تئیس سال۔۔''

''نام۔۔؟''

''سر اسے ''بیلا ڈونا'' کا نام دیا گیا ہے۔لفظ''بیلا ڈونا'' کارزل نے ایک فخر سے بتایا تھا۔جیسے اپنے ہی انتخاب پر نازاں ہو۔

پیٹرسن نے گردن کو حرکت دیئے بغیر کارزل کو دیکھا۔کارزل کو اپنی حماقت کا احساس ہوا۔اسے لڑکی کی حقیقی معلومات دینی تھی بس۔۔۔یہ سیکنڈ نام رکھنے کا کام اور آپشن صرف اس کا ہی تھا۔

''اصل نام کیا ہے۔۔؟'' پیٹرسن نے پوچھا۔

''سبین قطب الدین۔۔۔'' کارزل نے بتایا۔۔

 

ناول **شام رنگ سیاہ** ابھی جاری ہے۔اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **20** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

دوسرا باب (سورج پرستی)

قسط نمبر 3

آفتابی زروں کو چننے والے، کرنوں کو بننے والے عبث ولا حاصل ہے سب، کہاں تھے سننے والے غفلت کی نیند میں تھے ڈوبے، تھی یہ کیسی پستی؟ چاند کو رقیب سمجھیں، ایسی تھی ان کی سورج پرستی

نیو یارک:

ہوا کی بادبانی کشتی کسی ناخدا کی رہنمائی کے بغیر خراماں خراماں آگے بڑھ رہی تھی۔ سڑک کے اطراف میں اگے میپل کے دیوقامت درختوں کے پتے لہرا رہے تھے۔ برفیلا موسم پگھل رہا تھا۔ اجلے دنوں کی دھوپ اپنے سنگھاسن پر پھر سے براجمان ہونے کی تیاریاں کرنے لگی تھی۔ شام اسی دھوپ کی گوئیاں بنی مچل رہی تھیں۔

قدیم وضع کے لکڑی سے بنے ایک پرانے ہٹ نما گھر کے باہر چکنی سڑک پر ایک تیز رفتاری کی حدود سے نکلی ہوئی گاڑی رکی تھی اور اس طرح رکی تھی کہ اس ہٹ نما گھر کے دروازے تک کھڑے ہوتے ہوتے گھوم گئی تھی۔ کار میں بیٹھے ان چاروں کا قہقہہ ٹھنڈی اور خاموش فضا میں بلند ہوا تھا۔ اس طرح کے خطرات سے کھیلنے والوں کا قہقہہ کہ لو آج پھر بچ گئے۔

آج پھر نہ ہمیں کچھ ہوا اور نہ ہماری کار کو......

کھلی چھت کی گاڑی کی پچھلی سیٹوں پر بیٹھا میران بنا دروازے کھولے ہی چھلانگ مار کر نیچے اتر آیا۔ ڈیوڈ نے اس کی طرف بیگ اچھالا۔ جو اس نے مشکل سے ہی سہی لیکن بروقت کیچ کر لیا۔

''آج کی رات کوئی ایسی چیز مت کھانا جو تمہیں سست کر دے۔'' مارڈی نے کہا۔ ''تمہاری لائف میں کوئی لڑکی نہیں ہے۔ اس لئے لڑکیوں سے اجتناب کرنے کا نہیں کہہ رہا۔'' اب کے مارڈی شرارتاً بولا تھا۔ میران نے اسے گھورا تھا۔

''تمہاری جیت ہماری ٹیم کے لیے ضروری ہے۔'' اس کے دوسرے دوست ڈینیل نے بھی کہا۔ ٹیم سے زیادہ ڈینیل کو میران کی جیت کی ضرورت تھی۔ کیونکہ ٹیم میں ڈینیل کی حیثیت جیت پر ناچنے والے جوکر سے زیادہ نہیں تھی۔

''فکر مت کرو دوست۔ بال یا گول کرے گی یا انکے سر پھاڑے گی۔'' میران نے کہا چاروں ہنسنے لگے۔

''اوکے بائے۔کل ملتے ہیں۔ربیکا آنٹی کو ہمارا سلام دینا۔''

''وائے ناٹ......بائے......''اس نے سب سے ہائے فائے شیک کیا تھا۔

گاڑی نے چرچرا کر حرکت کی اور کسی بھاری بھرکم مادم کی طرح دائیں بائیں بے ڈھنگی سی ڈول کر پلک جھپکتے میں چھلاوے کی مانند اس کی نظروں سے دور ہوگئی۔کار میں بیٹھے وہ چاروں جھول کر رہ گئے تھے۔مارڈی ایسی ہی رش ڈرائیونگ کرتا تھا۔خصوصاً تب جب وہ جیت جاتے تھے۔ورنہ آج اسکی اتری ہوئی صورت قابل دید ہونے والی تھی۔میران مسکراتے ہوئے ان کو جاتے دیکھتا رہا پھر مڑ کر اپنے گھر کی طرف بڑھا۔''سن شائن'' کی طرف جس میں نہ سورج کی روشنی تھی اور نہ ہی شائن...... حسب معمول گھر میں اندھیرا تھا۔باہر کی لائٹ، جو پرندوں کے لیے بنائے گئے چھوٹے سے گھر کے اوپر لگی تھی، بھی آن نہیں تھی جبکہ ربیکا جانتی تھی کہ میران ابھی گھر نہیں آیا۔

آج اس کا میچ ہے اور اس نے دیر سے آنا ہے۔

میران نے ڈور بیل بجائی۔دوبارہ بجانے پر بھی دروازے نہیں کھلا۔

''لگتا ہے ممی سو چکی ہیں......''

اس نے کندھے سے بیگ پیک اتار کر اس میں سے اپنی پینٹ تلاش کی۔مارڈی نے جلدی میں اس کے کپڑے ٹھونس ٹھسا کر اندر ڈال دیئے تھے اور آتے وقت اسے بدلنے بھی نہیں دیئے تھے۔اس وقت وہ باسکٹ بال والے نیکر، شرٹ اور جوگرز میں ہی تھا۔گھر کی چابی تلاش کرنا اس کے لیے کسی معرکے سے کم ثابت نہیں ہوا تھا۔

چابی اس نے دروازے میں گھمائی اور بڑی جان لگا دینے کے بعد دروازہ کھلا۔دروازے کا لاک پچھلے کئی سالوں سے خراب تھا لیکن ربیکا گھر کی باقی ساری چیزوں کے ساتھ ساتھ اسے بھی نہ بدلنے پر بضد تھی۔

''عیسیٰ کے پاس اسی لاک کی چابی ہے میں نہیں چاہتی کہ اس گھر میں داخل ہوتے وقت عیسیٰ کو رتی بھر بھی مایوسی ہو۔خواہ وہ مایوسی بدلاؤ کی ہی کیوں نہ ہو۔''ربیکا وجہ پیش کرتی تھی۔گھر کی دوسری بہت سی چیزوں کو لے کر بھی اس کے پاس ایسی ہی وجوہات تھیں۔جن سب میں عیسیٰ کا نام آتا تھا۔

''یہ عیسیٰ نے بنائی ہے۔یہ عیسیٰ میرے لئے لایا تھا۔یہ عیسیٰ نے خود یہاں رکھی ہے۔یہ عیسیٰ کی سالگرہ......''میران چپ ہو جاتا تھا۔اسے کسی چیز پر کوئی اعتراض ہی کب تھا بھلا۔

دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا۔سامنے بھی اندھیرے نے اس کا استقبال کیا۔پورا گھر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔اسے لگا وہ کسی غار میں گھس آیا ہے۔

ایسا غار جہاں عرصے سے مٹھ باسی اس کی دنیا کی خیریت کے لیے آسن جمائے بیٹھے تھے۔ وہ روشنی کر کے ان کے آسن کو توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اپنی دنیا کے خیریت کے لیے تو وہ خود غرض تھا ہی۔

وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ بہت احتیاط سے اس نے جوگرز اتارے تھے اور واش روم میں آ کر نہ کھولنے سے پہلے اس نے کمرے کا دروازہ اور پھر واش روم کا دروازہ اچھی طرح سے بند کر لیا تھا۔ ربیکا سو چکی تھی اور وہ اپنے شور سے اسے ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتا تھا۔

رات کا موسم گرچہ مائل بہ خنکی تھا، لیکن اس کی حالت چیخ چیخ کر غسل کے لیے پکار رہی تھی۔ والی بال کی وجہ سے اس کا سارا جسم پسینے سے بھرا ہوا تھا۔ گراؤنڈ کی مٹی بھی اس کے جسم پر کہیں کہیں موجود تھی۔ اسے خود سے الجھن محسوس ہو رہی تھی۔ غسل خانے میں آتے ہی اس نے گرم پانی کا شاور فل سپیڈ سے کھول دیا۔ گرم پانی نے اس کے جسم پر پڑتے ہی اس کی ساری تھکن کو دور کر دیا اور بھاپ نے اسے تازگی دی۔ شاور کے دوران وہ گنگنانے لگا تھا یہ آج کی جیت کی خوشی تھی جو اس کے لبوں پر گانے کی صورت مچلنے لگی تھی۔

جسم کو تولیے سے خوشک کر کے اس نے رات کا کھلا ڈھلا گرم ٹراؤزر پہن لیا اور باہر ڈائننگ ایریا میں نکل آیا۔ ڈائننگ ٹیبل پر کوئی برتن وغیرہ موجود نہیں تھے۔ وہ اندر کچن میں گیا تو وہاں بھی خالی کچن اور خالی فریج اس کا منہ چڑانے لگا۔ ربیکا نہ جانے کیا کھا کر سوئی تھی کیونکہ کچن میں کچھ بھی بنا ہوا نہیں پڑا تھا۔ اس نے اپنے ڈبل روٹی کے دو پیس ٹوسٹر میں ڈال کر انہیں خستہ کیا اور پھر ان پر جیم لگا کر باہر نکل آیا۔ یہ وہ کھانا تھا جو صبح کے علاوہ اکثر باقی دن کے اوقات میں بھی اسے کھانا پڑتا تھا۔

ٹی وی دیکھنے کے ارادے سے اس نے لاؤنج کی لائٹ آن کی تو کمرے میں روشنی کے پردے چاک ہوتے ساتھ ہی کرسی پر ایک بت بیٹھا ہوا ظاہر ہوا تھا۔

یہ بت ربیکا کا تھا۔

ربیکا کے وہاں بیٹھنے سے ظاہر تھا کہ وہ کافی دیر سے وہاں موجود ہے۔ وہ سوئی نہیں تھی۔ پھر اس نے دروازہ کیوں نہیں کھولا تھا؟ میران حیران ہوتا اگر یہ واقعہ آج پہلی بار رونما ہو رہا ہوتا۔ ربیکا اکثر ایسا ہی کرتی تھی۔ وہ اپنے خیالوں میں اس طرح گم ہوتی کہ اردگرد سے بے گانہ ہی ہو جایا کرتی تھی۔ ایسے لمحوں میں اس کی چھ کی چھ حسیات وقتی طور پر مر جاتی تھیں۔ وہ ایک مردہ تتلی کی طرح زندہ تو لگتی تھی، لیکن پر ہلانے، رنگ چھوڑنے سے قاصر۔

میران کی ساری خوشی کافور ہو گئی۔

ادھ کھایا ٹوسٹ اس کے ہاتھ میں ہی جھول کر رہ گیا۔ تاسف سے اس نے سر کو ہلکے سے جھٹکا دیا۔ اسے پتہ تھا آج پھر

تماشا ہوگا۔اسے وہ سب پھر سے سننا ہوگا جو وہ ہزار بار سن چکا ہے۔جو اس قدر از بر ہو چکا تھا کہ اس سے تحت الشعور کی رگیں بھی پناہ مانگتی تھیں۔آخر خوشیاں اس سے اتنی جلدی کیوں روٹھ جاتی ہیں۔کوئی بھی خوشی اس کے لئے دائمی کیوں نہیں ہے۔اس نے ٹوسٹ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور بنا سنورے بالوں میں انگلیاں پھنسا تا بڑی آہستگی سے ربیکا کے پاس گیا۔

اندھیرے سے روشنی میں آ جانے پر بھی ربیکا نہیں چونکی تھی اور اس طرح بیٹھی تھی جیسے کسی ماہر نقاش نے اسے کرسی پر بٹھا کر اس پر مرمر کا خول چڑھا دیا ہو۔

''ممی......آپ نے کھانا کھا لیا؟'' قریب جا کر اس نے اس کو کندھوں سے تھام کر نرمی سے چونکایا اور حد درجہ نارمل انداز سے سرسری سا ایک ایسا سوال کیا تھا جس سے ربیکا ڈرے نا......ربیکا کو اس کے خیالوں سے اٹھانا مردے میں دوبارہ جان بھرنے کے مترادف تھا۔

''ہمم......'' ساری احتیاطوں کے باوجود بھی وہ بری طرح چونکی اور اپنی کرسی سے اچھل کر کھڑی ہوگئی۔لمحے بھر کو ربیکا کی آنکھیں اس طرح پھیلی تھیں جیسے وہ اپنے سامنے کوہ قاف کے کسی بھوت کو دیکھ رہی ہو۔جس کے بارہ سر ہوں، دو زبانیں اور چار آنکھیں......پھر رفتہ رفتہ ان کی بصیرت جیسے انہیں واپس لوٹائی گئی تھی۔

''عیسیٰ......؟'' وہ پہچانے کی کوشش میں ادھ موئی ہو رہی تھی۔

''نہیں......میں ہوں میران......'' وہ تحمل سے کھڑا رہا۔اسے پتا تھا اب اگلا سوال کیا آئے گا۔

''کون میران؟''

اگلا سوال وہی تھا جیسا کہ قیاس تھا۔پوچھتے ہوئے ربیکا کی آنکھیں اس طرح چندھیاں کر اندر کو سکڑ گئی تھیں جیسے ان کے سامنے سورج آ گیا ہو، اپنی تمام تر تابانی سمیت اور وہ اس سے کوئی شرط لگا کر جیتنا چاہ رہی ہوں۔

''میران......آپ کا بیٹا۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

''اوہ......میرا بیٹا......میران......'' ربیکا کو جیسے یاد آ گیا کہ وہ ایک جوان بیٹے کی ماں ہے۔وہ میران کے گلے لگ کر جھول گئی۔جیسے بڑی مدت کے بعد اس سے ملی ہو۔میران فوج سے پلٹا ہو یا وہ خود چاند سے ہو کر آ رہی ہو۔میران کو اپنا اور ربیکا کا توازن برقرار رکھنے میں بڑی قوت لگانی پڑی۔

''آپ نے کھانا کھا لیا؟'' خود سے الگ کر کے وہ بڑے پیار سے پوچھنے لگا۔

''ہاں......میں نے کھا لیا ہے۔عیسیٰ کے ساتھ، آج تو وہ میرے بنائے ہوئے کھانے کی بہت ہی تعریف کر رہا تھا۔'' وہ بڑی سچی خوشی سے مسکرائی تھی۔میران اپنے باپ کا نام سن کر بمشکل مسکرا سکا۔

''کیا بنایا تھا آج آپ نے ان کے لئے۔ میرے لئے کیوں نہیں رکھا؟'' وہ بس اتنا ہی پوچھ سکا۔

''آج میں نے اس کے لیے بریانی بنائی تھی۔ پاکستانی بریانی اسے بڑی پسند ہے۔ تمہاری لئے نہیں بچ سکی، تم کچھ اور کھا لو کیونکہ عیسیٰ اپنی بھوک سے زیادہ کھا گیا ہے۔ تمہیں تو پتا ہے کہ وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتا ہے۔''

''میں نے کھانا کھالیا ہے۔''

''اب وہ باہر گیا ہے میرے لیے آئسکریم لینے۔'' وہ چاہت سے بولی۔

''آپ اتنی دیر آرام کر لیں۔ بابا آئیں گے تو میں انہیں آپ کے کمرے میں بھیج دوں گا۔'' وہ جانتا تھا کہ اب ربیکا کا آرام کرنا کس قدر ضروری ہو گیا ہے۔

''ٹھیک ہے۔'' خلاف توقع اس نے آمادگی دے دی۔ ''پھر تم جاگتے رہنا ورنہ مجھ سے اٹھ کر دروازہ نہیں کھولا جائے گا۔ نجانے کتنی دور چلا گیا ہے عیسیٰ۔ کہہ تو رہا تھا کہ ساتھ والی مارکیٹ سے لے آتا ہوں۔''

''جی، میں جاگتا رہوں گا۔'' وہ فرمانبرداری سے بولا۔

''پتہ نہیں کیوں میرا جسم ٹوٹ رہا ہے۔ مجھے میرے کمرے تک چھوڑ آؤ میران! میری جان۔''

ربیکا نے چلنے کی کوشش کی اور پھر بے اختیار درمیان میں ہی اس طرح لڑکھڑائی جیسے ماڈل کی ریمپ پر واک کرتے ہوئے ہیل ٹوٹ گئی ہو۔ میران نے جلدی سے ربیکا کو پکڑ کر بروقت سنبھالا۔ وہ پھر سے اس کے کندھوں پر جھول گئی۔ اس پر جیسے ایک دم سے نیند کا دورہ پڑا تھا۔

''آئیں۔'' وہ اسے سہارا دے کر اس کے کمرے میں چھوڑنے جانے لگا تھا اور تب ہی ایک کثیف بو کے بھبکے نے اس کی سانسوں کی سرگم کو درمیان میں روکا تھا۔ جلدی سے اس نے اپنا ہاتھ اپنی ناک پر رکھ لیا تھا۔ یہ بو ربیکا کے منہ سے آ رہی تھی۔ ایک جانی پہچانی بو۔ میری جوانا کی بدبو...... جس کا مطلب تھا کہ انہوں نے آج پھر نشہ کیا تھا۔

''دھیان رکھنا۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارا والد دروازے پر دستک دیتا رہے اور تم بھی میری طرح غافل بن کر بیٹھے رہو۔ باہر بہت سردی ہے۔ اسے بہت سردی لگتی ہے۔ وہ پاکستان سے آیا ہے نا...... وہاں کے لوگ جو امریکا آتے ہیں تو انہیں بہت سردی لگتی ہے۔ ان سے نیویارک کا موسم برداشت ہی نہیں ہوتا۔''

''جی میں دروازے پر دھیان رکھوں گا۔'' اس نے اسے ان کے بیڈ پر لٹا دیا۔ لیٹتے ہی وہ فوراً مکمل طور پر نیند کی آغوش میں چلی گئی تھی۔ جیسے کوئی نومولود بچہ ہو۔ پاؤں سے چہرے تک کمبل اوڑھا کر میران نے اس کے کمرے کی لائٹ آف کر دی اور پھر سے باہر لاؤنج میں نکل آیا۔

ٹی وی نجانے کس چینل کے کون سے مناظر دکھا رہا تھا۔ اسے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ سب آؤٹ آف فوکس تھا۔ آنکھوں سے نکل کر گالوں پر بہتے آنسوؤں نے سب دھندلا کر دیا تھا۔

اسے اس والد کی آمد کا دھیان رکھنا تھا جسے مرے ہوئے پچیس سال گزر چکے تھے۔

یہ سن 1980ء کی بات تھی۔ یورپین ممالک میں ویزے کی سہولیات اور ان ممالک میں تیزی سے ہوتے ترقیاتی کاموں نے تیسری دنیا کے باشندوں کو ان ممالک میں ہجرت کر جانے کی ترغیب دی تھی۔ ایشیاء خصوصا جنوبی ایشیاء کے لوگ تو اپنے ملکوں کی غربت، بڑھتی آبادی اور محدود وسائل ہونے کے باعث ایسے ممالک کی طرف کھنچے چلے گئے تھے۔ بنگلہ دیش، نیپال، افغانستان، بھارت اور پاکستان سے بھی بہت سے لوگ مستقل اور غیر مستقل طور پر ہجرت کر کے امریکا، برطانیہ، کینیڈا میں سکونت اختیار کرنے لگے تھے۔ انہی میں سے ایک عیسیٰ بھی تھا...... بن عیسیٰ...... خوبرو، رعنا نوجوان...... جس کی آنکھوں میں محبت کی بڑی بڑی پکاریں درج تھیں۔

ساکت خاموش چہرے میں پیار کی کہانیاں رقم تھیں۔ جس کے آگے دنیا کے سارے مردوں کی کشش کم پڑ جاتی تھی۔

عیسیٰ پاکستان کے صوبہ پنجاب کے شہر سرگودھا کا رہائشی تھا۔ بچپن میں ہی اپنے ماں باپ اور چار بہن بھائیوں کی ایک ہی دن موت کے بعد انتہائی گہری کم گوئی کا شکار ہو چکا تھا۔ اس وقت وہ سات سال کا تھا۔ گاؤں والوں کی طرح وہ یہ نہیں سوچ رہا تھا کہ اس کا سارا گھرانہ ایک ہی دن کیسے مارا گیا؟ وہ بس یہ سوچ رہا تھا کیا وہ تنہا رہ گیا ہے۔ اپنی خونی رشتوں کی ایک ہی دن موت کا اس پر کچھ ایسا اثر ہوا تھا کہ وہ نہ تو کبھی رویا تھا اور نہ ہی کبھی اداس ہوا تھا۔ اس کی مسکراہٹ بھی ختم ہو گئی تھی، ہنسنے کی پھر اس نے کبھی ضرورت محسوس نہ کی، قہقہے لگانے کی کبھی طلب نہ پڑی، اور ساتھ ہی جیسے جینے کی خواہش بھی باقی نہ رہی تھی۔ نہ کوئی طلب تھی نہ مانگ، نہ کھانے کا ہوش نہ پینے کی چاہ۔ بس ایک چپ تھی جو اس کے پورے وجود پر مسلط کر دی گئی تھی۔ انسانوں کی بستی میں وہ نہ نظر آنے والا فرشتہ بن گیا تھا۔

عیسیٰ نے امریکا میں آ کر مختلف کاموں کے لئے کوشش کی تھی۔ وہ محنتی تھا۔ کوئی بھی کام نہ صرف بڑی آسانی سے سیکھ جاتا تھا بلکہ اسے بڑی مہارت اور جانفشانی سے کیا بھی کرتا تھا۔

پہلے اس نے چند ہفتے ایک پٹرول پمپ پر کام کیا، اس کے بعد ایک ریسٹورنٹ میں اور پھر ایک پیکنگ فیکٹری میں...... اس نے جہاں جہاں کام کیا وہاں وہاں کے مالک اس کے کام سے ہمیشہ خوش ہوئے۔ لیکن اس کے اندر کا دہقانی مرد کبھی مطمئن نہیں ہو پایا۔ یہ اطمینان اسے الیگزینڈر کے چیری کے باغات میں جا کر ملا تھا۔ ایک وسیع پرائیویٹ زرعی اراضی، جہاں چیری اور بلیک بیری کے بے تحاشہ درخت اور جھاڑیاں تھیں جن کی مسحور کن خوشبو پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لیے رکھتی

تھی۔ بلیک بیری اور سرخ چیری کے وہ چھوٹی قامت کے درخت اور ان پر لگے شگفتہ بنفشی پھل دیکھ کر ہی عیسیٰ نے ارادہ کرلیا تھا اگر اسے یہاں کام مل گیا تو پھر وہ مزید کہیں نہیں جائے گا۔

عیسیٰ کو وہاں آسانی سے رکھ لیا گیا تھا۔ اس کا کسرتی جسم اس بات کا غماز تھا کہ وہ زری محنت کے لئے ہی بنا ہے۔ عیسیٰ کو اس کوارٹر میں بھی جگہ مل گئی تھی جو لڑکوں اور عمر رسیدہ مردوں کے لئے مختص تھا۔ ان کے کوارٹر سے ذرا فاصلے پر ایک دوسرا کوارٹر بھی تھا۔ جہاں لڑکیاں اور عمر رسیدہ عورتیں رہتی تھیں۔ وہاں کے ہی ایک کمرے میں ربیکا بھی موجود تھی۔

ربیکا کا تعلق فلوریڈا سے تھا۔ وہ ایک بروکن فیملی سے تھی۔ زندگی کا بہت سا حصہ اس نے باری باری کبھی ماں کبھی باپ کے پاس گزارا تھا۔ اب وہ زندگی کو صرف اپنے ساتھ گزار رہی تھی۔

مردوں کا کام درختوں کی حفاظت، ان کے پتوں، پھلوں کی جانچ پڑتال، ان کی کانٹ چھانٹ، پانی دینا اور کھاد ملانے کا تھا جبکہ عورتیں صرف اس کے پھلوں کو چن کر ڈبوں میں پیک کرتی تھیں۔ مرد عموماً صبح سے دوپہر تک کام کرتے تھے جبکہ عورتوں کا کام دوپہر کے آغاز سے شام گئے تک جاری رہتا تھا۔ پھلوں کا موسم نہ ہونے کے دوران مرد، عورتیں سب ہی بھی موسمی سبزیوں کے کھیتوں میں کام کرتے تھے۔

اپنے اپنے کوارٹر میں سے نکلتے ہوئے ایک دن عیسیٰ اور ربیکا، دونوں کا ٹکراؤ ہوا تھا۔ ربیکا اپنی ڈیوٹی کے شروع ہونے پر سہیلیوں کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی نکل رہی تھی اور عیسیٰ ڈیوٹی ختم کرکے ڈھیلی شرٹ خود پر چڑھاتا ہوا واپس کوارٹر میں جا رہا تھا۔ دونوں بے دھیانی میں ٹکرائے تھے۔ ٹکر کچھ اسی زوردار بھی نہیں تھی۔ عیسیٰ کے لئے تو بالکل ہی غیر محسوس تھی۔ لیکن ربیکا کی پیشانی سے زیادہ کسی نے دل پر گھونسا مارا تھا۔ چونک کر وہ پیچھے ہوئی تھی اور عیسیٰ کو دیکھ کر اس کے دل کی خال اندر تک سکڑتی چلی گئی تھی۔

یہ ٹکر آنے والی بہت سی ملاقاتوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ عیسیٰ اگلے ہی لمحے سنبھل کر شرٹ کو سیدھا کرتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا لیکن ربیکا جیسے وہاں ہی منجمد ہو گئی تھی۔ باب کٹ بال، اور خود بھی لڑکا سی بنی رہنے والی سفید رنگت کی مالک ربیکا کو وہ گندمی رنگت والا لڑکا اس قدر پسند آ گیا تھا کہ وہ اسے دیکھتے ہی دل دے بیٹھی تھی۔

''کوئی اتنا دلکش کیسے ہوسکتا ہے؟''

اس کا دل جھوم جھوم کر صدائیں لگا رہا تھا۔ روشن آنکھوں والے دیوتا نے اسے اپنے بس میں کرلیا تھا۔ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ اٹھی۔

بلیک بیری اور چیری کے پھل چنتے وقت، انہیں ڈبوں میں پیک کرتے وقت، کھانا کھانے سے رات سونے سے پہلے تک ربیکا اس ٹکراؤ کو ذہن میں دوہراتی رہتی تھی۔ سوچتی رہتی تھی۔ از بر کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ وہ خراش جو پیشانی سے ہوتی ہوئی

دل کی چوٹ بن گئی تھی۔ بڑی آسانی سے دل کا روگ بھی بن سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی۔ لیکن سنجوگ کے روگ کتنے میٹھے ہوتے ہیں کہ ان کی لذت چکھے بغیر گزارہ بھی ممکن نہیں ہوتا۔ وہ خود کو اس ایشیائی کی محبت میں مبتلا ہونے سے روک نہیں سکتی تھی۔ جس کے بارے میں آنے والے وقتوں میں اس کی سہیلیوں کو بہت مشکل سے اس بات پر ایک یقین آیا تھا کہ وہ پاکستان کا عام آدمی ہے۔ کسی شاہی خاندان کا فرزند نہیں ہے۔

لڑکے اپنے کوارٹر میں اپنے اپنے کام خود کرتے تھے۔ دوپہر کا کھانا جو ہاؤس کی طرف سے ملا کرتا تھا کے علاوہ صبح کا ناشتہ رات کا کھانا بھی خود بناتے تھے۔ اپنے کپڑے خود پریس کرتے تھے۔ خود دھوتے اور باہر سوکھنے کے لیے بھی خود ہی ڈالتے تھے۔ ربیکا جو عیسیٰ سے ٹکراؤ سے پہلے تک اس بات سے غافل تھی کہ ان کے کوارٹروں کے ساتھ ہی لڑکوں کا بھی کوئی کوارٹر ہے اور وہاں لڑکوں، بوڑھوں کے ساتھ ساتھ مشرقی شہزادہ بھی رہائش پذیر ہے۔

اب دن رات وہاں دیکھنے لگی تھی۔

''احتیاط سے چلو ربیکا...... جب سے یہ ایشیائی ہمارے ملک میں آنے لگے ہماری عورتوں کو روگ لگنے لگا ہے۔ ان کا حصول صرف یہاں کی شناخت تک ہے پھر یہ اپنے پیچھے والوں اور یہاں والیوں کو بھولنے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگاتے۔'' ربیکا کی سہیلی نے اس سے کہا تھا۔ اس کے باوجود ربیکا نے اپنے سونے کی جگہ اسی دوست کے ساتھ بدل لی تھی۔ نئی جگہ سے وہ قد آدم کھڑکیوں کے اندر سے عیسیٰ کو آسانی کے ساتھ کوارٹر میں چلتے پھرتے دیکھ سکتی تھی۔

باغ میں اپنا کام کرنے کے بعد عیسیٰ کے کچھ بھی مشاغل نہیں تھے۔ وہ سب سے سلیقے اور ادب سے بات کرتا تھا لیکن الگ تھلگ ہی رہتا تھا یا شاید اسے اس بات کا اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ سب سے میل جول نہیں رکھ پا رہا۔ وہ چپکے چپکے عیسیٰ کو سارے کام کرتے ہوئے دیکھا کرتی تھی۔ خاموشی سے کھانا بنا کر اپنے بستر پر بیٹھ کر کھاتے ہوئے عیسی ...... ربیکا کو مائیکل اینجلو کا عیسیٰ لگتا تھا۔ ویسا ہی یہ قد بت، ویسی ہی جسامت، ویسی رنگت۔ بس اس پر وحی نہیں کشش اترتی تھی۔ محبت کی کشش، سب کو کھینچ لینے کی کشش، مار دینے والی کشش، ربیکا اس کشش پر پہلے ہی لمحے بیعت کر چکی تھی۔ وہ اس عیسیٰ کی وحی کو مان چکی تھی۔ ایک عیسیٰ پر ایمان لا کر وہ دوسرے عیسیٰ کے قدموں میں جا گری تھی۔

اپنے کوارٹر میں عیسیٰ صرف ٹراؤزر پہن کر گھوما کرتا تھا۔ اس کی موٹی کلائیاں، مضبوط بازو، چوڑی چھاتی اور ان پر سیاہ گھنگریالے بال عیاں ہوتے تھے اور اسے دیکھتے ہی ربیکا کا سانس اکھڑنے لگتا تھا۔ اس کی محبت تو ارفع تھی، ربیکا تو اسکے دیدار میں بھی بخوشی جان دے سکتی تھی۔

عیسیٰ کام کرتے، چلتے پھرتے اکثر نوٹ کرتا تھا کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ ہنسی کی بندش میں بند کچھ سرگوشیاں بھی اس

کے کانوں میں اترتی تھیں۔جنہیں وہ سمجھنے سے قاصر تھا۔لیکن اتنا تو جان ہی جاتا تھا کہ کھد بدسا منے کے کوارٹر میں ہو رہی ہے۔ کبھی کبھی اس کی نظر ربیکا پر بھی پڑ جاتی تھی اور وہ اسے محض اتفاق سمجھتا تھا۔کھڑکی کے آہنی جنگلے پر ٹھوڑی ٹکائے ربیکا جھینپ جاتی تھی، چونک کر پرے ہوتی تھی اور کبھی آگے سے مسکرا دیا کرتی تھی۔جواب میں عیسیٰ بھی پھیکی سی مسکراہٹ کا تبادلہ کرتا تھا۔وہ ابھی تک اس بات سے انجان تھا جس سے دونوں کوارٹر والے خوب اچھے سے آگاہ ہو چکے تھے۔مردوں کے کوارٹر میں ربیکا''ونڈو گرل''(کھڑکی والی لڑکی) کے نام سے مشہور ہو چکی تھی اور عورتوں کے کوارٹر میں سے زلیخا کے نام سے پکارا جانے لگا تھا۔جسے ہر لمحہ یوسف کا دیدار مقصود تھا۔وہ ان میں سے کسی ایک لفظ پر بھی نہیں چڑتی تھی بلکہ اندر ہی اندر خوش ہوتی تھی۔

مردوں کا کوارٹر صبح کے وقت خالی ہو جاتا تھا۔عورتیں بڑی فراغت اور تسلی سے صبح اٹھتی تھیں، کیونکہ انہیں دوپہر میں باغ میں جانا ہوتا تھا۔لیکن ربیکا صبح مردوں سے بھی جلدی اٹھ کر باغ میں چلی جایا کرتی تھی۔وہ نہ تو ناشتا کرتی تھی اور نہ وہ سب کام جو دوسری لڑکیاں اٹھ کر کرنا شروع ہو جاتی تھیں۔اسے کپڑے بدلنے، نہانے، بننے سنورنے کی بھی زیادہ پرواہ نہیں ہوتی تھی۔

باغ میں جا کر وہ ایسے ظاہر کرتی جیسے وہ چہل قدمی کرتے ہوئے ادھر آ نکلی ہے، اور پھر ایک جگہ بیٹھ کر وہ چور نظروں سے عیسیٰ کو دیکھا کرتی تھی۔وہ خاموشی سے پتوں کی جانچ پڑتال کرتا تھا۔کھاد ملاتا، پانی دیتا......اسے اس باب کٹ بالوں والی لڑکی سے کوئی انسیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔نہ ہی ربیکا کی طرح اس کا دل اسے دیکھ کر دھڑکتا تھا۔نہ آنکھیں اس کے دیدار کو ترستی تھیں۔ عیسیٰ کا کوئی ایسا قریبی دوست بھی نہیں تھا جو عیسیٰ کو بتاتا کہ یہ لڑکی چہل قدمی کرنے نہیں بلکہ عبادت کے لیے آتی ہے۔محبت کی عبادت کے لیے......اور یہ اپنی عبادت میں کس قدر شدت پسند ہے کہ کسی ایک دن بھی ناغہ نہیں کرتی۔جیسے محبت میں اپنے کافر ہو جانے سے ڈرتی ہو۔

عیسیٰ نے ساری زندگی اس طرح کے حالات دیکھے تھے کہ اس کا دل پتھر کی طرح سخت ہو چکا تھا۔جس پر محبت کا نقش کندہ کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کرنے کی ضرورت تھی۔ربیکا یہ بات جان گئی تھی۔اس نے عیسیٰ کے بارے میں سب پتہ کر لیا تھا کہ وہ کہاں سے آیا اور یہاں آنے کے بعد اس نے کہاں کہاں کام کیا ہے۔

سرسری چہل قدمی کی بات اب سرسری مدد کروا دینے پر آ گئی تھی۔عیسیٰ کے ساتھ درختوں کی دیکھ بھال کرتے دونوں میں اب کسی حد تک بات چیت ہو جاتی تھی اور عیسیٰ کی سمجھ بس اتنی ہی تھی کہ یہ لڑکی تنہائی کا شکار ہے اور اس سے بات چیت کر کے اپنی تنہائی دور کرتی ہے۔وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے ساتھ چلتے ہوئے اپنی ساری زندگی کے قدم اس سے ملانے کی دعائیں کر رہی ہے۔عیسیٰ کم گو شخص تھا۔امریکا آنے کے بعد اس کا واحد دوست بنا تھا اور وہ بھی ایک لڑکی......ربیکا......جس سے وہ لڑکوں کی طرح کا ہی برتاؤ کر رہا تھا۔کیونکہ وہ اسے کہیں سے بھی لڑکی نہیں نہیں لگتی تھی۔جلدی بے تکلف ہو جانا، پینٹ شرٹ پہننا......اس نے

اپنے ملک میں بھلا کہاں دیکھا تھا یہ ماحول......اس لیے یہاں کی ساری لڑکیاں بھی اسے اپنی جنس کی ہی لگتی تھیں۔

کام کے بعد وہ عیسیٰ کے ساتھ بیٹھ جاتی اور اسے اپنی سنانے اور اس کی سننے کے بجائے اسے دیکھتی رہتی۔ وہ اس کے ہاتھوں کو دیکھتی، آنکھوں کو، چوڑے ماتھے کو، بھرے بھرے گالوں کو، وہ چاروں طرف سے حسن ہی حسن تھا۔ ربیکا کو سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اسے کہاں سے دیکھے اور کس حصہ کو نظر انداز کرے۔ وہ سراپا دید تھا۔

ربیکا کے دل میں کیا تھا یہ کوئی چھوٹا سا بچہ بھی جان سکتا تھا۔ اور ربیکا سوچتی تھی کہ مرد "بے خبر" ہو تو اس کا روپ اور بھی نکھر جاتا ہے۔ وہ اور بھی دلکش لگتا ہے۔ ایسے موقع پر کہ جب کسی لڑکی کے دل میں ہیجان ہو، قربت کی موجیں سر اٹھا رہی ہوں ایسے موقعے پر سامنے والے کی بے خبری، یا محبت کو جلا دیتی ہے یا مزید نکھار دیتی ہے۔ بے خبر عیسیٰ اسے اس قدر پیارا لگتا تھا کہ اس کا دل کرتا تھا وہ کسی ماں کی طرح اسے اپنی آغوش میں چھپا لے اور پوری دنیا میں سے کسی کو اس کا چہرہ دیکھنے کی اجازت نہ دے۔ وہ اس پر بری طرح سے قابض ہو جائے۔

ربیکا اب عیسیٰ کو خوش کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔ وہ عیسیٰ کے کپڑے دھو دیا کرتی تھی۔ خود پریس کرتی تھی۔ اس کے لیے کھانا بھی خود بناتی تھی۔ دوپہر میں جو کھانا کمپنی کی طرف سے ملتا تھا وہ اس میں سے کافی حصہ عیسیٰ کو دے دیتی تھی۔ جب سے اس نے یہ بات نوٹ کی تھی کہ اس کی خوراک کافی زیادہ ہے اور اس کا ایک ڈش سے گزارا نہیں ہوتا۔ اس کی خاطر وہ اپنی آدھی بھوک کو بخوشی سہہ جاتی تھی۔ لڑکیاں جانتی تھیں کہ ربیکا عیسیٰ پر بری طرح فدا ہو چکی ہے لیکن جسے یہ بات اصل میں جاننا چاہیے تھی وہ اس سے بے خبر تھا۔ وہ اس سب کو ایک تعلق سمجھے ہوئے تھا بس......اور انہیں صبر کے دنوں میں سے ایک دن ربیکا کی ہمت جواب دے گئی۔

ایسٹر کی چھٹیوں میں جب سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا چکے تھے تو دونوں کوارٹر تقریباً تقریباً خالی ہو چکے تھے۔ پانچ سو میں سے صرف پانچ لوگ بچے تھے۔ جن میں وہ دونوں بھی شامل تھے۔ وہ دونوں ہی اپنے اپنے کوارٹرز میں اکیلے تھے اور بوریت کے دن گزار رہے تھے۔ باغ کا کام بند تھا۔ انچارج اور باورچی تک چھٹیوں پر تھے۔ دونوں کے پاس کوئی ایسا ٹھکانا نہیں تھا جہاں ایسٹر کی چھٹیوں میں جا سکتے۔

دن کی روشنی میں ایک روز ربیکا نے دیکھا کہ عیسیٰ کوارٹر سے باہر نکلا تھا۔ وہ اس وقت عیسیٰ کے لئے ہی سویٹر بن رہی تھی۔ جو اس نے کوارٹر میں رہنے والی عورت سے سیکھا تھا۔ عیسیٰ مضبوط اور قوی ہاتھ پاؤں والا تھا۔ اس کے لئے سویٹر بناتے بناتے وہ اس کی قربت محسوس کرنے لگی تھی۔ بار بار وہ سویٹر کو خود سے لگا کر دیکھا کرتی تھی۔ اسے ایسے چومتی تھی جیسے کسی مقدس کتاب کو چوم رہی ہو۔

جب کافی دیر گزر جانے کے بعد بھی عیسیٰ واپس نہ آیا تو ربیکا اپنی نشست چھوڑ کر عیسیٰ کو ڈھونڈنے کے لیے باہر نکلی۔ اسے فکر ہونے لگی تھی۔ لیکن اس فکر میں کہیں کہیں محبت کی گرمائش تھی۔ تنہائی میں کچھ کرنے کی شرارت کی سازش تھی۔

بوڑھی عورت نے ربیکا کو سلائیاں چھوڑ کر باہر جاتے دیکھا تو مسکرا اٹھی۔ کیونکہ وہ بھی عیسیٰ کو باہر جاتے دیکھ چکی تھی۔

چیری کے بے پھل کے درختوں میں وہ اسے خالی جگہ پر سوتا ہوا نظر آیا تھا۔ کچی کھاد ملی ہوئی زمین پر...... وہ اس وقت صرف ٹراؤزر میں تھا۔ اس کی شرٹ گولاسی ہو کر اسی کے سر تلے رکھی تھی اور جسم پر جا بجا مٹی لگی ہوئی تھی۔ دھوپ سے گرم زمین پر وہ بڑی میٹھی نیند سو رہا تھا۔ دہقانی باپ کا دہقانی بیٹا...... زمین کا پوتر...... روشنی بانٹتا...... سورج جیسے ربیکا کی آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ یہ منظر ایسا دلکش تھا کہ ربیکا کا دل چاہا کہ وہ یہ قیامت تک یہ منظر دیکھتی رہے۔ جس کا سایہ وہ خود بن چکی تھی اس کے سامنے کھڑی ہو کر وہ اس پر اپنا سایہ کرنے لگی۔ عیسیٰ کی بے اقرار پتلیاں ساکت ہو گئیں۔

ہوا میں کسم کے کچے پھلوں کی خوشبو تھی۔ مدھم اور بھید بھری مہک چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ وہ جو دل سے ہار چکی تھی اب مزید انتظار کی چوکھٹ پر کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ پتا نہیں وہ کونسا لمحہ تھا جب اس نے سوئے ہوئے عیسیٰ کو ہاتھ لگا کر...... واپس جانے کی تمہید باندھی تو...... کسی نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور کھینچ کر اسے خود سے قریب کر لیا۔

سورج نے شرما کر خود کو چھپا لیا۔ چیری کے درخت آپس میں بھید بھری سرگوشیاں کرنے لگے تھے۔ ان کے پتے مسکرا رہے تھے۔ تتلیاں آ آ کر جھنڈوں کی شکل میں وہاں اکٹھی ہو رہی تھیں۔ چیری کے پھل اس سال بہت رسیلے ثابت ہونے والے تھے۔ انہوں نے دو محبت کرنے والوں کو دیکھا تھا۔

ہوا میں کسم کے پھل پک پک کر چھٹنے لگے تھے۔ رسیلی خوشبو چاروں طرف چھانے لگی تھی۔

ایسٹر کے وہ دن اور وہ راتیں جب وہ دونوں اس جگہ پر تنہا تھے ان دونوں کی زندگی کی یادگار ترین راتیں تھیں۔ یہ راتیں انکی زندگی سے پھر کبھی نہیں نکل سکی تھیں۔ کچھ منظر تحت الشعور میں ایسے بیٹھ جاتے ہیں کہ پھر وہ جیسے تحت الشعور کے بھی پسندیدہ ہو جاتے ہیں۔ ذہن انہیں بار بار خود میں دہراتا رہتا ہے۔ آنکھیں انہیں بار بار یاد کرتی ہیں۔ دل ان کے لئے بار بار دھڑک اٹھتا ہے۔

شادی کے بعد عیسیٰ نے ربیکا کو کام کرنے سے منع کر دیا تھا۔ چونکہ ان کے ملک میں عورتوں سے کام لینے کا رواج نہیں تھا۔ اس کی بہنیں، ماں، چاچی، تائی ان کی بیٹیاں غرض کسی بھی طرح کی عورت ذات کام نہیں کرتی تھی اور نہ ہی خاندان کی کوئی دوسری عورت...... اس لیے اب اسے بھی کام کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

''جو حکم میرے عزیز......'' ربیکا عیسیٰ کی گردن میں بازو لپٹتے ہوئے بولی۔ وہ اس کے فیصلے سے خوش ہوئی تھی۔ کام تو دور اگر عیسیٰ اسے کہتا کہ وہ سانس لینا بند کر دے تو ربیکا سانس لینے کو بھی گناہ سمجھتی...... یہ ایسی زندگی تھی جسے وہ خواب میں بھی نہیں سوچ

سکتی تھی اور عیسیٰ ایسا شوہر تھا جو حسن کی دیوی ایفروڈویٹ کو بھی نصیب نہیں ہوا ہوگا۔اس کی آنکھیں عیسیٰ کو دیکھ دیکھ کر نہیں تھکتی تھیں۔جس نئے علاقے میں وہ دونوں شفٹ ہوئے تھے، وہاں قریب وجوار کی انڈین اور پاکستانی عورتیں تلاش کر کے اس نے عیسیٰ کے لیے اس کے دیس کے کھانے بنانے سیکھے تھے۔وہ ان کھانوں کو اس قدر جانفشانی سے بناتی تھی کہ اس کو سکھانے والیاں بھی حیران رہ جاتی تھیں۔

''کسی نے ٹھیک کہا ہے کھانا مہارت سے نہیں محبت سے بنتا ہے۔''

وہ آئے دن عیسیٰ کے لیے اب دیسی کھانے بنانے لگی تھی۔جو اسے بھی عیسیٰ کی محبت میں پسند آنے لگے تھے۔جب سے اسے پتہ چلا تھا کہ عیسیٰ کو بریانی بہت پسند ہے اس نے تب سے ہی ایسی بہت سی کتابیں ڈھونڈنی شروع کر دی تھیں جن میں بریانی کی طرح طرح کی ترکیبیں لکھی ہوئی تھیں۔عیسیٰ جب جب ان کھانوں کو کھا کر ربیکا کی طرف دیکھتا تھا ربیکا کی ساری تھکن دور ہو جاتی تھی۔وہ عیسیٰ کے کام پر جانے کے بعد جلدی سے گھر سمیٹتی تھی اور پھر کھڑکی کے پاس بیٹھ کر اس کا انتظار کیا کرتی تھی۔

دونوں نے اپنے نئے گھر کا نام ''سن شائن'' رکھا تھا۔جس میں ہر وقت سورج چمکتا رہتا تھا۔جو لکڑی سے بنا ہوا تھا اور جہاں چاروں طرف ربیکا کو عیسیٰ کی خوشبو پھیلی محسوس ہوتی تھی۔وہ عیسیٰ کی لماری کھول لیتی اور اس کے کپڑوں میں سے اس کی خوشبو سونگھتی رہتی......اسے گھر میں بند ہو کر عیسیٰ کی راہ تکنا بھی اچھا لگتا تھا۔اور عیسیٰ جتنا مرضی تھکا ہوا ہوتا وہ ربیکا سے ایسے مسکرا کر ملتا تھا کہ جیسے اس کے لیے پہاڑوں سے پھول توڑ کر آیا ہو۔

''یہ ایشیائی دھوکا دیتے ہیں۔''شادی سے پہلے اس کی کتنی ہی دوستوں نے اسے یہ کہتے ہوئے عیسیٰ سے شادی کرنے سے منع کیا تھا اور ربیکا نے سب کی باتوں اور مشوروں کو رد کر دیا تھا۔

''سب ایک جیسے نہیں ہوتے......اگر عیسیٰ نے مجھے دھوکا دیا تو مجھے اس پر دکھ نہیں ہوگا ہاں میں اپنی کوتاہ عقلی پر ماتم ضرور کروں گی۔''ربیکا نے کہا تھا اور اب آنے والے وقت نے ثابت کر دیا تھا عیسیٰ باقی سب کی طرح کا نہیں تھا۔دونوں کی زندگی کا واحد مقصد جیسے ایک دوسرے کو خوش کرنا ہی تھا۔

ربیکا کی زندگی کا ہر دن سہانا تھا۔وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ سہانے دن اب جلد ہی ختم ہونے والے ہیں۔

☆......☆......☆

عیسیٰ نے پاکستان میں کسی کو بھی اپنی شادی کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ربیکا کے پوچھنے پر اس نے بس اتنا ہی کہا کہ اس کا پاکستان میں ایسا کوئی نہیں ہے جس سے وہ پوچھے یا شادی کی اجازت لے۔ماں باپ سمیت سب مر چکے تھے......کیسے اور کب مر چکے تھے اس کے بارے میں نہ کبھی عیسیٰ نے بات کی تھی اور نہ ہی ربیکا نے پوچھا تھا۔شادی کی بات پاکستان میں کسی کو

بتانے یا نہ بتانے پر ربیکا کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔خود اس کے ماں باپ زندہ تھے اور اس نے بھی تو اپنی شادی کے بارے میں ان کو نہیں بتایا تھا۔دونوں بھی کہاں جانتے تھے کہ ان کی بیٹی اپنے دن رات کہاں گزار رہی ہے۔

ایک سال بعد دونوں کے گھر بیٹا پیدا ہوا تھا۔ جسے دیکھتے ہی ربیکا نے کہا تھا۔

''یہ مجھ پر خدا کی رحمت ہے اس لیے اس کا نام میران ہوگا۔لوگوں کو ایک عیسیٰ نہیں ملتا خدا نے مجھے دو دو دے دیئے ہیں۔''

عیسیٰ مسکرا اٹھا۔

میران بالکل اپنے باپ کی کاپی تھا......اس کا ہم شکل......جس کے جسم میں ابھی سے ہی دہقانی بن نمایاں تھا۔

عیسیٰ کے کام پر جانے کے بعد وہ دوسرے عیسیٰ سے دل بہلاتی رہتی تھی۔اسے بناتی، سنوارتی رہتی تھی۔اس کے لیے سویٹر بنتی رہتی تھی۔عیسیٰ سے پاکستانی ماؤں کے قصے سن سن کر وہ خود بھی پاکستانی ماں بن چکی تھی اور وہ اس سب پر خوش تھی۔

چونکہ ربیکا اب کام نہیں کرتی تھی۔اس لئے گھر میں صرف ایک انکم آ رہی تھی۔عیسیٰ کی......ایسے میں میران کی پیدائش بڑھتے اخراجات، لحہ بہ لحہ بدلتی دنیا کے ساتھ مل جانے کی چاہ......ان لوگوں کے مسائل بھی بڑھنے لگے تھے جو درویش صفت تھے۔عیسیٰ پریشان رہنے لگا تھا۔اگرچہ ربیکا اس کے ساتھ ایک جھگی میں بھی گزارا کر سکتی تھی اور ساری زندگی بھوکی رہ کر بھی عیسیٰ کو کچھ نہ کہنے والی تھی لیکن کچھ باتوں کا احساس الہام کی صورت عیسیٰ کو خود سے ہی تھا۔

''اگر تم اجازت دو تو میں بھی کام کوئی کر لیتی ہوں عیسیٰ......کوئی بھی چھوٹا موٹا کام جس پر تمہیں اعتراض نہ ہو۔'' ایک دن ربیکا نے پریشانی عیسیٰ کے گلے سے جھولتے ہوئے کہا تھا۔

''میں اپنی پیاری بیوی سے کیوں کام کرواؤں بھلا......'' اس نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا تھا۔ربیکا موم کی طرح پگھل کر خود میں سمٹی تھی۔

''یہاں سب ہی کام کرتے ہیں عیسیٰ......کیا مرد، کیا عورتیں......''

''کرتے ہوں گے لیکن مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میری نازک بیوی کام کرے......میں چاہتا ہوں کہ وہ بس......'' ربیکا شرما کر رہ گئی تھی۔

''پھر ہم پاکستان شفٹ ہوجاتے ہیں۔سنا ہے وہاں زندگی آسان ہے۔'' ربیکا نے کہہ دیا تھا۔اسے اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ وہ عیسیٰ کے ملک شفٹ ہوجاتی۔وہ تو عیسیٰ کے ساتھ دنیا کے کسی بھی کونے میں رہ سکتی تھی۔ایک محل میں بھی اور ایک قید خانے میں بھی۔

''لیکن میں پاکستان شفٹ نہیں ہوسکتا۔وہ ملک میرا پورا گھرانہ کھا گیا ہے مجھے ہر جگہ اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں کی

قبروں کے ڈھیریاں نظر آتی ہیں۔ پورا پاکستان میرے لیے قبرستان بن چکا ہے۔"

ربیکا احساس جرم کا شکار ہوئی، اس نے عیسیٰ کو اداس کر دیا تھا۔ عیسیٰ نے پہلی بار اپنے بہن بھائیوں کا ذکر کیا تھا وہ بھی اس انداز سے کہ ربیکا مزید کچھ نہیں پوچھ سکتی تھی۔ اسے جیسے خود سے ہی اس بات کا اندازہ تھا کہ عیسیٰ سے اس کے خاندان کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرنا ہے۔

"پھر ہم یہ گھر بیچ کر کوئی کاروبار کر لیتے ہیں۔ انسٹالمنٹ پر نیو گھر لے لیتے ہیں۔" ربیکا نے ایک اور مشورہ دیا جبکہ عیسیٰ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔

"پاکستان میں میرے والد کی جائیداد میں میرا کچھ حصہ بنتا ہے جو میرے چچا کے پاس ہے اگر میں پاکستان جاؤں اور اسے بیچ دوں تو مجھے کافی بڑی رقم مل سکتی ہے۔ جس سے ہم یہاں کسی کاروبار میں حصہ ڈال سکتے ہیں۔ اس طرح ہمیں کچھ آسانی ملے گی۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔" ربیکا نے فوراً کہا تھا۔ اسے عیسیٰ سے ایک دن کی جدائی برداشت نہیں تھی۔

عیسیٰ ربیکا کو اپنے ساتھ لے کر جانا نہیں چاہتا تھا، نہ اسے اپنے خاندان والوں سے ملوا کر اس پر کسی قسم کے طنز کسونا چاہتا تھا، لیکن اسے اپنی انگریز بیوی سے اس قدر محبت تھی کہ وہ اس کی کوئی بات ٹال بھی نہیں سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے رضامندی دے دی تھی۔ ربیکا خوشی خوشی اسی دن سے پاکستان جانے کی تیاری کرنے لگی تھی۔

چند دنوں کے بعد وہ تین افراد پاکستان میں تھے۔

عیسیٰ کے کہنے پر ربیکا نے کچھ شلوار قمیص، دوپٹے اور چادریں خرید لی تھیں۔ امریکا میں عیسیٰ نے کبھی ربیکا کو نہیں کہا تھا کہ وہ ایسا ویسا لباس نہ پہنا کرے۔ لیکن وہ چاہتا تھا کہ یہاں اس کے خاندان میں وہ ایک مثالی بیوی کے طور پر سامنے آئے۔ اس کے خاندان کو عیسیٰ کے فیصلے پر فخر ہونا ہو لیکن اعتراض بھی نہ ہو۔ کوئی ربیکا کو کچھ بھی کہنے کی ہمت نہ کر سکے۔

پاکستان میں ربیکا ویسا ہی لباس پہن رہی تھی جیسا عیسیٰ نے اسے پہننے کو کہا تھا۔ شلوار قمیص کے اوپر، دوپٹا اسکارف لینے کی بارہا مہارت امریکا میں کر چکی تھی اور یہاں اب اس قدر سلیقے سے لے رہی تھی کہ وہاں کی عورتیں بھی اسے مرعوبیت سے دیکھنے لگی تھیں۔ اردو کے کافی جملے بھی اس نے یاد کر لیے تھے جو اس کے منہ سے ادا ہوتے ہوئے اور دلکش ہو جاتے تھے۔ وہ عیسیٰ کے خاندان سے بہت خوش اخلاقی سے ملی تھی۔ وہ لوگ بھی بہت محبت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اور ایک انگریز بہو کو اپنے درمیان پا کر بہت خوش تھے۔ یہ سوچ کر بھی کہ ان کے خاندان کے ایک فرد نے مستقل ایک ترقی کرتے ملک میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ وہ لوگ خوش تھے یا کم از کم خوشی کا اظہار تو کر ہی رہے تھے۔

ان کا پاکستان میں قیام مہینے بھر کا تھا اور عیسیٰ پہلے دن سے اس موقع کی تلاش میں تھا جب وہ، وہ بات کرے جس مقصد کے لئے وہ پاکستان آیا تھا۔ کیونکہ جائیداد کے بکنے اور ہاتھ میں پیسہ آنے میں بھی کافی وقت لگ جانا تھا۔ وہ ایک ایک کرکے پہلے ہی بہت دن ضائع کر چکا تھا۔ اب شاید بات کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ ایک دن رات کے کھانے کے بعد عیسیٰ نے چچا کے سامنے جائیداد میں سے اپنے حصے کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ مطالبہ کرنا عیسیٰ کیلئے کچھ ایسا آسان نہیں تھا۔ اس نے چچا کو تمام صورتحال سے آگاہ کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ چچا اس کی کسی بھی بات کو نافرمانی خیال کریں۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد چچا نے ہی اس کی کفالت کی تھی اور وہ نہ بھی کرتے تو اپنے خاندان کا اس قدر باغی نہ ہو سکتا تھا جو تایا اور چچا کو بھی باپ کا ہی درجہ دیتے ہیں۔

''میں اب ہمیشہ کے لیے امریکا شفٹ ہو جانا چاہتا ہوں۔'' اس لئے مناسب ترین الفاظ میں اپنی مطالبے کی توجیہہ پیش کی تھی۔

چچا رئیس نے بڑی خاموشی اور محبت سے عیسیٰ کی بات سنی تھی۔ خاندان کے باقی افراد کو بھی جیسے عیسیٰ کے اس مطالبے کی توقع نہیں تھی سب چچا کے ردعمل کے انتظار میں تھے کہ وہ جو کہیں گے اس کے بعد سب اپنی اپنی رائے اسی کے مطابق کر لیں گے۔ اگر چچا اسے نافرمانی گردانیں گے تو وہ بھی عیسیٰ پر بولیں گے اور اگر چچا رضامندی دے دیں گے تو وہ بھی اس بات پر خوش ہو جائیں گے۔

چچا رئیس کی خاموشی عیسیٰ پر بہت بھاری گزر رہی تھی۔ بڑے کمرے میں لمبائی کے رخ بچھے بڑے دسترخوان پر ایک طرف مرد تھے اور دوسری عورتیں۔ ربیکا عیسیٰ کے بالکل سامنے بیٹھی تھی اور عیسیٰ کے چہرے پر رقم وحشت واضح طور پر پڑھ سکتی تھی۔ مدھم روشنی میں سب کے چہرے گڈمڈ ہو رہے تھے۔ آتش دان کی لو بھڑک رہی تھی۔ جس نے سب کو جن بھوت بنا کر رکھا ہوا تھا۔

''میں اپنی خاندانی جائیداد نہیں بیچ سکتا۔'' بالآخر خاموشی ٹوٹی۔ چچا رئیس نے کہا تھا عیسیٰ کو کم و بیش اسی بات کی توقع تھی۔

''لیکن...... میں کل ہی زمین کی قیمت نکلوا کر تمہیں تمہارے حصے کی ادائیگی کر دوں گا تاکہ تم اپنی بیوی کے ملک امریکا شفٹ ہو جاؤ اور اپنی زندگی مزید اچھے طریقے سے شروع کر سکو۔'' چا چا رئیس نے مسئلے کا مناسب حل پیش کیا تھا۔ عیسیٰ نے سکھ کا سانس لیا تھا۔ اس چیز کو وہ بہت مشکل سمجھ رہا تھا جو چا چا رئیس کے لچکدار رویے کی بدولت بہت آسان ثابت ہوئی تھی۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ جائیداد میں سے حصے کی بات یقیناً چا چا کو ناگوار گزرے گی، اگر ایسا ہوا بھی تھا تو انہوں نے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ نہ ہی عیسیٰ کو یہ کہا تھا کہ وہ اپنے ملک واپس آ جائے، اپنے باپ کے حصے کی زمین پر کام کرے۔ جیسے دوسرے لوگ کر رہے تھے۔ انہوں نے وہی کیا تھا جیسا عیسیٰ چاہتا تھا۔ ربیکا بھی اس بڑے مسئلے کے جلد حل ہو جانے پر خوش تھی۔

''زمین کی قیمت تو کل ہی نکل آئے گی لیکن رقم کا انتظام کرنے میں کچھ دن لگ سکتے ہیں میرے بیٹے......'' انہوں نے

بہت پیار سے کہا تھا۔عیسی نہال ہو گیا تھا۔

''ٹھیک ہے چاچا جانی۔ہم ابھی مزید پندرہ بیس روز پاکستان میں ہی ہیں۔'' عیسٰی نے بھی جواباً کہا تھا۔ باقی کا کھانا خاموشی سے کھایا گیا تھا۔

اگلے دن زمین کی قیمت نکلوالی گئی تھی جو اس قدر زیادہ تھی کہ عیسٰی کو یقین ہی نہیں آیا کہ وہ اپنے باپ کے اتنے بڑے حصہ کا مالک ہے اور یہ رقم جلد ہی اسے ملنے والی ہے۔ وہ رقم اس قدر زیادہ تھی کہ امریکہ میں وہ جو دل کرتا کام شروع کر سکتے تھے۔عیسٰی نے پیسوں کو امریکی ڈالر میں منتقل کر کے ربیکا کو اصل رقم بتائی تھی۔اور ربیکا عیسٰی کی گردن سے جھول جھول گئی۔اسے بھی عیسٰی کی طرح بڑے لمحے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ وہ دونوں جلدی اتنی بڑی رقم کے مالک بننے والے ہیں۔

وہ امریکہ جا کر ان پیسوں سے بہت بہتر بلکہ بہترین زندگی شروع کر سکتے تھے۔خیالوں ہی خیالوں میں وہ روشن مستقبل کے پلان بنانے لگی تھی۔ وہ کہاں گھر لے گی۔اس کی کیسی ڈیکوریشن کرے گی۔ کیسے صوفے، کیسے پردے، کیسا کچن...... وہ اس قدر خوش تھی کہ اگر خوشی سے ماں بنا جاتا تو وہ دنیا کی آبادی میں بے تحاشہ اضافے کا سبب بن جاتی، خدا نے اسے ایک سال میں ہی سب کچھ دے دیا تھا۔ایک پیار کرنے والا شوہر، ایک پیارا سا بیٹا اور اب محفوظ معاش بھی...... وہ ہر طرح سے مطمئن تھی اور سکون سے سپنے بن رہی تھی۔نہیں جانتی تھی کہ وہ سپنے تو بدہضمی والے سپنے تھے۔ جو ایک دم سے ڈرا کر رکھ دیتے ہیں اور منہ میں کڑوا ذائقہ گھول دیتے ہیں۔

☆......☆......☆

رات میں جھینگر بھید بھری سرگوشیاں کر رہے تھے۔تیتری جس کی بابت مشہور ہے کہ خدا کی ثناء کرتی ہے وہ بھی اس رات جھوم جھوم کر حمد پڑھ رہی تھی۔پھر بھی ربیکا کو نیند نہیں آ رہی تھی نہ جانے کون سی بے چینی تھی جو خواب کی صورت اسے آنے والے حالات کے لئے تیار کر رہی تھی۔عیسٰی باہر اپنے چاچا کے ساتھ بات چیت کر رہا تھا۔اس نے اسے کہا تھا کہ میران کو لے کر اندر سونے چلی جائے۔ وہ اندر آ گئی تھی۔عیسٰی نہیں آیا تھا۔اب نیند میں وہ بستر پر ہاتھ مار رہی تھی۔عیسٰی وہاں نہیں تھا۔وہ خواب میں ہی عیسٰی کی عدم موجودگی سے پریشان ہو رہی تھی اور خواب میں ہی عیسٰی عیسٰی کہتی اسے تلاش کر رہی تھی۔سردی کے باوجود اس کے ماتھے پر پسینہ تھا۔ساتھ لیٹے ہوئے میران کو اس نے اتنی شدت سے خود میں لپیٹ رکھا تھا کہ ننھا میران بھی نیند میں کسمسا رہا تھا۔دونوں بے چین ہو رہے تھے اور اس بے چینی کی کوئی وجہ نہیں تھی۔بعض اوقات قدرت آنے والے وقت کے لیے انسان کو بڑے پیار سے تیار کرتی ہے تا کہ وہ برا وقت سہہ جائے۔لیکن برا وقت آنے پر انسان ادھ موا ہو جاتا ہے ایک دکھ کی وجہ سے...... ایک قدرت کی سازش کی وجہ سے......

''عیسیٰ......عیسیٰ۔'' وہ نیند میں کہہ رہی تھی اور پریشان ہو رہی تھی۔

''ربیکا......ربیکا......'' عیسیٰ نے اسے عجلت میں اٹھایا تھا۔

''کیا ہوا ہے؟'' ربیکا جھٹکے سے اٹھی تھی۔ خواب کی تلاش پوری ہو چکی تھی۔ عیسیٰ اس کے سامنے تھا۔ لیکن......وہ اپنا رنگ وروپ کہاں چھوڑ آیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر عیسیٰ کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

''عیسیٰ کیا ہوا تمہیں......تم اس قدر پریشان......'' ربیکا کا دل ہول کر رہ گیا تھا۔

''میں کہتا ہوں کوئی سوال نہ کرو......بس جلدی کرو......دیر نہ کرو......ہمیں یہاں سے فوراً نکلنا ہے۔'' عیسیٰ نے ایسے لہجے اور ایسے انداز میں کہا تھا کہ ربیکا کو اس کی آواز میں خطرے کی بو آئی تھی۔ وہ اس طرح افراتفری میں اٹھ تو گئی تھی لیکن اپنے حواس بحال نہیں کر پائی تھی۔

''ربیکا......'' عیسیٰ نے اسے جھنجھوڑا تھا اس نے مزید اور کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ جلدی سے اپنا سوٹ کیس پکڑ کر اس میں تھوڑا بہت سامان ڈالنا شروع کر دیا۔

''اس سب کا وقت نہیں ہے۔ بس اپنا پاسپورٹ پکڑو اور جتنے بھی پیسے ہیں وہ سب......'' عیسیٰ نے ربیکا کے ہاتھ سے سب چھین لیا تھا۔ خود وہ دراز میں سے پستول نکالنے لگا تھا۔ عیسیٰ کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر ربیکا کی جان نکل گئی تھی۔ عیسیٰ نے اسے بت بنے دیکھا تھا اور کندھے سے پکڑ کر ایک بار پھر سے جھنجھوڑا تھا۔

''ایک لمحہ بھی ضائع مت کرو ربیکا......'' اس نے تیز لہجے میں کہا تھا۔ ربیکا نے ویسا ہی کیا جیسا عیسیٰ نے کہا تھا۔ لمبی چادر اوڑھ کر اس نے پاسپورٹ اور سوئے ہوئے میران کو اٹھایا تھا اور عیسیٰ کی تقلید میں کمرے کی کھڑکی پھلانگ گئی تھی۔

رات کے ظرف میں ایک چاند تھا۔ اور وہ چاند اتنا تھڑ ولا تھا کہ اپنی چاندنی بس اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا۔

عیسیٰ اسے لے کر مالٹے کے باغات میں سے ہوتا ہوا بھاگے جا رہا تھا۔ ربیکا کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا پھر بھی وہ سمجھ سکتی تھی کہ اس کا محبوب کسی خطرے میں ہے۔ اسے خود کی تو کوئی فکر ہی نہیں تھی لیکن عیسیٰ پر ایک خراش کے بدلے میں وہ اپنے ہزار جنم بھی قربان کر سکتی تھی۔

نیند سے اٹھ کر تیز بھاگنے سے اس کا سانس جلد ہی پھول گیا تھا۔ حواس جواب دے رہے تھے۔ نیند سے جا کر ایک دم سے بھاگنا شروع کر دینا آسان نہیں تھا۔ جو خطرہ وہ محسوس کر رہی تھی اس نے اس پر وحشت طاری کر دی تھی۔ رات، سناٹا، جھینگر، تیتری کی بھیانک آواز......وہ بری طرح خوفزدہ ہو گئی تھی۔

''ہوا کیا ہے عیسیٰ......مجھے کچھ تو بتاؤ......'' بھاگتے بھاگتے اس نے ہانپتے ہوئے پوچھا تھا۔

''اگر یہاں سے نکلنے میں ایک منٹ کی بھی دیر کی تو ہم سب مارے جائیں گے۔'' عیسیٰ نے تیز تیز بھاگتے ہوئے اسے کہا۔ ربیکا مزید خوفزدہ ہوگئی اور اس نے اور تیز بھاگنا شروع کر دیا۔ کیا جائیداد کا وہ معاملہ جو سمجھتی تھی کہ آسانی سے حل ہوگیا تو وہ اور زیادہ پیچیدہ ہوگیا تھا۔

''لیکن کیوں...... چاچا رئیس کہاں ہیں......''

''چاچا رئیس ہی تو......'' عیسیٰ کی بات اس کے منہ میں ہی رہ گئی تھی۔ دفعتاً فضا میں فائر کی آواز گونجی تھی۔ سناٹا دور تک پھٹتا چلا گیا تھا۔ اور پھر دوسرا فائر ہوا تھا اور پھر تیسرا......عیسیٰ لڑکھڑا کر گرا تھا۔ تین میں سے کوئی ایک گولی اسے لگی تھی۔

''آہ......'' درد، خوف اور ہار سے ملی جلی عیسیٰ کی آواز برآمد ہوئی تھی۔

''عیسیٰ......'' اور اگلے ہی پل ربیکا کی چیخ بلند ہوئی۔ یہ چیخ اتنی بلند تھی کہ رات کے سناٹے میں چاند پر بھی جا سکتی تھی۔ یہ چیخ گولی کی آواز سے بھی کہیں بلند تھی۔ وہ چکرا کر لڑکھڑا کر گرتے عیسیٰ پر جھکی تھی۔

گولی عیسیٰ کے سینے پر لگی تھی اور اس ایک گولی نے عیسیٰ کی ہمت چھین لی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اب اس کے پاس چند ہی لمحے بچے ہیں۔ لمحے بھر میں اس کا لباس خون سے رنگ گیا تھا۔ بے مہر چاند آشکار ہو چکا تھا۔ جو تب ان کی مدد نہیں کر رہا تھا اب زخموں کو کھول کر دکھانے لگا تھا۔ ربیکا کا اندر باہر آنسو سے بھیگ گیا تھا۔

''میری پیاری ربیکا......'' وہ آہوں میں بولا تھا۔

''عیسیٰ......'' ربیکا نے وہاں ہی بیٹھ کر رونا شروع کر دیا تھا۔ میران کو ٹھنڈے گھاس پر لٹا کر دونوں ہاتھوں سے عیسیٰ کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ عیسیٰ نے بھی اس کے ہاتھ تھام لئے تھے۔

''وہ لوگ قریب آرہے ہیں ربیکا......میران کو لے کر یہاں سے جاؤ......نہر کو پار کر کے ڈولی کی رسی کاٹ دینا......''

''میں نہیں جاؤنگی۔'' ربیکا نے بری طرح سے انکار میں سر ہلایا۔ وہ بے بسی سے رونے لگی تھی۔

''میران کے لے جاؤ یہاں سے...... ہمارے بچے کے لیے......'' عیسیٰ جانتا تھا کہ ربیکا کو خدا کے علاوہ کوئی طاقت یہاں سے نہیں ہلا سکتی اس لئے اس نے میران کا واسطہ دیا تھا۔

''نہیں...... ہرگز نہیں......تمہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ چاہے وہ مجھے قتل کر دیں۔'' اس کے آنسو عیسیٰ کا چہرہ بھگونے لگے تھے۔

''ربیکا......'' عیسیٰ نے ہولے سے اس کا نام لیا تھا۔ ربیکا تڑپ سی گئی۔

''میں آؤں گا......لیکن ابھی یہاں سے جاؤ۔'' عیسیٰ نے کہا اور ایسے کہا کہ وہ پھپک پھپک کر رونے لگی۔

''عیسیٰ......میں کیسے جاؤں۔''

''ہمارے بچے کے لے جاؤ ربیکا......''عیسیٰ نے کہا تھا اور یہ دیکھ کر کہ ربیکا کچھ نرم ہوئی ہے اپنے ہاتھوں کی ہمت جمع کر کے اس کا چہرہ اپنے چہرے کے قریب کیا تھا۔

''مجھے بوسہ دو ربیکا......''عیسیٰ نے کہا تھا۔ ہوا جامد ہوگئی تھی۔ کسم کے پھل جلنے لگے، تیز کثیف ناگوار بو چاروں طرف چھا گئی۔ ربیکا کی جان نکل کر اس کے پیر کے انگوٹھے تک آ گئی تھی۔

''میں مر جاؤں گی عیسیٰ......''اس سے الگ ہوتے ہوئے وہ بولی۔

''وعدہ کرتا ہوں......میں آؤں گا۔ کسی بھی روپ میں......خدا اتنا ناانصاف نہیں ہوسکتا......''وہ آسمان کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''عیسیٰ......''

''جاؤ، وہ لوگ قریب آ رہے ہیں۔ میں ان کو روکتا ہوں نہر پار کر جاؤ۔ رسی کاٹ دینا......''عیسیٰ نے اسے ایک چاقو پکڑ ایا تھا۔ ربیکا اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ لیکن ابھی بھی جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔

''ربیکا......''سانسوں کی سرگم میں آواز برآمد ہوئی۔

''میں آؤں گا وعدہ کرتا ہوں۔ اب جاؤ......''عیسیٰ نے پیار سے کہا تھا۔

ربیکا نے روتے ہوئے نہر پار کی تھی اور رسی کو چاقو سے کاٹ دیا۔ ڈولی جھولتی ہوئی نیچے گر گئی تھی۔ لمحے کی دیر ہوئی۔ وہ لوگ قریب تھے اور اب فائرنگ کر رہے تھے۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ فائر کون کر رہا تھا۔ کیا عیسیٰ پر مزید گولیاں چلائی جا رہی تھیں یا عیسیٰ ان لوگوں پر فائر کر رہا تھا۔ رات میں جھینگروں کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔ تیتری جس کی بابت مشہور ہے کہ خدا کی ثنا کرتی ہے وہ بھی اس رات جیسے آہ و پکار کرنے بیٹھ گئی تھی۔

☆......☆......☆

روتے روتے ربیکا بڑی سڑک پر آ گئی۔ لمبی سڑک کہاں کو جا رہی تھی اور ربیکا کو کدھر جانا تھا۔ دونوں ہی جیسے اس بات سے انجان تھے۔ رات کا اندھیرا صبح میں بدل رہا تھا۔ جب اسے ایک ٹرک کی مدد ملی۔ ایک لمبا سفر کر کے وہ بڑے شہر جا کر امریکن ایمبسی گئی۔ اس کے محبوب کی جان کو خطرہ تھا۔ اسے ایک لمحہ کی بھی دیر نہیں کرنی تھی۔ کیا اب جلدی کا کوئی فائدہ تھا۔ نہیں......وہ اس رخ پر تو سوچنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

اگلے پورے ایک ماہ تک عیسیٰ کو تلاش کیا جاتا رہا۔ لیکن عیسیٰ کا کچھ پتہ نہیں چل سکا تھا۔ نہ اس کی لاش مل سکی تھی اور نہ ہی وہ خود......جس حویلی میں ان تینوں نے کم از کم بیس روز قیام کیا تھا اس کے در و دیوار کے علاوہ ایک ایک چیز بدل گئی تھی۔ حتیٰ کہ مکین

بھی......اب جو خاندان وہاں پر رہائش پذیر تھا نہ ربیکا انہیں جانتی تھی اور نہ وہ ربیکا کو......

"یہاں کوئی اور خاندان آباد تھا۔رئیس کا خاندان......" وہ چلا چلا کر ادھ موئی ہو گئی تھی۔سارے گاؤں کی گواہی نے اسے جھوٹا قرار دے دیا تھا جب انہوں نے کہا تھا کہ اس حویلی میں یہی خاندان پچھلے تیس برسوں سے رہائش پذیر ہے اور تمام مالٹے کے باغات اسی خاندان کے ہیں۔

ربیکا دھک سے رہ گئی تھی۔وہ جانتی تھی اس کی دنیا کو لوٹ لیا گیا ہے۔بہت ہی بے دردی کے ساتھ اور بہت ہی چلا کی سے عیسیٰ کے خاندان کا ملنا تو دور کی بات وہاں کسی ایک شناسا بندے کو بھی نہیں دیکھ پائی تھی۔پولیس کو بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ گاؤں والوں کا یقین کریں یا ربیکا کا، جو عیسیٰ کی تلاش، اس کی ممکنہ جدائی کے خدشے سے لرزاں دیوانی نظر آتی۔

"واپس چلی جاؤ یہاں سے۔" ایک دن اس کی کار کے دروازے پر کسی فقیر نے دھپ سے ہاتھ رکھ کر اس کے کان کے پاس آ کر سرگوشی کی تھی۔ربیکا چونکی۔"وہ تمہیں اس کے روپ میں مل تو گیا ہے اسی پر قانع ہو جاؤ......" فقیر نے میران کی طرف اشارہ کیا۔ربیکا نے اسے کوئی مشرقی دعا سمجھی تھی۔"وہ تم سے یہ بھی چھین لیں گے۔اس سے پہلے یہاں سے چلی جاؤ۔" ربیکا نے روتے ہوئے اس درویش کے ہاتھ چوم لیتے تھے۔

"کیا وہ مر گیا ہے؟" اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا تھا۔"کیا عیسیٰ مر گیا ہے؟"

"تمہارا ایمان کیا کہتا ہے؟ کیا عیسیٰ مر گیا ہے؟" فقیر نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا تھا۔

"میرا ایمان......؟ ربیکا اس غیر متوقع سوال پر حیران ہوئی تھی۔اسے فقیر سے اس بات کی توقع ہرگز نہیں تھی۔لیکن پھر اگلے ہی پل اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔"میرا ایمان تو نہیں......لیکن عیسیٰ کا ایمان کہتا ہے کہ عیسیٰ (پیغمبر) نے ابھی واپس آنا ہے۔"

"تو پھر جاؤ اور جا کر انتظار کرو......"

اور اگلے دن ربیکا واپس امریکا آ گئی۔

☆......☆......☆

چونے اور مٹی میں دو قدریں مشترک ہیں۔کورا پن اور کھوکھلا پن......اور جس میں یہ دونوں وصف ہوتے ہیں وہ بیک وقت شر بھی ہوتا ہے اور خیر بھی......مقدس بھی، ناپاک بھی، پاکیزہ بھی اور......اور غلیظ بھی......

کورے پر جو بھی لکھا جائے وہ ویسی ہی تقدیر پا لیتا ہے۔بسم اللہ لکھ دی جائے تو مقدس ہو جاتا ہے۔کفر لکھ دیا جائے تو ناپاک......

کھوکھلے کو جس چیز سے بھی بھر دیں وہ بھی ویسا ہی بن جاتا ہے۔عطر بھر دو تو تاقچوں میں سجا دیا جاتا ہے۔پیک دان

بنا دوں تو غلیظ ہو جاتا ہے۔

مٹی میں جو بیج ڈالا جائے وہ اسی کی فصل اگاتی ہے۔ چونے میں جو رنگ ڈالا جائے وہ اس کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ دونوں ہی احتجاج نہیں کرتے، دونوں ہی جیسے انسان کی خدمت کے لیے بنے ہوئے ہیں۔ آپ انہیں جیسا چاہتے ہیں یہ ویسے ہی بن جاتے ہیں۔

مٹی یہ نہیں کہتی کہ وہ اس بیج کو قبول نہیں کر سکتی...... اسے صرف گندم اگانی ہے یا چاول...... وہ دوزخ کا پودا تھور بھی اگاتی ہے اور جنت کا پھل انار بھی......

چونا بھی اس رنگ کو رد نہیں کرتا جو آپ اسے دیتے ہیں۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ اس کا پسندیدہ رنگ تو لال ہے یا پیلا اور دل چھوتا قالب ایک آب خورہ یا صراحی...... وہ اس بات کو اہمیت دیتا ہے کہ انسان کیا چاہتا ہے۔ وہ اسے کس قالب میں دیکھنا چاہتا ہے۔ قرآن کی رحل کی شکل میں یا بھیڑیے کے سر کے روپ میں...... اور وہ اسے کونسا رنگ دے رہا ہے شہابی رنگ، جو فتح سے مزین ہے۔ شیامی، جو وصل کے سے منسلک ہے۔ کسم...... جو اشارہ کرتا ہے کسی کے قتل کی طرف...... یا سیاہ رنگ...... جو ظاہر کرتا ہے کہ یہاں کوئی بھید ہے۔

بھید...... اچھا یا برا......

☆......☆......☆

آدھی گزری رات میں رہزنوں کی بانگیں تھیں۔ روشنی والے رہبر ستارے دم سادھے بیٹھے تھے۔ قافلہ لٹنے کے لئے تیار تھا۔ تاریکی اس قدر بڑھ چکی تھی کہ رات کے رنگ اس کے سامنے پھیکے پڑنے لگے تھے۔ جب یہ وقت آن پڑتا ہے تو انسان سب ورد، وظیفے بھول جاتا ہے۔ کسی پرواہ کی گنجائش باقی نہیں بچتی، کوئی وسوسہ چونکانے نہیں آتا، کوئی وہم نہیں ستاتا۔ اس کے پاس صرف اس کی ذات ہوتی ہے اور لامتناہی خالی پن...... ایسے وقت میں کی گئی عبادت پتھر پر ضرب ہوتی ہے اور گناہ شعور پر گہرا نشان......

مٹی کے پرانے بڑے سے قدح (پیالے) میں چونے کا پہاڑ بنا کر اس نے ہاتھ سے درمیان میں ایک گڑھا بنایا تھا۔ کائنات کے عظیم گڑھے جیسا، جس کے بارے میں سائنس دان قیاس آرائیاں کرتے ہیں کہ دنیا کا سب ختم ہو کر وہاں چلا جاتا ہے اور وہ سب نگل لیتا ہے۔ چونے کا یہ گڑھا بھی سب نگلنے والا تھا۔ اس کی بری تقدیر، اس کی سیاہ قسمت، اس کی محرومیاں، اس کے دکھ، غم سب کچھ...... وہ جانتی تھی۔ بس یہ نہیں جانتی تھی کہ خوشیاں بھی، راحت بھی، سکون بھی......

تسلے سے پانی کا ڈونگا بھر کر وہ آہستہ آہستہ گڑھے کے اوپر انڈیلتے ہوئے اسے بھرنے لگی۔ بلوری پانی کی دھار پھیکے چاند کی بے رس چاندنی میں چمکتی تھی۔ جس نے چونے کے ساتھ سنگم کرتے ہی سطح کو جھاگ دار کر دیا تھا۔ جیسے وسیع سمندر پر خوف

ناک طوفانی لہروں کا رقص......قدح جھاگ سے بھر گیا تھا پھر جوں جوں پانی نیچے جاتے ہوئے چونے کو جذب کر رہا تھا توں توں بھاپ اڑنے لگی تھی۔ چونا گرم ہو رہا تھا۔ بھاپ اڑ رہی تھی۔ کوہ آتش فشاں کی بھاپ......سوکھی لکڑی کے شعلے چٹخنے کی آواز پیدا ہونے لگی تھیں۔ جیسے قدح کے بھیتر کوئی جادوگرنی آہ و پکار کر رہی ہو۔ ایسے موقع پر وہ قدح سے دور ہو جاتی تھی۔ اسے ڈر لگتا تھا، بابا بھی اسے دور ہو جانے کی تلقین کیا کرتے تھے۔ مبادہ چونے کی گرد آنکھ میں نہ چلی جائے۔ لیکن آج اسے کوئی ڈر نہیں لگ رہا تھا۔ آج گرد اس کے دماغ پر سوار ہو چکی تھی۔

تھوڑی دیر میں چونا ٹھنڈا ہو گیا۔ رقیق مائع بن گیا۔ اس نے پاس پڑی پرانی ڈوئی کو قدح میں ڈالا اور ہولے ہولے گھمانا شروع کر دیا۔ وہ دونوں کو یکجا کر رہی تھی۔ پانی اور چونے کا ملاپ کر رہی تھی۔ گناہ اور ثواب کا بھی......نیکی اور بدی کا بھی......دونوں اس طرح مل رہے تھے کہ اب الگ کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔

"آپ اس چونے کو الماس برادہ کہتے رہے ہیں ناں بابا......اب میں آپ کو بتاؤں گی کہ اس برادے کو الماس میں کیسے بدلنا ہے۔ چونا واقعی میں "ناگ منی" ہے۔ بس اس کی چمک کو پیچھے سے دیکھنا پڑتا ہے۔ سامنے سے دیکھو تو یہ اندھا کر دیتی ہے۔"

ڈوئی سے چونے کو یکجا کرتے ہوئے اس نے خود سے کہا تھا اور اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کی......جو کچھ ایسا بھی آسان نہیں تھا اور کچھ کم تکلیف دہ بھی نہیں تھا۔ چونے اور پانی کے ملاپ کے ساتھ ساتھ وہ اپنی خوش قسمتی اور بدقسمتی کو بھی ملا رہی تھی۔ کوئی ایک چیز نکل کر سامنے آنا تھی۔ کھولا اور کورا چونا ان میں سے کوئی ایک روپ لینے والا تھا۔

شر یا خیر......مقدس یا ناپاک.......پاکیزہ یا غلیظ......

لکڑی کے تختے پر سانچہ پھیلا کر اس نے پرانے چمچے سے چونے کو سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی تھی۔ کوشش کامیاب رہی تھی۔ سانچے کی سطح لمحہ بہ لمحہ اونچی ہونے لگی تھی۔ سانچہ بھرنے لگا تھا۔ ڈینی کے دیے حشیش سے بھرے ہوئے کیپسولز کو اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ سانچوں میں چونے کی سطح کے نیچے دفن کیا۔ سانچہ بھر گیا تھا۔ وہ بڑی دیر تک سانچے کو دیکھتی رہی تھی۔ پھر جیسے وہ اپنے فعل سے ڈر کر چونکی اور یکدم سے اندر کو بھاگی۔ باقی کا چونا اس نے قدح میں ہی پڑا رہنے دیا تھا جو رات ہی رات میں جم کر اسکے کام بڑھا سکتا تھا۔ لیکن وہ اسے استعمال کرنے یا دھونے کے بجائے اپنی چارپائی پر دبک کر لیٹ گئی تھی۔

رات کے رنگ سنہری تھے۔ ہر سو ستارے جھلملا رہے تھے۔ ساتھ کی چارپائی پر بابا سو رہے تھے اور اس سے آگے چھوٹی زویا......وہ سونے کے لئے اپنے کمرے میں نہیں گئی تھی بلکہ بابا اور زویا کے ساتھ ہی لیٹ گئی تھی۔ آج اسے ڈر لگ رہا تھا جبکہ وہ تو کبھی نہیں ڈرتی تھی۔ بچپن میں اماں فیکٹری چلی جاتی تھی۔ بابا بھی کبھی کبھی گھر سے باہر نکل جاتے تھے۔ اس کا سارا ڈر تو تنہائی نے ہی ختم کر دیا تھا۔ پھر آج سب کے ساتھ ہوتے ہوئے وہ کیوں ڈر رہی تھی۔

آرٹ کالج کے باغ میں کھلے موتیا، گلاب اور رات کی رانی کے پھولوں کی مہک کی لپٹیں دور دور تک پھیل رہی تھیں۔ پورا گن پت روڈ مہک رہا تھا۔لیکن اس سے میو ہسپتال کے مردہ خانے سے آتی کافور اور کیمیکل کی بو پریشان کر رہی تھی۔ وہ بچپن سے ہی اس جگہ جانے سے ڈرتی تھی۔ اسے عجیب وحشت ہوتی ہے۔ایک روز محلے میں سب گیند بلا کھیل رہے تھے۔کھیل کے دوران گیند مردہ خانے کی وحشت زدہ عمارت کے اندر چلی گئی تھی اور گیند واپس لانے کا قرعہ اس کے نام کا نکلا تھا۔بچوں نے ٹوٹے جنگلے سے اسے اندر بھیج دیا تھا اور اس کی واپسی چیخوں کے ساتھ ہوئی تھی۔اس روز کے بعد اس نے کبھی وہاں کا رخ نہیں کیا تھا۔انارکلی بازار جاتے ہوئے بھی وہ دوسرے راستے کا انتخاب کیا کرتی تھی۔لیکن آج جیسے اس کی چارپائی کو کسی نے گھسیٹ کر اس مردہ خانے میں رکھ چھوڑا تھا۔وحشت سے اس کا دل پھٹنے پر آ گیا تھا۔اسے سخت نیند آ رہی تھی لیکن اس کم بخت دل کی دھڑکن سنبھلتی تو وہ سوتی......

''اب چھوٹی کا علاج ہو جائے گا۔'' اس نے دھیان بدلنے کے لیے اور اپنے منفی ضمیر کو مثبت رخ کی طرف لگانے کے لئے سوچنا شروع کیا۔''میں بابا کو یہ ہی کام کروادوں گی۔ہم ایک کارخانہ لگا لیں گے۔میں اس گھر کو دوبارہ خرید لوگی۔''

نیند سے اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

''ہاں! اب سب خواب پورے ہو جائیں گے۔بس چند ہفتوں کی ہی تو بات ہے۔میں کسی اچھے سے کالج میں داخلہ لے لوں گی۔اماں کی قبر کو پکا بھی کرواؤں گی۔'' وہ جانتی تھی کہ اب بس جلدی ہی سب بدل جائے گا۔جو کام اس نے کیا تھا وہ اس سے مطمئن تھی۔بہت مطمئن......پھر اسے نیند کیوں نہیں آ رہی تھی اور وہ یہ سب کیوں سوچے جا رہی تھی؟

نیند لانے کے لئے اس نے زبردستی اپنی آنکھیں بند کر لیں۔اخیر مہینے کا گھٹتا چاند اماوس کی راتوں کی طرف مائل تھا اور جیسے ابھی سے اس کا اہتمام کر رہا تھا۔روشندان سے آتی سیاہ چاندنی ایسی لرزہ خیز تھی کہ اس کے اندر کوئی بھیڑیا غرانے لگا تھا۔

آج سبین نے طغرے کو اسی طرح تیار کیا تھا جیسے وہ کبھی بچپن میں تیار کرتی تھی۔پرخلوص محبت کے ساتھ......آج اسے چونے سے نفرت کا احساس نہیں ہوا تھا جو ان کی زندگیاں نگل گیا تھا۔کیونکہ اب یہ ہی چونا انہیں نئی زندگی بھی دینے والا تھا۔

رات کے نامعلوم کس پہر سوچتے سوچتے وہ سونے لگ گئی تھی کیونکہ سخت نیند آ رہی تھی۔

''سبین......اٹھ جاؤ......'' بابا نجانے کب اٹھ گئے تھے اور اب اسے اٹھا رہے تھے۔لیکن وہ تو جاگ رہی تھی ابھی سوئی ہی نہیں تھی۔نیند سے تو اسکی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔کیا وہ سوئی نہیں تھی؟ کیا وہ سو نہیں سکی تھی؟

''دن چڑھنے والا ہے......اٹھ جاؤ......'' بابا نے نماز کے لئے وضو کرتے ہوئے پھر سے صدا لگائی تھی اور ساری رات کی جاگتی ہوئی سبین ایک بار پھر سے اٹھ گئی تھی۔

☆......☆......☆

''تمہارا ایمان کیا کہتا ہے؟ کیا عیسیٰ مر گیا ہے؟''

''میرا ایمان تو نہیں لیکن عیسیٰ کا ایمان کہتا ہے کہ (پیغمبر) نے ابھی واپس آنا ہے۔''

''تو پھر جاؤ اور انتظار کرو۔'' اور ربیکا انتظار کرنے لگی تھی۔

''عیسیٰ مر چکا ہے۔'' یہ باتیں انسانوں سمیت کائنات کے فرشتے بھی اسے ماننے کے لیے آمادہ نہیں کر سکتے تھے جبکہ اس نے خود دیکھا تھا۔عیسیٰ کے دل کی طرف گولی لگتے ہوئے۔ماس چیر کر دل تک جاتی ہوئی گولی......جس نے عیسیٰ کا موٹا لباس فوراً خون سے تر بتر کر دیا تھا اور ربیکا کی روح چھلنی چھلنی......سب یاد تھا۔سارا منظر......تمام تر جزئیات کے ساتھ......عیسیٰ کا آہ بھر کر لڑکھڑا کر گرنا اور پھر آخری سانس لیتے ہوئے بھی......لیکن اسے فقیر اور عیسیٰ دونوں کی باتوں پر ایمان ہو گیا تھا۔

''وعدہ کرتا ہوں......میں آؤں گا کسی بھی روپ میں......خدا اتنا نا انصاف نہیں ہو سکتا۔''

عیسیٰ جھوٹ نہیں بولتا تھا۔اسے جھوٹ سے نفرت تھی۔وہ جانتی تھی کہ وہ اس سے جھوٹا وعدہ نہیں کر سکتا تھا۔وہ آئے گا۔ضرور آئے گا۔وہ ہر آس، ہر آہٹ پر عیسیٰ کی آمد کی منتظر تھی۔وہ اس بوسے کے دلفریب احساس سے پھر گزرنا چاہتی تھی جو انہیں الوداعی ملاقات پر دیا گیا تھا۔وہ اس بوسے کو الوداع ہی تو نہیں سمجھ رہی تھی۔وہ کہاں مان رہی تھی کہ عیسیٰ مر گیا۔وہ تو سمجھ رہی تھی کہ عیسیٰ گم ہو گیا ہے۔اس کے خاندان والوں نے اسے گم کر دیا ہے۔روپوش کر دیا ہے۔بھلا کوئی اپنے خون کو کیسے قتل کر سکتا ہے۔وہ بھی صرف جائیداد کے لئے......نہیں،وہ صرف عیسیٰ سے ناراض ہو گئے ہیں۔جیسے ہی راضی ہوں گے اسے امریکہ واپس بھیج دیں گے۔

پھر دن بدن ربیکا کی حالت ابتر ہوتی چلی گئی تھی۔

وہ عیسیٰ کی تصویریں نکال نکال کر دیکھا کرتی تھی۔ان تصویروں کو اپنے سینے کے ساتھ لگا کر بھینچتی تھی۔ان کو اپنے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ لگاتی تھی۔ان تصویروں کو اتنی بار نکال کر دیکھا گیا تھا اور ان کو اپنے آنسوؤں میں اس قدر شریک بنایا گیا تھا کہ تصویروں میں موجود عیسیٰ کی تشبیہہ مٹ کر رہ گئی تھی۔کوئی تیسرا ان تصویروں کو دیکھ کر اندازہ بھی نہیں لگا سکتا تھا کہ ان میں ایک بھرپور مرد کبھی موجود تھا۔

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں آؤں گا۔'' گھر کی خاموشی میں اس بات کا الارم بجتا رہتا تھا اور وہ سن سن کر باہر کی دنیا سے بہری ہو رہی تھی۔

''خدا اتنا نا انصاف نہیں ہو سکتا۔اسے آنا ہو گا۔میں مرتے دم تک اس کا انتظار کروں گی۔وہ آئے گا۔ہاں......وہ آئے گا۔مجھے اس بات پر اتنا ہی یقین ہے جتنا اے خدا تیری ذات پر۔'' وہ روتے ہوئے خدا کے آگے گڑگڑاتی تھی۔

''اور اگر وہ نہ آیا تو میرا تجھ پر سے بھی اعتبار اٹھ جائے گا اے خدا!''

عیسیٰ کی موت کے بعد ربیکا کی واحد زندگی مختلف ادوار میں بٹ گئی تھی۔

ایک لمبا عرصہ وہ بہت زیادہ مذہبی رہی تھی۔ وہ دن رات عبادت گاہوں میں گزارتی تھی۔ صبح چرچ کھلنے سے بہت پہلے ہی وہاں موجود ہوتی اور پھر رات گئے نکلا کرتی، وہ مسجدوں میں جاتی، ان کے ساتھ عیسیٰ کے مذہب کی عبادت کرتی، نماز پڑھتی، دعا مانگتی۔

وہ رو رو کر خدا سے کہتی تھی کہ وہ اسے ایک بار عیسیٰ سے ملوا دے۔ وہ عیسیٰ کے خدا کو عیسیٰ کے واسطے دیتی، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ دیتی، دو نبیوں کے واسطے دے کر وہ ایک انسان کو پانا چاہتی تھی۔ ایک مرے ہوئے انسان کو جس کو مرا ہوا ماننے کو اس کا دل راضی ہی نہیں ہوتا تھا۔

ربیکا خدا کو طرح طرح کے لالچ دیتی۔ عبادت کا لالچ، ریاضت کا لالچ، اسے خوش کرنے کا لالچ...... وہ عالموں کے پاس جاتی، بزرگوں سے دعا کے لئے کہتی، بچوں کو کہتی کہ وہ اس کے لیے دعا کریں کہ عیسیٰ آ جائے۔ وہ بلا امتیاز ہر مذہب کے ماننے والوں کو ملتی رہی کہ نجانے کس کا خدا سچا ہو۔ کہیں اس سے دعا مانگنے میں کسی خاص خدا کا نام لینے میں کوتاہی نہ رہ جائے۔ عیسیٰ کے معاملے میں وہ کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ سرگودھا میں نرم گھاس پر اتنی بری طرح سے گری تھی کہ اب کنکروڈ سے ٹھوکر لگنے سے بھی ڈرنے لگی تھی۔

''تم میری کا نووینا کرو......سنا ہے اس کو کرنے والے کی ساری دعائیں قبول ہو جاتی ہیں۔''

ربیکا نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس نے میری کا نووینا کیا تھا۔ نو بدھ وہ پیدل چرچ جا کر نو نو گھنٹے لگاتار دعائیں مانگتی رہی تھی۔ لیکن عیسیٰ دسویں بدھ بھی نہیں آیا تھا۔ نہ اس سے ملنے نہ اس کے پیروں کے چھالوں پر مرہم رکھنے...... ذوالجناح کے جلوس کی راکھ اس نے اپنے سر میں ڈالی۔ بدھ دانت تجوری دیکھنے کے لئے اس نے دھکے سہے۔ چرچوں کے آگے موم بتیاں جلا جلا کر اس نے اپنی ساری دولت خدا کو خوش کرنے کے لیے لٹا دی۔ لیکن خدا خوش نہیں ہوا تھا۔

پھر......خدا کی خوشنودی سے مایوس ہو کر وہ شیطان کی پجاری بن گئی تھی۔ یہ اس کی زندگی کا دوسرا دور تھا۔ اب وہ صحیح معنوں میں غریب ہو گئی تھی۔ دولت سے بھی اور عقیدے سے بھی جو سب سے بڑی غریبی ہوتی ہے۔

''میں عیسیٰ کی روح سے ملنا چاہتی ہوں۔'' ایک بنگالی سحر کار کے پاس جا کر اس نے کہا تھا اور اپنا سارا زیور موتی اس کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ وہ انگوٹھی بھی جو عیسیٰ نے اسے شادی کی پہلی رات دی تھی۔ خدا کی خوشنودی سے مایوس اب وہ انسانوں کو مایوس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سحر کار نے اسے ایک ہفتے کا وقت دے دیا تھا۔ ہفتے کے بعد اندھیرے کمرے میں بتیاں جلا کر عیسیٰ کی روح کو بلانے کی تیاری کی گئی تھی اور اس شہرت یافتہ سحر کار کی ساری شہرت سمیت اس کا سحر بھی کافور ہو گیا تھا۔

''یہ لو اپنے زیور...... یا اس کی روح پر میرا جادو نہیں چل سکا یا اس کی روح عالم ارواح میں موجود ہی نہیں ہے۔''

''یعنی وہ زندہ ہے۔'' ربیکا چلا اٹھی تھی۔ ''ہاں! وہ زندہ ہے۔ وہ زندہ ہے میں بھی کتنی پاگل ہوں اس کی روح سے ملنے آ گئی۔''

پاگل پن میں اس کی حالت قابل ترس ہو چکی تھی۔ وہ دونوں عیسیٰ کو کھو چکی تھی۔ دین والا بھی اور محبت والا بھی، حقیقی بھی مجازی بھی دنیاوی بھی آخری بھی......

''وہ آئے گا۔ وہ آئے گا۔'' اکیلے گھر میں وہ چلاتی رہتی ہیں...... خود کو یاد کرواتی رہتی۔

وہ چیری کے باغات جاتی، وہاں پہروں بیٹھی رہتی۔ چیری کے ان درختوں تلے جاتی جہاں پہلی بار ایک ہوئے تھے۔

پھر اس پر تیسرا دور آیا۔ جذباتی اتار چڑھاؤ کے بعد اس پر نفسیاتی دورے پڑنے لگے۔ جو سب سے زیادہ خطرناک تھے۔ یہ وہ وقت تھا جس میں وہ خوش تھی اور بیک وقت اداس بھی...... نجانے اس دورے کا آغاز کیوں کر ہوا تھا۔ کیسے ہوا تھا۔ کون سا جادو جو عیسیٰ کی واپسی کے لئے وہ کروا رہی تھی وہ اس پر ہی چلا گیا تھا۔

ربیکا نے یہ باور کر لیا تھا کہ عیسیٰ زندہ ہے اور وہ اس وقت اس گھر میں ہے۔ وہ باطنی طور پر اسے حاضر سمجھتی تھی۔ خدا کو خوش کرنے، اس کی چاہ سے نافرمانی، عیسیٰ کو یاد کرنے کے ابواب کے بعد...... یہ سب سے زیادہ قابل رحم حالت تھی۔ وہ بیڈ پر اس طرح لیٹتی جیسے عیسیٰ کے ساتھ لپٹ کر سو رہی ہو۔ کھانا بھی وہ ٹیبل پر دو لوگوں کا لگاتی تھی۔ عیسیٰ کے لئے خریداری کرتی تھی۔ اس کے کپڑے پریس کرتی تھی۔ دھوتی تھی اور اکیلے گھر میں ایک غیر حاضر بندے سے بات چیت کرتی رہتی تھی۔ لیکن پھول کی خوشبو آئے اور پھول نظر نہ آئے تو ایسے میں انسان اور بے بس ہو جاتا ہے۔ اسی بے بسی میں وہ خود سے نالاں ہو گئی تھی۔ یا شاید اپنی قسمت سے کہ اس نے اپنی زندگی کا چوتھا اور بھیانک دور شروع کر لیا تھا۔ عیسیٰ مر گیا تھا اور خود کو مارنے کا اس نے نیا طریقہ ڈھونڈ لیا تھا۔ نشہ......

وہ ویسے تو عیسیٰ سے مل نہیں پا رہی تھی۔ شاید وہ سوچ رہی تھی کہ وہ مر کر عیسیٰ سے مل لے گی۔ اسی لیے شاید وہ مرنے کی تیاری کرنے لگی تھی۔ وہ بے حد کمزور ہونے لگی تھی۔ اپنے آپ بڑبڑاتی رہتی تھی۔ ایک طرف اسے عیسیٰ کی موت کا دکھ تھا۔ دوسری طرف وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھی وہ مر چکا ہے۔ وہ عجیب کشمکش کی زندگی گزار رہی تھی۔ اور ایسی زندگی صرف وہ ہی نہیں گزار رہی تھی بلکہ اس کے ساتھ کوئی اور بھی شریک تھا۔ میران......

میران بڑا ہو رہا تھا لیکن ربیکا کو کسی چیز کی پرواہ ہی کب تھی۔ گھر میں صرف ایک ہی شخص تو موجود تھا۔ عیسیٰ...... جو موجود نہ ہوتے ہوئے بھی ہر جگہ چھایا ہوا تھا۔ اپنے تخیل میں ربیکا کوئی رکاوٹ نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے میران کو بورڈنگ میں

داخل کروا دیا تھا اور ہر مہینے اس سے ملنے بھی نہیں جاتی تھی۔ یہ چیز خود ربیکا کیلئے ہی قاتل ثابت ہوئی تھی۔ گھر کے بعد بورڈنگ کی تنہائی نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ ربیکا کو کبھی یاد آتا تھا کہ اس کا اور عیسیٰ کا ایک بچہ بھی ہے تو وہ میران سے ملنے بورڈنگ چلی جاتی تھی۔ بدقسمتی سے کبھی وہ ملاقات کا دن نہ ہوتا تھا۔ کبھی میران تعلیمی دورے پر سینٹر سے باہر ہوتا تھا۔

تعلیم کے ان سالوں میں دونوں کے ملاقاتیں گنتی پر گنی جا سکتی تھیں اور یہ ملاقاتیں بھی ایسی تھیں جیسے بے موسمی پھل۔ ان میں نہ پیار تھا نہ کیف...... ربیکا سے مل کر میران مزید مرحومی کا شکار ہو جاتا تھا۔ تنہائی نے اسے سمجھداری عطا کر دی تھی۔ وہ سب اتنی آسانی سے سمجھ گیا تھا جیسے سرگودھا کی اس رات میں جب وہ ٹھنڈی گھاس پر سو رہا تھا جیسے سب سن رہا تھا۔

بورڈنگ کی تعلیم مکمل کر کے واپس آیا تو اسے احساس ہوا کہ دنیا کتنی بدل چکی ہے۔ ربیکا ویسی بھی نہیں رہی تھی جیسے کبھی کبھی اس سے بورڈنگ میں ملنے آ جاتی تھی۔ وہ میران کے سامنے ہی سگریٹ کے کش لگایا کرتی تھی۔ نشہ آور مشروب پیا کرتی تھی۔ عجیب باتیں کیا کرتی تھی۔ خالی کرسیوں سے، بیڈ کی دائیں طرف سے...... نہاتے ہوئے وہ گنگناتی تھی اور ایسے سہمتی تھی جیسے کسی کی شرارتوں سے محظوظ ہو رہی ہو۔ گھر میں ایک جوان بیٹا تھا اور اسے اس بات کا احساس تک نہیں تھا۔ بے حد منتوں، مرادوں کے بعد بھی خدا نے اسے عیسیٰ نہیں لوٹایا تو اس نے اپنا عیسیٰ خود پیدا کر لیا تھا۔

میران اپنے دوستوں سے ربیکا کا تعارف نہیں کرواتا تھا۔ وہ ان سے عجیب بہکی بہکی باتیں کرتی تھی۔ وہ انہیں عیسیٰ نامی اس شخص کی باتیں سناتی تھی جو زندہ بھی تھا اور مرا ہوا بھی...... جو کبھی تو بازار سے اس کے لیے کچھ لینے گیا ہوتا اور کبھی سرگودھا کے مالٹوں کے باغ میں جان کی بازی ہار رہا ہوتا۔ میران کے دوست سمجھ نہیں پاتے تھے کہ وہ اس بہکی ہوئی عورت اور اس کی بیٹے سے ہمدردی کریں یا اس پر ہنسیں۔ جلد ہی میران کو احساس ہو گیا کہ اسے، جو ہے جیسے ہی کی بنیاد پر قبول کرنا ہوگا۔ ناگزیر کے ساتھ سمجھوتا کرنا ہوگا......

☆......☆......☆

سرد راتوں سے بدلہ لیتی سرما کے دن کی دھوپ گن پت روڈ پر اپنے پر کھول کر پرواز کرنے لگی تھی۔ پرانی وضع کے سرخ اینٹوں والے گھر اور ان کی بالکونیوں کے سیاہ جنگلے دھوپ کو منعکس کرتے لشکارے دینے لگے تھے۔ لمحے بھر کو بوسیدہ لکڑیاں بھی جگمگ جگمگ کرنے لگی تھیں۔ سیاح گھروں کو، اور ان گلیوں کو دیکھنے کیلئے دور دور سے آتے تھے۔ اور یہاں کا ماضی کا حصہ بنے وقت کو محسوس کرنے کی کوشش کرتے تھے جو یہاں کے مکینوں پر بیت گیا تھا۔ ان گھروں پر سے گزر گیا تھا۔

"لیکن وہ کیا جانیں کہ جو وقت ابھی قائم ہے۔ جو مکین ابھی رہائش پذیر ہیں ان کی زندگیوں کو کون سا وقت روند رہا ہے۔" سبین نے تلخی سے سوچا تھا۔ ناشتے کے بعد وہ گھر کی صفائی کر رہی تھی اور بابا صحن میں اپنے چاک پر بیٹھ کر کام شروع کرنے

والے تھے جب انہوں نے اس کے رات والے سوکھتے ہوئے سانچے کو دیکھا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' پتا نہیں انہیں سانچے میں کیا انوکھا نظر آیا تھا جو انہوں نے پوچھ لیا۔ سبین ایک دم سے باہر نکلی اور پھر دروازے میں کھڑے کھڑے اس نے اپنی سانس بحال کرنے کی کوشش کی تھی۔

''ماڈل ہے اور کیا ہے......؟'' وہ لاپرواہی ظاہر کرتے ہوئے کہنے لگی۔

''یہ ٹھیک سے نہیں بھرا گیا۔ مجھے بہت سی جگہوں پر ابھار دکھ رہا ہے۔ کہیں نیچے بلبلا نہ ہو۔ ٹھہرو میں دیکھتا ہوں۔'' بابا کہہ کر چھوٹی چھلنی سے اس کا معائنہ کرنے لگے تھے جب اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر بابا کے ہاتھ سے ماڈل پکڑ لیا تھا۔

''رہنے دیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے اتنا ہلکان ہونے کی......ٹھیک ہے۔'' اس نے نارمل نظر آنے کی ساری کوششیں کر لی تھیں۔ بابا نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

''اب اسے کہاں لے کر جا رہی ہو؟'' بابا نے پوچھا تو وہ گھبرا گئی۔

''وہ چھت پر رکھ دیتی ہوں۔ جلدی سوکھ جائے گا۔'' اس نے کہہ کر سانچے کو دیوار پر رکھ دیا۔

''اتنی جلدی کس بات کی ہے؟''

''میں فرش دھونے لگی ہوں۔ یہ پھر سے گیلا نہ ہو جائے۔'' اس نے کسی طور بابا کی تسلی کی تھی۔ اس کا آج رویہ نیا تھا۔

''صرف ایک کیوں بنایا ہے جب بنانے بیٹھی تھی تو ایک کے ساتھ کافی سارے بنا لینے تھے۔''

''چونے کی بوری اندر تھی باہر جو تھا میں نے اس سے ہی بنا لیا۔''

''لیکن یہ قدح تو بھرا ہوا ہے آمیزے سے......''

''ہاں میں تھک گئی تھی۔''

''اچھا......لاؤ میں بنا دیتا ہوں۔ لوح قرآنی کا ماڈل بنایا ہے نا تم نے......ایسا ہی مال اور بھی بنا لیتے ہیں۔''

''نہیں......'' وہ تیز آواز سے بولی تھی۔ بابا نے اب کی بار اچھنبے سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''میرا مطلب ہے ایسا مال نہ بنائیے گا۔ چچا کریم نے دوسرے ماڈلز کا کہا ہے۔ آپ تھک جائیں گے۔ میں فارغ ہو کر اور بنا لوں گی۔''

بابا نہ سمجھتے ہوئے چاک پر سے اٹھے اور اندر چلے گئے تھے۔ جوان لڑکی کو ایک باپ سمجھ ہی کب سکا ہے۔ انہیں اپنی اس ناسمجھی کا بخوبی علم تھا۔

گھر کی صفائی کے بعد دوپہر کا کھانا بنا کر اور سب کو کھلا کر وہ شاہ عالمی شیشہ مارکیٹ گئی تھی۔ طغرے کو اس نے مہنگے اور

نفیس شیشے میں پیک کروایا تھا۔ بلوری سطح کے نیچے لوح قرآنی کے چودہ الفاظ جگمگا رہے تھے۔ جنہیں قرآن کی میخیں کہا گیا ہے۔ ان میخوں کے نیچے حشیش کو چھپا کر وہ اپنی بنیادیں مضبوط کرنا چاہتی تھی۔ کیا یہ پاگل پن کی انتہا تھی؟

واپس گھر آئی تو بابا اس کے منتظر تھے۔

''کہاں گئی تھیں؟ اور یہ ہاتھ میں کیا ہے؟''

''اسے فریم کروانے گئی تھی۔ میری ایک سہیلی کب سے مانگ رہی تھی۔ اب اس کی شادی بھی ہے تو سوچا اسے شادی کا تحفہ دے دوں گی۔''

''ڈینی کون ہے؟'' بابا نے پوچھا تو وہ اپنے کمرے میں جاتے جاتے مڑی تھی۔ لوح قرآنی کا طغرا اس کے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے رہ گیا تھا۔ اور اگر وہ طغرہ گر کر ٹوٹ جاتا تو...... اس کے پاس کہا تھاں اتنا آٹا کہ وہ اس کا کفارہ ادا کر سکتی، جیسا کہ قرآن والی باجی کہا کرتی تھیں کہ اگر قرآن یا کوئی مقدس چیز غلطی سے نیچے گر جائے تو اس کے کفارے کے طور پر آٹا دیتے ہیں۔ کیا کفارہ ادا کرنے کے لیے اسے چکی پر بیٹھنا پڑتا تھا۔ جس سے وہ جان چھڑانا چاہتی تھی۔

''ڈینی کون ہے؟'' بابا نے پتا نہیں اس کے چہرے کے تاثرات دیکھے تھے کہ نہیں...... انہوں نے پھر سے اپنا سوال دہرایا۔

''کیوں آیا تھا کیا وہ یہاں......؟''

''ہاں، تمہارا پوچھ رہا تھا۔'' جبکہ سبین نے اسے سختی سے گھر میں آنے سے منع کیا تھا۔

''گاہک ہے۔ کسی جگہ نئی دکان کھول رہا ہے۔ مختلف طرح کے ماڈل بنانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ کافی پیسے دے گا وہ اس کام کے۔''

''لیکن ہم سانچوں کے علاوہ اور بنا بھی کیا سکتے ہیں۔ زیادہ پیسے تو نئی طرز کے مالک کے مل رہے ہیں آج کل......'' بابا افسردگی سے بولے۔

''وہ اپنے سانچے دے گا۔ اس نے کہا ہے۔''

''پھر تو ٹھیک ہے۔ تم مجھے بتا دینا میں بنا دوں گا۔''

''جی......'' کمرے میں آ کر اس نے سانس بحال کیا اور الماری میں کپڑوں کی تہ تلے دبے اس موبائل کو نکال کر ڈینی کو کال کی جو ڈینی نے اسے ایک ہفتہ پہلے دیا تھا اور جسے سبین نے خود سے بھی چھپا کر رکھا ہوا تھا۔

''پرسوں دن بارہ بجے کی فلائٹ ہے تمہاری، نیویارک کی...... تیار رہنا۔'' ڈینی نے دوٹوک بات کی تھی اور کال بند ہوگئی۔

سب کچھ جانتے ہوئے بھی سبین کے دل نے بری طرح سے دھڑکنا شروع کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

"بن عیسیٰ......" خوبرو، رعنا نوجوان ......جس کی پرسکون آنکھوں میں محبت کی بڑی بڑی پکاریں درج تھیں۔ خاموش چہرے میں پیار کی کہانی رقم تھی۔ جس کے آگے دنیا کے سارے مردوں کی کشش کم پڑ جاتی تھی۔

"وہ تم سے بھی بہت محبت کرتے تھے۔ تمہیں اپنے سینے پر لٹاتے تھے۔" ربیکا میران کو بتاتی تھی۔ میران جانتا تھا کہ وہ اصل محبت تک کبھی نہیں پہنچ سکے گا۔ پاپا ہوتے تو یقیناً اسے اس سے زیادہ چاہتے جو ربیکا کے اندازے تھے۔ لیکن اب وہ پاپا کی محبت سے محروم تھا۔ ان کی وفات کی وجہ سے......اور ربیکا کی محبت سے بھی محروم تھا۔ پاپا کی وفات کی ہی وجہ سے۔ ربیکا بھول گئی تھی کہ میران اسی عیسیٰ کا بیٹا ہے۔ جسے پیسوں، تعلیم کے علاوہ محبت کی بھی ضرورت ہے۔

بہت بار میران نے اپنے طور پر ربیکا کا علاج کرنے کی کوشش کی تھی۔ نفسیاتی علاج کے ناکام ہونے کے بعد وہ اس کا جذباتی علاج کرنا چاہتا تھا۔

"پاپا اب اس دنیا میں نہیں رہے ممی......" وہ یہ بات کہہ دیتا جو اسے اندازہ ہوتا کہ اس کی بات پر یقین کر لیا جائے گا۔ اس لئے وہ الگ الگ طریقوں سے یہ بات کرتا تھا۔

"آپ انہیں بھول جائیں ممی......وہ بہت اچھے تھے لیکن اب ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔"

"وہ میرے دل میں ہے۔" ہر بار ان کو بھلانے کی کوشش میں وہ زیادہ شدت سے عیسیٰ کو یاد کرنا اور رکھنا تھی۔ میران کو آہستہ آہستہ ادراک ہو گیا کہ یہ سب لاحاصل ہے۔ وہ ممی کو کبھی پاپا کو بھول جانے پر آمادہ نہیں کر سکے گا۔ پھر اس نے ایک نیا طریقہ اختیار کیا۔ اس نے پاپا کی باتیں کرنا شروع کر دیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس طرح اس کا دل ہلکا ہو جائے گا۔ لیکن یہ کوشش بھی رائیگاں گئی تھی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا تھا کہ اس کے اپنے مرحوم والد سے دوستی بہت بڑھ گئی تھی۔ اس نے ربیکا کے ذریعے جانا تھا کہ وہ واقعی بہت اچھے انسان تھے۔ ممی ان سے ان کے مرنے کے بعد اگر اتنی شدید محبت کر رہی تھی تو وہ اسی قابل تھے کہ ان سے بے پناہ محبت کی جائے۔

"میں ان دنوں کو کبھی نہیں بھول سکتی جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ جب سب ایسٹر کی چھٹیوں میں لوگ گھروں کو گئے ہوئے تھے اور میں اور عیسیٰ وہاں پر تھے۔"

ربیکا کا بھول جاتی تھی کہ وہ اپنے بیٹے سے گفتگو کر رہی ہے۔ جوان بیٹے سے......دراصل وہ تو کسی سے بھی گفتگو نہیں کر رہی ہوتی تھی۔ وہ تو سب اپنے آپ کو یاد کروا رہی ہوتی تھی۔ میران آگے سے مسکراتا رہتا تھا۔ اسے اپنے والد کے بارے میں سننا اچھا لگتا تھا۔

پھر ایک دن اسے پتہ چلا کہ ربیکا نے نشہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ میران کے سامنے سگریٹ پیتی تھی۔ اسے بھرتی تھی۔ میران اس سے پوچھ گچھ کرتا تو ربیکا اس پر چلانا شروع ہو جاتی تھی۔

''تم کون ہوتے ہو مجھ سے باز پرس کرنے والے۔ عیسیٰ نے کبھی مجھ سے یہ سب پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ وہ شوہر جو جانتا تھا کہ میں اس کے ایک اشارے پر اس کے لئے ساری دنیا چھوڑ دینے کو تیار ہوں۔ اس نے کبھی مجھے ان باتوں سے نہیں روکا۔ میں کیا پہن رہی ہوں۔ کیوں پہن رہی ہوں۔ کیا کھا رہی ہوں۔ کہاں جا رہی ہوں۔ اس نے کبھی نہیں پوچھا۔ پھر تم کیوں روک رہے ہو۔''

میران کافی عرصے ان چیزوں کو برداشت کرتا رہا۔ پھر اس نے کوشش کی تھی کہ وہ ایسے کسی فرد سے نہ ملے جس سے وہ نشہ آور اشیاء لے رہی تھی لیکن یہ کوشش بھی رائیگاں گئی تھی۔ وہ ربیکا کے ایک ایک لمحے پر تو پہرا دینے سے رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ ربیکا سے لڑ نہیں سکتا تھا۔ اسے ربیکا پر ترس آتا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ پاکستان جا کر اپنے والد کے خاندان والوں سے ملے گا۔ انہیں احساس جرم دلائے گا۔ یا بتائے گا کہ ان کے مجرمانہ قدم کے بعد ایک عورت کی کیا حالت ہو گئی۔ لیکن درپردہ اس فیصلے کے پیچھے ایک تسلی پوشیدہ تھی۔ ایک اطمینان حاصل کرنے کی تمنا تھی۔ احساس جرم دلانے کے پیچھے ایک تصدیق کی چاہ تھی کہ وہ آیا واقعی فوت ہو چکے ہیں۔ ایک تجسس تھا جو اسے بے چین کرنے لگا تھا۔ اس نے اتنی بار سنا تھا کہ عیسیٰ زندہ ہے کہ وہ اپنی اور ربیکا کی تسلی کے لیے پاکستان جانا چاہتا تھا۔ اگر وہ زندہ نہیں بھی تھے تو وہ ان کی قبر کو تلاش کر سکتا تھا۔ ربیکا کو وہاں لے کر جا سکتا تھا۔ شاید اسی طرح عیسیٰ کی قبر سے لپٹ کر ربیکا کو یقین آ جائے اور قرار بھی......

اس کے دوست انڈیا جا کر تاج محل دیکھنے کا پلان بنا رہے تھے۔ اس نے بھی اس ٹرپ پر جانے کی حامی بھر لی تھی۔ پانچ روز دہلی میں قیام کر کے جس روز وہ لوگ تاج محل دیکھنے کے لیے آگرہ جانے والے تھے۔ میران اسی روز پاکستان آ گیا تھا۔ اس نے ان سے کہا تھا کہ وہ انہیں چند روز بعد جوائن کر لے گا۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ پاکستان میں بھی ایک تاج محل اس کا منتظر ہے۔

☆......☆......☆

وہ پاکستان آ گیا۔ وہ تو جیسے سمجھ رہا تھا کہ وہ سرگودھا جائے گا اور اسے جاتے ہی اس کے باپ کے بارے میں سب پتہ چل جائے گا۔ وہ لوگ اس کے آنے کا ہی انتظار کر رہے ہوں گے، اور اسے دیکھ کر سب بتا دیں گے کہ اس رات کیا ہوا تھا۔ اور اب وہ اس سب پر کتنے شرمندہ ہیں۔

اس کے پاس سوائے اس بات کے اور کوئی معلومات نہ تھیں کہ اس کے والد پنجاب کے سرگودھا میں رہتے ہیں اور ان کا

تعلق وہاں کی ایک امیر فیملی سے تھا۔

''رئیس خاندان کے بارے میں کچھ جانتے ہیں آپ؟ سرگودھا میں انکے مالٹے کے باغات ہوا کرتے تھے۔'' وہ ان دو باتوں کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتا تھا اور اسے اس سے آگے کی معلومات دینے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ ہر ایک سے بس یہی دو باتیں کر رہا تھا۔

''ان کی زمین چک سینتالیس سے آگے ہے۔'' کسی نے اسے بتایا تھا۔ وہ وہاں گیا تھا بنا خوفزدہ ہوئے۔ ربیکا سے یہ کہانی سن لینے کے بعد بھی کہ والد کے خاندان نے کیسے بے دردی سے ان پر گولیاں چلوادی تھیں۔ لیکن اس کے ذہن میں شاید یہ بات تھی کہ وہ بس ان کا پوچھنے ہی تو آیا ہے۔ کون سا جائیداد میں سے حصہ مانگنے آیا ہے۔ امریکہ جیسے ماحول میں رہتے ہوئے اس نے کسی دوسرے ماحول کو بہت کج روی سے جج کیا تھا۔ پاگل......وہ محض خدا کے واسطے پر ان سے سچ اگلوانے کی امید لے کر چلا آیا تھا؟ کیا وہ اسے سچ بتانے والے تھے اگر اس کے والد زندہ تھے بھی تو......

''کیا یہ باغات رئیس خاندان کے ہیں۔'' اس نے باغ کے مالی سے پوچھا۔

''کسی زمانے میں ہوا کرتے تھے۔''

''اب کن کے ہیں۔''

''اب تو......امیر نے خرید لیے ہیں۔ اور اس بات کو بھی کئی سال بیت گئے۔''

''تو وہ کہاں گئے۔؟ مطلب رئیس کے خاندان کے افراد......'' اس نے پوچھا تو گڑ گڑ حقہ پیتے مالی نے حقہ کی نال چھوڑ کر اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا۔

''سب مر گئے۔''

''کیسے......؟'' اس کی حیرانی فطری تھی۔

''جو ظالموں کا انجام ہوتا ہے وہ ہی ان کا ہوا......رئیس نے پہلے اپنے بھائی اور بھاوج سمیت ان کے چاروں بچوں کو جان سے مارا......نہ جانے سب سے چھوٹا والا عیسیٰ کیسے بچ گیا۔ لیکن اسے بھی پھر بیس سال بعد قتل کر دیا۔ اس کی انگریز بیوی بے چاری پاگلوں کی طرح اسے یہاں تلاش کرتی رہی، لیکن پھر وہ بھی اپنے بچے کی سلامتی کے خیال سے واپس چلی گئی۔ خدا ایسے لوگوں کو کیسے معاف کرتا بھلا......''

میران جانتا تھا کہ ننھے بچے کے نام سے اس کا ذکر ہی ہوا ہے۔

''کیا ہوا سب کے ساتھ......؟''

''آتش دان کی آگ بھڑک اٹھی تھی ایک رات......جس نے ساری حویلی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مال تو جلا ہی جلا لاشیں ایسی بری طرح سے جلیں کہ شناخت نہ ہو سکیں۔ یہ تک پتہ کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ ان میں سے مرد کون ہے اور عورت کون...... عجیب بات ہے ناں......جن عورتوں کی شکلیں گاؤں کے کتوں نے بھی کبھی نہ دیکھی تھیں ان کے جسموں کو تو شاید مردوں نے غسل دیا۔ بس خدا کے کام......اس واقعے کے بعد تو میری ساری طمع بھی جل کر خاک ہو گئی۔''

''کیا کوئی بھی نہیں بچ سکا......؟''

''بیٹیاں بچ گئی تھیں جو دوسرے گاؤں بیاہی تھیں۔ انہوں نے ہی یہ جائیداد بیچی جو کوئی خریدنے پر تیار نہ تھا۔ کیونکہ باغ کو کلر کھا رہا تھا۔ لاکھ تدبیروں کے باوجود بھی......پھر آگ والے واقعے کے بعد تو سمجھو سب کو خوف لاحق ہو گیا تھا۔ بس اس موسم کی فصل کے بھاؤ بک گئی یہ جائیداد......لیکن میں کہتا ہوں نیت نیت کی بات ہوتی ہے۔ جیسے ہی جائیداد میرے نے خریدی، اسی موسم ایسا چوکھا پھل آیا کہ باہر کی کمپنیاں تک منہ مانگے پیسے دینے لگیں۔ بس اللہ کے کام......''

''حویلی کہاں ہے۔''

''اس باغ کے پار......وہ ابھی تک جلی ہوئی ہے۔ کوئی نہیں جاتا وہاں، سب کہتے ہیں کہ وہاں بھوت ہیں۔ نہ بکتی ہے نہ بستی ہے۔''

وہ جانا چاہتا تھا وہاں پھر کچھ سوچ کر نہیں گیا تھا۔ اس کو خوشی ہوئی تھی اس کے باپ کو قتل کرنے والوں کو اچھی سزا مل گئی تھی اللہ کے کام......یقیناً انہیں اللہ ہی سمجھ سکتا ہے۔

''کیا اس انگریز بیوی والے کی قبر کے بارے میں کچھ جانتے ہیں آپ......ان کا نام عیسیٰ تھا۔ میں ان کا بیٹا ہوں۔''

''میں جانتا ہوں ان کی خبر لینے تمہارے علاوہ اور کوئی آ بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن تمہارے باپ کی قبر کے بارے میں، میں کچھ نہیں جانتا......اپنی ماں کے لئے یہاں کی مٹی لے جاؤ شاید اسے قرار آ جائے اور اس شہر والوں کو بھی......جو کہتے ہیں کہ وہ اکثر رات کو ایک عورت کی چیخ و پکار کی آوازیں سنتے ہیں......جو عیسیٰ عیسیٰ پکارتی ہے۔''

میران نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس نے وہاں کے باغات کی بہت سی مٹی اکٹھی کر کے اپنے بیگ میں رکھ لی تھی۔ ربیکا کے لیے یہ مٹی اور ساری خبریں یقیناً بہت خوشگوار ثابت ہونے والی تھیں۔ اس کا یہاں آنا فائدے مند ثابت ہوا تھا۔ اسے عیسیٰ کا تو پتہ نہیں چلا تھا لیکن عیسیٰ کے مجرموں کے انجام کی خبر ضرور ہو گئی تھی۔ اب جب وہ ربیکا کو جا کر بتائے گا کہ ان کے قاتلوں کو خدا نے کیا سزا دی ہے تو خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔

سرگودھا سے وہ خوشی خوشی واپس لاہور آیا تھا۔ انڈیا کے لئے اس کی واپسی کی فلائٹ میں ابھی چھ گھنٹے باقی تھے۔ جب وہ

لا ہور گھومتے گھومتے ایک لڑکی سے ٹکرا گیا تھا۔سبین سے......اس نے اس کے تاج محل کے ماڈل توڑ دیئے تھے اور اپنا دل اس کے ساتھ جوڑ لیا تھا۔وہ کہاں جانتا تھا کہ وہ بھولی لڑکی اس کی یادیں اپنے دل میں بسا لے گی۔اور اس ملاقات کی یادیں خود اسکے اپنے دل میں بھی بس جائیں گی۔وہ یہ بھی تو نہیں جانتا تھا۔

☆......☆......☆

ایک دو دن سے بابا بڑی خاموشی کے ساتھ سبین کی تیاری دیکھ رہے تھے۔وہ بیگ تیار کر رہی تھی۔کپڑے دھو کر استری کر کے اس میں رکھ رہی تھی۔کچھ ایک دو نئے سستے جوڑے بھی خرید کر لائی تھی کچھ پرانے لنڈے کے جوتے اور دوسری ہی ایسی بہت سی چیزیں بھی ...... یہ ایک مختلف طرح کی تیاری تھی۔وہ سب دیکھ رہے تھے لیکن ان کی ہمت نہیں رہی تھی کہ وہ اس سے کچھ پوچھ سکتے۔طلاق کے بعد وہ کسی حد تک خود مختار ہو گئی تھی۔کہاں جا رہی تھی۔کہاں سے آ رہی تھی نہ وہ بابا کو بتاتی تھی اور نہ ہی بابا پوچھتے تھے۔شیر کو علم ہو چکا تھا کہ اب اس سے اس کا علاقہ چھین لیا گیا ہے۔وہ بوڑھا ہو رہا ہے اور اسے زبردستی یا خوشی سے نئے شیر کو جگہ دینی ہے۔وہ صبر سے اسے دیکھتے رہتے۔

وہ اپنی مرضی سے بازار آتی جاتی تھی۔اپنی مرضی سے چچا کریم کو مال دینے جاتی تھی۔نہیں دل کرتا تھا تو مال اتنا اکٹھا ہو جاتا تھا کہ گھر ہی گودام لگنے لگتا۔بابا کہتے رہتے تھے کہ وہ جا کر مال دے بھی آئے۔

''دے آؤں گی۔'' وہ لاپرواہی سے کہتی اور تب تک نہیں جاتی تھی جب تک گھر میں سب ختم نہ ہو جاتا تھا۔وہ فاقوں پر نہ آ جاتے تھے۔اب وہ بیگ تیار کر رہی تھی۔بابا الجھن کا شکار تھے۔وہ کہاں جانے والی تھی؟ وہ کیا کرنے والی تھی؟ بابا کو اندازہ ہوتا تو وہ اسے جان سے مار دینا پسند کرتے بہ نسبت گھر سے باہر قدم نکالنے کے......

''میں جا رہی ہوں۔'' اس سے پہلے کہ بابا اس سے کچھ پوچھتے۔اس نے خود ہی انہیں بتا دیا تھا۔بتانا ضروری بھی تھا۔یہ جواب تو اسے دینا ہی تھا۔سوال کے بدلے یا بنا سوال کے......

''کہاں......؟'' بابا نے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔یہ بات تو وہ بھی جانتے تھے کہ وہ جا رہی ہے۔لیکن کہاں؟ بس یہی نہیں جانتے تھے۔

''کراچی......'' اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔لفظ اس طرح ادا ہوئے تھے کہ مجھ سے اور کچھ نہ پوچھیے گا میں جواب دینے کے موڈ میں نہیں ہوں۔

''کیوں......؟'' مختصر جواب پر مختصر سوال۔

''میں یہ کام سیکھنے جا رہی ہوں۔۔وہاں ایک پندرہ روزہ ورکشاپ کا آغاز ہو رہا ہے۔یہاں لاہور میں بھی ان کا کیمپ لگا

تھا۔ میں نے ٹیسٹ دیا تھا اور انہوں نے مجھے پاس کر دیا تھا پھر میں نے داخلے کا فارم فل کر کے جمع کروا دیا انہوں نے مجھے بلایا ہے۔'' وہ بڑے طریقے اور دھڑلے سے جھوٹ پر جھوٹ بولتے رہی......

''کس لئے اتنی کوشش کر رہی ہو تم......''

''ہم سب کے لئے......''

''میں تمہارے لئے رشتہ دیکھ رہا ہوں۔ جلد ہی تمہاری شادی ہو جائے گی۔'' بابا یہ بات کہنا چاہ رہے تھے اور کہہ نہیں پا رہے تھے۔ یہ بات کہتے انہیں سبین کے متوقع رویے سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔

''تمہاری شادی......'' ہمت کر کے وہ بس اتنا ہی کہہ سکے۔ لمحے بھر میں ہی سبین کی آنکھوں نے چنگاری پکڑ لی تھی۔ شادی کے نام پر ہی وہ بھڑک اٹھی تھی۔

''آپ کو اب یہ حق حاصل نہیں ہے میں نے ایک بار آپ کی مرضی سے رشید کو قبول کیا تھا۔ دوبارہ غلطی نہیں کروں گی۔ چاہے آپ میرے لیے کسی شہزادے کو ہی کیوں نہ تلاش کر رہے ہوں۔''

بابا نے اس کی بات پر غصہ نہیں کیا تھا۔

''جب تم ہمیں یہ حق نہیں دیتیں کہ ہم تمہارے لئے کچھ بہتر سوچتے تو تمہیں بھی یہ حق نہیں ہے کہ تم ہمارے لئے کچھ سوچو۔ مت جاؤ کہیں بھی، ہمارے لئے مت ہلکان کرو خود کو، میں دو وقت کی روٹی جتنا کام تو کر ہی سکتا ہوں۔'' بابا کی بات نے اسے لاجواب کر دیا تھا۔

''بہتر سوچ......؟'' اس نے طنز سے بابا کی الفاظ دہرائے تھے۔ ''یہی تو فرق ہے آپ میں اور مجھ میں۔ آپ جسے ہمارے لیے بہتر سمجھتے رہے اس نے ہماری زندگی تباہ کر دی۔ بیشک میرے پاس آپ جیسا فن نہیں ہے۔ نہ چونے کا اور نہ ہی آنکھیں بند کر لینے کا لیکن اب جو میں بہتر کرنے جا رہی ہوں وہ واقعی میں ہماری زندگیوں کو بہترین کر دے گا۔ مجھے زویا کا علاج کروانا ہے۔ اس گھر کو پھر سے خریدنا ہے۔ میں آپ کی طرح کوئی شہکار تو نہیں بنانا چاہتی۔ لیکن بے مول مرنا بھی نہیں چاہتی۔'' نخوت سے وہ اپنی ہی روانی میں بولتی چلی گئی۔ اس کے لہجے اور بات نے ایک طرح سے بابا پر چوٹ کی تھی کہ اسے بابا کی غلطیوں کا ازالہ کرنا ہے۔ بابا نے دکھ سے اس کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کو وہ بھی افسردہ ہوگئی تھی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔ جو اخذ کر لیا گیا تھا۔

''کہاں رہو گی کراچی میں۔'' بابا نے پوچھا تو اس نے سکھ کا سانس لیا۔ مطلب مسئلہ حل ہو گیا تھا۔

''ہاسٹل کا بندوبست ہو گیا ہے۔ پندرہ دن کی کلاس ہے۔ مجھے وقفے وقفے سے پندرہ دن کے لیے جانا پڑے گا۔ جلد ہی میں یہ کام سیکھ لوں گی۔ پھر ہم کارخانہ لگا لیں گے۔ آپ کو کام کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ ہم ورکر رکھ لیں گے۔ جیسا دوسرے

لوگ کرتے ہیں۔ گولڈن پتی، افشاں، رنگ سب کا کام کریں گے۔ میں آپ کے فن کو بہت اوپر لے جاؤں گی۔ چاچا کریم سے میں نے سب پوچھ لیا ہے۔ انہوں نے مجھے بہت اچھے سے اس کام کی باریکیاں بتائی ہیں۔" بہت روانی سے اس نے کل سے یاد کیا ہوا جھوٹا سبق دہرایا۔

"میں تمہیں اسٹیشن چھوڑ آتا ہوں۔ کب کی ہے روانگی؟" بابا اٹھتے ہوئے بولے۔

"اس کی ضرورت نہیں، لاہور سے کافی لڑکیاں جا رہی ہیں۔"

"چونے کا کام سیکھنے؟" بابا حیران ہوئے تھے۔ وہ لڑکوں کی بات کرتی تو وہ مان بھی لیتے لیکن لڑکیاں اور چونے کا کام؟

"وہاں صرف یہ طغرے بنانا ہی نہیں سکھائے جا رہے اور بھی سو طرح کے کام ہیں۔ کھانا پکانا، دستکاری، ملتانی نقش و نگاری، کڑھائیاں وغیرہ وغیرہ۔ میں بس سٹاپ پر ان کا انتظار کر لوں گی۔ وہ آ جائیں گی تو ہم چلے جائیں گے۔" کہہ کر وہ بیگ لینے اپنے کمرے میں جانے لگی تھی۔

"سبین؟" بابا نے اسے پیچھے سے پکارا تھا۔

"جی۔" وہ پلٹی تھی۔

"سب سے خفا ہو جانا...... مجھ سے خفا ہو جانا، اس گھر سے ہو جانا۔ چونے کے کام سے ہو جانا لیکن اپنی تقدیر سے کبھی خفا نہ ہونا۔ کیونکہ جب انسان اپنی تقدیر سے خفا ہوتا ہے تو بدی کی طرف جاتا ہے۔" بابا نے کہا تھا۔ سبین کا دل ہول کر رہ گیا تھا۔ اس سے ایسی بات۔

"پرانے زمانے میں سورج پرست ہوا کرتے تھے بیٹا! جو سورج کو اپنا خدا مانتے تھے۔ اس کی پوجا کرتے تھے۔ عبادت کرتے تھے۔ پھر ایک دن سورج پر گرہن لگ گیا۔ لوگوں نے سمجھا کہ ان کا خدا ان سے ناراض ہو گیا ہے۔ انہوں نے سورج کو راضی کرنے کے لئے اپنے بچے تک ذبح کر ڈالے۔ پھر قانون قدرت کے مطابق گرہن تحلیل ہوا تو سورج پھر سے ظاہر ہوا۔ لوگوں کا عقیدہ راسخ ہو گیا۔ اس کے بعد جب جب سورج گرہن لگتا وہ لوگ اسی طرح کرتے، اپنے بچے قربان کرتے، عورتوں کی قربانیاں دیتے۔ سمندروں میں زیور موتی ڈالتے، قیدیوں کا خون بہاتے۔

شاید تمہیں یہ باتیں سن کر عجیب لگے کہ پرانے زمانے میں لوگ جاہل تھے۔ لیکن نہیں، میرا ماننا ہے کہ اب زیادہ جہالت ہے۔ ہماری خواہشات ہمارا سورج ہے۔ جس کو ہم خدا مان کر پوجتے ہیں۔ کبھی جو اس سورج پر گرہن آتا ہے تو ہم اس پر اپنی ذات کی بلی چڑھاتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری تقدیر ہم سے ناراض ہو گئی ہے۔ اس کو راضی کرنے کے لیے ہم اپنا سب کچھ قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ کھرا ضمیر، پرخلوص نیت، مضبوط ایمان اور سچا مذہب۔ تم سمجھ رہی ہو ناں......"

''جی بابا۔'' وہ وقتی طور پر اداس ہوگئی تھی۔ بابا کی گفتگو نے اسے منتشر کردیا تھا۔ چھوٹا سا بیگ لے کر باہر نکلی تو بے اختیار ہی بابا کی طرف بڑھی اور ان کے آگے جا کر اس نے اپنا سر ان کے سامنے جھکا دیا۔

''اپنا خیال رکھنا۔'' بابا نے اس کے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا اور آنسو چھپانے کے لئے منہ پھیر لیا۔

''خدا حافظ۔'' جب وہ باہری دروازے کی طرف بڑھ رہی تھی تو پیچھے سے اسے چھوٹی زویا کی آواز آئی۔ یہ نیا لفظ زویا نے کوئی دو ماہ بعد کے بعد بولا تھا۔ اس کا دل پسیج کر رہ گیا۔

''خدا حافظ۔'' پیچھے پلٹ کر اس نے بھی کہا اور پھر آنسو چھپاتی جلدی سے گھر کی دہلیز پار کر گئی۔



قسط نمبر 4

گہری دھند نے سارے شہر کو اپنے لحاف تلے چھپا رکھا تھا۔ دھوپ جو پچھلے کافی دنوں سے نکھر نکھر کر جوبن پر آ رہی ہے پھر سے کسی غار میں جا چھپی تھی۔ منظر نظروں تلے ایسے چھپن چھپائی کھیل رہے تھے جیسے انسانوں کے سامنے آ کر برہنہ نہ ہونا چاہتے ہوں۔ میران نے باہر دیکھتے ہوئے افسردگی سے آنکھیں موند لیں۔ پھر کھڑکی کے پردے برابر کیے اور اپنے کمرے میں آ کر چھوٹے سے بیگ میں اپنے کپڑے رکھنے لگا۔

آج اس کا فائنل میچ تھا۔ اسے جلدی کلب جانا تھا اور وہ کہاں جانے کی تیاری کر رہا تھا؟ دھند جو باہر چھائی تھی اچھل کر کمرے میں آ گئی اور ساری کی ساری میران کی آنکھوں میں بھر گئی۔ بینائی رکھتے ہوئے وہ جیسے اندھا ہو گیا۔

''تمہیں اپنی والدہ کا ایسے خیال رکھنا ہے جیسے لوگ خزانے کا رکھتے ہیں۔ ہر وقت چوکنے ہو کر......'' ڈاکٹر الیگزینڈر نے میران سے کہا تھا۔ میران تاسف سے سر ہلا کر رہ گیا تھا۔

عیسیٰ جو کل رات ربیکا کے لئے آئس کریم لینے گیا تھا تو وہ رات میں واپس نہیں لوٹا تھا۔ صبح میران ذہنی طور پر ربیکا کے ہنگامے کے لیے تیار تھا۔ ہر بار ایسا ہی تو ہوتا تھا۔ وہ روتی تھی، چیختی تھی، گھر کی چیزیں توڑتی تھی، خود کو نوچتی تھی۔ ربیکا خود کے ساتھ بہت عرصے سے جو ڈھونگ کھیل رہی تھی تو اس ڈھونگ پر دیوانوں کی طرح تالیاں بجانے والی بھی وہ خود ہی تھی۔ وہ اسٹیج کی اداکارہ تھی جو کردار اپنے اوپر اس طرح حاوی کر لیتی ہے کہ اس کردار کو اپنے ساتھ گھر بھی لے کر چلی جاتی ہے اور اس کردار کی مشق بیک اسٹیج کرنے کے بجائے گلیوں بازاروں میں کرتی پھرتی ہے۔

اپنے خود کے پیدا کردہ عیسیٰ کے وجود پر وہ اتنی شدت سے ایمان لے آئی تھی کہ اسے اس کے اصل میں نہ ہونے کی سوچ بھی کفر لگتی تھی۔ ایک میز پر دو جانوں کا کھانا لگانا، رات میں تکیوں کو عیسیٰ سمجھ کر ان سے لپٹ کر سونا، عیسیٰ کے لیے کپڑے خریدنا، انہیں استری کرنا، یہ وہ اسٹیج پلے تھا جس کے پردے گرنے میں نہیں آ رہے تھے اور مسلسل اداکاری نے اسے خوشی کے بجائے اذیت دی تھی۔

میران نے صبح اپنے اور ربیکا کے لیے ناشتا بنایا، پھر سوئی ہوئی ربیکا کو اٹھانے اس کے کمرے میں چلا گیا۔ آگے جو منظر تھا اس کی اسے ہرگز توقع نہیں تھی۔ نہ تو کمرے کی چیزیں توڑی گئی تھیں، نہ ہی ربیکا چیخ رہی تھی، رو رہی تھی اور نہ ہی خود کو نوچ رہی تھی۔ بیڈ سے نیچے گری ہوئی ربیکا آڑھی ترچھی سی فرش پر پڑی تھی اور اس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔

میران کے پیروں تلے سارا ''سن شائن'' نکل گیا اور بنا سن شائن کے اس نے خود کو رات کے اندھیرے میں گم پایا۔

اس نے فوراً ڈاکٹر الیگزینڈر کو بلایا۔ ناشتا جسے کر کے وہ جلدی سے کلب کے لئے نکلنے والا تھا میز پر پڑا پڑا ہی ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ مارڈی کے فون پر فون آ رہے تھے۔ وہ یقیناً اسے میچ کے لئے بلا رہے تھے اور اب ڈاکٹر الیگزینڈر اسے کہہ رہے تھے کہ اسے ربیکا کی حفاظت ایسے کرنی ہے جیسے لوگ خزانے کی کرتے ہیں۔ ہر وقت چوکنے رہ کر......اور ہر وقت پہرہ داری کرتے ہوئے۔

''مجھے بتائیے ڈاکٹر الیگزینڈر میں کیا کروں؟''

''ربیکا پہلے بھی کافی دفعہ میرے پاس علاج کے لیے آ چکی ہے۔ اب کافی عرصے سے نہیں آ رہی تھی۔ مجھے لگا کہ یہ ٹھیک ہو چکی ہے لیکن میں غلط تھا۔ یہ تو مزید بیمار ہو چکی ہے۔'' ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا۔ میران کو سن کر عجیب لگا تھا۔ ربیکا ڈاکٹر الیگزینڈر کے پاس علاج کروانے جاتی رہی تھی؟ کیوں؟ کیا وہ خود کو بیمار سمجھتی تھی۔ عیسیٰ کے نام کے تاریک ڈھونگ کے پیچھے کہیں سچ کی طمع کاری بھی پوشیدہ تھی یا ڈاکٹر کے پاس جا کر علاج کروانا بھی کسی ذہنی اختراع کیے ہوئے اسکرپٹ کا حصہ تھا جس پر ربیکا بڑی اچھی اداکاری کر رہی تھی۔

لیکن پھر اب کیا ہوا تھا؟ تھیٹر کی روشنی سے نکل کر باہر کی دنیا کا سامنا کرنے اسے مہنگا پڑا تھا جو وہ بیڈ سے بے ہوش ہو کر گر گئی تھی یا وہ اسٹیج سے بیک اسٹیج چلی گئی تھی۔ تاریکی سے مزید تاریکی میں......

''خیر اس مسئلے کو چھیڑ کر ہمیں وقت برباد نہیں کرنا چاہیے۔ جو تمہارے مرحوم والد سے متعلق ہے۔ ہمیں جلد از جلد اس کا حل تلاش کرنا چاہیے۔''

ڈاکٹر الیگزینڈر کے منہ سے عیسیٰ کے لئے ''مرحوم'' کا لفظ سن کر میران کو دلی دکھ ہوا تھا۔ وہ اگرچہ ربیکا کی طرح یہ تو نہیں سمجھتا تھا کہ اس کے والد زندہ ہیں لیکن کہیں اندر ہی اندر اسے بھی ایک آس سی تھی کہ ایک دن اس کے والد واقعی میں آ جائیں گے۔ ربیکا کی آس کا کیا نتیجہ نکلتا ہے اس کے لئے وہ بھی منتظر تھا یا شاید ربیکا کا تھوڑا سا اثر اس نے بھی لے لیا تھا۔

''تم انہیں کسی صحت افزا مقام پر لے جاؤ...... جہاں ساتھ ساتھ ان کا علاج بھی ہو...... جیسے کہ کسی سینی ٹوریم وغیرہ...... ربیکا کو جسمانی ہی نہیں ذہنی علاج کی بھی سخت ضرورت ہے۔ انہوں نے تمہارے والد کے غم کو سینے سے نہیں لگایا۔ روح کا حصہ بنا لیا ہے۔ بہتر ہے کہ جلد کچھ بہتر کیا جائے۔ میں ایک سینی ٹوریم کے بارے میں جانتا ہوں۔ وہاں میرا ایک دوست تعینات ہے۔ اگر تم وہاں ربیکا کو لے جاؤ گے تو یہ ربیکا کے لئے بہتر ہوگا اور تمہارے لیے بھی...... میرے دوست کی وجہ سے تمہیں پیسوں میں بھی کافی چھوٹ مل جائے گی۔'' ڈاکٹر الیگزینڈر ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ شاید قیافہ شناس بھی تھے۔ انہوں نے میران کے چہرے سے اس کی ساری معاشی حالت کا حساب کتاب لگا لیا تھا۔

آنے والی بہار سے جھومتے صنوبر کے دیو قامت درخت نظروں کے سامنے سے اتنی تیزی سے گزر رہے تھے کہ گمان ہوتا تھا کہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے ہوں۔ ہوائیں جھوم جھوم کر پھولوں کی خوشبوؤں کو پھیلا رہی تھیں اور پرندے چہک چہک کر اپنے گھونسلے بنا رہے تھے۔ میران کے لیے اتنی خوش کن باتوں میں سے کسی ایک میں بھی خوشی نہیں تھی۔

یہ ڈاکٹر الیگزینڈر کی ہی ہدایت تھی کہ وہ ربیکا کو سینی ٹوریم لے کر جا رہا تھا۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ہی ایسا اس کی بے ہوشی میں ہوا تھا کیونکہ وہ ہوش مندی میں اس جگہ کو نہیں چھوڑ سکتی تھی جہاں اس کے ساتھ ہر وقت عیسیٰ موجود ہوتا تھا۔ ایک ایسی جگہ پر جانے کا تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی جہاں کا عیسیٰ کو نہ پتا ہو اور وہ خود بھی وہاں اپنا تخیلاتی عیسیٰ پیدا کرنے سے قاصر ہو۔

فارم فل کر کے وہ ربیکا کے پاس آیا تھا۔ یہ الوداعی ملاقات تھی۔ سینی ٹوریم میں کم از کم ربیکا کو چھ ماہ رہنا تھا اور یہ مدت مکمل صحت مندی تک بڑھ کر ایک سال سے دو سال تک بھی ہو سکتی تھی۔ پیسوں کا انتظام بہت مشکل سے ہوا تھا لیکن اسے یہ سب کرنا تھا۔ ربیکا کے لیے، اپنے لیے......

"آپ کو پتا ہے ناں کہ میں آپ کو یہاں کیوں لایا ہوں۔"

"میں جانتی ہوں۔ میرے علاج سے بہتر تھا کہ تم عیسیٰ کو کہیں سے ڈھونڈ لاتے......" اس کی آنکھیں بنجر تھیں۔ اس کا بیٹا اسے اتنی دور لے آیا تھا جس جگہ کا عیسیٰ کو علم ہی نہیں تھا۔ ربیکا نے اپنے اندر اتنی سسکیاں دبا لی تھیں کہ وہ سراپا چیخ بن گئی تھی۔

"آپ کو کم از کم اب یہاں چھ ماہ رہنا ہے۔"

"عیسیٰ گھر میں آیا اور میں وہاں نہ ہوئی تو وہ مجھے کہاں تلاش کرے گا۔ تم بھی گھر پر نہ ہوئے تو......؟" وہ اپنی کہے جا رہا تھا اور ربیکا اپنی...... دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوجے کی بات نہیں سن رہا تھا۔

"مجھے ایک ایک ماہ کے وقفے سے آپ سے ملنے کی اجازت ہے۔"

"تم گھر پر ہی رہنا...... بہت ضروری ہو تو گھر سے باہر نکلنا۔"

"میں ایک ایک ماہ بعد آ کر آپ سے مل لیا کروں گا۔"

"عیسیٰ کو ہرگز مت بتانا کہ میں بیمار ہوں۔"

"مجھے اجازت دیں۔ میں چلتا ہوں۔" اس نے ربیکا کو گلے لگایا اور باہر نکل گیا تھا۔ اس کے باہر نکلتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسو بھی باہر نکل آئے تھے۔

باہر شام کسی کنویں کا روپ دھار چکی تھی۔ بیک وقت مدد بھی اور...... بھیانک بھی......

☆......☆......☆

ایرپورٹ پر حسبِ معمول رش تھا۔ جن لوگوں کی فلائٹ کا وقت قریب تھا وہ عجلت میں ڈیپارچر لاؤنج کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کچھ مفصل انداز میں اپنے پیاروں سے الوداعی ملاقات کر رہے تھے۔ جانے والے خوش تھے۔ پیچھے رہ جانے والے افسردہ......کہیں خوشی تھی تو کہیں غم......کہیں اداس چہرے تھے تو کہیں مسکراہٹیں...... ہر طرف ایک افراتفری کا عالم تھا۔ غیر ممالک جانے والوں میں صرف ایک شاید سبین ہی ایسی تھی کہ جس کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔ سبین کا دل گھبرانے لگا تھا۔ اپنے اکیلے پن سے......؟ وہ گھر والوں سے دور جا رہی تھی اور پہلی بار جا رہی تھی۔ باطنی کے ساتھ ساتھ وہ ذہنی طور پر بھی تنہا تھی۔

ہلکے آسمانی سے رنگ کے اسکارف کو اس نے سر پر مزید اچھی طرح لپیٹا، یہ اپنی بے قراری پر قابو پانے کی بے اختیاری کوشش تھی۔ ہاتھ میں پکڑی سفید موتیوں کی چمک دار تسبیح جس کے دانے ایک کے بعد ایک بڑے ہی منظّم انداز سے ایک کے اوپر ایک کر کے گر رہے تھے، اس کے وجود کے ساتھ ساتھ کانپ رہی تھی۔ سفید اجلے بے شکن لباس، سیاہ فرشی جوتوں، کانوں میں ہیرے جیسے بندوں اور ہلکے سے میک اپ کے ساتھ وہ اس وقت کوئی مومی گڑیا لگ رہی تھی۔ مسلم مومی گڑیا۔

اس نے ایک دین دار عالمہ کا سا پیرہن اوڑھ رکھا تھا۔ یہ سب کرنے کو اسے ڈینی نے کہا تھا۔ وہ غلطی کی کوئی گنجائش نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ وہ اس گیم کو بہت اچھی طرح کھیل رہا تھا اور کارزل کی نظر میں ''مقام'' کی ''برتری'' چاہتا تھا۔ اس نے جو سبین کو بتایا تھا وہ سب نہ صرف اس کے ذہن میں بلکہ حقیقت میں بھی ایسا ہونے والا تھا کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ معصوم نظر آنے والی، دین دار عالمہ کا بہروپ اپنائے یہ لڑکی اصل میں لوحِ قرآنی کے طغرے کی آڑ میں ''حشیش'' اسمگل کر رہی ہے۔

سبین کا دل بری طرح سے گھبرانے لگا تھا۔ وحشت اس سے گھٹ گھٹ کر لپٹنے لگی تھی۔ وہ ڈر رہی تھی یا بے خوفی سے یہ سب کر کے اپنی قسمت سے کوئی بدلہ لے رہی تھی؟ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی اس کیفیت کو کیا نام دے۔ بھٹکتے خیال کو خود سے دور کرنے کے لیے اس نے نظریں گھماتے ہوئے وہاں ڈینی کو تلاش کیا تھا۔ ڈینی اسے وہاں ہی ملا تھا جہاں کا اس نے کہا تھا۔ گرین کلر کی اے ٹی ایم مشین کے پاس......سبین کی نظریں اس سے ملیں تو وہ جو وہاں نجانے کب سے کھڑا تھا منہ میں پھنسی تیلی کو دائیں بائیں کرتا ہوا اس کے پاس آیا تھا۔

''تمھیں تو میں پہچان ہی نہیں سکا......'' اس نے ایک نظر اس کے سراپے کی طرف ڈالتے ہوئے کہا تھا۔ سبین کچھ نہیں بول سکی اور ڈینی کے سر کی گندی ہو چکی سولا ہیٹ کو دیکھنے لگی۔ الفاظ اس کے منہ میں پریشانی کے گرداب میں پھنسے ہوئے تھے۔

''سب کام ٹھیک ہے؟''

''ہاں......'' وہ بمشکل ہی یہ لفظ بھی ادا کر سکی تھی۔

''سب سمجھا دیا ہے میں نے تمھیں......ان شکلوں کو یاد رکھنا جو لوگ ہمارے ساتھ ہیں۔ غلطی سے بھی غلط مت کر بیٹھنا۔''

''ٹھیک ہے۔میں سمجھ گئی۔''

''اس ماڈل کی حفاظت خود سے بھی زیادہ کرنا......'' ڈینی نے ہاتھ میں پکڑے ماڈل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔پھراس نے ایک سبز رنگ کا ربن اس کے بیگ کے ساتھ لٹکا دیا تھا۔

''سبز رنگ......قومی پرچم کا رنگ......'' کہہ کر وہ خود ہی ہنسا تھا۔سبین کی گھگی بندھی ہوئی تھی۔''لاہور ایر پورٹ پر زیادہ دشواری نہیں ہوگی تمہیں لیکن آگے خیال رکھنا۔بے حد احتیاط کے ساتھ کام کرنا۔''

''تم نے تو کہا تھا کہ یہ کوئی ایسا بھی مشکل کام نہیں ہے۔'' وہ گھبرائی گھبرائی سی بولی۔

''مشکل کام تو سبزی کاٹنا بھی نہیں ہے لیکن نادان لوگ اسی چھری سے اپنی انگلی کاٹ بیٹھتے ہیں۔یہ بھی ایسا ہی کام ہے۔بے وقوف بنو گی تو بے وقوف لگو گی بھی......ویسی ہی لگو جیسا تمہارا حلیہ ہے۔ایک پر اطمینان اور پر اعتماد عالمہ کا......جس کا دل ہیرے کی طرح شفاف ہے اور وہ کوئی گناہ کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔'' وہ یک ٹک ڈینی کی باتیں سن رہی تھی۔

''اب سمجھ گئی ہو گی کہ میں تمہیں یہ حلیہ اختیار کرنے کو کیوں کہا ہے۔''

سبین نے اپنے سراپے کی طرف دیکھتے ہوئے بے اختیار سر ہلایا تھا۔

''کیا مجھے واپسی پر پیسے مل جائیں گے؟'' وہ نیو یارک تسلی کر کے جانا چاہتی تھی۔اگر ڈینی ہر چیز کی تسلی کر رہا تھا تو بہتر تھا کہ وہ بھی کر لیتی......ڈینی اس کے سوال پر مسکرایا تھا۔وہ جانتا تھا کہ اس وقت سبین کے دل و دماغ میں کیا کیا چل سکتا ہے۔اس کے دانتوں میں پھنسی ماچس کی غلیظ تیلی اس کی مسکراہٹ پر باہر آنے کو لپکی تھی۔سبین نے اپنی ابکائی کو بمشکل روکا تھا۔

''میں مر بھی جاؤں گا تو تمہیں تمہارے پیسے مل جائیں گے لڑکی......یہ کام ایسا شفاف ہے۔''زبان دینے'' کی اہمیت کیا ہوتی ہے وہ میں نے اسی کاروبار سے سیکھی ہے۔تمہیں بھی میں ''زبان'' دے چکا ہوں۔بالکل فکر مت کرو۔لوگوں نے تو اس کام کو ایسے ہی بدنام کر رکھا ہے۔بھلا کوئی چیز ایک ملک سے دوسرے ملک لے کر جانا ایسا کون سا گناہ ہے۔یسوع پوچھے ان قانون بنانے والے کم عقلوں سے......'' سبین ان کم عقلوں پر لیکچر سننے موڈ میں نہیں تھی۔

''لیکن پیسے اسی شرط پر ملیں گے جو تم نے مجھ سے طے کی ہے۔تمہیں کم از کم دس بار ہمارے کہنے پر وہاں وہاں جانا ہو گا جہاں جہاں ہم کہیں گے۔اس کے بعد تم آزاد ہو گی۔چاہو تو کام کرو......چاہو تو نہ کرو......اور تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں۔'' ڈینی نے آنکھ ماری۔''لوگ ہمیں چھوڑ کر نہیں جاتے۔بلکہ کچھ لڑکے لڑکیاں تو اپنی شناخت بدلنے کے لیے پلاسٹک سرجری تک کروا لیتے ہیں۔'' وہ رکا، سبین جلدی سے کچھ کہنے ہی والی تھی کہ وہ پھر سے بول اٹھا۔وہ جانتا تھا کہ وہ کیا پوچھنے والی ہے۔

''لیکن اس ایک چکر کے جتنے پیسے طے ہیں اس کا چوتھا حصہ تمہیں مل جائے گا اور تم جانتی ہو کہ وہ چوتھا حصہ بھی کس قدر

زیادہ ہے۔تمہارے سارے غم دور کردے گا۔" ڈینی نے "سارے" کو کھینچتے ہوئے کہا تو سبین کانپ کر رہ گئی۔ڈینی کیا کیا جانتا تھا؟

"اب جاؤ......روانگی کا وقت قریب آ رہا ہے۔" ڈیپارچر لاؤنج میں لگی دیوہیکل گھڑی اور پھر فلائٹس کے شیڈول کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ڈینی کے حکم پر سبین کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں آگے بڑھی تھی۔

"اور سنو......"اس کی پکار پر سبین پھر سے رکی۔جیسے وہ یہ ہی تو چاہتی تھی کہ کوئی اسے روک لے، آگے بڑھنے سے...... اور بلا لے۔واپس پیچھے کے راستوں پر......

"تمہیں بیلا ڈونا کا نام دیا گیا ہے۔وہاں سب تمہیں اسی نام سے پکاریں گے۔"

"اس نئے نام کی کیا ضرورت تھی؟"

"بس کارزل کے کام ہیں یہ سب......یاد رکھنا......بیلا ڈونا......" ڈینی نے پھر سے نام کے ہجوں پر زور دے کر کہا۔

"لیکن اس کا مطلب کیا ہے؟" جاتے جاتے وہ ایسے ہی پوچھ بیٹھی۔ڈینی کے ہونٹوں پر بے اختیاری مسکراہٹ مچلی تھی۔

"زہریلا پھول......"

ڈینی کے منہ سے مطلب جان کر سبین کے چہرے کے رنگ اڑ گئے تھے۔

☆......☆......☆

ربیکا کو سینی ٹوریم بھیجنے کے لئے میران کو بہت سی قربانیاں دینی پڑی تھیں۔اس نے والی بال کو خیرباد کہہ دیا تھا اور ایک ساتھ دو دو جابز کرنے لگا تھا۔دن کے وقت وہ ایک پیکنگ فیکٹری میں کام کرتا تھا اور رات میں ایک کلب میں بارٹینڈر کی جاب، جہاں اسے رات گئے تک کام کرنا پڑتا تھا۔وہاں سے گھر آ کر وہ سو جاتا تھا۔پھر صبح جلدی اٹھ کر خود ناشتا بناتا تھا۔وہ والا ناشتا جو ریڈی میڈ ہوتا تھا اور جسے جلدی میں رہنے والے لوگوں کے لئے ہی فیکٹریز میں بنا کر بیچا جاتا تھا۔یہ روکھا پھیکا ناشتا اس وقت اور بدمزا ہو جاتا تھا جب اسے اکیلے بیٹھ کر کھانا پڑتا تھا۔

یہ سب بہت عجیب تھا۔تھکا دینے والا......اور اس سے بھی زیادہ رلا دینے والا۔

وہ لاؤنج میں پڑی اس راک چیئر کو اکثر ہی دیکھتا رہتا تھا جس پر ربیکا شام میں بیٹھ کر اس کے باپ کو تفصیل سے یاد کیا کرتی تھی۔

"تمہیں پتا ہے میران......میری گرینی ہوا کرتی تھی۔کیتھرین......وہ بہت اچھی خاتون تھیں۔وہ اکثر دعا کیا کرتی تھیں کہ حضرت عیسیٰ کی آمد ان کی زندگی میں ہو جائے۔وہ عیسیٰ کا دیدار کریں، ان سے باتیں کریں۔مجھے سلاتے ہوئے تھپکتے ہوئے ان کے لبوں پر ہمیشہ ہی دعا ہوا کرتی تھی۔پتا نہیں ان کی یہ دعا کیسے میری بھی آرزو بن گئی۔تم تو جانتے ہو نا کہ بچپن کے خواب،

دن اور باتیں انسان کے شعور میں کیسے چٹانوں کی طرح بسیرا کر لیتی ہیں۔

پھر جب میں پہلی بار عیسیٰ سے ٹکرائی اور میں نے عیسیٰ کو دیکھا تو مجھے ایسے لگا کہ گرینی کی ساری دعائیں اور میری آرزوئیں پوری ہوگئی ہوں۔ وہ اتنا سادہ، اتنا چپ، اتنا روشن تھا کہ اس بات سے انکار کی گنجائش ہی نہیں رہتی تھی کہ انسانوں کی بستی میں وہ کوئی فرشتہ بن کر نہیں اترا ہے۔"

ربیکا اسے بتاتی تھی کیونکہ اس کے پاس میران کے علاوہ سننے والا اور کوئی نہیں تھا۔ سوسائٹی میں ربیکا کی کوئی سہیلی نہیں تھی۔ اس کے سوتیلے بہن بھائی بھی عرصہ ہوا اسے نفسیاتی مریضہ کا خطاب دے کر چھوڑ چکے تھے۔ ماں باپ مر چکے تھے۔ ایسے میں صرف میران ہی بچتا تھا اور میران نے یہ سب اتنی بار اور اتنی جزئیات کے ساتھ سنا تھا کہ اب سب اس کے سامنے کسی رٹی رٹائی فلم کی طرح چلتا تھا۔

"کوئی ماننے کو تیار ہی نہیں تھا کہ وہ پاکستان کا کوئی شہزادہ نہیں ہے۔ وہ باہر گارڈن میں صفائی کر رہا ہوتا تھا تو پڑوس کی عورتوں کو بھی تب ہی باہر کام پڑتے تھے۔ آتش دان کی لکڑیاں کاٹتے وقت تو مجھے باقاعدہ اس کی نگرانی کرنی پڑتی تھی۔ اسے عادت نہیں تھی نا کام کرتے ہوئے شرٹ پہننے کی...... میری پڑوسنوں نے تو وہ دن بھی یاد کر رکھے تھے جب جب وہ آتش دان کے لیے لکڑیاں چھوٹی کرتا تھا۔ میں تو باہر لگی تاروں پر چادریں ہی تانتی رہتی تھی کہ میرے علاوہ کوئی عیسیٰ کو اس حالت میں نہ دیکھے۔"

ربیکا یاد کرتے ہوئے ہنستے ہوئے بتاتی تھی اور سب بتاتے بتاتے ایک دم سے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی تھی۔

میران کے لئے سب اعصاب شکن تھا لیکن اب ربیکا اس گھر میں نہیں تھی۔ اسے اس کے باپ کے بارے میں بتانے والا کوئی نہیں تھا۔ پھر بھی خالی گھر میں جیسے ربیکا کی آواز گونجتی رہتی تھی۔ وہ ٹی وی کی آواز اونچی کر دیتا تھا۔ پھر بھی اسے لگتا راک چیئر پر کوئی بیٹھا رو رہا ہے۔ رو نہیں رہا تو اس طرح ہنس رہا ہے کہ سننے والے کا رونا نکل رہا ہے۔ ربیکا کی غیر موجودگی کے یہ دن اس کے ساتھ سے زیادہ اذیت ناک تھے۔

ایک ماہ کے بعد وہ پہلی بار ربیکا سے ملنے گیا تھا۔ اس دوران اس کا جتنا بھی علاج ہوا تھا اس کا کوئی بھی واضح فرق اسے محسوس نہیں ہوا تھا۔ ہسپتال والوں کی طرف سے شکایت ملی تھی کہ ربیکا علاج کروانے میں تعاون نہیں کر رہی ہے۔ وہ ربیکا کے پاس گیا تھا۔ اس نے ربیکا کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ وہ علاج کے سلسلے میں ڈاکٹرز کا ساتھ دے۔ ان کی باتیں مانے، ان کے ساتھ تعاون کرے کیونکہ اسے ہسپتال کے اخراجات چکانے میں بہت زیادہ محنت کرنا پڑ رہی تھی۔

"ہم پر بہت قرض چڑھ رہا ہے ممی......"

"تم فکر نہ کرو...... عیسیٰ کی جائیداد بک جانے دو، ہمارے حالات بہتر ہو جائیں گے۔ اس کے چچا نے اس کا حصہ دینا

ہے۔ پچا......" وہ خلاؤں میں گھورنے لگی تھی۔ ربیکا ابھی بھی وہاں ہی تھی۔

"میں پاکستان گیا تھا ممی......" بالآخر ایک دن اس نے ربیکا کو بتا دیا تھا۔ جو وہ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ ربیکا پہلی بار چونکی تھی۔

"میں نے وہاں پاپا کو تلاش کیا۔"

"پھر......" ایک ذرا سا لفظ اس نے کس قدر بے قراری اور دیوانگی سے کہا تھا میران جانتا تھا۔ یہ عورت اگر اس کی ماں نہ بھی ہوتی تو اس کے لیے اس کے باپ ترس ہی ترس تھا۔ اس سے تو بہت اچھا تھا کہ اس کا باپ اس سے اس قدر محبت کرنے کے بجائے بے وفائی کر جاتا، اسے دھوکا دے جاتا۔ اس طرح اسے قرار تو آ جاتا۔

"ان میں سے اب کوئی بھی نہیں بچا ممی......سب کو خدا نے ان کے کیے کی سزا دے دی ہے۔"

"عیسیٰ جیسے فرشتے پر گولی چلائی تھی انہوں نے...... ایسا تو ہونا ہی تھا ان کے ساتھ۔" ہمہ تن گوش ربیکا بڑبڑائی تھی۔ میران اس کے اگلے ردعمل کا انتظار کرنے لگا۔ کیا یہ بہتری کی طرف پہلا قدم تھا۔

"اور اگر عیسیٰ کو تب کچھ ہو جاتا تو تم دیکھتے کہ وہ لوگ دنیا میں ہی کیسے جہنم میں جلتے۔"

میران نے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔ تو یعنی اس کی کسی بھی کوشش کا کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا اور نہ ہی آگے ہونے والا تھا۔ وہ سمجھ نہ سکا کہ کوئی کسی کو اتنی ایمان داری سے کیسے چاہ سکتا ہے۔ کوئی محبت میں ایسا باوفا ہو سکتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد بھی اس کی محبت کی جدائی کا یقین نہ کرے۔

وہ وہاں کے ڈاکٹر سے ملا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان کا مزید بہتر طریقے سے علاج کیا جائے۔ پیسوں کی پروانہ کرتے ہوئے۔ علاج چھ ماہ سے ایک سال تک پہنچ سکتا تھا۔ اس کی آخری ملاقات ربیکا سے جنوری کے مہینے میں ہوئی تھی۔ تب اس کی حالت کافی بہتر ہو چکی تھی۔ اس کا نفسیاتی علاج بھی ہوا تھا۔ وہ واحد ملاقات تھی جب اس نے میران سے عیسیٰ کی بات نہیں کی تھی اور بس یہ ہی کہے جا رہی تھی کہ وہ اسے واپس نیویارک لے جائے۔

"سب آپ کے علاج کے لئے ہی ہو رہا ہے ممی......بس کچھ عرصہ اور یہاں رہ لیں۔"

"مجھے اپنے گھر جانا ہے۔ میں یہاں سے اکتا چکی ہوں میران۔" سینی ٹوریم میں ہی ربیکا کو اندازہ ہو چکا تھا کہ میران نے بورڈنگ میں اپنی تعلیم کس طرح مکمل کی ہوگی۔ جب وہ اسے ملنے ہی نہیں جاتی تھی۔ بھول ہی گئی تھی کہ اس کا کوئی بچہ بھی ہے۔ جسے توجہ کی ضرورت ہے۔ میران نے اتنے سال کس خاموشی سے گزار دیئے تھے۔ وہ اپنے باپ پر گیا تھا۔ جس نے بڑے بڑے دکھ اپنی چپ کے چادر تلے لپیٹ لیے تھے۔

"یہاں کا ماحول کافی دوستانہ ہے۔ بس تھوڑے دن اور......میری خاطر۔"

''میران کے لیے جاؤ یہاں سے...... ہمارے بچے کے لیے۔'' پچیس سال پہلے کی ایک التجا ربیکا کے کانوں میں گونجی تھی۔ ربیکا خاموش ہوگئی۔ یہ آمادگی کی طرف اشارہ تھا۔

☆......☆......☆

اور جیسا ڈینی نے کہا تھا۔ پاکستان ایئرپورٹ پر سبین کو زیادہ دشوار کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ اس کے بیگ پر لگے سبز ربن کو دیکھ کر اس کی کوئی خاص چیکنگ نہیں ہوئی تھی۔ تاہم ایک دو لڑکیوں نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا ضرور تھا۔ ان کی اب تک کی جاب میں سبین پہلی لڑکی تھی جو اسمگلنگ کرنے جارہی تھی۔ ورنہ اس سے پہلے تک انہیں اس کام میں لڑکے ہی ملوث نظر آئے تھے۔ وہ جو خود رشوت لے کر اسے بنا چیکنگ کے جانے دے رہی تھیں۔ اسے ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے سبین پکی دوزخی ہو اور ان کی رشوت تو جنت کا ہی کوئی لین دین ہو۔ سبین ان کی نظروں کی تاب سے خود میں سمٹ گئی تھی۔

ڈیپارچر لاؤنج میں وہ نجانے کتنی دیر تک بیٹھی رہی تھی۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد وہ اس وقت چونکی تھی جب ہال کے اسپیکر پر اس کا نام دوسری بار پکارا گیا تھا۔ اس نے اپنا نام سن لیا تھا لیکن وہ اٹھ نہیں سکی تھی۔ انسانی جسم سے وہ موم میں ڈھلی ہوئی وہاں بیٹھی لمحہ بہ لمحہ پگھل رہی تھی اور اپنا نام سن کر ساری بکھری موم کو اکٹھا کر کے وہاں سے اٹھنا اسے ناممکن لگ رہا تھا۔

''اٹھ جاؤ سبین۔ تمہاری فلائٹ کا ٹائم ہوگیا ہے۔'' ہال کے فرش پر موپ پھیرتے ایک ورکر نے سرگوشی کرتے ہوئے اسے اٹھنے کے لئے اکسایا تھا۔ سبین نے چونک کر ورکر کی طرف دیکھا تھا اور اسے لگا ساری دنیا اس کام میں ملوث ہے۔ سب ہی کہیں نہ کہیں، اندر ہی اندر P.360 کے لئے کام کر رہے ہیں۔

''اٹھو......اب سوچنے کا وقت گزر گیا ہے۔'' ورکر نے پھر سے کہا تھا۔

ڈینی کا انتظام اعلا تھا۔ سبین نے دل ہی دل میں اس کے کام کی کاملیت کی داد دی تھی۔ ہال سے نکل کر وہ لمبی راہداری کی طرف بڑھی تھی اور پھر جہاز میں سوار ہوگئی تھی۔

بارہ گھنٹے کی طویل مسافت کے بعد وہ نیویارک شہر آئی تھی۔ وہ شہر جسے چرچوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے، کلبوں کا شہر، تھیٹروں کا شہر، روشنیوں کا شہر، ہجوم کا شہر بھی......اور جسے سب ''منی ورلڈ'' (چھوٹی دنیا) بھی کہتے ہیں۔

سبین اس شہر کو کیا کہنے والی تھی؟ جہاں اس کی بربادی کے سارے اسباب موجود تھے۔

ڈینی نے اسے بتا دیا تھا کہ اول تو کوئی گڑبڑ ہوگی نہیں......اور اگر ہو بھی گئی تو اسے کیا کرنا ہے۔ شک پڑ جانے پر وہ اس کے سامان کی تلاشی لیں گے۔ ظاہری سی بات ہے کہ وہاں سے کچھ بھی نہیں نکلے گا۔ پھر وہ اس کے ہاتھ میں پکڑے طغرے کو جانچیں گے اور وہاں ہی سے اسے اپنی اداکاری کا آغاز کرنا ہے۔

اگر کتا اس طغرے کو سونگھے تو اسے بری طرح بولنا ہے کہ وہ اس ناپاک جانور کو اس مقدس چیز کے قریب بھی بھٹکنے نہیں دے سکتی......اور اگر وہ اس طغرے کو توڑنا چاہیں تو اسے چلانا ہوگا کہ وہ اسے شہید نہیں کر سکتے......بس اتنا سا کام تھا۔ جو اسے اچھی طرح سمجھا دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کرنا تھا۔ جو وقت آنے پر اسے کرنا تھا اور جو اس نے اچھی طرح سیکھ لیا تھا۔ وہ ہر طرح سے مطمئن ہو کر آئی تھی لیکن پتا نہیں کیوں یہاں آ کر اس کا دل گھبرانے لگا تھا۔

چیکنگ کے دوران وہ دوسری لائن میں تھی۔ جب اس کی پشت پر ایک ہاتھ پڑا تھا۔ ایک سرد مہری سی لیڈی نے آنکھوں سے اشارہ کر کے اسے اپنے پاس آنے کو کہا تھا۔ اس نے کمال مہارت سے اپنی لائن بدل لی تھی اور چیکنگ کے لیے اسی لیڈی کے پاس گئی تھی۔

طغرے کو جانچا گیا تھا۔ لیڈی نے قریب کھڑی دوسری لیڈی کو مسکراتے ہوئے وہ طغرا دکھایا تھا۔ سبین نہیں سمجھ سکی کہ وہ کیا کہہ رہی تھیں۔ اللہ کے بعد اس کے پاس بس ڈینی کا ہی سہارا تھا لیکن وہ جس طرح مسکرا رہی تھی اس سے ظاہر تھا کہ وہ اس کے بنائے طغرے کی تعریف کر رہی تھیں۔

سبین بمشکل مسکرائی تھی۔ ایک آفیسر جس نے چیکنگ کرتی لیڈیز کو مسکراتے اور سبین کے چہرے کے تاثرات پڑھ لیے تھے سب کو نظروں ہی نظروں میں تولا تھا اور پھر سبین کے پاس آیا تھا۔ اسے دیکھ کر دونوں لیڈیز برف کی ہو گئی تھیں۔ سبین سمجھ گئی تھی کہ وہ آدمی ''ٹیم'' کا حصہ نہیں ہے۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے آتے ہی سبین سے طغرے کی بابت پوچھا تھا۔

''یہ ایک اسلامی تحفہ ہے۔ سینٹ جین چرچ کے لیے......میرے استاد محترم نے اسے اپنے ہاتھوں سے بنا کر بھیجا ہے۔ ہم لوگ دنیا بھر میں امن کا پیغام پھیلاتے ہیں۔ دنیا بھر کے لوگوں کو امن کی طرف لاتے ہیں۔ ہماری ایک تنظیم ہے جسے امریکا سے پچھلے ہی دنوں اجازت نامہ دیا گیا ہے۔ میں اس تنظیم کی طرف سے بھیجی جانے والی پہلی لڑکی ہوں۔'' وہ اندر ہی اندر اس قدر گھبرا گئی تھی کہ اپنے بیگ میں سے تنظیم کی منظوری کا کارڈ بھی نکال کر دکھانے لگی تھی۔

پتہ نہیں یہ اس کی معصومیت تھی یا اس کا مؤدب انداز......کہ آفیسر ایک اچٹتی سی نگاہ اس پر ڈال کر چلا گیا تھا۔

ساری جانچ پڑتال سے گزر کر وہ ایئرپورٹ سے باہر نکلی تھی اور باہر نکلتے ہی اس نے کھل کر ایسے سانس لی تھی جیسے پیدائش کے وقت سے اب تک کسی دم گھٹنے والے غار میں زندگی گزار کر آئی ہو۔ ایک سانس سے اس کا گزارہ نہیں ہوا تھا تو وہ تیزی سے مزید سانسیں لیتے ہوئے کتنی دیر تک وہاں ہی کھڑی رہی تھی۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ وہ تازہ دم ہو گئی تھی۔ جیسے کالج سے آنے کے بعد اماں کے ہاتھوں کی دم والی چائے پی لینے کے بعد ہو جایا کرتی تھی۔

نیو یارک کی ہوا تو ویسے بھی بہت تازہ ہوتی ہے جو لاہور میں کم ہی میسر آتی ہے اور گن پت روڈ والے تیز ٹریفک کے علاقوں میں تو بالکل ہی خال خال...... اسے ایسا لگا تھا جیسے وہ کسی پہاڑی جھرنے کے ساتھ ساتھ بہنے لگی ہو۔

''تو یہ کام اتنا آسان تھا۔'' تازگی کے ساتھ ساتھ یہ تازہ سوچ بھی اس کے اندر آئی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور بے اختیار ہی مسکرا اٹھی۔ وہ سمجھی تھی کہ پتا نہیں کتنی سختی ہوگی۔ خوف جو چوبیس گھنٹے سے اس کے ساتھ تھا ایک دم سے کافور ہو چکا تھا۔ نیو یارک کی اجلی دھوپ میں سب نکھر گیا تھا۔

باہر نکل کر وہ اس ٹیکسی کو تلاش کرنے لگی جس کا ڈینی نے اسے بتایا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک ٹیکسی ڈرائیور خود ہی چل کر اس کے پاس آ گیا تھا اور اس نے اس کا سامان اپنے ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

☆......☆......☆

ٹیکسی ڈرائیور نے اسے ایک سنسان سے علاقے میں ایک پرانے سے گیسٹ ہاؤس کے باہر اتار دیا تھا۔ جسے دیکھ کر ہی اسے عجیب طرح کے خوف کا احساس ہوا۔ صحرات میں جیسے کوئی اندھا کنواں...... تھوک نگل کر اس نے خود کو سنبھالا، کیونکہ اب اسے اگلے پندرہ روز یہاں ہی قیام کرنا تھا۔ طغرا اور اپنا باقی سامان پکڑ کر وہ اندر چلی گئی اور دھک سے رہ گئی۔ باہر سے نظر آتا بنجر سا گیسٹ ہاؤس اندر سے اس قدر عالی شان تھا کہ پل بھر میں وہ جیسے زمین کی تہ سے پہاڑی علاقوں کی دلفریب منظر میں پہنچا دی گئی ہو۔ مبہوت ہو کر وہ چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اس کے اندر پہنچتے ہی سفید اور سیاہ وردی میں ملبوس گیسٹ ہاؤس کا ایک ورکر اس کی طرف بڑھا تھا۔ جس نے اس کا سامان پکڑ لیا تھا اور اسے دوسری منزل پر موجود ایک کمرے کے اندر پہنچا دیا گیا۔ اسے کسی قسم کی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔

کمرہ اتنا شاندار تھا کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ کبھی زندگی بھر ایسے کسی کمرے میں قیام کر سکتی ہے۔ پردے، صوفے، قالین، بیڈ، کرسی، آئینہ...... سب ان گھر کی سجاوٹ والی کتابوں سے کہیں بڑھ کر تھا جسے وہ اور زویا انارکلی کی پرانی کتابوں کے اسٹال سے دیکھا کرتی تھیں۔ یہ سب تو کوئی الگ ہی جہان تھا۔ ڈینی کی کہی ہر بات سچ ثابت ہو رہی تھی۔

دھم سے وہ نرم گداز بیڈ پر گری اور سامنے لگے سنہرے چوکھٹے میں جڑے آئینے میں خود کو دیکھنے لگی، تو اس نے پا لیا تھا وہ سب جو وہ چاہتی تھی۔ مسکراہٹ نو وارد چور کی طرح اس کے ہونٹوں پر وارد ہوئی تھی۔

لمحے بھر بعد ہی دروازے پر دستک ہوئی تو وہ اپنے خوابوں کی حسین دنیا سے واپس لوٹی۔

''کون ہے؟'' دستک کے جواب میں اس نے پوچھا تھا۔

''بیلا ڈونا......'' جواباً گمبھیر آواز میں کہا گیا تھا۔ یہ اشارہ تھا کہ وہ ''ٹیم'' کا آدمی ہے۔ سبین نے دروازہ کھول کر استفہامیہ

نظروں سے دروازے کے سامنے کھڑے سر جھکائے اس سیاہ فام کو دیکھا تھا۔

''ماڈل......؟''

''اوہ۔'' کمرے کی ستائش میں وہ اہم کام تو بھول ہی گئی تھی۔ ماڈل اس سیاہ فام کو پکڑا کر اس نے دروازہ بند کر لیا اور ایک سکون کی سانس لی تھی۔ پھر ڈینی کا نمبر ملا کر اس نے ساری بات اسے بتا دی تھی۔

''اب تم جلدی سے دوسرا ماڈل تیار کر لو......ریسپشن پر کال کر کے ورکر کو بلا لو......وہ تمہیں دوسرے روم میں لے جائے گا۔ تمہارے کام کی ہر چیز وہاں موجود ہے۔ اگلی بار نیا ماڈل بنا دینے کے بعد تم پرانا ماڈل دو گی۔ میں نے کارزل کو ساری بات سمجھا دی تھی لیکن وہ شاید ٹھیک سے سمجھا نہیں۔''

''کارزل کون ہے؟'' وہ ایسے ہی پوچھ بیٹھی۔

''تمہیں اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ ایسے کاموں میں اتنا ہی شامل ہو جتنی تمہیں ضرورت ہے۔'' ڈینی کا لہجہ اگرچہ خراب تھا لیکن وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ سبین کو کام اور پیسے کے علاوہ کسی بھی اور بات سے سروکار نہیں رکھنا چاہیے تھا۔

''جلدی سے دوسرا ماڈل بنا لو۔''

''میں تھک گئی ہوں ڈینی......سونا چاہتی ہوں۔ میں دو راتوں سے جاگ رہی ہوں۔''

''پولیس کو بھنک بھی پڑ گئی تو وہ یہ نہیں دیکھے گی کہ تم تھکی ہوئی ہو۔ تمہیں بعد میں گرفتار کرنا ہے۔''

کال منقطع ہو گئی تھی۔

اس کے مطلب کا سارا سامان دوسرے کمرے میں موجود تھا۔ چونا، سانچے سب کچھ......جلدی سے پانی میں چونا گھول کر اس نے لوحِ قرآنی کے ایک سانچے پر آمیزہ ڈالا تھا۔ پھر اسے اوون میں خشک کر لیا تھا۔ ورکر سے کہہ کر اسے شیشے میں کور بھی کروا لیا تھا۔ بالکل پہلے والے ماڈل ہی کی طرح...... یہ سب کام گیسٹ ہاؤس میں ہی ہوا تھا۔ ماڈل ایک گھنٹے کے اندر اندر تیار تھا۔ ورکر اسے شیشے میں فریم کروا کر پھر سے اس کے پاس دے گیا تھا۔ اس سارے کام اور لڑکے کے انتظار میں وہ بہت زیادہ تھک گئی تھی۔ اسے پرسوں رات سے نیند آ رہی تھی۔ وہ دو راتوں کی جاگی ہوئی تھی۔ ایئرپورٹ اور پھر فلائٹ میں ہر دم چوکنا رہنے سے اس کے اعصاب شل ہو گئے تھے۔ وہ سکون سے شاور لینا چاہتی تھی۔ اطمینان سے کپڑے بدل کر سو جانا چاہتی تھی لیکن واپس اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ دھم سے بیڈ پر گر گئی اور گھنٹوں بے حس و حرکت ایسے ہی پڑی رہی۔ جو کام کرتے ہوئے، کرنے سے پہلے، کرنے کا سوچتے ہوئے، کرتے وقت اس کو گھبراہٹ نہیں ہوئی تھی۔ اب جب وہ سب کام کر چکی تھی تو ان لمحوں کی ساری گھبراہٹ ایک دم سے اس کے پاس آ گئی تھی۔ اس کا دل اس بری طرح دھڑکنے لگا تھا کہ اسے لگا یہ سینے سے باہر آ جائے گا اور اس پر ہنسنا شروع کر دے گا۔

وہ اتنا رونا چاہتی تھی کہ اس سنسان جگہ پر ایک جھیل بنا سکتی تھی۔

بنا کپڑے تبدیل کیے، بنا شاور لیے وہ لیٹ گئی اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ سونے کی زبردستی کوشش تھی۔

''گھوگھو......گھوگھو......'' اور تب ہی ایک آواز اس کے کانوں میں اتری تھی۔ جھٹکے سے اس نے اپنی دونوں آنکھیں کھولی تھیں۔

''گھوگھو......گھوگھو......'' یہ جانی پہچانی نفرت انگیز چکی چلنے کی آواز......کہاں سے آ رہی تھی یہ آواز......؟ کمرے میں تو خاموشی تھی اور باہر تاریکی......شب باش حشرات اپنا راگ الاپ رہے تھے۔ ایسے میں اسے چکی چلنے کی آواز اس قدر تیز انداز میں سنائی دے رہی تھی کہ اس کے کانوں کے پردے پھٹنے والے ہو گئے تھے۔

''گھوگھو......گھوگھو......'' وہ ہڑبڑا کر بیڈ پر سے اٹھی۔ بند کھڑکیوں کو ایک بار پھر سے بند کیا۔ پردے آگے کر کے برابر کیے۔ دروازے کے لاک کو چیک کیا۔ اس ذرا سے کام میں وہ پسینے پسینے ہو گئی تھی اور ''گھوگھو'' کی آواز تھی کہ رکنے میں نہیں آ رہی تھی۔ اس نے غسل خانے کو کھول کر دیکھا۔ بیڈ کے نیچے جھانکا، وارڈ روب کا ایک ایک پٹ کھول کر اندر جھانکا۔ سب خالی تھا۔ صرف ایک اس کے ضمیر کا کواڑ کھلا ہوا تھا۔ جہاں وہ دیکھنا بھول گئی تھی۔

''گھوگھو......گھوگھو......'' وہ آواز کے ماخذ کو نہ پا سکی تو اس نے اپنے کانوں پر سختی سے ہاتھ رکھ لیے اور چلا اٹھی۔

''اماں بند کر دو چکی مجھے سونا ہے۔'' وہ بالکل ایسے ہی چلائی تھی جیسے گن پت روڈ پر موجود اپنے چھوٹے سے گھر کے، چھوٹے سے کمرے میں چنیوٹ کے پرانے بیڈ پر لیٹی چلائی تھی۔

''اماں بند کر دو چکی......'' وہ اور طاقت سے چلائی۔ لیکن یہ گن پت روڈ نہیں تھا۔ یہ تو نیو یارک تھا۔ چھوٹے گھر کے برعکس کمرا اتنا بڑا تھا کہ انسان خود کو گم کر لے۔ بیڈ بھی کس قدر شاندار تھا۔ پھر اسے نیند کیوں نہیں آ رہی تھی؟ صرف ایک چکی چلنے کی آواز اسے تنگ کر رہی تھی؟

''چکی تو بند ہے میں تو باورچی خانے میں ہوں۔'' وہاں اماں کی آواز آتی تھی۔ یہاں خاموشی تھی۔ اماں کچھ نہیں بول رہی تھیں اور ان کی خاموشی کیسی چلاتی ہوئی تھی۔ سبین کا دل وحشت سے پھٹنے پر آ گیا تھا۔

''گھوگھو......گھوگھو......'' اس نے تکیے میں سر دے لیا......وہ جتنی کوششیں کر رہی تھی۔ آواز اتنی ہی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے کانوں کے اندر تک اپنی انگلیاں دے لیں لیکن آواز آنا بند نہیں ہو رہی تھی اور جب وہ اپنی ساری کوششوں سے تھک گئی تو اس نے بے اختیار ہی اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا۔

''مجھے معاف کر دو اماں...... مجھے معاف کر دو۔'' روتے روتے اس نے التجا کی تھی اور بیڈ پر ایسے گری تھی جیسے اس کی روح نے اس کے جسم سے ناتا توڑ لیا ہو۔

گھوگھو کی آواز پھر بھی بند نہیں ہوئی تھی۔ سبین جانتی تھی کہ یہ بند بھی نہیں ہوگی۔ آج پھر اسے ساری رات جاگ کر اور رو کر گزارنی تھی۔

☆......☆......☆

آسمان کے شکم میں سارا دن آگ لگا کر سورج اب راکھ اڑا دینے کے موڈ میں تھا۔ پرتحمل، بارعب سا اندھیرا چاروں طرف پھیلنے لگا تھا۔ کتھئی رنگ میں ڈوبا دن شام کے بنفشی قدح میں ڈبکی لگانے کی تیاری کر رہا تھا۔

فیکٹری میں اپنی جاب کے اوقات پورے کر لینے کے بعد میران اب کلب کی طرف جا رہا تھا۔ دوپہر کا لنچ چونکہ اسی مصروفیت کی نذر ہو جاتا تھا۔ اس لیے وہ کسی بیکری وغیرہ سے اپنے لیے کچھ ایسا خرید لیتا تھا جسے چلتے چلتے ہی کھایا جا سکے۔ آج بھی وہ سستے سے پیٹیز کھاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ چند روز بعد کلب کی ''ٹاور'' ایک ایکٹیویٹی بھی تھی۔ جس کے لیے کافی زیادہ انرجی چاہیے تھی۔ ان سب کو محض اس کی مشق ہی تھکا دیتی تھی۔ نجانے ایکٹیویٹی والے دن کیا حال ہونے والا تھا۔ لیکن میران کو خوشی تھی کہ اس ایکٹیویٹی کے ان سب کو اضافی پیسے بھی ملنے والے تھے جو ایک معقول رقم تھی۔

سیل فون کی بیل بجی تو ایک ہاتھ سے پیٹیز کھاتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ سے کال پک کر کے فون کان کے ساتھ لگایا تھا۔

''میران عیسیٰ......؟'' استفہامیہ پوچھا گیا تھا۔

''جی......''

''آپ کی والدہ ربیکا عیسیٰ اب مکمل صحت مند ہیں۔ آپ انہیں واپس گھر لے کر جا سکتے ہیں۔''

''کیا......؟'' میران کو جیسے اس خبر کی صداقت پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔ ایک سال کے بعد یہ واحد خوشخبری تھی جس پر وہ دل سے خوش ہو سکتا تھا۔

اگلے ہی دن سے اس نے میری کے ساتھ مل کر ربیکا کا کمرہ تیار کرنا شروع کر دیا تھا۔ میری ان کی پڑوسی تھی۔ میران کے ساتھ کسی حد تک فرینک تھی اور اپنے کالج میں فن تعمیر کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ میران نے کچھ جوڑی ہوئی رقم سے گھر کو بھی سجانا شروع کیا تھا۔ میری کم بجٹ اعلا کارکردگی کی ثبوت دینا چاہتی تھی۔ دونوں نے سارے گھر کے وال پیپرز تبدیل کیے تھے۔ پرانے فرنیچر کو پالش کیا تھا۔ کچھ چیزیں انہوں نے گھر پر ہی تیار کر لی تھیں۔ جن میں میری ماہر تھی۔ پرانی بوتلوں سے سنٹر ٹیبل بنانا، میران کی پرانی ٹی شرٹس سے کشن، کم خرچ والے فوٹو فریم، گلدان اور ڈیکوریشن پیس وغیرہ۔ اس نے کم بجٹ میں بہت عمدہ کام کیا تھا۔ گھر نے ایک نئی شکل اپنا لی تھی۔

میران بہت خوش تھا ان دنوں ......ربیکا آ رہی تھی اور سب سے بڑی بات یہ کہ ٹھیک ہو کر آ رہی تھی۔ اسے اور کیا چاہیے تھا۔

کلب میں بھی اس کے خوش کن رویے کو سب نے نوٹ کیا تھا۔

''ایسا تو محبت میں ہوتا ہے ڈیئر......کیا تمہیں محبت ہو چکی ہے۔''

نہیں......لیکن مجھے محبت ملنے والی ہے۔ اپنی ماں کی......''اس نے جذباتی ہو کر کہا تھا۔ اپنی آنے والی زندگی کی تبدیلیوں کو وہ ابھی سے محسوس کرنے لگا تھا۔

فیکٹری اور کلب وہ دونوں جگہوں پر بہت دل لگی سے کام کر رہا تھا۔ کلب میں وہ پورے ایک سال تک کچن میں ہی قید رہا تھا۔ بہت بار اس نے کوشش کی تھی کہ وہ پیٹر سے بارٹینڈر کا کام سیکھ کر بارٹینڈر بن جائے۔ کیونکہ بارٹینڈر کی تنخواہ کچن میں کام کرنے والے ورکر کی نسبت زیادہ تھی۔ پیٹر نے اسے کام سکھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ لیکن وہ ذہنی طور پر اتنی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا کہ وہ آسان سا کام بھی جلدی سے نہیں سیکھ سکا تھا اور مہینے بھر بعد جب اس نے وہ کام جیسے تیسے کر کے سیکھ لیا تو منیجر نے اس کی ایک دن کی کارکردگی کے بعد ہی اسے پھر سے واپس کچن میں بھیج دیا تھا۔

''کیا میرے کام میں کوئی خرابی ہے؟''

''خرابی کام میں نہیں میرے دوست......تمہاری اداس صورت میں ہے۔ بار میں آنے والا کوئی بھی اداس صورتیں نہیں دیکھنا چاہتا۔ لوگ خوش ہو کر ڈرنک مانگتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انہیں خوش ہو کر ڈرنک مانگتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ انہیں خوش ہو کر ہی ڈرنک پیش کیا جائے۔ تم کام تو سیکھ ہی چکے ہو۔ اب خوش رہنا بھی سیکھ لو تو بہتر ہے۔'' منیجر نے اسے وہ کام کہا تھا جو وہ اپنی پیدائش سے اب تک سیکھنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس میں ایسا کورا ثابت ہوا تھا کہ ٹھیک سے سیکھ ہی نہیں سکا تھا۔

آج بڑے دنوں کے بعد وہ پھر سے بار پر کھڑا ہوا تھا اور منیجر سمیت اس کے دوست بھی اسے دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ وہ لڑکیوں کو ہنسا رہا تھا، گنگنا رہا تھا، بار کاؤنٹر کی سطح پر مختلف کرتب کر رہا تھا۔ بوتلوں کو مہارت سے اچھال اچھال کر گلاسوں میں انڈیل رہا تھا۔

منیجر کو اور کیا چاہئے تھا بھلا......

''تم کل سے بار پر کھڑے ہو سکتے ہو......''منیجر نے اسے رات جانے سے پہلے کہا تھا۔

خوش مزاجی خوش قسمتی کی راہیں کیسے کھولتی ہے یہ اس نے تب جانا تھا۔

☆......☆......☆

بلی کے پنجوں جیسے صبح دبے پاؤں دھرتی پر اپنے قدم جما رہی تھی۔ بنا آواز پیدا کیے......مکمل خاموشی سے......اس راز

داری میں شرارت بھی ہوسکتی تھی اور چالبازی بھی...... روشن کرنیں وسوسے کی طرح تاریک گلی کوچوں میں پھیل کر انہیں روشن کر رہی تھیں۔ اس سب میں ایک راگ بھی اپنے سر اٹھا رہا تھا اور صبح کی اجلی سفیدی میں، پھوٹتی کرنوں میں، پاکیزہ خاموشی میں پھیلتا وہ راگ اپنی تمام تر خوبیوں، خامیوں کے ساتھ دلکش لگ رہا تھا۔

روئی روئی اور سوئی سوئی آنکھوں سے سبین اٹھ کر کھڑکی تک آئی تھی۔ پردے کھسکا کر اس نے باہر جھانکا تھا۔ بے پتواری راگ کی آواز لمحہ بہ لمحہ دور سے نزدیک آرہی تھی اور جب وہ بالکل سبین کی کھڑکی کے سامنے آگیا تو سبین نے دیکھا کہ وہ کوئی نوعمر لڑکا تھا۔ جو اپنی ہی مستی میں مست ماؤتھ آرگن کو منہ سے لگائے عجیب وغریب سی دھن نکال رہا تھا۔ لڑکے کی بے فکری، اس کی لاابالی، بے نیازی سب اس کی شخصیت سے عیاں تھی۔ گندے مندے حلیے، پرانے شوز، بنا اسٹائل کے بالوں والی کٹنگ میں اس کی بے فکری دیکھتے ہوئے سبین نے اس پر رشک کیا تھا۔

''کیا دنیا میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنے آپ کو ان سب چیزوں سے استثنا رکھتے ہیں۔'' اس نے اداسی سے سوچا تھا۔ ایک طرح سے اپنا اور اس لڑکے کا موازنہ کیا تھا۔ پھر نجانے اس کے دل میں کیا آئی تھی کہ اس نے کھڑکی میں پڑے گلدان میں سجے پھولوں میں سے ایک پھول نکال کر نیچے سے گزرتے اس لڑکے کی طرف اچھال دیا تھا۔ لیکن وہ لڑکا اپنے آپ پر کچھ زیادہ ہی نازاں تھا یا شاید حد سے زیادہ عاجز کہ اسے اپنے قریب پھول گرنے کا احساس تک نہیں ہوا تھا اور ماؤتھ آرگن بجاتا وہ سبین کے پھینکے گئے پھول پر پاؤں رکھتا ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔

سبین اس لڑکے کے اس رویے پر مسکراتی ہوئی غسل خانے میں چلی گئی۔

دوپہر کے قریب اسے ڈینی کی کال آئی تھی۔

''نئے ماڈل کو سینٹ جین چرچ دے آؤ...... ایرپورٹ سے نکل آئی ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اپنا کام کر چکی ہے۔ سکیورٹی کیمرہ فوٹیج کو پھر سے دیکھا جاتا ہے۔ جنہیں دوسری بار ماہرین دیکھتے ہیں اور وہ ذرا سی بھنک پڑنے پر تمہاری تلاش شروع کر دیں گے۔ ان کے لیے تمہارے روم تک پہنچنا کچھ مشکل ثابت نہیں ہوگا۔ اس لیے ماڈل کو جلد از جلد چرچ میں جا کر دے آؤ......''

ڈینی نے اسے تمام ہدایات دی تھیں۔ ڈینی واقعی اس کام کو بہت احتیاط سے کر رہا تھا۔ ایرپورٹ انتظامیہ کیا، خود سبین کو بھی نہیں پتا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے اور کیوں۔

نیا ماڈل تیار تھا۔ ریسپشن پر کال کر کے اس نے سینٹ جین چرچ کا پتا منگوا لیا تھا۔ اس بار اسے ڈرائیور نہیں دیا گیا تھا لیکن ایک اچھی رقم دے دی گئی تھی۔ باقی سب اسے خود ہی کرنا تھا۔ نہا کر، نئے کپڑے پہن کر اور ہلکا سا تیار ہو کر وہ سینٹ جین چرچ چلی گئی تھی۔ اسی چرچ کا نام اس نے ایرپورٹ پر بھی لیا تھا۔

''میں ایک ایسی تنظیم کا رکن ہوں۔جس کے ذریعے ہم پوری دنیا میں امن کا پیغام پھیلاتے ہیں۔ہم مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو ان باتوں کی طرف جمع کرتے ہیں جو مشترک ہوتی ہیں۔قرآنی حروف کا یہ طغرا اسی سلسلے کی کڑی ہے۔یہ مذہب اسلام کے ماننے والوں کا اپنے عیسائی بہن بھائیوں کے لئے تحفہ ہے۔''

اس نے ایئر پورٹ پر بولے جانے والے بیان کو یہاں بھی رٹے رٹائے طوطے کی طرح بولا تھا۔

چرچ کی انتظامیہ اس کی گفتگو سن کر متاثر ہوئی تھی اور لوح قرآنی کا نفیس تحفہ دیکھ کر مبہوت ...... سبین کو ہاں بہت عزت دی گئی تھی۔اس کے لیے کھانے کا پرتکلف انتظام کیا گیا تھا اور اس کی تنظیم کے اس ''نیک'' کام کو سراہا گیا تھا۔

چرچ سے واپسی پر اس نے ٹیکسی نہیں لی تھی۔وہ پیدل ہی چلنے لگی تھی۔اس کا ارادہ نیو یارک شہر کو دیکھنے کا تھا یا شاید اس کے کانوں میں جورات کی چلتی چکی کی آواز قید تھی وہ اسے شہر کے شور میں تحلیل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔یہاں اتنی رونق تھی کہ وہ اپنی تنہائی کو اس میں ضم کر سکتی تھی۔دن اتنا روشن تھا کہ وہ اپنی ساری تاریک راتیں اس کی جھولی میں ڈال سکتی تھی اور اتنا شور تھا کہ اس کی سب خاموشیاں نکل سکتا تھا بلکہ ختم بھی کر سکتا تھا۔

گیندے کے پھول سا وزنی، پیچیدہ اور صد برگ سا دن پوری آب و تاب کے ساتھ کھلا ہوا تھا۔اسی دن کی مسحور کن خوشبو میں وہ ہر ہر چیز کو حیران ہوتی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی۔کتنا الگ تھا نیو یارک، لاہور کی نسبت...... وہاں تھا ہی کیا۔گندی آب و ہوا، گندے مکانات، گندی گلیاں، گندے بچے، گندے در و دیوار...... اور یہاں...... اس سب کا الٹ، نتھری ہوئی ہوا، خوب صورت مکانات، روشن سیاہ سڑکیں، نفیس پیارے لوگ، اونچی اونچی عمارتیں...... ہر چیز جیسے واشنگ مشین میں ڈال کر دھو کر سجائی گئی تھی۔

کچھ فاصلے پر اس نے لوگوں کا عجیب و غریب رش سا دیکھا تو اپنا بے مقصد راستہ بدل کر وہ بھی اسی طرف ہو گئی۔

وہاں بہت سے لوگ تھے جنھوں نے ایک جیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ٹی شرٹ اور نیکر...... جن کے رنگ بھی ایک جیسے تھے۔لال اور پیلے...... اور ان پر کسی کمپنی کے لوگو کی مہریں لگی ہوئی تھیں۔ستر سے سو کے لگ بھگ وہ سارے نوجوان، صحت مند لڑکے تھے جو مسکرا رہے تھے۔جوش جن کے چہروں سے عیاں تھا اور جن کو دیکھنے کے لیے ان سے بھی دوگنا ہجوم وہاں اکٹھا ہو چکا تھا۔

سبین کو جلد ہی احساس ہو گیا کہ وہ لوگ کسی چیز کی تشہیر کرنے والے ہیں۔تشہیر کرنے کا یہ انداز وہ پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

زمین پر پہلے بارہ لڑکوں نے ایک گول دائرہ بنایا تھا۔قدرے بڑے سائز کا...... اور ایک دوجے کے کندھوں پر اپنے بازو پھیلا کر دائرے کو مضبوط کیا تھا۔ان بارہ لڑکوں کے کندھوں پر گیارہ لڑکے چڑھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔انہوں نے بھی نیچے والوں کی طرح کیا تھا۔اپنے بازو ایک دوجے کے کندھوں پر پھیلائے تھے۔اور اب گیارہ کے کندھوں کے اوپر دس لوگ چڑھ رہے

تھے۔ ان کے انداز سے ظاہر تھا کہ انہوں نے اس چیز کی بہت بار مشق کی ہے۔ اردگرد دیکھنے والے لوگ خوب انجوائے کر رہے تھے۔ وہ ہنس رہے تھے اور انہیں جوش دلا رہے تھے کہ وہ جو کر رہے ہیں کریں اور اچھی طرح کریں۔ عورتیں، مرد تالیاں بجانا شروع ہو گئے تھے۔ لڑکے، بچے سیٹیاں بجانے لگے تھے۔ لڑکیاں جو خود بھی خوب صورتی میں کسی سے کم نہیں تھیں۔ ان خوب صورت نوجوان لڑکوں کو دیکھ کر پاگل ہو رہی تھیں جن کی آدھی نیکروں اور آدھی آستینوں سے ان کی جوانیاں اور خوب صورتیاں عیاں تھیں۔ وہ ساری ''ہوہو'' کرتے ہوئے نعرے بازی کر رہی تھیں۔

سبین سب دیکھ کر مسکرا اٹھی تھی۔ یہ سب اس کے لیے نیا تھا اور دلکش بھی...... وہ اس سب سے لطف اندوز ہونے سے خود کو روک نہیں سکتی تھی۔

اب دس کے اوپر نو لوگ چڑھ رہے تھے۔ ٹاور بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ پھر نو کے اوپر آٹھ...... اوپر ہوتے ہوتے ٹاور سکڑتا جا رہا تھا۔ آٹھ کے اوپر سات لڑکے، پھر چھ، پانچ، چار، تین اور جب سب سے اوپر دو لڑکے کھڑے ہو گئے تو ٹاور کی اونچائی بہت بڑھ گئی۔ سب گردنیں اوپر کر کے انہیں دیکھنے لگے۔ سبین بھی بڑے اشتیاق سے سب دیکھ رہی تھی۔ تالیوں، سیٹیوں، ہوہو کا شور بھی بلند ہونے لگا۔ لوگ انہیں سراہ رہے تھے۔ پھر سبین نے دیکھا کہ ایک لڑکا جس کے ہاتھ میں کمپنی کے لوگو والے بہت سے غبارے تھے۔ وہ انہیں اپنی کلائی میں باندھے ہوئے اس ٹاور پر چڑھنے لگا تھا۔ شور مزید بلند ہو گیا تھا۔ لڑکا سب کے کندھوں، بازوؤں پر پاؤں رکھتا ہوا آہستہ آہستہ اوپر چڑھ رہا تھا۔ پھر چند ہی لمحوں میں وہ سب سے اوپر پہنچ کر دو لڑکوں کے اوپر کھڑا ہو گیا اور اس نے ایک نظر نیچے کے ہجوم پر ڈالی۔

سبین اپنی جگہ کھڑی کھڑی پتھر کی ہو گئی۔

لڑکے نے اپنی کلائی پر سے کمپنی کے لوگو والے غبارے ہوا میں چھوڑے تھے۔ ایک شور بلند ہوا تھا۔ لوگوں کی طرف سے اور کمپنی کے ورکرز کی طرف سے بھی......

پھر ٹاور ٹوٹنے میں چند لمحے ہی لگے۔ اطراف میں کھڑی کمپنی کی گاڑیوں نے شٹر الٹا دیئے اور سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

اب اردگرد کھڑے لوگوں کو کمپنی کی طرف سے مشروب پلایا جا رہا ہے۔ لوگ خوشی خوشی ڈسپوزیبل گلاس لے رہے ہیں۔

کچھ شوخ لڑکے تو دو دو گلاس اٹھا رہے تھے۔ بھلا مفت کا مشروب کون چھوڑتا ہے۔ چاہے وہ بدذائقہ ہی کیوں نہ ہو۔

سبین کے پاس بھی ایک ورکر آیا۔ اس کے ہاتھ میں مشروب کا گلاس تھا جو وہ سبین کو پیش کر رہا تھا۔ لیکن سبین ایک دم سے پرے ہو گئی۔ جیسے وہ کسی خیال سے چونکی تھی۔ وہ اس لڑکے کو تلاش کرنے لگی جس کے ہاتھ میں غبارے تھے اور جو سب سے اوپر تھا۔ رش اس قدر زیادہ تھا کہ وہ لڑکا اسے نظر ہی نہیں آ رہا۔ ٹاور کے لڑکوں نے ٹوٹ کر رش کو اور بڑھا دیا تھا۔ اسے ہر جگہ ایک ہی

رنگ کے لباس نظر آ رہے تھے۔ لال اور پیلے...... اور ایک ہی طرز کے کپڑے...... نیکر اور شرٹ...... ایسے میں اس لڑکے کو تلاش کرنا اس کے لئے مشکل تر ہو رہا تھا۔

لڑکوں، لڑکیوں، مردوں اور عورتوں کو کندھوں سے دھکیلتی ایک ایک کو غور سے دیکھتی وہ آگے بڑھ رہی تھی۔ کبھی واپس پیچھے ہوتی تھی۔ سب چہرے اسے ایک جیسے لگ رہے تھے۔ ایک عجیب طرح کی پریشانی نے اس کے گرد احاطہ بنا دیا تھا۔

''اگر وہ لڑکا مجھے نہ مل سکا تو......'' وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگی تھی۔ اور تب ہی اسے اپنے پیچھے سے ایک آواز سنائی دی تھی۔

''میم......'' وہ پلٹی تھی۔ اب کی بار وہی لڑکا ایک گلاس اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔ سبین لمحے بھر میں جامد ہوگئی۔ جس کی اسے تلاش تھی وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ مسکراتے چہرے کے ساتھ......

اس کے خدوخال دیکھتے ہوئے وہ کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں چلی گئی۔ ایک بار پھر سے...... اس کے چہرے کا لا ابالی پن بھرپور مردانہ وجاہت میں ڈھل رہا تھا۔ آنکھیں پہلے سے بڑی اور اس قدر روشن ہو چکی تھیں کہ سبین ان میں اپنا پورا عکس دیکھ سکتی تھی۔ اس نے اپنا ہیئر اسٹائل بدل لیا تھا اور وہ اس پر پہلے سے زیادہ جچ رہا تھا۔ اور ہونٹ...... گل مہر کے پھولوں کی طرح دہکتے ہوئے اور نمی والے سرخ...... جیسے وہ آج بھی کوئی مشروب پی کر ہونٹ صاف کرنا بھول گیا ہوں۔

وہ جوان ہو چکا تھا۔ اور اس کا بدن بتا رہا تھا کہ اس کی ذات کی تکمیل بہت نفیس اور حیادار پس منظر میں ہو چکی ہے۔

''میم......'' لڑکے نے پھر پروفیشنلی انداز سے مسکراتے ہوئے اسے پکارا تھا۔ سبین نے گلاس تھام لیا تھا۔ لڑکا اسے دیکھتے ہوئے واپسی کے لئے الٹے قدم لینے لگا تھا۔

''کیا اس نے اسے نہیں پہچانا......'' دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے سوچا۔

''میران...... مجھے پہچانو......'' اس کے اندر کوئی چلا چلا کر کہہ رہا تھا اور باہر اس کے ہونٹ ایسے سلے تھے جیسے وہ زندگی بھر ایک بھی لفظ تو نہ بولی ہو۔ میران الٹے قدم لیتا ہوا دور جا رہا تھا۔ پھر دھند میں گم ہو جانے والے منظر کی طرح وہ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا اور سبین اسے دیکھتے ہوئے بس یہی بات سوچے جا رہی تھی۔

''کیا اس نے مجھے نہیں پہچانا......؟ کیا وہ مجھے بھول گیا؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہرگز نہیں...... خدارا میں اپنے ساتھ یہ ظلم برداشت نہیں کروں گی۔''

واپس گیسٹ ہاؤس پہنچنے تک وہ یہ سب سوچتے ہوئے الجھ الجھ کر خود سے لڑنے لگی تھی۔

☆......☆......☆

''کیا ہوا......؟'' پیٹر نے مسکراتے ہوئے میران کو دیکھ کر ٹھوکا مارا۔

''کیا؟'' گیلے گلاسوں کو خشک کپڑے سے صاف کرتا ہوا میران چونکا۔

''کس کو سوچ کر مسکرا رہے ہو؟''

''کسی کو بھی نہیں......''

''جب کوئی کہتا ہے کسی کو بھی نہیں......اصل میں تب ہی کوئی ہوتا ہے۔''

سینٹ جین چرچ......لیکسنٹن ایونیو سے واپسی پر میران بہت چپ چپ انداز میں کام کر رہا تھا۔اندر ہی اندر مسکرا رہا تھا اور اپنی خوشی کو چھپا رہا تھا۔یہ دونوں چیزیں بھید بھری تھیں۔اس کے دوست پیٹر نے یہ بات نوٹ کی تھی۔

''لگتا ہے آج ٹاور کی ایکٹیویٹی نے تمہیں کچھ زیادہ ہی مسرت بخشی ہے۔'' پیٹر کے ساتھ جیکسن بھی آملا تھا۔میران جو ہمیشہ گہری اداسی میں کھویا رہتا تھا۔اب اجلی مسکراہٹ میں مگن تھا۔ایسے میں دونوں کی حیرت فطری تھی۔دونوں اس کی مسکراہٹ کی اصل وجہ جاننے کی کوشش کر رہے تھے۔

''میران آج کل اس لیے بھی خوش ہے کہ اس کی والدہ پورے چودہ ماہ کے بعد گھر واپس آرہی ہیں۔'' جیمی نے اعلان کرنے کے سے انداز میں سب کو بتایا۔

''یہ تو واقعی خوشی کی بات ہے۔''

''مبارک ہو دوست......''

''شکریہ......مجھے بدھ کے روز انہیں لینے جانا ہے۔''

وہ بدھ کے روز کو دنوں کے حساب سے نہیں گن رہا تھا بلکہ اس دن میں حائل سیکنڈز تک کو ایک ایک کر کے گن رہا تھا۔ ربیکا صحت مند ہو کر گھر آنے والی تھی۔اس سے بڑی خوشی اس کی زندگی میں بھلا اور کیا ہو سکتی تھی۔ایسے میں ایک اور چیز نے اسے خوش کر دیا تھا۔سبین کا سامنا ہونے سے......

اسے کہاں اندازہ تھا کہ نیویارک شہر میں اس کا سامنا کبھی اس لڑکی سے بھی ہو سکتا ہے جس سے وہ لاہور کے ایک گنجان بازار میں ملا تھا اور اس نے اس کے تین تاج محل توڑ دیئے تھے۔کیا وہ لڑکی ان تاج محل کی قیمت لینے یہاں تک آگئی تھی؟

''جیکسن کیا تم پائن ایپل اور اورنج جوس تیار کرو گے۔ایک ایک گلاس......؟'' میران نے کہا۔اس کی آنکھوں میں جگنو سے روشن تھے۔

''سیٹر ڈے نائٹ ہے میرے دوست......نابالغوں کی انٹری بند ہے۔آج کون جوس کو پوچھے گا۔''

''بس ہے کوئی......'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ ''وہ آج ضرور آئے گی۔'' اور یہ بات اس نے جیکسن سے زیادہ خود سے کہی تھی۔

☆......☆......☆

کچھ لوگوں سے ہماری شناسائی عالم ارواح میں ہی ہو جاتی ہے۔ ہم وہاں ایک دوسرے سے بات چیت کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کے دوست بن جاتے ہیں۔ پھر جب وہی روحیں دنیا میں ملتی ہیں تو انہیں پہلی ہی ملاقات میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ لوگ جنم جنم سے ساتھ ہیں۔ ان کے محسوسات حقیقی ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت میں پرانی شناسائی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

سبین بھی اسی کسی پرانی شناسائی کے زیر اثر تھی۔ وہ جیسے عالم ارواح میں میران سے دنیا میں محبت کرنے کا، وفا نبھانے کا وعدہ کر آئی تھی۔ اب اس وعدے کو پورا کرنے کے لیے بے چین تھی۔ مشروب ختم ہو چکا تھا اور خالی ڈسپوزبل گلاس نجانے کب سے اس کے ہاتھ میں تھا۔ جہاں وہ میران کے ہاتھوں کا لمس ڈھونڈنے کی لاحاصل کوششیں کر رہی تھی۔

وہ مسکراتا چہرہ اسے کبھی بھولا ہی نہیں تھا۔ تب بھی نہیں جب وہ اپنے کالج میں کم مائیگی کے احساس تلے کونوں کھدروں میں سب سے چھپتی پھرتی پناہ تلاش کیا کرتی تھی۔ تب بھی نہیں جب وہ گھر کی کھڑکی سے آرٹ کالج کے باغ میں بیٹھے لڑکے، لڑکیوں کے راز و نیاز کو سنا کرتی تھی۔ تب بھی نہیں جب وہ اماں کی بیماری کی وجہ سے ہسپتال میں ان کے ساتھ شب و روز گزارنے پر مجبور تھی۔ پھر جب اماں کی ہی آخری خواہش پر اس نے رشید سے نکاح کے لئے ''قبول ہے'' کہا۔ تب بھی نہیں......اب جب کہ وہ اسی کے شہر میں تھی۔ اس کے بے حد قریب تھی۔ اب وہ اسے کیسے نہ باقاعدگی سے یاد کرتی۔

کیا اسے روک کر اس سے کوئی بات کر لینی چاہئے تھی؟ ہاں...... یقیناً۔ پھر اس نے ایسا کیا کیوں نہیں؟ اسے روکا کیوں نہیں۔ اسے کیوں جانے دیا۔ وہ ایک دم سے چپ کیوں ہو گئی تھی۔ وہ ایسی غائب دماغ تو کبھی نہیں رہی تھی۔ اسے میران کو یاد دلانا چاہیے تھا کہ اس نے پاکستان میں اس کے تین تاج محل توڑ دیئے تھے۔ کیا اب وہ نیویارک میں ان کی قیمت ادا کر سکتا ہے؟ اسے اپنا وقت دے کر......؟ اسے بتانا چاہیے تھا کہ وہ اس سے اپنی پہلی ملاقات کبھی بھی نہیں بھولی۔ اس کا نام اسے ہمیشہ حفظ رہا۔ جس نے اس کے بدبودار دنوں میں دارچینی جیسی نفیس خوشبو پھیلائی رکھی۔ کم از کم وہ یہ تو کہہ ہی سکتی تھی کہ اس کا چہرہ کچھ جانا پہچانا سا ہے۔ وہ بھی شاید یاد کرنے کی کوشش کرتا......اور خدا اگر سبین پر مہربان ہوتا تو عین ممکن تھا کہ اسے یاد آ جاتا......

''ہاں......میرے خدا تجھے اس کی یادداشت کا ساتھ دینا پڑے گا۔ اسے یاد دلانا پڑے گا کہ وہ صرف مجھ سے لاہور کے شاہ عالمی بازار میں ہی نہیں ٹکرایا بلکہ عالم ارواح میں بھی اس نے میری دہلیزوں کے آگے اپنے نام کے تعویذ دبائے ہیں اور میں نے بھی اس کے نام کی تسبیحات کی ہیں۔'' بے قراری سے کمرے کے چکر لگاتے ہوئے اس نے خدا سے دعا کی تھی۔ یہ دعا ساری

کی ساری التجا سے پر تھی۔

''ہائے ...... لیکن اب وہ کیا کرے؟ اسے نیویارک جیسے بڑے شہر میں کہاں کہاں ڈھونڈے؟ کیا بھیا نک غلطی کر دی تھی اس نے ...... وہ ساکت کیوں ہو گئی تھی۔ اور اب اس کی غائب دماغی کا نجانے کیا نتیجہ نکلنے والا تھا۔

کمرے کے چکر لگاتے لگاتے اس نے گلاس کو خالی ڈسٹ بن میں ڈالا تھا۔ اور تب ہی اس کی نظر کپ کی پشت پر موجود کمپنی کے ٹیگ پر پڑی تھی۔

''ڈریم کلب ......'' سبین کی آنکھوں میں روشنی سی بھر گئی تھی۔

وارڈ روب کھول کر اس نے اپنے ساتھ لائے ہوئے تمام لباسوں میں سے سب سے بہترین لباس کو چنا تھا۔ پھر لائٹ سا میک اپ کیا تھا۔ اماں کے دیئے ہوئے سونے کے جھمکے پہنے تھے۔ گوری کلائیوں میں کالے کانچ کی آدھ درجن چوڑیاں چڑھائی تھیں اور ست رنگی چنری کا دوپٹا اوڑھا۔ اس کے محلے کی سہیلیاں کہتی تھیں کہ جب جب وہ یہ سب تردد کرتی ہے، غضب ڈھاتی ہے۔ آج یہ سب کر کے وہ قیامت برپا کرنا چاہتی تھی۔

اس نے خود کو آئینے میں دیکھا۔ روشن کمرے کا چمکتا آئینہ آج جیسے دنیا کے سارے سچ بول رہا تھا۔ سبین کی احساس کمتری کہیں کھو گئی تھی۔ کم مائیگی کافور ہو چکی تھی۔ جو عکس سامنے تھا وہ پھولوں کے بستر پر سونے والی کسی پری پیکر ایسی شہزادی کا تھا جو جانتی ہی نہ تھی کہ کانٹے کا درد کیا ہوتا ہے۔ بڑی دیر تک خود کو دیکھتے رہنے سے اس کے اندر اعتماد آیا تھا لیکن وہ اس حالت میں کہاں جا رہی تھی؟

کال کر کے اس نے گیسٹ ہاؤس میں ہی ایک ٹیکسی منگوالی تھی۔

''مجھے ڈریم کلب جانا ہے۔'' ٹیکسی کے اندر بیٹھتے ہوئے اس نے ڈرائیور سے کہا۔

''اس کلب کی کون سی برانچ ......؟ شہر میں تو اس کلب کی کم از کم دس برانچیں ہیں۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے کہا تو اس کا سر گھوم گیا۔ لیکن پھر اگلے ہی پل اس کے ذہن نے کام کیا۔

''جو برانچ سینٹ جین چرچ کے قریب ہے وہاں چلیں۔'' اس نے اعتماد سے کہا۔ یہ صرف اس کا اندازہ تھا اور یہ اندازہ سچ بھی ہو سکتا تھا۔ ورنہ وہ آج رات ڈریم کلب کی ساری برانچیں گھوم لینے والی تھی۔ دس برانچیں گھومنا کچھ ایسا بھی اعصاب شکن کام نہیں تھا۔

☆......☆......☆

''میران نام کا لڑکا یہاں کام کرتا ہے؟'' اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا تھا۔ یہ تیسری برانچ تھی جہاں وہ آئی تھی۔ پچھلی دونوں برانچوں پر اسے نفی میں جواب ملا تھا۔

''ہاں......'' گارڈ نے وہ لفظ کہہ دیا تھا جو وہ سننا چاہ رہی تھی اور اس جواب نے اس کے دل کی دھڑکن کو اور زیادہ تیز کر دیا تھا۔ اتنا تو وہ ''نہیں'' سن کر مایوس نہیں ہوئی تھی جتنا ''ہاں'' سن کر گھبرا گئی تھی۔ اب وہ کیسے اندر جائے۔ اس سے کیا کہے۔

''میں انہیں باہر بلوا دیتا ہوں۔ کیا کہوں ان سے......میرا مطلب کیا نام ہے آپ کا......'' گارڈ نے شاید اس شلوار قمیص میں کھڑی لڑکی کی مدد کرنے کے احساس سے خیال پیش کیا تھا۔

''نہیں......میں خود ہی جا کر مل لیتا ہوں۔'' کہہ کر وہ کلب کے اندر آ گئی تھی۔ جہاں کے بے ہنگم شور نے اس کا سواگت کیا تھا۔ دروازے کے اندر کی دنیا ہی اور تھی۔ تیز میوزک، قہقہے، ہنسی، کان تو بہرے ہی ہو رہے تھے۔ آنکھیں بھی نیلی پیلی روشنی میں اندھی ہونے لگی تھیں۔ سبین کی کھوجتی نظریں وہاں کی ایک ایک چیز پر کھبنے لگی تھیں۔ نجانے وہ یہاں پر کس ٹائپ کی جاب کرتا تھا۔ وہ ویٹر تھا یا بارٹینڈر؟ فرنٹ کاؤنٹر پر کام کرتا تھا یا بیک کچن......؟

''میران کہاں ہیں۔ میں نے اسے مشروب لانے کو کہا تھا۔'' قریب سے گزرتے ایک ویٹر کو روک کر اس نے کہا تھا۔ اور ایسے کہا تھا جیسے وہ میران کی بچپن کی دوست ہو۔ ویٹر نے اسے عجیب سی نظروں سے دیکھا تھا۔

''تم نے کیسے میران سے آرڈر لانے کو کہہ دیا۔ وہ یہاں کا ویٹر نہیں ہے۔ بارٹینڈر ہے۔ اندھیرے میں تیر چلانا اچھی بات ہو سکتی ہے پر آنکھیں بند کر کے تیر چلانا تو سراسر حماقت ہے ڈیر......'' ویٹر کہہ کر مسکراتا ہوا چلا گیا تھا۔ اپنی حرکت پر شرمندہ ہو کر سبین بھی بے اختیار ہی مسکرا اٹھی۔ کیا بے وقوفانہ حرکت کی تھی اس نے......اپنے سر پر ہلکی سی چپت مار کر وہ بار کی طرف بڑھی۔

میران پاس ہی ایک ٹیبل کی سطح پر کرتب کر رہا تھا۔ الٹے گلاسوں کو سیدھا کرنا، بوتل شیک کر کے ایک ساتھ بہت سے گلاسوں کو بھرنا اور مٹھی بھر کر اسٹابری کو اس طرح پھینکنا کہ ہر ایک گلاس میں ایک ایک اسٹابری آ جائے۔ اس کے سامنے بیٹھی لڑکیاں یہ سب اور اسے دیکھتے ہوئے خوش ہو رہی تھیں اور ایک دوجے کے کانوں میں کھسر پھسر بھی کر رہی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد جب میران کے سامنے والی سیٹ خالی ہوئی تو سبین اپنا لباس سنبھالتی ہوئی وہاں جا کر بیٹھ گئی۔

میران نے ٹیبل کی سطح پر آگ لگا رکھی تھی۔ اور سبین کے وہاں بیٹھتے ہی وہ اس آگ کو ہاتھ سے بجھانا بھول گیا تھا۔ سبین اس کی آنکھوں میں بے خوفی سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی اور میران اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یہ تو پہلے سے بھی زیادہ حسین ہو گئی ہے۔ آگ کے شعلے دونوں کی نظروں کے ایک ہوئے خط کے درمیان میں بھڑک بھڑک کر بجھنے لگے تھے۔ نجانے کتنے ہی لمحے جل گئے تھے اور کتنی ہی صدیاں بیت گئی تھیں۔

''پائن ایپل یا اورنج......؟'' بالآخر میران نے اس کی خوب صورت آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اپنے لب کھولے۔

وہ وہی بات پوچھ رہا تھا کو شاہ عالمی میں بھی ایک بار پوچھ چکا تھا۔ اسے پتا تھا اب کی بار وہ انکار نہیں کرے گی۔

''اورنج جوس......'' سبین نے ایسے کہا تھا جیسے وہ کوئی بہت ہی قیمتی مشروب طلب کر رہی ہو۔ یا جیسے وہ اس مشروب کا آرڈر بھی عالم ارواح میں دے چکی ہو اور یہاں بس اس کو دہرا رہی ہو۔

''میں نے پائن ایپل بھی بنوا کر رکھا ہوا ہے۔'' میران نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

''لیکن مجھے بس اورنج چاہیئے۔ اور ہاں...... دو گلاس لانا......ایک میرے لیے اور ایک اپنے لیے کیونکہ مشروب کو تب تک طلب نہیں کرنا چاہیے جب تک آپ کے ساتھ کوئی ساتھی نہ ہو...... اکیلے انسان کے لیے خدا نے دنیا میں بہت سا سادہ پانی رکھا ہوا ہے۔'' سبین نے کمال ہوشیاری سے اسے اسی کا فقرہ دہرایا تھا۔ میران مسکرا کر اپنا سر کھجانے لگا تھا۔ یعنی اس کی طرح سبین کو بھی اس ملاقات کا ایک ایک جز یاد تھا۔

☆......☆......☆

گہری رات میں وہ جگنوؤں کی روشنیاں تھیں جو آسمانی قندیلوں کی طرح تا حد نظر پھیلی ہوئی تھیں۔ سڑک کے اطراف میں اگی سبز گھاس پر ان جگنوؤں کے قافلے ٹھہرے ہوئے تھے۔ جو رات میں سوتے نہ تھے بلکہ جیسے کسی بارات کا اہتمام کر رہے تھے۔

وہ دونوں پیدل چلتے ہوئے نجانے کہاں جا رہے تھے۔ کلب سے تو میران اسے ٹیکسی اسٹینڈ تک چھوڑنے کے لیے نکلا تھا لیکن اب ایسے چل رہا تھا جیسے کسی پارک میں ٹہل رہا ہو جبکہ انہیں کلب میں ہی کافی رات بیت چکی تھی۔

آہستہ آہستہ خالی ہوتا کلب بالکل ہی خالی ہو گیا تھا۔ میران کے علاوہ باقی سب ورکر کل کے دن کی تیاری کرتے ہوئے صفائی وغیرہ کرنے لگے تھے اور وہ دونوں تھے کہ اپنی جگہوں سے اٹھ نہیں رہے تھے۔ ایک ایک اورنج جوس کا گلاس جیسے کوئی دریا بن کر گیا تھا جو ان سے ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ دونوں کو شاید اس بات کا احساس تک نہیں تھا کہ بہت سی کرسیوں کے درمیان وہ دونوں اکیلے رہ گئے ہیں اور میران کے دوست کن انکھیوں سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے ایک دوسرے کو اشارے کر رہے ہیں۔ ذو معنی مسکرا رہے ہیں۔

سبین بھی بھول گئی تھی کہ اسے واپس گیسٹ ہاؤس جانا ہے۔ رفتہ رفتہ ڈھلتی رات میں دونوں کے دل میں ایک نیا جہاں طلوع کر رہے تھے۔

''میران...... یہ چابیاں پکڑ لو...... تمہارا شاید یہاں ہی سونے کا ارادہ ہے۔ دوپہر کے وقت کلب پھر سے کھول دینا۔ ہم جا رہے ہیں۔'' ڈینی نے میران سے کہا تو اسے اتنی جلدی بہت سے وقت کے گزر جانے کا احساس ہوا تھا۔ سبین کو جیسے ایک دم سے الہام ہوا تھا کہ وہ اتنی رات ہو جانے کے باوجود ''گھر'' سے باہر ہے۔

اب دونوں سڑک کنارے ٹہل رہے تھے۔ سوئے ہوئے پھولوں اور حال کرتے جگنوؤں کی باڑ کو دیکھتے ہوئے۔

میران نجانے کون سا کلون لگاتا تھا یا یہ اس کے جسم کی مخصوص خوشبو تھی۔ جو سبین سے کبھی دور نہیں ہوئی تھی۔ یہ وہی خوشبو تھی جو اسے شاہ عالمی کے بازار میں تب محسوس ہوئی تھی جب میران نے اپنی کلائی پر دھری جیکٹ کو کالر سے پکڑ کر گھما کر پیچھے اپنے کندھے پر رکھا تھا۔ ایسا کرتے سمے اس کے بدل کی خوشبو اور کلون کی مہک سبین تک پہنچی تھی اور وہ پرے نہیں ہو پائی تھی۔ آج بھی اسے وہی جانی پہچانی سی خوشبو آ رہی تھی۔ کیا یہ اس کے کلون کی مہک ہی تھی یا اس کی......؟ وہ فیصلہ نہ کر سکی۔

''تو تم ان ماڈل کی قیمت لینے یہاں تک آ گئی ہو؟'' میران نے چلتے چلتے کسی فرضی گیند کو ٹھوکر مارتے ہوئے مذاق میں بات چھیڑی تھی۔

''تمہیں کیا لگتا ہے؟''

وہ اس کے سوال پر لاجواب ہوا تھا۔ سبین کے جھمکے ہلے تھے۔ اس نے اس طرح کے فیشن پہلی بار دیکھے تھے اور اسے احساس ہوا تھا کہ اس نے اب تک جو دیکھا سب بے کار تھا۔ اصل حسن تو اس کے سامنے تھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ تم صرف ماڈل کی قیمت لینے نہیں آئی ہو۔'' اس نے اپنا آپ سبین کے سامنے کرتے ہوئے اس سے کہا۔ وہ قیمت کے علاوہ کس چیز کی طرف اشارہ کر رہا تھا سبین سمجھ سکتی تھی۔

''صحیح لگتا ہے تمہیں......'' اس نے اعتراف کر لیا۔ جو محبت کرنے والے پہلی ملاقات میں کریں یا سالوں بعد......کیا فرق پڑتا ہے۔

''میں یہاں اپنی زندگی لینے آئی ہوں۔'' کہیں اندر ہی اندر اس نے اداسی سے خود سے بھی کہا تھا۔ کیونکہ میران کے سامنے وہ ایسی کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہ اندر ہی اندر باتیں کرنے کے سودوں نے اس کی ذات میں ہمیشہ گھاٹا ہی لکھا تھا لیکن وہ اس واضح گھاٹے کے باوجود بھی اپنے پاس اور کوئی آپشن نہیں رکھتی تھی۔

''شکر کرو تم آ گئی ہو......ورنہ مجھے آنا پڑتا تھا۔ ممی کہتی ہیں کہ قرض نہیں رکھتے۔'' وہ معنی خیزی سے مسکرایا۔ سبین کے دل کی دھڑکنیں آنکھ مچولی کھیلنے لگیں۔

''میں نے کہہ تو دیا تھا کہ اٹس اوکے......''

''لیکن مجھے نیویارک واپس آنے تک دکھ رہا کہ میں نے تمہارا نقصان کر دیا تھا۔ کیا تمہارے بابا نے اسے پھر سے بنا لیا تھا۔''

''نہیں......میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا کہ میرے بابا اسے پھر سے بنا لیں گے۔ لیکن چونا ٹوٹ جائے تو پھر اسے جوڑنا مشکل ہوتا ہے۔ چونے کو سیدھ میں کھڑے رہنے کی بیماری ہے۔ عجز کے برادے سے یہ قالب میں ڈھل کر بادشاہ بن جاتا ہے اور تم تو جانتے ہو کہ بادشاہ ن مڑتے ہیں نہ ٹوٹتے ہیں نہ پھر جڑتے ہیں۔ وہ تو بس مرتے ہیں یا......قتل......ہوتے ہیں۔'' وہ

خلاؤں میں دیکھتے ہوئے گویا ہوئی۔

''تو تم بھی اپنے بابا کی طرح اس فن کو سیکھ گئی ہو۔''

''اتنے اچھے طریقے سے کہ اب تو شاید بابا بھی میری کاریگری پر حیران رہ جائیں۔'' وہ دکھ سے سوچ کر رہ گئی۔

''کیا میرا مجسمہ بناؤ گی؟''

''نہیں۔''

''کیوں......؟''

''میں مجسمہ سازی میں زیادہ ماہر نہیں ہوں۔تمہاری شکل خراب کر دوں گی۔''

''چلے گا۔''

''لیکن میرے نہیں چلے گا۔تمہاری اس صورت کو میں تصور میں بھی نہیں بگاڑ سکتی۔''

''چلو جب میں دنیا سے چلا جاؤں گا تم تب بنا دینا......'' اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

''خدا نہ کرے...... یہ لڑکا کیا اول فول بک رہا ہے۔'' وہ دل ہی دل میں خدا سے اس کے حصے کی معافی مانگنے لگی تھی۔

''ایک جگہ ہے سبین......شہر کے مضافات میں...... وہاں بہت سے درخت ہیں، بہت سے پودے ہیں، پھول تو بے تحاشا ہیں اور ایک جھیل بھی ہے۔میں نے اپنا بہت سا وقت وہاں گزارا ہے۔مجھے وہ جگہ دنیا میں سب سے زیادہ پسند ہے۔''

''اچھا......'' سبین سمجھ نہ سکی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ یہ موضوع اسے کچھ بے تکا سا لگا تھا۔ایک دم سے کسی مضافاتی علاقے کی باتیں کرنا شروع کر دینا۔

''گیارہ بج کر پچپن منٹ پر وہاں ایک بہت ہی پیارا منظر نمودار ہوتا ہے۔حیران کن حد تک حسین......سارا سال میں اس منظر میں بس ایک آدھ منٹ کا فرق پڑتا ہے۔میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ دنیا کا خوب صورت ترین منظر ہوتا ہے۔''
کہہ کر وہ اس کی سستی سے چلتی چال کے سامنے آ کھڑا ہوا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔سبین کی سمجھ میں نہ اس کی بے محل بات آئی نہ اس کا عجیب سا انداز۔

''تو......؟''

''تم اس منظر سے بھی زیادہ حسین ہو۔''

جگنوؤں کے قافلے پھولوں کی باڑ سے اٹھ کر سبین کی آنکھوں میں آ کر بسیرا کرنے لگے تھے۔

☆......☆......☆

''سبین کہاں ہو تم......تم نے اپنی خیریت کا ایک بھی فون نہیں کیا؟'' بابا کی آواز اس کے کانوں میں پڑی تھی اور اس کی ساری سوئی ہوئی حسیں جاگ گئی تھیں۔ جھٹکے سے وہ بیڈ پر ہی اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

''جی بابا......میں کراچی پہنچ گئی ہوں۔''

''اب پہنچی ہو؟'' وہ حیرت سے پوچھ رہے تھے۔

''نہیں......کل صبح......ٹرین لیٹ ہوگئی تھی۔''

''تو بیٹی سکینہ کے گھر اپنی خیریت کا ایک فون ہی کر دینا تھا۔'' بابا شکوہ کررہے تھے۔ ''یا ادھر جا کر ایک دم سے ہی ہمیں بھول گئی ہو۔''

''نہیں بابا......'' اس نے ہلکے سے کہا۔ وہ بابا کو کیا بتاتی کہ ایک رات تو اسے چکی کے شور کی وجہ سے نیند نہیں آئی اور دوسری رات میران کے ان الفاظ ''تم اس منظر سے بھی زیادہ حسین ہو۔'' کی گونج سے۔

''یہاں سگنل میں کچھ مسئلہ تھا بابا......میں نے تو کئی بار کوشش کی تھی سکینہ کے گھر کال کرنے کی۔''

''کھانا ٹھیک سے مل رہا ہے وہاں تمہیں......کیسی جگہ ہے۔ کمرہ وغیرہ تو ٹھیک ہے ناں......'' بابا فکرمندی سے پوچھ رہے تھے۔ سبین اپنے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے مسکرانے لگی تھی۔

''جی بابا......سب بہت ٹھیک ہے۔'' وہ چہک کر بولی تھی۔ پھر بھی بابا کی تسلی کرنے میں اسے پورے پندرہ منٹ لگ گئے تھے۔ پھر فون بند کر کے وہ کھڑکی کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی تھی کیونکہ کل صبح والا ساز آج پھر سے اسے سنائی دینے لگا تھا۔

دور سے ایک دھبہ قریب ہو رہا تھا۔ تاریکی میں پھیلتی روشنی میں ایک سیاہ سا دھبہ......وہ لڑکا آہستہ آہستہ کل والے راستے پر ہی گامزن آج بھی سبین کے گیسٹ ہاؤس کی طرف آتا ہوا اس کی کھڑکی کے نیچے سے گزرنے والا تھا۔ سبین بڑے اشتیاق سے اسے دیکھنے لگی اور بڑی توجہ سے اس کا ساز بھی سننے لگی۔ لڑکا بہت نفیس انداز میں ماؤتھ آرگن بجا رہا تھا۔ اس کا راگ بہت نفیس تھا۔ جیسے وہ صرف ماؤتھ آرگن ہی نہیں دنیا کے سارے راگ بجا رہا ہو۔ سبین کو آج سے پہلے اندازہ نہیں تھا کہ ماؤتھ آرگن سے ایک سے زیادہ سر بھی نکل سکتے ہیں۔ وہ سروں کو اتنا نہیں جانتی تھی لیکن جتنا جانتی تھی یا سن سکتی تھی بلاشک وشبہ کہہ سکتی تھی کہ وہ لڑکا کمال کا ماؤتھ آرگن بجا رہا تھا۔

آج پھر اس نے کھڑکی میں پڑے گلدستے میں سے ایک پھول نکال کر لڑکے کی طرف عین ان لمحوں میں پھینک دیا تھا جب گڑکا اس کی کھڑکی کے نیچے سے گزر رہا تھا لیکن کل کی ہی طرح آج بھی وہ لڑکا اپنی دھن میں، اپنے ساز میں اتنا مگن تھا کہ اسے اندازہ ہی نہیں ہوا تھا کہ دوسری منزل کے کمرے کی کھڑکی سے کسی نے اسے سراہتے ہوئے اس کی طرف پھول پھینکا ہے۔

آج بھی وہ سبین کے اچھالے ہوئے پھول پر پاؤں رکھتا ہوا گزر گیا تھا۔سبین اس کی ایسی بے خبری پر ہنسنے لگی تھی۔تاہم اس راگ کو سن کر وہ فریش ہوگئی تھی۔

گھڑی میں وقت دیکھا تو پورے سات بج رہے تھے۔رات اگرچہ وہ دیر سے سوئی تھی اس کی نیند بھی گہری نہیں تھی لیکن اس سب کے باوجود وہ خود کو تازہ دم محسوس کر رہی تھی۔کسی قسم کی کوئی تھکن نہیں تھی۔اس نے آج پہننے کے لیے کپڑے پریس کروانے کے لئے ورکر کو دیئے اور خود نہانے چلی گئی۔نہا کر نکلی تو اس کے کپڑے بھی پریس ہو کر آ چکے تھے اور ناشتا بھی...... جسے کر کے وہ تیار ہوگئی۔کمرے میں تھوڑا بہت میک اپ کا سامان بھی موجود تھا۔کچھ وہ اپنے ساتھ لائی تھی۔جو وہ اپنے ساتھ لائی تھی اس نے اسے استعمال کرنا ہی مناسب سمجھا۔کیونکہ جو کمرے میں موجود تھا وہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔تاہم بڑی احتیاط کے ساتھ کرل مشین کا استعمال کرتے ہوئے اس نے اپنے سیدھے بالوں میں ڈھیلی سی لہریں ڈال لی تھیں۔جن میں وہ کھل اٹھی تھی۔پرانے فیشن میگزین کی تصویروں کو یاد کر کر کے اس نے اپنے اوپر ہی مشق کی تھی۔پتا نہیں اس کی یادداشت اچھی تھی یا اس کی قسمت...... کچھ بھی خراب نہیں ہوا تھا۔سب اس کے حسن کی طرح نکھرتا ہی چلا گیا تھا۔

کھڑکی سے باہر طلوع ہو چکا دن اب جوبن پر پہنچ چکا تھا۔بہار کا موسم کسی وحی کی رح بڑے مقدس انداز سے نازل ہو رہا تھا۔ان دنوں میں آنے والی زندگی کے لئے خوشخبریاں تھیں۔وہ جانتی تھی۔

تیاری کا عمل بڑا خوش کن تھا۔وہ آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے اور کچھ یاد کرتے ہوئے مسکراتی رہی تھی۔

''میرا نام میران ہے۔'' وہ آواز جسے وہ کبھی نہیں بھولی تھی آج پھر اس کو اپنی یاددہانی کروا رہی تھی۔بیشتر بار اس نے اس آواز کو بے حد اداسی سے یاد کیا تھا اور اب...... وہ کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔کوئی اور اس کے کمرے میں ہوتا تو یقیناً اسے پاگل خیال آتا۔اسے گمان ہی کہاں تھا کہ وہ کبھی اس سے دوبارہ ملے گی۔اس کے لیے تیار ہوگی۔بنے گی،سنورے گی۔

ساری تیاری کے بعد اس نے وقت دیکھا تو دس بج رہے تھے۔اسے گیارہ بجے میران کے پاس پہنچنا تھا۔اس نے کہا تھا کہ وہ گیارہ بجے اسے شہر کے مضافات میں ملے گا۔اس نے آفر تو کی تھی کہ وہ اسے پک کر لے گا مگر سبین اسے یہاں بلانا نہیں چاہتی تھی۔اس لیے اس نے کہا تھا کہ وہ خود ہی وہاں پہنچ جائے گی۔

تیار ہو کر وہ نیچے اتری تھی۔پھر ٹیکسی لے کر میران کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گئی تھی۔میران نے کہا تھا کہ وہ،وہ جگہ دیکھ کر حیران رہ جائے گی۔اور ایسا ہی ہوا تھا۔

وہ ایک چھوٹا سا ایک قطعہ تھا۔شہر کے شور سے الگ تھلگ ایک خاموش،پرسکون جگہ...... جس کے چاروں طرف درخت ہی درخت تھے...... سرسبز پودے اور رنگ برنگ کے پھول...... جن پر تتلیاں اٹکھیلیاں کر رہی تھی،اور درختوں کی پھننگ پر پرندے

چہچہا رہے تھے۔ میران نے اس منظر سے ملایا تھا۔ کیا وہ بھی ایسی ہی سحر طاری کر دینے والی خوب صورتی کی مالکہ تھی؟ اگر تھی تو وہ اب تک خود سے اتنی بے خبر کیوں تھی؟

سبین اس منظر کی ابتدا سے ہی مسحور ہوگئی تھی۔ ابھی اندر نجانے کیا کیا تھا۔ وہ جلدی سے آگے بڑھی تھی لیکن پھر ایک دم سے رک گئی۔ وہ کہاں جائے؟ میران نے اسے کہا تھا کہ وہ اسے یہاں ہی ملے گا اور اب اسے اس جگہ پر کہیں بھی میران نظر نہیں آ رہا تھا۔ سیل فون نکال کر اس نے میران کو کال کی لیکن اس کا نمبر بند جا رہا تھا۔ بار بار ملانے پر بھی نمبر بند ملا...... اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ وہاں ہی کھڑی رہ کر میران کا انتظار کرے یا آگے بڑھ جائے۔ پھر جب خاموشی میں کسی کے گٹار چلانے کی مدھم سی آواز اس کے کانوں میں پڑی تو وہ مسکرا اٹھی اور چکنے پتھروں پر احتیاط سے پاؤں رکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔ ایسی مبہوت کر دینے والی جگہ پر ایسا دلکش کام میران ہی کر سکتا تھا۔

سبین اس کے پاس پہنچی تو اس نے دیکھا کہ ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگائے ہوئے وہ ایک پرانا، سستا سا گٹار بجا رہا تھا۔ نجانے وہ کون سی دھن بجا رہا تھا۔ مشرقی کہ مغربی...... اداس کہ خوش گوار...... لیکن وہ جو بھی تھا سبین کا دل چاہا کہ وہ اسی طرح گٹار پر اپنی انگلیاں چلاتا رہے اور وہ صدیوں تک وہاں اس کے سامنے بیٹھ کر اسے دیکھتی رہے۔

میران نے اپنی بند آنکھیں کھولیں تو سامنے سبین کو پایا...... میران مسکرا اٹھا۔

''آمد کی یہ اطلاع سیل فون پر بتانے سے زیادہ حسین ہے ناں......؟'' اس کا اشارہ گٹار اور دھن کی طرف تھا۔ سبین نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''تم گٹار بھی بجا لیتے ہو......''

''تم بتاؤ...... تم سمجھ لیتی ہو؟''

''ہاں۔'' وہ خود اعتمادی سے بولی۔

''تو بتاؤ اس دھن میں شاعر کیا کہہ رہا ہے؟''

''بنا لفظوں کے میں شاعر کا پیغام کیسے سمجھوں؟ تم صرف دھن بجا رہے ہو۔ ساتھ گانا بھی گاؤ تو میں کچھ بتا سکتی ہوں۔''

''کسی پیغام کو الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس دھن میں شاعر کہہ رہا ہے کہ اس کی محبوبہ اس کی چاہت سے بے خبر ہے۔'' میران نے آنکھ دباتے ہوئے بتایا تھا۔ سبین شرم سے تھوک نگل کر رہ گئی تھی۔

''تم خالی ہاتھ آئی ہو......؟''

''نہیں...... میں نے چوڑیاں پہنی ہوئی ہیں۔ یہ دیکھو......''

''اوہ گاڈ......میرا مطلب ٹوکری نہیں لائیں؟''

''کس چیز کی......'' وہ نہ سمجھی۔

''کھانے پینے کی چیزوں کی بھئی......میں باہر کا اور اپنے ہی ہاتھوں کا بنا ہوا کھانا کھا کھا کر تنگ آچکا ہوں۔''

''کیا ایسا بھی کچھ اہتمام کرنا تھا مجھے......''

''یہ ہی تو اہتمام کرنا تھا تمہیں......تمہیں یہاں میں نے اسی لیے بلایا تھا ورنہ مجھے کیا ضرورت پڑی تھی تمہیں یہاں بلانے کی......'' میران نے کہا تھا اور لمحے میں سبین کے چہرے کے رنگ بدل گئے۔ وہ اس کے لیے پورے دو گھنٹے لگا کر تیار ہوئی تھی اور وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے صرف گھر کا کھانا کھانے کے لیے اسے یہاں بلایا ہے۔ اسے اپنی ہتک کا احساس ہوا تھا۔ تب ہی میران قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔ اس نے سبین کے چہرے کے اڑے ہوئے رنگ دیکھ لیے تھے۔

''مذاق کر رہا ہوں۔ میں ہر چیز کا انتظام کر کے آیا ہوں۔'' میران نے کہا تو سبین کی سانسیں پھر سے ہموار ہوئیں۔

''جلدی کرو......سورج اپنا راستہ بدلنے والا ہے۔ پھر تم وہ نہیں دیکھ سکو گی جو میں دکھانا چاہتا ہوں۔'' ایک دم سے ہی وہ اٹھا اور سبین کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کو بڑھا تھا۔ سبین یہ تک نہیں کہہ سکی تھی کہ وہ اس کا ہاتھ نہ پکڑے......وہ خود چل لے گی۔ اس نے سپردگی دے دی تھی۔ میران اسے لے کر ایک قدرے اونچے مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں سے جھیل پوری کی پوری نظر آ رہی تھی۔

''یہ دیکھو......''

سبین نے میران پر سے نظریں ہٹا کر اس کے اشارے کی طرف دیکھا تھا۔ سامنے ایک جھیل تھی اور اس کے عین درمیان میں اور عین اوپر دن کا سورج چمک رہا تھا۔ جھیل کے غیر مرئی سے بھنوروں میں سورج کی کرنیں رقص کر رہی تھیں۔ ہر ہر بھنور نفیس سنہری قالین کی طرح سلوٹ زدہ سا ہو کر اپنے عکسوں کو بڑھا رہا تھا۔ پانی کا اصل رنگ تو کہیں کھو کر ہی رہ گیا تھا۔ اس وقت جو جھیل نظروں کے سامنے تھی وہ سونے کے پانی سے بھری ہوئی دکھتی تھی۔ سبین دم بخود رہ گئی۔

''یہ منظر پورے تین منٹ تک برقرار رہتا ہے۔ جب تک سورج عین ندی کے اوپر رہتا ہے۔'' میران اسے بتانے لگا تھا۔

''یہ آگ اور پانی کا سنگم ہے۔ ایسے لگتا ہے ناں جیسے سورج کی آگ پانی کو جلا ڈالنا چاہتی ہو......اور پانی سورج کی تپش کو خود میں سمو کر اسے ٹھنڈا میٹھا کر دینا چاہتا ہو۔ عجیب تصادم لگ رہا ہے ناں یہ......''

''ہاں......ایسا ہی ہے۔ مجھے لگ رہا ہے میں سورج سے آج پہلی بار ملی ہوں۔ پانی کو بھی میں نے اصل میں آج ہی دیکھا ہے۔'' وہ کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں بولی۔ اسے آج پتا چلا تھا کہ پرانے زمانے میں لوگ سورج کی پرستش کیوں کیا کرتے تھے۔ یقیناً سب سے پہلی عبادت سے پہلے انہوں نے بھی سورج کا ایسا ہی کوئی منظر دیکھ لیا ہوگا۔

’’چلو......دعا مانگو......‘‘میران نے کہا تو وہ چونکی۔

’’کیا مطلب......تم سورج پرست ہو؟‘‘

’’نہیں۔ میں قدرت پرست ہوں۔ خدا کو مانتا ہوں۔ اس کے ہر دلفریب منظر پر مجھے احساس ہوتا ہے کہ خدا بہترین تخلیق کار ہے۔ اس لیے میں دعا کرتا ہوں......تم بھی کرو......‘‘

میران نے ہاتھ جوڑ کر آنکھیں بند کیں تو اس نے بھی اس کی تقلید میں مسکرا کر دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے۔ لیکن وہ اس کی طرح آنکھیں بند نہ کرسکی بلکہ جھیل میں نظر آتے اس کے عکس کو دیکھنے لگی اور دعا کرنے لگی۔

’’اے خدا......میں نے زندگی بھر کوئی اتنی نیکیاں نہیں کیں کہ میں اس کے بدلے میں ہی تجھ سے میران مانگ سکوں۔ پر میں ایک التجا کرتی ہوں کہ مجھے یہ ملے نہ ملے لیکن اس کی یہ پرچھائیں مجھ سے دور نہ جائے۔ میں جب جب یہاں آؤں......مجھے جھیل کے پانی میں اس کا عکس دیکھنے کو مل جائے۔ میں اس عکس کو دیکھ دیکھ کر ہی ساری زندگی گزار دوں گی۔‘‘

اس نے بڑی شدت اور رقت سے یہ دعا کی تھی۔ وہ شروع سے ہی ایسی بے سلیقہ رہی تھی۔ دعا مانگنا اسے کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ اسے اندازہ یہ نہیں تھا کہ اس نے دعا میں کیا مانگ لیا ہے۔ کتنی بھیانک التجا خدا کے حضور بھیج دی ہے جو منظور بھی کرلی گئی ہے۔



ناول **شام رنگ سیاہ** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **20** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 5

''سمبل کے درخت میں ایک خاصیت ہوتی ہے۔ یہ جتنا پرانا ہو اس پر اتنے ہی تازہ پھول لگتے ہیں۔ زیادہ نئی خوشبو والے، زیادہ شوخ رنگ والے، زیادہ افادیت والے...... ایسا اس لئے نہیں ہوتا کہ وہ بہار کے نئے پھول ہوتے ہیں اس لیے شوخ ہوتے ہیں، تازہ خوشبو اور چمکتے رنگوں والے ہوتے ہیں۔ بلکہ ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ سمبل اپنے ہر سال کے تجربے سے سبق سیکھتا ہے۔ وہ ہر سال اپنی خامیوں کو دور کرتا ہے۔ ہر نئی بہار پر وہ پچھلی بہار سے زیادہ شوخ اور تازہ پھول کھلاتا ہے۔ اس کے بڑھاپے میں اس کے پھولوں کو رونق دیدنی ہوتی ہے۔

لیکن اس خاصیت میں ایک قباحت بھی پوشیدہ ہے۔ اس ساری محنت میں سمبل کی مثال خوش نما پنکھوں والے مور کے بدنما پنجوں جیسی بن کر رہ جاتی ہے۔ گدلے، بے ڈھب اور بے جوڑ پنجے...... چند روزہ زندگی والے شوخ رنگ پھول جب جھڑتے ہیں تو سمبل کی شاخیں بھی بھدی، گندی اور بے وقعت لگتی ہیں۔ خود بوڑھا ہو کر وہ پھولوں کو خوش نما بنا دیتا ہے لیکن اپنی اہمیت پیدا نہیں کر پاتا۔

انسانی زندگی اور سمبل میں حد درجہ مماثلت ہے۔ انسان بھی اپنی زندگی سال ہا سال تجربات اکٹھے کرنے میں خرچ کر دیتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کو خوش نما بنانا چاہتا ہے۔ اسے مختلف اور بہت سے رنگوں سے سجانا چاہتا ہے۔ اس میں نئی نئی خوشبوئیں بھرنا چاہتا ہے۔ چمک پیدا کرنا چاہتا ہے اور جب وہ سمجھتا ہے کہ اس نے بہت تجربہ اکٹھا کر لیا ہے اور اب وہ اپنی حیات کی ڈالیوں پر سب سے جاذب نظر پھول اگا سکتا ہے تو اسے اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی دن سے شام، شام سے رات اور رات سے گہری رات میں ڈھل کر اپنا وجود ختم کرنے کے لیے بے قرار ہے۔

سمبل کے پھلوں کو سونگھنے کی اور دیکھنے کی اب کسی کو چاہ نہیں رہی ہے۔

☆......☆......☆

سورج کسی ننھے بچے کی طرح کھلکھلاتا ہوا اپنا سفر پورا کر رہا تھا۔ اس کی میٹھی روشنی دھرتی پر شیرینی بانٹتی پھر رہی تھی۔ درختوں کے سایوں کی جھولیاں اس شیرینی سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔ ہوا میں اس قدر مٹھاس گھلی ہوئی تھی کہ ہر سانس لینے میں کھجور کھانے کا ذائقہ حلق میں گھل جاتا تھا۔

سبین سب دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ وہ اس جگہ سے اتنی متاثر ہوئی تھی کہ آگے چلتے میران کو جیسے بھول ہی گئی تھی۔ جگہ تھی کہ کوئی جادونگری...... ایسے جیسے چھپن چھپائی کھیل رہی تھی۔ اپن اندر لاتعداد منظر قید کیے ہوئے جو ہر نئے قدم پر نکل کر سامنے آرہے تھے۔ وہ جیسے کہہ رہی تھی کہ جتنا تلاش کرلو اتنا تمہارا...... اس کی خوب صورتی کا جیسے کوئی انت ہی نہیں تھا۔

''یہ میری پسندیدہ ترین جگہ ہے۔ جب جب شہر کی فضا سے تنگ آجاتا ہوں۔ یہاں آجاتا ہوں۔''

''یعنی اگر تم کہیں نہ ملو تو یہاں آسانی سے مل سکتے ہو۔'' اس نے اپنے آگے آگے چلتے میران سے کہا۔ جس کے نقش قدم پر پاؤں رکھتی وہ چکنے پتھروں اور بے ڈھب گھاس پر ڈگمگاتی ہوئی اس کی تقلید میں آگے بڑھ رہی تھی۔

''ہاں...... ایسا کہہ سکتی ہو۔ جب جب میں تم سے ناراض ہوجایا کروں گا اور تمہیں کہیں نہیں ملوں گا تو تم مجھے یہاں آکر ڈھونڈ لینا۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تمہیں میں ناراض کروں گی ہی کیوں......'' سبین نے دل میں، دل سے سوچا تھا۔

چلتے چلتے جب وہ تھک گئی تو ایک سنگی بینچ پر بیٹھنے لگی۔ لیکن میران نے اسے فوراً روک دیا تھا۔

''ارے...... ایسا غضب نہ کرو۔''

''کیا مطلب؟''

''بینچ پر نہ بیٹھو...... قدرت کو کھل کر انجوائے کرو...... جو مزا اوس والی گھاس پر بیٹھنے کا ہے۔ وہ مزا سونے کے بینچ پر بیٹھ کر بھی میسر نہیں آسکتا۔ آزما کر دیکھ لو......'' میران نہ صرف قدرت کا دلدادہ تھا بلکہ وہ اسے اچھی طرح سے پرکھا بھی ہوا تھا۔

ہنستے ہوئے سبین بینچ سے اٹھی اور اوس والی گھاس پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ اسے بتا نہ سکی کہ وہ اوس کیا کہر والی گھاس پر بھی اپنی راتیں بتا چکی ہے۔ آرٹ کالج کے باغ میں اپنے غم کی راتیں، ماں کی بیماری پر اپنی بے بسی کی راتیں، ان کی موت پر اپنے صدمے کی راتیں، اپنی شادی پر اپنی کم مائیگی کی راتیں اور پھر اپنی طلاق پر اپنی بے توقیری کی راتیں...... لیکن اگر وہ اسے بتانا چاہتی تھی تو اپنے غموں کو، دکھوں کو اس شدت سے نہیں بتا سکتی تھی جس شدت سے وہ اس پر بیت چکے تھے۔ یہاں آنے کے بعد اس کی ہر چیز میں بدلاؤ آگیا تھا۔ دنیا کو دیکھنے کا اس کا نظریہ ہی بدل گیا تھا۔ پچھلی ساری زندگی اسے بے معنی اور لاعلمی کی زندگی لگنے لگی تھی۔ اپنے ''باعلم'' ہونے کے بعد جو وہ دیکھ رہی تھی وہ سب دلکش ہی دلکش تھا۔

جس حصے میں وہ دونوں بیٹھ گئے تھے وہاں ابھی تک سورج کی تمازت نہیں پہنچی تھی اس لیے اوس اور گھاس کا عارضی رشتہ قائم تھا۔ درختوں کی شاخوں اور پتوں سے چھن چھن کر آتی سورج کی باریک کرنیں میران کے روشن چہرے پر پڑ رہی تھیں اور اسے اور منور کر رہی تھیں۔ وہ باسکٹ میں سے کچھ کھانے کی چیزیں نکال رہا تھا اور سبین اسے ہی دیکھے جا رہی تھی۔

''سبین تم یہاں......'' اسے سینڈوچ دیتے ہوئے بولتے بولتے رکا تھا۔ اس نے خود کو دیکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ سبین جھینپ گئی تھی۔ میران اندر ہی اندر مسکرایا۔

''تو......تمہارا یہاں کیسے آنا ہوا......کیا یہاں تمہارے رشتے دار رہتے ہیں؟''

''نہیں......''

''تو......؟'' وہ پوچھ رہا تھا اور سبین کو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔

''اگر تم نہیں بتانا چاہتیں تو اٹس اوکے۔''

''نہیں۔ اس میں نہ بتانے والی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل میں یہاں...... یہاں ایک این جی او کے تحت آئی ہوں۔ جن کا کام مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان نفرت اور تعصب کو دور کرنا ہے۔'' اس نے اس کے سامنے بھی وہی جھوٹ بولا تھا جو وہ ایئرپورٹ پر بول کر آئی تھی۔ وہاں تو وہ پولیس سے ڈر رہی تھی۔ جیل جانے سے ڈر رہی تھی۔ یہاں وہ کس سے ڈر رہی تھی؟

میران کو لمحے بھر کے لیے بھی شک نہیں ہوا تھا کہ سبین اس کے سامنے جھوٹ بول رہی ہے۔

''تمہارا قیام کتنے دن کا ہے؟''

''پندرہ دن......''

''پھر......اس کے بعد......''

''اس کے بعد کیا؟'' جیسے وہ جانتی ہی تو نہ تھی کہ وہ کیا پوچھنا چاہ رہا ہے۔

''اس کے بعد تم واپس چلی جاؤ گی؟''

''ہاں......لیکن میں پھر سے آؤں گی۔ مجھے بار بار آنا پڑے گا۔'' وہ خلاؤں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں معاہدہ کر چکی ہوں۔''

''کس قسم کا معاہدہ......؟''

''مطلب این جی او والوں نے مجھے بتا دیا ہے کہ مجھے بار بار یہاں آنا پڑے گا۔''

''تو کیا تم نے نیویارک دیکھا؟ کیا تمہارے پاس اتنا وقت ہے؟''

''میں ابھی پرسوں ہی آئی ہوں اور صرف سینٹ جین چرچ تک ہی گئی ہوں۔''

''مجھے اپنی والدہ کو لینے سینی ٹوریم جانا ہے۔ اگر تم تنہائی محسوس کر رہی ہو تو......'' اس نے پوچھا پھر جیسے اسے خود ہی اس کی مصروفیت کا احساس ہوا۔ ''سچ تمہیں تو این جی او کے بہت سے کام ہوں گے۔''

سبین کو انکار کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ وہ تاسف سے سر ہلا کر رہ گئی تھی اور اندر ہی اندر اس نے اپنے جھوٹ پر لعنت بھیجی۔

کھانا کھا کر وہ دونوں ایک ایسے حصے میں آ نکلے تھے جہاں ہر طرف سمبل کے درخت تھے۔ نارنجی مائل سرخ رنگ کے پھولوں سے لدے ہوئے درخت...... سبین نے زندگی بھر بہت سے درخت دیکھ رکھے تھے۔ بہت سے پودے بھی جن پر طرح طرح کے پھول لگتے تھے۔ کتنے درخت، پودے تو آرٹ کالج کے باغ میں ہی لگے ہوئے تھے۔ لیکن اس نے کسی درخت پر آج تک اس طرح کے خوب صورت پھول نہیں دیکھے تھے۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ پھول صرف پودوں پر ہی لگتے ہیں۔ درخت تو پھلوں کے لیے ہوتے ہیں لیکن سمبل کو دیکھ کر اسے اپنا نظریہ بدلنا پڑا تھا۔ ان پھولوں میں اتنی تازگی اور اتنی جاذبیت تھی کہ سبین انہیں دیکھتی رہ گئی تھی اور ان پھولوں سے لدے درختوں کی چھاؤں میں ایسے گھوم گھوم گئی تھی جیسے اسے بچپن میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ ساون میں گگلی ڈالا کرتی تھی۔

''آؤ...... تمہیں دائنا سے ملواؤں۔'' میران کہہ کر ایک سمت کی جانب بڑھ گیا۔ سبین بھی اس کے پیچھے چل پڑی۔

آگے چل کر درخت راستوں کو مزید تنگ کر رہے تھے۔ انہی درختوں کے جھرمٹ کے نیچے کین کی ہاتھ سے بنی پیڑھی نما نشست پر ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ لڑکی اتنی خوب صورت تھی کہ سبین ایک لمحے کو رک گئی اور اسے یک ٹک دیکھنے لگی۔ لڑکی ہونے کے باوجود بھی اسے دیکھ کر سبین کے دل کی دھڑکنیں چند ثانیوں کے لیے تھم گئی تھیں۔

اس لڑکی کو آنکھیں بڑی بڑی سیاہ، پاک اور روشن تھیں۔ جن میں مقدس پانی کی ندیاں ٹھاٹھیں مارتے ہوئی لگتی تھیں۔ چہرہ سپاٹ اور بے داغ تھا، جہاں جنب کی پرچھائی کا گمان ہوتا تھا۔ بال سونے کی تاروں جیسے سنہری تھے۔ اور ہونٹ...... جیسے زعفران اپنی رعنائی وہاں سے ہی حاصل کرتا ہو۔ سبین کو لگا وہ کسی انسانی مخلوق کو نہیں بلکہ جنت کی کسی حور کو دیکھ رہی ہو۔ کوئی بیک وقت اتنا حسین، اتنا معصوم اور اپنی ان دونوں خصوصیات سے اتنا غافل کیسے ہوسکتا ہے۔ سبین کو بے اختیار ہی وہ لڑکا یاد آ گیا تھا جسے دو روز سے وہ صبح اپنے کمرے کی کھڑکی سے نیچے بے حد بے نیازی سے ماؤتھ آرگن بجاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اس کی شخصیت میں بھی ایسی ہی عاجزی تھی۔

اس لڑکی کا نام دائنا تھا۔ دائنا نے اس وقت اپنے آگے چار پانچ شیشے کے جار رکھے ہوئے تھے۔ جس میں کچھ عجیب و غریب سی چیزیں تیر رہی تھیں۔ ان سے پرے کھجور کے پتوں کی بے آرام چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ یہ دائنا کی چھوٹی سی دکان تھی۔

''میران یہ کیا ہے۔'' اس نے ماہی آب میں پڑی ہوئی اس عجیب وغریب حشرات طرز کی تیرتی ہوئی چیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ جونکیں ہیں۔دائنا یہاں ان کا ہی کام کرتی ہے۔''

''مطلب......''

''ٹھہرو......ابھی سمجھاتا ہوں۔'' میران نے کہا اور اگلے ہی پل اپنی شرٹ اتار کر دائنا کے سامنے بچھی کھجور کی چٹائی پر لیٹ گیا۔دائنا بڑی معصوم اور چپ چاپ سی لڑکی تھی۔اس نے خاموشی سے اپنا کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ماہی آب میں سے جونکیں نکال نکال کر وہ میران کی کمر پر رکھنے لگی۔سبین بھی وہاں ہی نیچے کھجور کی چٹائی پر میران کے پاس بیٹھ گئی۔

''اس سے کیا ہوگا؟''

''فاسد خون صاف ہوگا۔اب بات سمجھ میں آئی؟''

''مجھے سمجھانے کے لیے تمہیں عملی مظاہرہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔'' نجانے کیوں اسے دائنا کو دیکھ کر جلن ہو رہی تھی۔وہ میران کی برہنہ کمر پر جونکیں رکھ رہی تھی۔

''ارے دائنا سے جل رہی ہو...... یہ تو بس اپنے کام سے کام رکھتی ہے۔'' میران کے پاس بھی جیسے جادو کی کوئی چھڑی تھی۔اس نے سبین کے دل کی بات پڑھ لی تھی۔ ''میں اسے جانتا ہوں۔بڑی معصوم ہے۔سالوں سے یہاں بیٹھ رہی ہے۔یہ ہی اس کی دکان ہے۔پہلے اس کی والدہ بھی بیٹھتی تھیں یہاں......لیکن اب صرف یہ بیٹھتی ہے۔''

سبین شرمندہ ہوئی۔اسے یہ بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔دائنا بھی شاید دلوں کے حال جان لینے میں ماہر تھی۔دونوں کی تکرار میں وہ ہلکے سے مسکرا رہی تھی۔

''یہ بولتی ہے؟''

''بولتی ہے لیکن بہت کم...... میں سالوں سے یہاں آ رہا ہوں اور میں نے اس کی آواز ایک دو بار ہی سنی ہے۔''

میران نے بتایا تھا۔سبین کو ایک دم سے زویا یاد آ گئی تھی۔وہ بھی اپنی مرضی سے بولتی تھی اور سبین اس کے بولنے کی شدت سے منتظر رہا کرتی تھی کہ وہ کوئی بات کرے،کوئی خواہش کرے جسے پورا کرنے کے لیے سبین اپنی سر دھڑ کی بازی لگا دے۔لیکن اس گھر کی بہت سی چیزوں کی طرح زویا بھی چپ رہ کر انجانے میں اسے اذیت دینے سے باز نہیں آتی تھی۔

تھوڑی ہی دیر لگی تھی۔میران کی کمر پر جہاں جہاں جونکیں رکھی گئی وہاں سے اب خون قطرے کی شکل میں باہر آ گیا تھا۔مطلب کام اچھے سے ہو گیا تھا۔دائنا نے ایک ایک کر کے بڑی مہارت سے ساری جونکیں ہٹا لی تھیں اور میران کی کمر کو گیلے تولیے سے صاف کر کے پھر خشک کر دیا تھا۔میران کھجور کی چٹائی سے اٹھا تو سبین نے دیکھا کہ اس کے جسم پر چٹائی کے چکور خانے بڑی ترتیب سے ابھر آئے تھے۔

''آج کل تو یہ کام پارلرز میں بھی ہو رہا ہے۔ یہ لڑکی کافی ماہر لگتی ہے۔ پھر یہ کسی پارلر میں اسی کام کی جاب کیوں نہیں کر لیتی......''

''ٹھہرو میں پوچھ لیتا ہوں۔'' میران نے کہا اور سبین کا سوال انگلش میں ترجمہ کر دیا۔ دائنا چند لمحے خاموش رہی تھی پھر اس نے درختوں کو دیکھتے ہوئے کوئی جواب دیا تھا۔ جسے سبین میران کے بنا ترجمہ کیے ہی سمجھ گئی تھی۔

''وہ کہہ رہی ہے کہ میں بہت سے پارلرز میں گئی ہوں لیکن وہاں کسی بھی جگہ سمبل کا درخت نہیں ہے اور میں یہ کام یہاں بیٹھ کر ہی کر سکتی ہوں۔ سمبل کے درخت کی چھاؤں میں......''

دائنا کے جواب سے اب کی بار سبین کو بابا یاد آ گئے تھے۔ اپنے کام کو لے کر ان کی منطقیں بھی ایسی ہی عجیب ہوا کرتی تھیں۔ ایک بار سبین نے اماں کو گھر کا فرش پکا کروانے کی بات کی تھی۔ کیونکہ سرخ اینٹوں کا وہ فرش اسے ہمیشہ سے ہی سخت ناپسند رہا تھا لیکن تب بابا نے اس کی مخالفت کی تھی۔

''میں چونے کا کام انہی سرخ اینٹوں پر بیٹھ کر کر سکتا ہوں۔ جب جب میں یہاں اپنے ظغروں کو پانی سے دھوتے ہوئے صاف کرتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ پانی کے ساتھ ساتھ میری پریشانی بھی اینٹوں کی درزوں میں چلی گئی ہیں۔''

''ہونہہ...... پریشانیاں تو جوں کی توں تھیں۔ پتا نہیں بابا کون سے پانی کو بہاتے تھے اور کون سی پریشانیاں سرخ اینٹوں کی درزوں میں جا چھپتی تھیں۔'' اس نے تلخی سے سوچا تھا۔

''کتنے پیسے......؟''

''جتنے میں آپ کو راحت محسوس ہو......'' دائنا نے مسکرا کر حیا زدہ سے لہجے میں کہا تھا۔ سبین ایک بار پھر سے حیران ہوئی تھی اور کسی حد تک شرمندہ تھی۔ دائنا کی ایک ایک بات اسے خود میں جھانکنے پر مجبور کر رہی تھی۔

میران نے اپنی ہپ پاکٹ سے کچھ پیسے نکال کر دائنا کے آگے کیے۔ جو اس نے ہاتھ میں پکڑنے کے بجائے کین سے بنی ایک ٹوکری کے اندر ڈلوا لیے۔ جس میں پہلے سے ہی کچھ پیسے موجود تھے۔ اس کا یہ انداز شاید اس لیے تھا کہ وہ کسی بھی گاہک کی رقم کو دیکھ نہ سکے کہ وہ اسے اس کے کام کی کتنی اجرت دے رہا ہے تا کہ اگلی بار اس کا کام کرتے وقت نہ تو وہ حد سے زیادہ گرم جوشی دکھائے اور نہ ہی سرد مہری......

''میں کب سے سوچ رہا تھا یہ کروانے کا......لیکن میرے خیال سے یہ بالکل ٹھیک وقت رہا۔''

''وہ کیسے......''

''فاسد خون کے ساتھ فاسد خیالات بھی نکل جاتے ہیں۔'' اس نے شرارت سے آنکھ دبائی۔ ''دیکھو۔ اب میں تمہیں

ایسے مل رہا ہوں جیسے کوئی فرشتہ۔ میرے دل میں کوئی برائی نہیں ہے۔'' کہہ کر وہ خود ہی ہنسنے لگا تھا۔ سبین بھی مسکرا کر رہ گئی تھی۔

''سبین...... تم کہاں ٹھہری ہوئی ہو۔''

''ایک گیسٹ ہاؤس ہے۔ این جی او نے ہی انتظام کیا تھا۔ جگہ کا نام تو مجھے نہیں آتا......'' وہ جان بوجھ کر جگہ کا نام بھول گئی۔

''اگر تم کہتی ہو تو میں تمہیں وہاں چھوڑ آتا ہوں۔ اس طرح تمہاری رہائش بھی دیکھ لوں گا۔''

''نہیں......'' اس نے سختی سے انکار کیا۔ وہ میران کو اپنے امریکا کے ''مشن'' کی بھنک بھی نہیں پڑنے دینا چاہتی تھی۔

''میرا مطلب ہے کہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔ میں چلی جاؤں گی۔ اب شام بھی ہو گئی ہے۔ میرے خیال سے ہمیں نکلنا چاہیے۔ واپسی کا سفر بھی طویل ہے۔''

دونوں نے شہر تک کے لیے ایک ہی ٹیکسی لی۔ پھر میران ایک جگہ پر اتر گیا۔

''ویسے اگر تم اپنی این جی او سے دو دن کی چھٹی لے سکتی ہو تو لے لینا...... پھر ہم دونوں ایک ساتھ ممی کو لینے سینی ٹوریم جائیں گے۔'' ٹیکسی سے اتر کر اس نے کھڑکی میں سر ڈال کر کہا تھا۔

''بہت مشکل ہے۔ وہ کبھی نہیں مانیں گے۔'' اس نے مشکل سے جھوٹ بولا۔

''مجھے کل پانچ بجے نکلنا ہے۔ اس لیے بتا رہا ہوں کہ اگر وہ مان گئے تو......'' میران نے آنکھ دبا کر مسکراتے ہوئے کہا۔ سبین کو پھر سے انکار میں سر ہلانے کے لئے اپنی ساری ہمتیں مجتمع کرنا پڑیں۔

جب وقت وہ گیسٹ ہاؤس پہنچی دن غروب ہونے کے لیے بے تاب تھا اور سارا عالم جماہیاں لیتا ہوا نیند کی آغوش میں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ رات انگڑائی لیتی ہوئی بیدار ہو رہی تھی۔ موسم میں لاجونتی کھلی ہوئی تھی۔ انگ انگ مہکا دینے والی...... اسی مہک میں ناؤتھ آرگن کا راگ بھی پھیل رہا تھا۔ سبین دائیں بائیں دیکھنے لگی۔ یہ صبح والا راگ ہی تھا۔ جلد ہی اسے وہ لڑکا اپنے روز کے راستے سے مخالف سمت سے آتا ہوا نظر آیا۔ صبح وہ جا رہا تھا اور اب آ رہا تھا۔ دن بھر لگتا تھا کہ وہ ماؤتھ آرگن ہی بجاتا رہا تھا۔ یہ ہی اس کا واحد کام تھا۔

گیسٹ ہاؤس کے اندر جانے سے پہلے وہ رک گئی۔ لڑکے کے قریب سے دیکھنے کا موقع بھی اسے تب ہی ملا تھا۔ سیاہ گدلی پینٹ پر سلیٹی رنگ کی ٹی شرٹ، سرخ جوتے جو اتنے پرانے ہو چکے تھے کہ اب ان کا اصل رنگ دیکھنے کے لیے آنکھوں کو تھکانا پڑتا تھا۔ سر پر سیاہ ربن، کانوں میں بالی، گردن پر چائینز رسم الخط کا ٹیٹو...... چھوٹی چھوٹی شفاف آنکھیں، کلی سے پھول میں ڈھلنے والے خدوخال...... وہ جیسا بھی تھا، اپنی بے فکری اور بے نیازی کی وجہ سے دلکش لگ رہا تھا۔ وگرنہ جو اس کا حلیہ تھا، کسی اور نے یہ سب اپنایا ہوتا تو احساس کمتری کے مارے سر نہ اٹھا سکتا۔

''ہیلو......'' وہ لڑکا اس کے بے حد قریب آ گیا تو سبین نے بڑے پیار سے اسے مخاطب کیا تھا۔ آج وہ اتنی خوش تھی کہ درختوں پودوں سے بھی گھنٹوں باتیں کر سکتی تھی۔ لڑکے کو اس نے اس لیے مخاطب کیا کہ وہ اس کے راگ کی تعریف کرنا چاہتی تھی۔ اسے بتانا چاہتی تھی کہ صبح جب وہ بیدار ہونے کے بعد اس کا راگ سنتی ہے تو اسے کتنا اچھا لگتا ہے۔

لڑکے نے شاید اس کے ''ہیلو......'' کی آواز نہیں سنی تھی۔ وہ ویسی ہی بے نیازی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ سبین کو پھر اسے مخاطب کرنا پڑا تھا۔ اس بار لڑکا رک گیا تھا اور ماؤتھ آرگن بجانا چھوڑ کر اس نے سبین کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔ سبین نے بہت پیارے لفظوں کے چناؤ کر کے اس کی موسیقی کی تعریف کی تھی اور اسے بتایا تھا کہ آج صبح اس کی موسیقی نے اسے کتنے اچھے انداز سے بیدار کیا ہے۔ وہ بے شک ایک سستا ماؤتھ آرگن بجاتا ہے لیکن وہ اسے اتنے اچھے انداز سے بجاتا ہے کہ وہ دنیا کا قیمتی ساز لگتا ہے۔

سبین کی تعریف پر لڑکے کے چہرے پر کسی طرح کے تاثرات نہیں ابھرے تھے۔ نہ منفی نہ مثبت...... وہ ابھی تک سوالیہ تھا۔ اس کی نظروں میں یہ عکس تھا کہ کیا وہ کوئی خاص بات کہنا چاہتی ہے۔ سبین حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ لڑکے نے جو اشارہ کیا، اس نے سبین کے پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ لی تھی۔

اشارے میں اس لڑکے نے سبین کو بتایا تھا کہ وہ گونگا ہے اور بہرہ بھی...... نہ سن سکتا ہے اور نہ بول سکتا ہے، اس لیے اسے جو کہنا ہے اشاروں میں سمجھائے۔ سبین اس کا اشارہ سمجھ کر دم بخود رہ گئی تھی۔

''اگر یہ گونگا بہرہ ہے تو اتنا اچھا ماؤتھ آرگن کیسے بجا لیتا ہے؟'' اپنے کمرے میں پہنچنے تک سبین بس یہ یہ بات سوچ جا رہی تھی۔

اس گونگے بہرے لڑکے کا نام حائک ہے اور یہ سمبل کے درختوں کے جھرمٹ تلے بیٹھی دائنا کا بھائی ہے۔

☆......☆......☆

چکنے فرش پر کرسٹل کا گل دان پھولوں سمیت پھینکا گیا تھا۔ مہنگے اور نفیس گل دان کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے فرش پر کینچوؤں کی طرح دور تک پھیلتے چلے گئے تھے۔ ایک شور بلند ہوا تھا جو چھناکے کے بعد خاموشی میں بدل گیا تھا اور شور سے زیادہ وہ خاموشی وحشت ناک تھی۔

واقعہ ایسا ہوا تھا کہ پیٹرسن خود کو پرسکون نہیں رکھ پایا تھا۔ جب کہ اسے ''گرینڈ فادر'' کی نصیحتیں ہمیشہ یاد رہتی تھیں کہ ایک فاتح آدمی کو جیت کے ساتھ ساتھ ہار میں بھی ایک فاتح کی طرح کا رویہ اپنائے رکھنا چاہیے۔ بردبار، بارعب اور باوقار...... پیٹرسن کو ہر صورت پرسکون رہنا تھا کیونکہ...... اسے ''فاتح'' بننا تھا۔

جیفرسن سمیت باقی سب گول دائرے میں سر جھکائے اس دیوتا پر اپنا ایمان سونپے ہاتھ باندھے پجاریوں کی طرح کھڑے تھے۔ پھر جیفرسن ہی پیٹرسن کے پاس آیا تھا کیونکہ گروپ میں بس اس کی ہی ہمت تھی کہ وہ پیٹرسن کے غصے کو جھیل پاتا۔

''پیٹی...... پرسکون ہو جاؤ۔'' اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پیار سے کہا تھا۔

''میں کیسے پرسکون ہو سکتا ہوں جب تک مجھے پتا نہ چل جائے کہ یہ سب نے کیا ہے۔'' اس نے غصے سے کہا تھا۔

غصے میں وہ اور زیادہ دلکش لگ رہا تھا۔ اس کے گال سرخ ہو رہے تھے اور کان کی لوئیں بھی...... وہ بالکل اپنے باپ پر گیا تھا۔ اسے بھی غصہ ایک دم سے اور شدید آتا تھا۔ تب اس کے بھی گال اور کان کی لوئیں سرخ ہو جاتی تھیں۔ پیٹرسن نے ایک چیز اضافی پائی تھی اور وہ تھی آنکھوں کے ڈوروں کا جامنی ہو جانا...... ایسی حالت میں اس پر سے نظر نہیں ہٹتی تھی۔ وہ انہی لوگوں میں سے تھا جو جب جب غصے میں آتے ہیں تو ان کی کشش دو چند ہو جاتی ہے۔ اور ان کے جسم کی جلد سونے کی طرح تپ کر اپنے جم سے بڑھ جاتی ہے۔

پیٹرسن کے بدل پر چڑھی سفید شرٹ کے بٹن اس طرح کھنچ گئے تھے کہ اس کا سراپا باہر آنے کو بے تاب نظر آ رہا تھا اور سر کے بالوں کی ایک موٹی لٹ ماتھے پر آ گری تھی۔

''کسی نے کچھ نہیں کیا...... تم غلط سوچ رہے ہو۔''

''نہیں۔ کوئی ہے۔ پہلے برنابی اور اب...... اب کون ہے جو غداری کر رہا ہے۔''

''یہ غداری نہیں تھی۔ یہ محض اتفاق تھا۔''

''یہ اتفاق نہیں ہو سکتا۔ یہ مخبری تھی۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ میرے ادارے سے چھپنے والی کتابوں کی جانچ پڑتال کرے اور مقدس کتابوں کی جانچ کرنے کے بارے میں تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ پھر اسی کھیپ کی جانچ کی گئی ہے جس میں چرس اسمگل کی جا رہی تھی۔ باقی کھیپ کو جانے دیا گیا ہے۔ پولیس کو نہ صرف اس کنٹینر کا نمبر معلوم تھا بلکہ ان کارٹن کے بارے میں بھی علم تھا جس میں چرس تھی اور تم کہہ رہے ہو کہ یہ سب اتفاق تھا۔''

جیفرسن خاموش ہو گیا تھا۔ پیٹرسن کے اندازے درست اعداد و شمار بیان کر رہے تھے۔

''لیکن اس سے ہمیں کوئی نقصان نہیں ہو گا ڈان...... آپ پریس میں وضاحت دے چکے ہیں کہ کوئی ہمارے ادارے کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس لیے اس نے ہمارے ادارے سے شائع ہونے والی مقدس کتابوں کے ذریعے اسمگلنگ کی ہے۔ آپ کے اس بیان نے سب کو مطمئن کر دیا ہے۔''

''لیکن میں مطمئن نہیں ہوں۔ مجھے جاننا ہے کہ کون ہے وہ؟'' پیٹرسن نے اپنی پینٹ کے ساتھ منسلک کیلس کو کھول کر

پرے پھینکا تھا۔ گرینڈ فادر کی ساری نصیحتیں یاد ہونے کے باوجود بھی وہ پرسکون نہیں ہو پا رہا تھا۔

''کارزل میں یہ کام تمہارے ذمے لگاتا ہوں۔ ایک ہفتے کے اندر اندر مجھے بتاؤ کہ وہ کون ہے جو بظاہر تو میرا دوست ہے لیکن پس پردہ میرا دشمن ہے۔''

''جو آپ کا حکم ڈان......''

کارزل کے جانے کے بعد ایک ایک کر کے باقی سب بھی نکل گئے تھے۔ صرف ایک جیفرسن وہاں ہی موجود رہا تھا۔

پیٹرسن نے اپنی شرٹ کے بٹن کھول کر اسے اپنے جسم سے الگ کیا تھا۔ پھر خاموشی اور سکون سے وہ ایک اونچے صوفے پر کسی شہنشاہ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ غصہ نکل گیا تھا۔ اب اطمینان سے سوچنے کا وقت تھا۔ اس کے تپے ہوئے گال، سرخ ہوئی آنکھیں آہستہ آہستہ نارمل حالت میں آنے لگی تھیں۔ غصے نے جو اس کے خدوخال بے ترتیب کر دیئے تھے تو اب وہ دوبارہ سے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ رہے تھے۔ اس کی درویشانہ صفتیں ظاہر کرنے والی معصومانہ خوب صورتی واپس لوٹ رہی تھی۔

جیفرسن نے کمال ہوشیاری سے دراز کھول کر وہاں سے ''کنگ آف ڈنمارک'' کے سگار نکالے تھے اور ایک سگار سلگا کر پیٹرسن کو پیش کیا تھا۔ پیٹرسن نے اسے تھام لیا تھا۔ مطلب اب خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔

''اتنا غصہ مت کیا کرو بھائی......تم جانتے تو ہو کہ تم میری جان ہو۔'' جیفرسن نے پیچھے آ کر ہلکے سے اس کے برہنہ کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھے اور وہاں مساج شروع کر دیا۔ وہ اسے آرام پہنچانا چاہتا تھا۔ پیٹرسن نے بھی ہلکے سے اس کے ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔ گرینڈ فادر کے بعد پوری دنیا میں سب سے زیادہ محبت اسے اپنے اسی چھوٹے بھائی سے تھی۔

''لیکن مجھے یہ بات سمجھ نہیں آ رہی کہ گروپ میں میرا دشمن کون ہے۔'' تین چار کش لے کر سلیٹی دھواں ہوا میں چھوڑتے ہوئے اس نے کہا۔

''میرے خیال سے یہ جوزف کا کام ہے۔ وہ برنابی کا گہرا دوست تھا۔ اور برنابی کی طرح وہ بھی تم سے جلنے اور حسد کرنے کے جذبے میں مبتلا ہے۔''

''اگر یہ کام جوزف کا ہی ہوا تو اسے بھی برنابی کے پاس جانا ہوگا۔''

''فی الحال تم سب بھول جاؤ......اتنا غصہ تمہاری صحت کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔''

''ولیم بھی اسی طرح غصہ کیا کرتا تھا۔ یہ شاید اسی کا اثر ہے۔'' پیٹرسن نے کہا تو جیفرسن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے باپ کا ذکر سالوں میں ایک آدھ بار ہی کیا کرتا تھا۔ وہ بھی کسی خاص خاص موقعے پر یا تب جب اس کے ذہن میں کوئی خاص بات ہوتی تھی۔ آج وہ کیا سوچ رہا تھا؟

''تمہیں سکون کی ضرورت ہے پیٹی۔''

پیٹرسن خاموش رہا تھا۔

''تمہیں یاد ہے پیٹی! بچپن میں ہم رش جھیل جایا کرتے تھے۔وہاں ڈیڈ ایک عورت سے جونکیں لگوایا کرتے تھے۔''

''ہاں......یاد ہے مجھے۔اس عورت کی ایک ننھی بچی بھی بیٹھتی تھی وہاں پر......بڑی بڑی آنکھیں ہوا کرتی تھیں اس کی۔''

''اب وہ لڑکی جوان ہو چکی ہے اور اس کی خوب صورتی......قیامت خیز ہے۔''

''کیا واقعی......؟''

''یقین نہیں تو خود دیکھ لو......''جیفرسن نے کچھ ایسی ادا سے کہا کہ پیٹرسن نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔جیفرسن معنی خیزی سے مسکرا رہا تھا۔لیکن کیا وہ پیٹرسن کی فطرت سے واقف نہیں تھا۔وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ پیٹرسن کو عورتوں سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔

''نہیں......'' پیٹرسن نے سختی سے نفی میں سر ہلایا۔پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔یہ اس کی ناراضی کی واضح علامت تھی۔

جیفرسن منہ لٹکا کر وہاں ہی کھڑا رہا تھا۔اس نے غلط وقت پر داؤ کھیلا تھا۔

بیڈ پر گرتے ہی پیٹرسن کو ایما یاد آئی تھی۔جس کے بعد اسے دنیا کی ساری عورتوں سے نفرت ہو گئی تھی۔

ایما......پیٹرسن کی ماں......اس کی پہلی بے پناہ محبت اور آخری بے انت نفرت......

کیونکہ بہت سی برائیوں کے ساتھ ایما میں ایک برائی یہ بھی تھی کہ وہ ایک کال گرل تھی۔

☆......☆......☆

میران نے اپنا مختصر سا سامان پیک کیا تھا۔اس نے ربیکا کے لیے ابھی سے بہت سے کھانے بنا کر فریج میں رکھ دیئے تھے۔اس کا کمرہ سجا دیا تھا۔اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ پھول بھی ابھی لا کر رکھ دیتا اور موم بتیوں کو بھی ابھی روشن کر دیتا۔

وہ ان دنوں بہت خوش تھا۔کل تمام دن کی سبین سے ملاقات نے اسے مزید نہال کر دیا تھا۔پاکستان سے پہلی ملاقات کے بعد وہ اسے بہت تفصیل سے سوچتا رہا تھا۔ایک گھبرائی گھبرائی سی لڑکی، جو چادر کے کونے میں انگلیاں لپیٹ کر اپنی بے چینی کو دور کرتی ہے۔ہاں کچھ ملاقاتیں ایسی ہی ہوتی ہیں جن کی یادیں آپ کو ہنسنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔وہ دوستوں کو بتا تا رہا تھا کہ کس طرح اس نے ایک لڑکی کے ماڈل توڑ دیئے اور پھر آگے کیا کیا ہوا۔سب سن کر ہنستے تھے اور وہ یاد کر کے......کیسا عجیب اتفاق تھا کہ اب وہ ہی لڑکی اس کے شہر میں رہ رہی تھی۔اس نے کل سبین سے پوچھا بھی تھا کہ کیا وہ اس کے ساتھ ممی کو لینے جانے میں دلچسپی رکھتی ہے۔سبین نے اپنی مجبوریاں بتا کر انکار کر دیا تھا۔پھر بھی میران کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ایک بار پھر سبین کو کال کرے،اس سے

پوچھے کہ کیا این جی او اسے آف دینے پر رضا مند ہوئی کہ نہیں......؟

پھر اس نے خود ہی یہ ارادہ ترک کر دیا تھا۔ یہ کسی کی زندگی میں حد سے زیادہ مداخلت تھی۔ پھر ابھی ان کی ملاقاتیں بھی ایسی نہیں ہوئی تھیں کہ وہ اس کے ساتھ اتنا لمبا سفر کرنے میں آرام دہ محسوس کرتی۔

چار بجے کے قریب جب وہ دروازے کو لاک کر کے گھر سے نکلنے والا تھا تب اس کا سیل فون بجا تھا۔

''میں سبین بول رہی ہوں میران...... مجھے این جی او نے آف دے دیا ہے۔انہوں نے کہا ہے کہ تم امریکا گھومو...... وہاں موجود مساجد اور چرچ کے تخمینے اکٹھے کرو۔ اگر میں تمہارے ساتھ جانا چاہوں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟''

''اعتراض......؟'' میران نے اچنبھے سے پوچھا تھا اور اگلے ہی پل دونوں ہنسنے لگے تھے۔

☆......☆......☆

پہاڑ رفتہ رفتہ بڑھتے اونچے ہوتے جا رہے تھے۔سڑکیں پر پیچ اور بل دار......سفر لمبا تھا اور سبین کا دل کر رہا تھا کہ یہ سفر کبھی ختم نہ ہو......فضا میں جیسے ازلی خاموشی تھی۔کوچ سے باہر درختوں کے پتے اور شاخیں نجانے کون سا راگ گا رہی تھیں کہ تتلیاں اس راگ پر رقص کرتی، لہراتی ہوئی جھنڈوں کی شکل میں وہاں اکٹھی ہو رہی تھیں۔سبین نے یہ تو سنا تھا کہ بنگال میں ایسے جادوگر موجود ہیں جو کہیں بھی بین بجائیں تو وہاں سے سانپ نکل آتا ہے۔لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ امریکا کے ایک خطے میں درختوں جیسے بے جان جادوگر بھی موجود ہیں۔جن کی بین پر تتلیاں لبیک کہتی ہیں۔

کوچ میں کھانا سرو کرنے کے بعد اب سوال و جواب کا سیشن شروع کیا جا رہا تھا۔ پہلا سوال کسی ایکٹر کے بارے میں تھا۔جس کا جواب میران کو نہیں آتا تھا۔جس نے اس سوال کا درست جواب دیا تھا اسے ایک ٹیڈی بئیر دیا گیا تھا۔

''مجھے بھی ٹیڈی بئیر چاہیے۔'' سبین نے بچوں کی طرح ضد کی تھی۔

''اوکے......میں کوشش کرتا ہوں۔''

آگے مزید دس سوال پوچھے گئے تھے جس میں سے میران کسی ایک کا بھی جواب نہیں دے پایا تھا۔

''میران......تم میرا ایک چھوٹا سا کام کر سکتے ہو۔''

''یار تمہیں بازار سے ٹیڈی بئیر لے دوں گا۔'' اس نے کہا تھا اور پھر پوچھے جانے والے بارہویں اور آخری سوال کا جواب دے دیا تھا۔

''یہ لو......آ گیا تمہارا ٹیڈی بئیر...... پتا نہیں لڑکیوں کو ٹیڈی بئیر اتنے پسند کیوں ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ ان کو اپنے ساتھ ایسے چپکا چپکا کر رکھتی ہیں جیسے وہ کوئی جیتا جاگتا انسان ہو۔''

''کیونکہ لڑکیوں کو تحفظ پسند ہوتا ہے۔''

''اور یہ تحفظ وہ ٹیڈی بیئر میں ڈھونڈتی ہیں؟''

''ہاں۔'' وہ ہنسی تھی اور اس کی ہنسی میں جلترنگ کے سارے سُر شامل تھے۔

محبت پھول کے اندر کا زرگل ہے جس کے اندر پورے پودے کی بقا مقید ہوتی ہے۔

میران کو نجانے کب نیند آ گئی تھی۔ اس کا سر سبین کے کندھے پر ڈھلک گیا تھا اور سبین کا دل چاہا کہ وہ قیامت تک اسی طرح بیٹھی رہے۔ کیا وہ دونوں عالم ارواں سے ایسا ہی گہرا تعلق بنا کر نکلے تھے؟ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر وہ ان سوچوں کو سوچنے لگی تھی جو کبھی گھر کی کھڑکی سے آرٹ کالج کو دیکھتے ہوئے اس کے دماغ میں آتی تھیں۔

محبت اتھاہ گہرائیوں والا چشمہ ہے۔ اس کی آبیاری کبھی ختم نہیں ہو سکتی۔

بابا، زویا، اماں، طغرے، اسمگلنگ، ڈینی...... وہ اس وقت کسی ایک کے بارے میں بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ بس...... سوائے میران کے...... سوچتے سوچتے نجانے اسے بھی کس وقت نیند آ گئی تھی اور اس کا سر میران کے سر کے اوپر آ گیا تھا۔

محبت شہد کی مٹھاس ہے اور اس میں شہد کا بھاری پن نہیں۔

ذہن سوتے وقت بھی وہ ہی غلطیاں کرتا ہے جیسا ہم اسے حکم دیتے ہیں۔ جیسا ہم اسے کرنے کو کہتے ہیں۔ سفر لمبا تھا لیکن اتنا لمبا نہیں جتنا وہ دونوں بند آنکھوں کے پیچھے جاگتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ طے کر رہے تھے۔

محبت شبنم کی اوس ہے۔ پھول کی ہر پتی کے لیے اس کا غسل لازم ہے۔

☆......☆......☆

ربیکا پہلے سے صحت مند نظر آ رہی تھی اور اس کی رنگت بھی کھلی ہوئی تھی۔ چہرہ شاداب ہو چکا تھا۔ صحت افزا مقام نے اس پر مثبت اثر ڈالا تھا۔ میران کو اس نے بھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا تھا اور میران کسی ننھے بچے کی طرح رو دیا تھا۔ دونوں کا یہ جذباتی سین دیکھ کر سبین کو احساس ہوا تھا کہ اسے وہاں نہیں آنا چاہیے تھا، لیکن ربیکا نے جلد ہی اس کی خفت دور کر دی تھی۔ وہ اس کے بیٹے کی پسند تھی۔ وہ پہلی نظر میں ہی سب جان گئی تھی۔ جلد ہی اس نے سبین سے بہت دوستانہ تعلق بنا لیا۔

ربیکا یہ جان کر بہت خوش ہوئی کہ وہ پاکستان سے آئی ہے۔

''تم کبھی سرگودھا گئی ہو؟'' اس نے اشتیاق سے پوچھا تھا۔ میران اس کی شکل دیکھ کر رہ گیا تھا۔ ربیکا نے بھی عین اسی لمحے میران کو دیکھا تھا اور وہ چپ ہو گئی۔ وہ اپنے دکھی بیٹے کو مزید دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔

''نہیں......'' سبین نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے مختصر جواب دیا تھا۔ ربیکا نے مزید کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ سامان بندھا ہوا تھا

اور واپسی کی ٹکٹس بھی میران نے جاتے وقت ہی بک کروالی تھیں۔ جلد ہی انہوں نے واپسی کا سفر طے کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ایسا اس لیے بھی جلدی ہوا تھا کیونکہ ربیکا وہاں ایک لمحہ بھی مزید گزارنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

پورے دو دن بعد واپس گیسٹ ہاؤس آکر سبین سوچنے لگی تھی کہ وہ یہاں کس لیے آئی تھی اور کس کام میں گرفتار کردی گئی تھی۔ وہ کس قید سے ڈر رہی تھی اور اب کس قید میں قید ہو جانے کے لیے دعا گو تھی۔ زندگی اس کے ساتھ کون سا کھیل کھیل رہی ہے۔ آنکھ مچولی یا کوکلا چھپا کی...... آنکھ مچولی جس میں پتا نہیں چلتا کہ آپ کی تھکن زدہ باری کسی اور کو منتقل ہونے والی ہے یا پھر سے آپ کو نئے سرے سے اسے ادا کرنا ہے۔ کوکلا چھپا کی...... میں ہر لمحہ ڈر رہتا ہے کہ آپ کو پیچھے سے ایک دھپ نہ پڑ جائے۔ وہ دونوں ہی کھیلوں سے ڈرتی تھی۔ پیچھے سے دھپ پڑنے سے بھی اور نئے سرے سے تھکن زدہ باری ادا کرنے سے بھی......

شام میں اسے احساس ہوا تھا کہ اس نے گھر کال نہیں کی جبکہ بابا نے اسے کہا بھی تھا کہ وہ ہر روز نہیں تو ہر دو دن بعد انہیں لازمی کال کرکے اپنی خیریت کے بارے میں بتاتی رہے۔

''سلام بابا......'' اس کی خوش کن آواز سن کر بابا جیسے پل بھر میں مطمئن ہو گئے تھے۔

''وعلیکم السلام۔ کیسی ہو، خوش ہو؟''

''جی۔ بہت خوش ہوں بابا!'' اس نے چہکتے ہوئے بتایا تھا۔

''کام ٹھیک سے سیکھ رہی ہو؟'' معصوم بابا نے معصوم سوال کیا تھا۔

''جی......'' اور اگلے ہی پل اس کی آواز دھیمی ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

اس نے اپنے نیویارک قیام کا آخری ڈنر میران کے گھر میں کیا۔ ربیکا کی دعوت پر...... وہاں ہی ربیکا کے بارے میں اسے پتا چلا۔ خود ربیکا کی زبانی اور کچھ کچھ میران کے ذریعے...... پاکستان سے ایک خوبرو نوجوان کی آمد، ربیکا کا اس کی محبت میں مبتلا ہونا، پھر دونوں کی شادی اور عیسیٰ کی غیر یقینی موت...... ربیکا نے پرانی تصویریں نکال کر سبین کو بھی دکھائیں، جنہیں دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی۔ میران اپنے والد پر دس فیصد بھی نہیں گیا تھا۔ پشمینے میں لپٹا عیسیٰ تو کوئی ولی لگتا تھا۔ ولی بھی ایسا جو اپنے عہدے اور عہد دونوں سے بے نیاز ہو۔

میران خوش تھا۔ ربیکا بہت اچھے انداز میں عیسیٰ کا ذکر کر رہی تھی۔ اور وہ عیسیٰ کے باتوں میں ''تھا'' کا صیغہ استعمال کر رہی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ مان چکی تھی کہ عیسیٰ مر چکا ہے۔ کھانا بے حد پر تکلف ماحول میں کھایا گیا۔ سبین نے کھانے کے بعد میران کے ساتھ مل کر برتن دھلوائے۔ ربیکا نے پہلے تو منع کیا لیکن میران نے ربیکا کو دیکھ کر آنکھ ماری اور ربیکا مسکرا کر اپنی جگہ پر ہی چپکی رہی۔ میران کی یہ حرکت سبین نے بھی دیکھ لی۔ شرم سے وہ کچھ کہنے سننے کے قابل نہیں رہی۔

''کل صبح کتنے بجے کی فلائٹ ہے تمہاری؟'' میران برتن دھو دھو کر سبین کو پکڑا رہا تھا اور وہ ان پر خشک کپڑا مار کر ایک طرف رکھتی جا رہی تھی۔

''کل صبح کی دس بجے کی۔''

''پھر کب آؤ گی؟''

''جب حکم ہوگا۔''

''مجھے تمہارا انتظار رہے گا۔''

''مجھے خود......دوبارہ یہاں آنے کا......''

''سبین......؟''

''بولو میران......؟''

''میں ان دنوں زندگی میں پہلی بار اتنا خوش ہوں۔''

''عجیب اتفاق ہے۔میں بھی......''

''کیا تمہارے پاس بھی دو وجوہات ہیں۔میرے پاس تو دو ہیں۔ایک ممی کی صحت یابی اور دوسری......''

''میرے خیال سے مجھے اب چلنا چاہیے۔مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' جلدی سے اس نے کپڑا ایک طرف رکھ دیا۔

''تمہیں دیر نہیں ہو رہی......تم ہچکچا رہی ہو اپنا نام سنتے ہوئے۔''

''کیونکہ میں سب کچھ ابھی سننا نہیں چاہتی میران ......میں پھر سے ملاقات کے لئے بھی کچھ رکھنا چاہتی ہوں۔سب ایک ہی ملاقات میں ختم نہیں کر دینا چاہتی، کچھ ادھار بھی رکھنا چاہیے، باتوں میں، ملاقاتوں میں اور تقدیروں میں......کیونکہ تقدیر خود پر ادھار رکھتی ہے نہ احسان......وہ جلد سے جلد ان دونوں چیزوں سے مبرا ہونا چاہتی ہے۔ہم اپنی ملاقات میں کچھ ادھار رکھیں گے تو ہماری تقدیر ہمیں پھر سے ملوانے کی کوشش کرے گی تاکہ تب ہم سارے حساب کتاب بے باق کر لیں۔''

میران نے سبین کی آنکھوں میں جھانکا تھا۔وہ خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ سمجھ دار بھی تھی۔

''مجھے جانے دو میران......مجھے جانا ہے اور جا کر پھر سے آنا ہے؟''

''میں ہر پل تمہارا انتظار کروں گا۔'' میران نے جذب سے کہا تھا۔سبین جو پہلے سے ہی اس کی محبت میں موم بنی ہوئی تھی اس گرم لہجے سے پگھل کر رہ گئی۔

☆......☆......☆

ایک سال سے بھی زیادہ عرصہ سینی ٹوریم میں رہ کر آنے کے بعد ربیکا اب پھر سے اس ماحول میں جذب ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔عیسیٰ کی خوشبو کو وہ لمحہ بہ لمحہ پھر سے اپنے اندر جذب کر رہی تھی۔اس بات پر یقین کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ عیسیٰ مر چکا ہے۔یہ صرف اس کی خوشبو ہے۔جو زندہ ہے اور صرف اس کے لیے زندہ ہے تاکہ وہ اپنی زندگی میں عیسیٰ کی کمی کو محسوس نہ کرے۔وہ قدرت کی اس فیاضی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی تھی۔

میران دیکھ رہا تھا کہ ربیکا شاید ٹھیک تو ہوگئی ہے لیکن ٹھیک سے زیادہ خاموش ہوگئی ہے۔وہ اس کے ساتھ مختلف جگہوں پر جانے کے پروگرام بنانا چاہتا تھا۔اس کے ساتھ گھومنا پھرنا چاہتا تھا لیکن ربیکا اس کے ہر پروگرام کو یہ کہہ کر رد کرتی جارہی تھی کہ اس کا کہیں بھی گھومنے پھرنے کا کوئی ارادہ نہیں۔وہ بس گھر میں رہنا چاہتی ہے۔

میران اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ تبدیلی کی بے کلی سمجھا تھا۔خود میران کو بھی سبین کے جانے کے بعد پھر سے اپنی روٹین میں واپس آنے میں بہت وقت لگا تھا۔پندرہ دنوں کی ان ملاقاتوں میں اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ تو اپنے بچپن سے سبین نامی دوست کا عادی رہا ہے۔اب وہ چلی گئی تھی تو اسے عجیب بے کیفی کا احساس ہونے لگا تھا۔اس نے کہا تھا کہ وہ پھر سے آئے گی۔لیکن کب آئے گی اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔آئے گی بھی کہ نہیں......تو کیا اس صورت میں اسے پاکستان جانا پڑے گا؟

گھر کی خاموشی میں ربیکا بھی خاموش تھی۔ساتھ ایک دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ پھر سے پرانی روش پر نہ چل پڑے۔ میران نے اس کی حرکتوں پر نظر رکھنی شروع کر دی تھی۔نتائج فی الحال مثبت ہی تھے۔ابھی تک ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی تھی۔ لیکن اکثر اوقات کلب سے واپسی پر اسے گھر میں سگریٹ کی تیز خوشبو محسوس ہوتی تھی۔وہ ایک ایک چیز کی جانچ کرتا تھا لیکن سگریٹ کا کوئی سراغ نہیں لگا پاتا تھا۔پھر وہ سر جھٹک کر اپنے شکوک رفع کرتا تھا۔شاید یہ سب اس کی غلط فہمیاں تھیں، اس کے وسوسے تھے، وہم تھے۔

سب حقیقت تھی۔وہ کیسے جان پاتا......

''ممی! مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ وہ عادتیں پھر سے نہیں اپنائیں گی۔''

''تمہیں اس کام کے لیے وعدے کی کیا ضرورت ہے۔''

''بس آپ نہیں جانتیں۔ڈاکٹرز نے آپ کے بارے میں مجھے کیا کیا ہدایات دی ہیں۔آپ وہاں بہت عرصہ ایک ہجوم میں رہی ہیں۔اب مجھے کام کرنا ہے۔میں نہیں چاہتا کہ اس گھر کی تنہائی میں آپ پھر بری عادتیں اپنالیں۔''

''ایسا نہیں ہوگا۔'' ربیکا سپاٹ انداز میں بولی تھی۔

''میں نہیں چاہتا کہ میں آپ پر پابندیاں لگاؤں، آپ کو گھر سے باہر نہ جانے دوں، آپ کے پاس نہ ہوں۔میں چاہتا

ہوں کہ آپ زندگی کا اس طرح مزا لیں جیسے دوسرے لوگ لے رہے ہیں۔ جیسے آپ کی دوستیں لے ہی ہیں۔ آپ برے لوگوں کا ساتھ چھوڑ دیں کیونکہ اگر آپ ان کا ساتھ نہیں چھوڑتے تو وہ آپ سے آپ کا ضمیر چھڑوا دیتے ہیں۔"

"میں سمجھ سکتی ہوں۔"

"میں چاہتا ہوں کہ ہم اس گھر میں بہت ہنسی خوشی زندگی گزاریں......ہمیں کسی طرح کا کوئی غم نہ ہو......" وہ بولتا جا رہا تھا۔ ربیکا کا سرد اور سپاٹ انداز اسے ایک بے چین سے تجسس میں مبتلا کرتا جا رہا تھا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔"

"آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو آپ مجھے بتائیں......پلیز آپ مجھے آپ پر اعتماد کرنے کا موقع دیں۔ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ پھر سے بری چیزوں کے قریب نہیں جائیں گی۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں۔"

میران نے اپنا ہاتھ آگے کیا تھا۔ ربیکا اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

سینی ٹوریم نے اس کا علاج ہی نہیں کیا تھا، اسے پتھر کا بھی کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

وہ واپس آ گئی تھی، ایک بار پھر سے جانے کے لیے......وہ انتظار میں تھی، بے تاب تھی اور بات بات پر چہک رہی تھی۔ بابا اور زویا نے حیرت سے اس کے بدلے ہوئے روپ کو دیکھا تھا۔ کیا پندرہ دن کے لیے کراچی جانا اسے ایسا ہی سرشار کر سکتا تھا؟ بابا کو علم ہوتا تو وہ کب کا اسے کراچی بھجوا چکے ہوتے۔ پندرہ دنوں کی غیر حاضری کے بعد وہ جیسے کسی اور ہی سبین سے مل رہے تھے۔ پرانی جون کو وہیں کراچی میں چھوڑ آئی تھی اور جونئی بدل کر آئی تھی وہ خوش گوار حیرت کا سبب بن رہی تھی۔ بابا نے اس کی خوشی کو نوٹ کیا تھا۔ انہوں نے اپنے بال چونے سے سفید نہیں کیے تھے لیکن وہ مطمئن تھے کہ چلو وہ تو خوش ہے ناں......طلاق کے بعد انہیں لگا تھا کہ وہ سنبھل ہی نہیں پائے گی اور نہ ہی انہیں سنبھلنے دے گی۔ وقتی طور پر وہ بھول گئے تھے لیکن وہ آج کل کچھ کچھ باغی ہو گئی ہے۔ انہوں نے اس کی ضدوں کو بھی نظر انداز کر دیا تھا۔

سبین بابا اور زویا سے ایسے باتیں کر رہی تھی جیسے زندگی بھر میں اس کی وہ ہی تو دونوں سہیلیاں بنی ہوں بس......

زویا بھی اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کی پہلی والی سبین آپی پھر سے لوٹ آئی تھی، جو اس کے ساتھ مل کر گھر کے سارے کام کرتی تھی۔ اس کے بال بناتی تھی، اسے لے کر بازار جاتی تھی۔ جس کے ساتھ دوپہر کی گرمیوں میں اس نے سٹے اور آلو ابال ابال کر کھائے تھے اور سردیوں میں بڑے شوق سے گڑ کی گچک اور چاول کی پنیاں بنائی تھیں۔

ڈینی نے سبین کو پیسے دیئے تھے۔لیکن ایک چوتھائی......جیسا کہ''زبانی معاہدے''میں طے کیا گیا تھا۔وہ کچی گولیاں کھیلنے کا عادی نہیں تھا۔وہ سبین کا استعمال آگے بھی کرنا چاہتا تھا۔وہ نہیں جانتا تھا کہ اب تو وہ سبین کو پورے پیسے دے دیتا تو سبین نے تب بھی امریکا جانے کے لئے اسے انکار نہیں کرنا تھا۔سبین کو نہ صرف ابھی مزید پیسے چاہئیں تھے بلکہ اسے ہر صورت باہر بھی جانا تھا۔میران سے ملنے کے لیے۔

وہ ایک چوتھائی پیسے بھی اتنے زیادہ تھے کہ انہیں تھام کر سبین کو کتنی دیر یقین ہی نہیں آیا تھا کہ اس نے''چونے''سے اتنے پیسے کما لیے ہیں۔رقم اس کے ذہن میں تو تھی لیکن جب تک وہ اس کے ہاتھ میں نہیں آ گئی وہ بے یقینی کا ہی شکار رہی......اسے لگتا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے گا۔ڈینی بنا پیسے دیئے ہی بھاگ جائے گا۔کہیں گم ہو جائے گا یا وہ ہی مر جائے گی،پر وہ اتنے پیسے نہیں کما سکے گی اور''چونے''سے تو ناممکن......اب ان ہی پیسے کو ہاتھ میں پکڑ کر وہ ایسے مسرت سے کھل رہی تھی جیسے آرٹ کالج کے باغ میں گل داؤدی کے پھول کھلا کرتے تھے۔چچا رشید غلط کہتے تھے کہ اس نازک ہاتھ ڈائی نہیں چلا سکتے......ان ہی نازک ہاتھوں نے ڈائی چلائی تھی اور ایسے چلائی تھی کہ ارد گرد کے سارے کارخانوں کے منافع کو مات دے دی تھی۔

ان پیسوں سے سب سے پہلے اس نے زویا کے ساتھ مل کر گھر کی تبدیلیاں کرنے کا آغاز کیا تھا۔معمولی نوعیت کی تبدیلیاں......اس نے گھر میں نیا رنگ کروایا تھا،کھڑکیوں کے پردے بدلے تھے۔کمروں میں کارپٹ بچھایا تھا۔اپنے اور زویا کے پلنگ سے دیسی روئی والے گدے ہٹا کر ان پر فوم والے میٹرس رکھے تھے۔باہر صحن کی اجڑی کیاری میں طرح طرح کے پھول دار پودے لگوائے تھے،طرح طرح کے گملے بھی لا کر رکھے تھے،بطخوں اور راج ہنس کی شکلوں والے،فرنیچر جو ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا اسے بھی بدلنے کو بابا کو کہہ دیا تھا۔وہ دونوں آئے دن بازار جا رہی تھیں اور سامان کے ساتھ لدی ہوئی واپس گھر آتی تھیں۔کھانا پکانے کا ان کا دل نہیں چاہتا تھا اس لئے وہ بھی زیادہ تر بازار سے ہی آ رہا تھا۔جبکہ بابا اسے دبے لفظوں میں کئی بار کہہ بھی چکے تھے کہ ان سے بازار کی روٹی نہیں کھائی جاتی،چلو سالن تک تو بات ٹھیک ہے۔

''کل آٹا گوندھ کر گھر میں روٹی بنا دوں گی۔آج کھا لیں۔''اور بابا کو کل کا انتظار کرتے پورے دس دن ہونے کو آئے تھے۔ڈھیٹوں کی طرح وہ بازار کی خمیری روٹی،جو ہوا لگتے ہی سخت ہو جاتی تھی،کو دانتوں تلے چبا چبا کر کھاتے رہتے تھے۔سبین سے بار بار اس لیے نہ کہتے تھے کہ نجانے کراچی میں کام کر کے کتنا تھک چکی ہو۔

''اتنے پیسے کہاں سے آئے تمہارے پاس؟''ایک دن بابا نے سرسری سے انداز میں پوچھا تھا۔اور بابا کا یہ سوال اسے واپس اس کے حواس میں لایا تھا۔وہ کراچی کام سیکھنے گئی تھی۔کمانے کے لیے نہیں......اسے یہ تاثر ہرگز نہیں دینا تھا کہ اس کے پاس کافی پیسے آ گئے ہیں۔بابا کی نظر میں ابھی وہ ہی خریداری تھی جو اس نے گھر کے لیے کی تھی۔جو ظاہر تھی،اگر وہ زویا اور سبین کی

الماری کھول کر چیک کرتے تو دیکھتے کہ وہاں کیا کیا کچھ نہ بھرا ہوا تھا۔ کپڑے، جوتے، جیولری، بیگز۔

''وہ میرے کام سے بہت خوش ہوئے ہیں۔ میں نے سیکھنے سے زیادہ وہاں کا کام کیا ہے۔ انہوں نے جاتے ہی مجھے وہاں مانیٹر (نگران) بنا دیا۔ یہ سب اسی کے پیسے ہیں۔'' وہ آج کل بہت اطمینان سے جھوٹ بولنے لگی تھی۔ ایئرپورٹ کی کھردری جلدوں والی انتظامیہ کو وہ بے وقوف بنا کر آ رہی تھی۔ سیدھے سادے بابا کیا چیز تھے اب اس کے آگے۔ انگریزی کے گہرے لفظوں میں بابا کو الجھا کر وہ سمجھ رہی تھی کہ اس کا جھوٹ سچ مان لیا جائے گا۔

''اتنے سارے......؟'' بابا اس کی بات پر کیسے یقین کرتے...... انہیں خود یہ کام کرتے ہوئے سالوں گزر چکے تھے۔ آخر ان کی بیٹی نے پندرہ دن میں وہاں کس قدر کام کر لیا تھا کہ اس کے پیسے ختم ہونے میں نہیں آ رہے تھے۔ سبین کو اندازہ ہوا کہ اس کے بابا ایئرپورٹ کی کھردری ساخت والوں سے زیادہ بے وقوف تو ہو سکتے ہیں لیکن پس ماندہ نہیں۔ پھر سب سے بڑی بات...... وہ اس کے بابا تھے۔

''اتنے بھی نہیں ہیں۔ یہ پردے تو میں لنڈے سے لے کر آئی ہوں اور یہ کارپٹ بھی کوئی عورت غلط کٹوا بیٹھی تھیں۔ میں نے اسے سستے داموں خرید لیا۔''

بابا کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ اس کے علاوہ کہ مطمئن ہو جاتے یا خاموش ہو جاتے۔

بعد کی ساری خریداری اس نے بہت چپکے چپکے سے کی تھی۔ اپنی بوریت کا حل اس نے بازار میں پھر کر خریداری کرنے سے خوب نکال لیا تھا۔ وہ زویا کو ساتھ لے کر انارکلی بازار چلی جاتی۔ دونوں وہاں بے مقصد گھومتی رہتیں...... چاٹ کھاتیں، دہی بھلے، آئس کریم، گول گپے...... کبھی وہ بھی لڑکے لڑکیوں کو بازاروں میں اسی طرح بیٹھ کر پیسے کی فکر سے بے نیاز کھاتے ہوئے، خریداری کرتے ہوئے دیکھتی تھی، اور ان سب کو دنیا کے خوش قسمت لوگ جانتی تھی۔ آج وہ بھی ان جتنی ہی خوش قسمت تھی۔ چیزیں جو جو اسے پسند آتی جا رہی تھیں وہ انہیں خریدتی جا رہی تھی۔ سلے ان سلے سوٹوں کا تو اس کی الماری میں ڈھیر لگ چکا تھا۔ چونکہ ساری زندگی غربت میں گزاری تھی اور سستے سوٹ، جوتے ہی پہنے تھے تو اب اسے پسند بھی وہی آ رہے تھے۔ مہنگی دکانوں کے پھیکے رنگو والے جدید سوٹ تو اسے بوڑھی مائیوں کے پہناوے لگ رہے تھے۔ زویا بھی نت نئی چنری کے دوپٹے اوڑھ کر خوش ہوتی رہتی تھی۔

ایسے ہی کسی دن انارکلی بازار میں گھومتے ہوئے رشید کی اس سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ رشید اسے دیکھ کر ساکت ہو گیا تھا۔ سبین پہلے سے زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی، اور اس سے بڑی قیامت خیز بات...... وہ سچے دل سے مسکرا رہی تھی۔ رشید کو کرنٹ لگنا تو بنتا ہی تھا۔

سبین نے نفرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا دل چاہا تھا کہ وہ اس رشید نامی لڑکے پر جو بدقسمتی سے اس کا تایا زاد تھا

تھوک دے، جو اپنے سے زیادہ اپنی ماں کے نقش قدم پر چل رہا تھا۔ جس کی اپنی ریڑھ کی ہڈی نہیں تھی لیکن سبین نے ایسا نہ کیا...... اس نے اس تھوک بھی اہمیت دی کہ وہ کیوں اسے ایک غلیظ شخص پر پھینک کر گندا کرے۔

زندگی نے اسے اپنے رنگ دکھائے تھے۔ پورے بیس سال......اب وہ چاہتی تھی کہ زندگی بھی دیکھ لے کہ انسان کیا کیا رنگ رکھتا ہے۔ کیا کیا رنگ اپنا سکتا ہے۔ وہ کیسے اپنے پرانے رنگوں کو بھول جاتا ہے۔ وہ سب اسے زنگ آلود لگنے لگتا ہے اور یہ سب نیا......خواہ وہ پیتل ہی کیوں نہ ہو اور اس نے بہت جلد زنگ سے بھی کریہہ صورت کیوں نہ اختیار کر لیتی ہو۔ وہ سب اسے سونے، ہیرے کی طرح کا دمکتا ہوا لگتا تھا۔

وہ جو پچھلے تیئس سالوں سے اس گھر میں رہ رہی تھی۔ پندرہ دن ایک لگژری گیسٹ ہاؤس میں گزار کر آنے کے بعد اس کا اس گھر میں دم گھٹنے لگا تھا۔ پنکھے کی رفتار اسے کم، بہت کم لگنے لگی تھی۔ درودیوار اسے گندے ترین لگنے لگے تھے۔ گھر میں اپنی پسند کی تبدیلیاں کر لینے کے باوجود بھی اسے لگ رہا تھا کہ وہ اس گھر میں اب مزید نہیں رہ سکتی۔

☆......☆......☆

موم کی شفاف بوندوں جیسے بارش کے ننھے ننھے قطرے بڑے منظّم انداز میں زمین پر گر رہے تھے۔ رات کی تاریکی میں شہر کی برقی روشنیاں اس موم کی آنکھ میں دیا سلائی جلاتی تھیں۔ لیکن وہ قطرے اپنے وجود میں اتنے کم حیثیت اور اپنے سفر میں اتنے عجلت پسند واقع ہوئے تھے کہ بھڑکنے سے پہلے ہی دھرتی کی سطح سے ٹکرا کر بھسم ہو جاتے تھے۔

لوگ بارش سے بچتے ہوئے اپنی اپنی منزلوں کو پہنچ رہے تھے۔ میران بھی کلب سے باہر نکل کر اپنے لیے کوئی ٹیکسی دیکھنے لگا تھا۔

پیر کا دن تھا۔ کلب جلد ہی بند ہو گیا تھا۔ جیسا کہ پیر والے دن عموماً ہی ہوتا تھا۔ میران نے ربیکا سے کہا تھا کہ وہ گھر میں آج رات کے کھانے کے لیے کچھ نہ بنائے۔ وہ آتے وقت آج باہر سے کھانا لے کر آئے گا۔ لیٹ ہی سہی لیکن وہ دونوں اکٹھے کھانا کھائیں گے۔ ایک عرصے سے وہ اکیلے کھانا کھا کھا کر تنگ آ چکا تھا۔ اب ہر کھانا اپنی ماں کے ساتھ کھانا چاہتا تھا۔

جیکٹ کی زپ کو گردن کے اوپر تک بند کر کے وہ آگے بڑھ رہا تھا جب اس نے سڑک کے عین درمیان میں ایک تماشا لگا ہوا دیکھا۔

کچھ سیاہ ہپی ٹائپ کے لڑکے زمین پر گری کسی لڑکی یا عورت کو ٹھوکریں مار رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ اسے گالیاں دیتے ہوئے دفع ہو جانے کو بھی کہہ رہے تھے۔ عورت خود پر پڑتی لاتوں کے باعث دہری ہو رہی تھی۔ ارد گرد لوگ تھے۔ میران اس کی شکل نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جس وقت وہ ہجوم کے قریب پہنچا، ہپی لڑکے اس پر تھوکتے ہوئے جا چکے تھے۔ ہجوم بھی اس سے کوئی سروکار

نہ رکھتے ہوئے چھوٹ گیا تھا۔ وہ عورت نیم زخمی حالت میں وہاں گری ہوئی تھی اور کراہ رہی تھی۔

میران بھاگ کر اس عورت کے پاس پہنچا اور اس نے اس کا ڈھلکا ہوا سر اٹھا کر اپنی ران پر رکھا۔

ربیکا نیم بے ہوش تھی اور اس کے سر سے خون نکل رہا تھا۔

☆......☆......☆

''آپ وہاں کیوں گئی تھیں ممی......آپ وہاں کیوں گئی تھیں۔'' میران بری طرح ربیکا پر چلایا تھا۔ کیونکہ چلانے کے علاوہ وہ اور کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اس کا دماغ اس برح طرح سے کھول رہا تھا اگر وہ پھٹ جاتا تو آتش فشاں کے لاوے سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتا۔ وہ ساری محنت جو اس نے ربیکا کے علاج پر کی تھی اس سب کی تھکن جیسے آج ہوئی تھی۔ قرض کی ادائیگی کی پریشانیاں جو علاج پر اس نے جھیلی تھیں وہ ساری کی ساری پھر سے اس کے اعصاب پر سوار ہوگئی تھیں۔ سارا قرض ادا کر چکنے کے بعد جیسے اسے الہام ہوا تھا کہ وہ سود ادا کرنا تو بھول ہی گیا ہے۔ جو قرض سے سو گنا زیادہ تھا۔ اس کے سارے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ اس کا دماغ چٹخنے لگا تھا۔ ربیکا سے یہ پوچھنا کہ وہ وہاں کیوں گئی تھی اس سے زیادہ وہ خدا سے پوچھ رہا تھا کہ یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں......؟

ربیکا ماتھے پر پٹی کیے کمرے کی کرسی پر شرمساری بیٹھی تھی۔ بارش کے باعث شہر کی سڑکیں گیلی ہو چکی تھیں اور ربیکا جو انہی سڑکوں پر لوٹ پوٹ ہو کر آئی تھی اب اس گندے لباس کے ساتھ ہی وہاں میران کو چلاتے ہوئے سن رہی تھی۔ پتھر بت کے آنسو بہہ رہے تھے۔ باقی اس کا سارا وجود بے حس ہو چکا تھا۔ میران ربیکا کو دیکھ کر پگھلا تھا۔ ماتھے پر خون، آنکھوں میں آنسو، ٹھوکروں سے درد کرتا جسم، دنیا سے عاجز، زندگی سے گھبرائی ہوئی، وسوسوں سے ڈرتی ہوئی یہ عورت آخر کیا چیز تھی۔

''کیا کر رہی تھیں آپ ممی وہاں پر......'' کمرے میں لاحاصل گشت کرتا وہ رکا۔ جو وہ پوچھ رہا تھا وہ جانتا تھا۔ پھر پوچھ کیوں رہا تھا۔ ربیکا کو اس اعتراف کے آنے والے لمحے کھانے لگے تھے۔

''میں وہاں حشیش لینے گئی تھی۔'' اس نے سپاٹ چہرے کے ساتھ کہا۔ میران اس کی شکل دیکھنے لگا تھا۔ اسے اس ڈھٹائی سے جواب ملنے کی توقع نہیں تھی۔ اسے لگا تھا کہ ربیکا جھوٹ بولے گی، لیکن اس کی صاف گوئی نے اسے طیش دلایا تھا۔ غصہ میران کی سرخ ہوتی گردن اور کنپٹیوں سے عیاں تھا۔

''کیوں......؟''

''میں تمہیں بتانا چاہ رہی تھی بلکہ میں تمہیں کئی بار بتا یا بھی ہے کہ میں عیسیٰ کو کبھی بھی فراموش نہیں کرسکتی......تم جتنی مرضی کوشش کر لو لیکن میں یہ کوشش نہیں کروں گی......میں اسے بھولنا چاہتی ہی نہیں تو میں کوشش بھی کیوں کروں۔ سینی ٹوریم میں، میں

نے علاج بھی اسی لیے کروایا تھا کہ میں واپس اس گھر میں آ سکوں کہاں ہر طرف عیسیٰ موجود ہے۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ علاج کروائے بنا میری واپسی ناممکن ہے۔تم مجھے کبھی بھی گھر واپس نہیں لے کر جاؤ گے اور وہ لوگ مجھے آنے نہیں دیں گے۔ میں نے اسی لیے اپنا علاج کروایا ہے لیکن میں تو پہلے بھی ٹھیک ہی تھی۔تم کیا سمجھتے ہو کہ میں شنے کی کوئی عادی عورت ہوں۔ میں اپنے پورے ہوش وحواس میں نشہ کرتی ہوں۔اور نشہ کرنے کے بعد بھی پورے ہوش میں ہی رہتی ہو۔بس یہ ہوتا ہے کہ پھر میرے پاس عیسیٰ آجاتا ہے۔تم مجھے پاگل کہہ لو یا کچھ بھی کہہ لو...... مجھے اب ایسے ہی زندگی گزارنی ہے۔بہتر ہے کہ تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو......اور اپنی زندگی ویسے گزارو جیسے تم چاہتے ہو۔"

ربیکا نے کہا تھا۔میران کا سارا غصہ ہوا ہو گیا۔اسے اپنے سے زیادہ ترس اس ہستی پر آیا جس نے ایک آدمی کے ساتھ بمشکل پچیس ماہ گزارے تھے اور اپنے پچیس سال تباہ کر لیے تھے۔کیا محبت ایسی ہی چیز ہے۔یہ ایک بار چپک جاتی ہے اور پھر تباہ کر کے ہی چھوڑتی ہے۔کیا یہ دیمک ہے جو سب چاٹ جاتی ہے۔یا وہ ناسور ہے جو ہمیشہ رستا رہتا ہے اور اندر ہی اندر سب ختم کر دیتا ہے۔

"میں اس کی لاش کو بھی دیکھ لیتی تو کبھی یقین نہ کرتی...... پھر اب تو اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ وہ آئے گا۔اس فقیر نے بھی مجھ سے کہا تھا کہ جا کر انتظار کرو......عیسیٰ کی آمد ہو گی۔"

"انہوں نے پیغمبر عیسیٰ کی آمد کی بات کی تھی۔ان کا انتظار کرنے کو کہا تھا کہ وہ آئیں گے تو آپ کے درد پر مرہم رکھیں گے۔جیسے انہوں نے کوڑوں پر دست شفا رکھا تھا۔کسی انسان عیسیٰ کی بات نہیں کی تھی۔اور بابا انسان تھے کوئی پیغمبر نہیں......"

"وہ پیغمبر نہیں تھا لیکن وہ پیامبر تھا۔محبت کا...... مجھے امید ہے کہ......"

"کیسی امید ہے یہ ممی! جو نہ پوری ہوتی ہے نہ ختم ہوتی ہے۔پچیس سال ہو گئے ہیں آپ کو ان کا انتظار کرتے ہوئے۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو اب تک آجاتے۔آپ خود سوچیں......اگر وہ زندہ ہوتے تو اب تک کون سی رکاوٹ ایسی تھی جسے وہ ان سالوں میں عبور نہ کر سکتے تھے۔آپ کی اس امید نے مجھے زندگی سے مایوس کر دیا ہے۔حیرت ہے کہ آپ کے حوصلے پست نہیں ہوئے۔"

"تم کچھ بھی کہہ لو......تم مجھے مطمئن نہیں کر سکتے۔تم جانتے ہی نہیں ہو کہ اس کا وعدہ میرے لیے کتنی اہمیت رکھتا ہے۔وہ جھوٹ نہیں بولتا تھا تو سوچو جھوٹا وعدہ کیسے کر سکتا ہے۔وہ آئے گا۔میرا دل گواہی دیتا ہے۔میں تمہاری گناہ گار ہوں لیکن تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو......میں تم سے تو غافل ہو سکتی ہوں لیکن عیسیٰ کی یاد سے نہیں۔"

"جب کہ اندر سے آپ بھی جانتی ہیں کہ وہ مر چکے ہیں۔انہوں نے آپ سے ملنے کا وعدہ عالم برزخ میں کیا ہو گا۔"

"ٹھیک ہے مان لیتی ہوں کہ وہ مر چکا ہے۔پہلے میں نے اس کی جدائی کے دکھ کو سینے سے لگا کر رکھا۔اب تمہارے کہنے پر اس کی موت کا غم منا لیتی ہوں۔سمجھوں گی میں اس کی موت کا صدمہ جھیل رہی ہوں۔"

''تو کیا ان کی موت کا غم بنانے کا یہ ہی ایک طریقہ ہے۔ کیا آپ اس ہی طرح سے ان کی موت کا صدمہ جھیلیں گی۔''

''میں اپنے بس میں نہیں رہ گئی ہوں۔ میں نے کہا ناں میں کوئی عادی نشہ ور نہیں ہوں۔ صرف اپنے غم کو بھولنے کے لیے ایسا کر رہی ہوں۔''

میران ان کی شکل دیکھنے لگا۔ اتنے ٹھوس جواز انہوں نے کہاں سے اکٹھے کر لیے تھے۔

''تم مجھے کسی اولڈ ہوم میں چھوڑ آؤ...... میں نے تمہیں ساری زندگی بہت تنگ کیا ہے اب اور نہیں کرنا چاہتی......''

''اور آپ انہیں یاد کرنا نہیں چھوڑ سکتیں۔''

''جب اپنی سانسیں چھوڑ دوں گی تب اس کی یاد کو بھی چھوڑ دوں گی۔ لیکن تمہیں میں جلدی ہی چھوڑ دوں گی۔ میں کسی دن خود ہی کسی اولڈ ہوم میں چلی جاؤں گی۔'' ربیکا کی اس بات نے اس کی باقی کی ساری تلخی بھی ختم کر دی تھی۔ ربیکا سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ کسی دن ایسا ہی کرتی، وہ جانتا تھا آگے تھا ہی کیا اس کی زندگی میں...... بورڈنگ کے بعد بھی اس نے تنہائی ہی دیکھی تھی۔ ربیکا کی موجودگی میں بھی اور اس کی غیر موجودگی میں بھی...... اب وہ بھی اسے چھوڑ کر جانے کی بات کر رہی تھی۔ ربیکا کے قریب بیٹھتے ہوئے اس نے اس مسئلے کا حل سوچ لیا تھا۔

''وہ لوگ آپ کو کیوں مار رہے تھے؟''

''میرے پاس پیسے نہیں تھے اور میں زبردستی ان سے چرس (حشیش) چھین رہی تھی۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

میران کے آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کے گالوں پر پھسلے تھے۔ اس کی نظروں میں پھر سے وہ منظر گھوم گیا تھا جب اس نے ربیکا کو لڑکوں سے ٹھوکریں کھاتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس منظر کی درد نا کی ایسی تھی کہ اسے اب کئی راتوں نیند نہیں آنے والی تھی۔

اس نے ربیکا کا نرم ہاتھ اپنے مضبوط مردانہ ہاتھ میں تھام لیا۔ ربیکا چونکی تھی۔ ایک جوان بیٹے کی ماں متعجب ہوئی تھی۔ ربیکا کو جیسے ابھی ابھی ادراک ہوا تھا کہ وہ ایک جوان بیٹے کی ماں ہے۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے تھے۔ پچیس سال کے بعد کسی مردانہ ہاتھ نے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ اور یہ کون تھا۔ عیسیٰ کا ہی بیٹا...... اس نے جھٹکے سے اپنا ہاتھ کھینچا...... نہیں وہ صرف عیسیٰ کی امانت تھی، اس کے بیٹے کی بھی نہیں...... نہ محبت میں، نہ چاہت میں......

جھٹکے سے ہاتھ جدا ہونے پر میران ربیکا کو دیکھنے لگا۔

''آئندہ کے بعد ایسا نہیں ہوگا۔ آپ کو چرس چاہیے۔ میں آپ کو لا کر دوں گا۔ میں آپ کو نشے سے مرتا ہوا تو دیکھ سکتا ہوں لیکن اس طرح سڑکوں پر لوگوں کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔'' اٹھتے ہوئے اس نے بات ختم کر دی تھی۔

☆......☆......☆

چرس بیچنے والے کہاں نہیں تھے۔ان کے ٹھکانے پوشیدہ تھے اور عیاں بھی۔شہر کا وہ کون سا شخص تھا جسے یہ نہیں پتا تھا کہ یہ ممنوع چیزیں کہاں سے ملتی ہیں۔

وہ شہر کے ایک پر رونق علاقے میں گیا۔جو پر رونق بھی تھا اور بدنام بھی...... جہاں ہر ناجائز کو جائز کیا جاتا تھا۔سمجھا جاتا تھا۔چوک پر کچھ سیاہ فام لڑکے کھڑے تھے۔جو ایسے ہی کاموں کے ڈیلر سمجھے جاتے ہیں۔مڈ مین...... ایک سے دوسرے تک رسائی کروانے والا۔دونوں کی ضروریات کو پوری کرنے والا۔وہ جانتا تھا کہ اسے یہاں سے ہی چرس ملے گی اور واقعی ایسا ہی ہوا تھا۔ایک لڑکے نے دور سے پہلے اسے نظروں ہی نظروں میں تولا تھا اور پھر اس کے قریب آیا تھا۔

''کسے ڈھونڈ رہے ہو ہینڈسم......؟''بات معنی خیزی سے پوچھی گئی تھی۔کچھ لڑکے کی زنانہ آنکھوں جیسی چمک نے اسے مزید معنی خیزی فراہم کی تھی۔

''میں یہاں کسی ڈیلر کو ڈھونڈ رہا ہوں۔''

''کس طرح کے ڈیلر کو......لڑکی......یا......''

لڑکا اسے بغور دیکھ رہا تھا۔میران کی صحت اس بات کی غماز نہ تھی کہ وہ کوئی ایسی ویسی چیز استعمال کر سکتا۔

''نشہ آور چیزوں کے ڈیلر کو......''اس نے لڑکے کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔لڑکے نے ادا سے میران کو دیکھتے ہوئے اپنی پینٹ کی ہپ پاکٹ سے ایک چھوٹا سا پیکٹ نکال کر میران کی طرف بڑھا دیا تھا۔

''نئے لگتے ہو......''اور اس کے گال پر ایک دل ربا سی چٹکی بھری۔میران نے چھپی ہوئی نفرت سے منہ پرے کیا۔

''کتنے پیسے......؟''

''پچاس ڈالر......''سن کر میران کے ہوش اڑے۔اسے نہیں پتا تھا کہ بنیادی کھانے کے علاوہ کھانے والی یہ غیر ضروری چیز اس قدر مہنگی ملتی ہے۔اس نے ادائیگی کر دی تھی۔اس دوران وہ لڑکا اسے مسلسل ایک ایک انچ سے دیکھتا رہا تھا۔

''میرا نام جیڈن ہے۔امید ہے آئندہ بھی ملتے رہو گے۔کیونکہ یہ اسٹائل سے شروع ہوتی ہے۔پھر قبر میں اتار کر جان چھوڑتی ہے۔''عجیب بات تھی،ایسی چیزوں کا ڈلر بھی اس کے خلاف بات کر رہا تھا۔یعنی وہ اپنے ہی کاروبار کے خلاف تھا۔

میران کو جو چاہیے تھا وہ اسے مل گیا تھا۔اس نے جیڈن کی کسی بات پر توجہ دینا ضروری نہیں سمجھا۔لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔اب اسے بار بار ان جیسے لوگوں سے ہی ملنا تھا۔

''یہ لیں......اسے استعمال کریں اور اپنے عیسیٰ کو یاد کریں۔''گھر آ کر اس نے پیکٹ ربیکا کے آگے پھینکا تھا۔اس کا لہجہ نا چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو گیا تھا۔ربیکا یک ٹک اسے اور پھر نیچے گرے پیکٹ کو دیکھتی رہی۔میران پلٹ کر اپنے کمرے میں جانے لگا تھا۔

”مجھے معاف کر دو میران ......“ ربیکا اس کی ٹانگ سے لپٹ گئی اور اس نے رونا شروع کر دیا۔

”اس سے بہتر تھا کہ تم میرے لیے گلے کا پھندا لے آتے ......“

”پھندا ہی تو لے کر آیا ہوں۔ کیا آپ کو نظر نہیں آ رہا۔ یہ دیکھیے میری گردن کے گرد لپٹا ہوا ہے۔“

”تم اپنے ہاتھوں سے میرا گلا گھونٹ دو میران! میں اف تک نہیں کروں گی۔“

”میں نہیں کر سکتا۔ میں اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا بھی نہیں گھونٹ سکتا۔ خدا نے مجھے بہت سے دکھوں کے ساتھ ساتھ یہ معذوری بھی عطا کی ہے۔“

وہ دنیا کا بدقسمت ترین بیٹا تھا جو اپنی ماں کے لیے ان کی موت کی چیزیں خرید کر لایا تھا۔

کھڑکی سے باہر ہوا سرگوشیاں کر رہی تھی، جو سازشی لہجوں سے مزین تھیں۔ ربیکا یک ٹک پیکٹ کو دیکھ رہی تھی۔ میران سے بھی واپس اپنے کمرے میں نہیں جایا جا رہا تھا۔

”میں تم سے معافی مانگنے کے لائق بھی نہیں رہی ...... میں نے عیسیٰ سے کیا وعدہ توڑا ہے۔ میں تمہارا اچھی طرح سے خیال نہیں رکھ سکی۔“

”تو رکھیے ناں ...... کس نے روکا ہے۔ کیا آپ کو نہیں اندازہ کہ مجھے آپ کی کتنی ضرورت ہے۔“ لہجے اگر انسانوں کو پگھلا سکتے تو اس وقت ربیکا صرف اس ایک لہجے سے ہی پگھل کر زمین میں ضم ہو چکی تھی ...... وہ خود کہاں تھی اور اس کا بیٹا کہاں تھا۔ کس کی حالت کا کون ذمہ دار تھا۔

”پچیس سال ہو گئے۔ خدا نے میری ضرورت پوری نہیں کی اور میں کسی اور کی ضرورت پوری کرنے کے قابل نہیں رہی ...... خدا نے مجھے دو غم دیئے۔ عیسیٰ کی موت کا اور میرے دیوانے ہو جانے کا ...... میں کیا کروں میران ...... میں نے بہت بار خود کو بدلنے کی کوشش کی ہے۔ تم سمجھتے ہو گے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں لیکن یہ سچ ہے۔ میں نے چوری چوری ڈاکٹر الیگزینڈر سے اپنا علاج بھی کروایا۔ میں نے عیسیٰ کی موت پر یقین کرنے کی کوشش بھی کی۔ لیکن ...... لیکن یقین کرو ...... تب ہی میرے سارے فرشتے مجھے خبردار کرتے تھے کہ وہ آئے گا۔ میں اسے بھولنے کی کوشش نہ کروں۔ وہ ضرور آئے گا۔ تم خود ہی بتاؤ میں ڈاکٹر الیگزینڈر کی بات پر یقین کرتی یا اپنے فرشتوں کی بات پر ...... میں کیسے اپنے فرشتوں کو جھوٹا کہہ دوں۔ میں کیسے عیسیٰ کے وعدے کو جھوٹا ہونے کی سند دے دوں۔“

”اب تو مجھے بھی انتظار ہے اس بات کا کہ فرشتے جھوٹ بولتے ہیں یا سچ ......“

”ہاں ...... یہ فرشتے اسے میرے پاس لے آئیں گے۔ تم دیکھنا ...... یا مجھے اس کے پاس لے جائیں گے۔“

ربیکا کی بات سے وہ تڑپ کر رہ گیا تھا۔ اسے لگا تھا کہ جیسے فرشتے ابھی سے یہ کام کرنے لگے ہوں۔

''میں تمہاری گناہ گار ہوں میران......تم مجھے برداشت کر لو......یا مجھے کسی کوڑے دان میں پھینک دو۔''

''آپ شرمندہ نہ ہوں۔ میں آپ کا بیٹا ہوں۔ آپ کی ہر ناجائز خواہش پوری کرنے کو بھی اپنا فرض سمجھتا ہوں۔'' اس نے ربیکا کو پیار کیا اور جلدی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

آج کمرے میں بند ہو کر تکیوں میں منہ چھپا کر رونے کی باری اس کی تھی۔

☆......☆......☆

ساری محنت اکارت گئی تھی۔ ربیکا کے ایک سال کے علاج پر میران پر کتنا ہی قرض چڑھ گیا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس طرح وہ ایک خوش حال گھرانہ بن جائیں گے۔ جیسا کہ اس کے باقی دوستوں کے گھرانے تھے۔ وہ بھی ایک ساتھ بیٹھ کر کھانے کھایا کریں گے۔ گھر میں اپنے دوستوں کی دعوت کر سکے گا۔ اس کی ماں اس کے دوستوں کو اچھے اچھے کھانے کھلائے گی۔ اچھے انداز سے ملے گی۔ اچھی اچھی باتیں کرے گی۔ جیسا وہ اپنے دوستوں کے گھروں سے مرعوب ہو کر آتا تھا ویسے ہی اس کے دوست اس کے گھر سے مرعوب ہو کر جایا کریں گے۔

تنہائی اور سوگواریت نے اس کے اندر ایسے گڑھے ڈالے ہوئے تھے کہ اسے اس کے دوستوں کے عام سے گھرانے بھی کسی دوسری دنیا کی ان دیکھی جنت کی طرح کے لگتے تھے۔ اس نے زندگی بھر ایسا ماحول دیکھا ہی کب تھا۔ وہ تو سمجھتا تھا کہ ہنس ہنس کر اور مسکرا مسکرا کر باتیں کرنے والی ماں کسی کسی کو ملتی ہے۔ جو خدا کے بہت ہی خوش قسمت لوگ ہوتے ہیں۔ پھر بڑھنے، پرکھنے اور جانچنے کے بعد اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ سب عام تھے۔ ہاں وہ ضرور خدا کا نزدیکی بندہ تھا جو آزمائش میں ڈالا گیا تھا۔

وہ ربیکا کے لیے نشہ آور اشیاء خرید کر لایا تھا۔ یہ ایسی گھٹیا بات تھی کہ اگر اس کے دوستوں کو پتا چلتی تو وہ اس سے شاید پھر کبھی بات کرنا پسند نہ کرتے۔ وہ ایک بد قسمت بیٹا نہیں تھا تو اپنے اس اقدام سے اب بن ضرور گیا تھا۔

ایسی پریشانی میں بس ایک سبین کی فون کال ہی تھی جو اسے جذباتی سہارا دے سکتی تھی۔

''نیویارک کا موسم کیسا ہے؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔

''میں نے تمہارے جانے کے بعد باہر نکل کر بھی اندر کی آنکھ نہیں کھولی کہ موسم کا اندازہ لگا سکتا۔'' اس نے ہلکے سے کہا تھا۔ اس ہلکے پن میں پیار کی وزنی وزنی گہرائیاں تھیں۔ کسی چاہنے والے کے یہ لفظ کیسا عجیب اثر ڈالتے ہیں۔ سبین اپنے پلنگ پر بیٹھی بیٹھی جیسے اچانک سے محبت کے رتھ پر سوار ہو گئی تھی۔

''تم پھر کب آؤ گی؟''

''جب بھی آؤں گی تمہیں بتا دوں گی۔''

''میں انتظار میں ہوں۔''

''اور مجھے کہیں قرار نہیں......''

کمرے کا دروازہ ایک دم سے کھلا تھا۔ سامنے بابا کھڑے تھے۔ سبین جھینپ گئی تھی۔ وہ ایسا بھی ظاہر کر سکتی تھی جیسے وہ اپنی کسی سہیلی سے بات کر رہی ہے۔ لیکن ظاہر کرنے کا وقت فوراً سے پھسل گیا تھا۔ کیونکہ جو سچ میں ظاہر تھا وہ باطل ظاہر کو ہیچ کر رہا تھا۔ پھر جو جگنو اس کی آنکھوں میں چمک رہے تھے۔ وہ یقیناً سہیلی کے ساتھ بات چیت کے وقت نہیں چمک سکتے تھے۔ بابا خاموش ہو گئے تھے۔ بوڑھے شیر نے نئے شیر کے لیے علاقہ ہی خالی نہیں کیا تھا بلکہ اب جنگل ہی چھوڑ دیا تھا۔ پھر جب سے وہ کراچی سے ہو کر آئی تھی اور گھر کو اپنے خرچ سے چلا رہی تھی۔ پہلے سے چپ اور بے ضرر بابا مزید درویش ہو گئے تھے۔ ان پر سبین کا رعب چڑھ گیا تھا اس کی آمدنی کا۔

''یہ ماڈل دے آنا کریم کو......'' بابا نے اگلی صبح اس سے کہا تھا۔ کل رات میں شاید وہ یہ ہی کہنے اس کے کمرے میں آئے تھے اور پھر کہہ نہیں سکے تھے۔

سبین تو جیسے بھولی ہوئی تھی کہ وہ یہ کام کرتے ہیں۔ چونے کا کام......اور وہ مزدوروں کی طرح تانگے پر سامان لاد کر مارکیٹ لے کر جاتی ہے۔

''رہنے دیں۔ نہ ہلکان ہوں آپ۔ مت بنایا کریں اب......گھر چل تو رہا ہے اس کے بنا بھی......''

''کیا اس کام کے وہ تمہیں لگاتار پیسے دیں گے؟''

''امید تو ہے کہ اب وہ مجھے لگاتار ہر ماہ پیسے دیا کریں گے۔ پھر ابھی تو کم ہیں لیکن آگے زیادہ ملنے لگیں گے۔'' اس نے گھر گھڑ کر جھوٹ بولا تھا۔ چلو چونے کے تاج محل بنانے کا اسے ایک یہ فائدہ تو ہوا تھا کہ وہ ماڈل نہ سہی......لیکن جھوٹ بولنا بڑی مہارت سے سیکھ گئی تھی۔

''میں اس کام کے بنا نہیں رہ سکوں گا۔ میں مر جاؤں گا۔ اس لیے تم اپنا کام کرتی رہو اور مجھے میرا کام کرنے دو......'' بابا رکھائی سے بولے تھے۔ اس نے دل میں بابا کی عادت پر نفرت کا اظہار کیا۔ کیا بابا کوئی شاہکار بنانا چاہ رہے تھے۔ کیا وہ جانتے نہ تھے کہ شاہکار تو اماں بنا چکی تھیں۔ انتہائی قلیل آمدنی میں انہوں نے دو بیٹیوں کو جوان کیا تھا۔ یہ شاہکار کیا کم تھا۔ چونے کے ایسے شاہکار سے تو بہتر تھا جس نے نہ زندگی کو شاہکار بنایا نہ قسمت کی دسترس میں کوئی شاہکار رہنے دیا۔

''یہ ماڈل دے آؤ۔'' اگلے دن بابا نے پھر انتہائی صبر کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے کہا تھا۔ وہ منہ موڑ کر کچن میں

جانے لگی تھی۔

''اگر تم نہیں جاسکتیں تو مجھے بتادو۔'' اب کی بار انہوں نے ایسے لہجے میں کہا تھا کہ اگر اب وہ ان کے کام کرنے کے قابل نہیں رہی یا خود کو کوئی بہت بڑی معرکتہ الآرا چیز سمجھ رہی ہے تو بے شک بتا دے۔ سبین شرمندہ ہوگئی تھی۔ اس گھر میں کب دو دیواریں بن گئی تھیں، اسے تو پتا ہی نہ چلا۔ وہ ایسا تو ہرگز نہیں چاہتی تھی۔

چادر اوڑھ کر وہ ایک بار پھر سے چچا کریم کو مال دینے چلی گئی تھی۔ تانگے کے بجائے اب کی بار اس نے پک اپ کروائی تھی۔ تانگے میں بیٹھنا اسے ایک دم سے ہی گھٹیا اور نیچ پن محسوس ہونے لگا تھا۔

گھر آکر اس نے کم مال ہونے کے باوجود ایک معقول رقم بابا کو دی تھی۔

''یہ کیا ہے۔ یہ پیسے تو میرے خیال سے زیادہ ہیں۔ بلکہ بہت زیادہ ہیں۔''

''ساری چیزوں کی قیمتیں بڑھ گئی ہیں اب۔ چچا کریم نے خود اضافی پیسے دیئے ہیں۔ گھر میں راشن پانی سب موجود ہیں۔ یہ پیسے آپ رکھ لیں۔ اپنے لیے کچھ خریدنا ہو تو خرید لیجیے گا۔'' اس نے اسے ٹھوس لہجے میں کہا تھا کہ بابا کو اس پر یقین کرنا ہی پڑا تھا۔ جبکہ وہ حقیقت جان ہی نہ پائے تھے کہ سبین دراصل چچا کریم کے پاس گئی ہی نہ تھی۔ ساری رقم اس نے خود اپنے پاس سے بابا کو دی تھی۔

عام ماڈل تو اس نے راستے میں ایک کوڑے والے کو دے دیئے تھے اور اسلامی ماڈل ایک فقیر کو تھما دیئے تھے۔

یہ بدلہ تھا۔ ابا کے فن سے......اور خود سے......نجانے کس کس ستم کا......

☆......☆......☆

تیسرا باب (تال کی کائی)

پہلے گدے پانی پر ڈھال بنائی
کاہی میں ساری شفافیت چھپائی
تعفن کی آنچ جب سمٹ نہ پائی
تو پھٹتے پھٹتے بکھر گئی، تال کی کائی

مہنگے سگار سے نکلتے کثیف دھویں کے مرغولے بند کھڑکی کے شفاف شیشے سے ٹکرا ٹکرا کر اسے دھندزدہ اور سیاہ کر رہے تھے۔شیشے کے پار کے سرسبز مناظر فریب نظر کے باعث جل جل کر بجھتے ہوئے دکھتے تھے اور ان سب میں ایک راگ بھی اپنے سر اٹھا رہا تھا۔ایک اداس اور روتا ہوا سا راگ...... جو شاید ماؤتھ آرگن سے نکل رہا تھا اور بہت ہی بے ڈھب انداز سے نکل رہا تھا۔ پیٹرسن کو کوفت ہوئی۔کیا بجانے والا خود نہ سن سکتا تھا کہ اس کا راگ کس قدر کوفت زدہ اور سماعتوں کے لیے مہلک ہے۔شاید بجانے والا خود بہرہ تھا۔ورنہ وہ یقیناً اس راز تک پہنچ جاتا کہ اس کا راگ بہت سے کانوں میں سیسہ انڈیلنے کا کام کر رہا ہے۔

ایک گہرا کش لے کر پیٹرسن نے دھواں اس انداز سے چھوڑا کہ دھویں کے بہت سے چھوٹے چھوٹے کھوکھلے دائرے ایک کے اوپر ایک اس کے منہ سے نکلتے چلے گئے تھے اور وہ ساری کاریگری انسانی نہیں بلکہ مکینکلی لگتی تھی۔پیٹرسن نے مسکراتے ہوئے ان لچھوں کو دیکھا تھا۔سراسر بازاری اور بے معنی کرتب میں...... جو سڑکوں پر پھرنے والے آوارہ ہپیوں کی سستی شعبدہ بازی سمجھی جاتی تھی۔جیفرسن نے کئی بار اسے اس حرکت سے منع کیا تھا۔

"تمہاری شخصیت کو یہ مناسب نہیں لگتا پیارے پیٹی......"

پیٹرسن کو جیفی کی بات سے اتفاق تھا لیکن اس کے باوجود وہ اکثر اوقات خود کو یہ حرکت کرنے سے روک نہیں پاتا تھا۔

اسے بہت اچھی طرح سے یاد تھا کہ یہ لچھے اس نے پہلی بار کہاں دیکھے تھے۔بچپن کی یادیں اتنی جلدی ذہن سے محو نہیں ہوتیں، یہ آخری سانس تک انسان کے تعاقب میں رہتی ہیں۔ان لچھوں کی یاد کے ساتھ ہی ایک آواز بھی اس کے کانوں میں اتری تھی۔

''گھٹیا عورت......تم نے دوبارہ گھر سے باہر قدم نکالا تو میں تمہیں قتل کرنے میں ایک منٹ کی دیر بھی نہیں کروں گا۔ یہ سوچ بنا کہ پھر مجھے کیا سزا ملتی ہے۔'' دور کہیں ولیم چنگھاڑتا ہوا کہہ رہا تھا۔

پیٹرسن نے اب کے ایک کش لے کر دھواں آئینے میں نظر آتے اپنے ہی عکس پر چھوڑا تھا۔ ان یادوں کی چبھن ایسی تھی کہ وہ خود سے بھی نظریں نہیں ملا پاتا تھا۔

☆......☆......☆

سرخ رنگ کی لوئیں بھڑک بھڑک کر ٹھنڈی پڑ رہی تھیں۔ اس چھوٹے سے آتش دان میں جلتی ننھی ننھی باریک لکڑیوں سے کمرے میں گرمی پیدا نہیں ہو پا رہی تھی۔ اس لیے پیٹرسن اپنے کھلونے وہاں ہی لے کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے کھلونے پر مشتمل اس کا کل اثاثہ لیگو باکس کا وہ ڈبا تھا جو ولیم نے اسے مہینہ بھر پہلے ایک فلی مارکیٹ (لنڈے بازار) سے لا کر دیا تھا۔ چونکہ لیگو باکس کا ڈبا پرانا تھا اس لیے اس کے اوپر اس کا وہ تشہیری لیبل بھی منسلک نہیں تھا جس پر کمپنی کے نام کے ساتھ ساتھ بہت سی تصویریں بھی بنی ہوتی ہیں۔ جس کو دیکھ دیکھ کر بچے ان کی کاپی کرتے ہیں۔ لیگو باکس کے پرزوں سے ویسے ہی کل پرزے بناتے ہیں۔

پیٹرسن کے پاس کوئی تصویر نہیں تھی۔ اس لیے اسے سب خود سے ہی بنانا پڑ رہا تھا۔ ظاہری بات ہے کہ جو زیادہ اچھا نہیں بن پا رہا تھا کیونکہ اس کے پاس کوئی مثال نہیں تھی۔ لیکن اس سے ایک فائدہ ضرور ہوا تھا وہ اپنے واحد کھلونے سے ابھی تک بور نہیں ہوا تھا۔

دور کھڑی ایما چھوٹی سی میز پر کھانے کے برتن سجا رہی تھی، اور کھلونوں سے کھیلتے پیٹرسن کو دیکھتے ہوئے ساتھ ساتھ نفرت سے منہ بھی بنا رہی تھی۔ وہ کبھی ماں بننے کی خواہش مند نہیں رہی تھی لیکن ولیم کے کہنے پر اسے فیملی بنانی پڑی تھی۔ وہ بھی تب جب وہ سمجھتی تھی کہ وہ اپنی جوانی کے عروج پر ہے اور یہ دن صرف مسرت سے گزارے جانے کے قابل ہیں، نہ کہ ایک بچہ سنبھالنے کے۔

پیٹرسن ایما کے اندرونی جذبات کی پروا نہ کرتے ہوئے اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ایما کی بے پناہ سختیوں اور پھٹکار کے باوجود بھی اسے ایما سے محبت تھی اور ولیم سے نفرت...... کیونکہ وہ مزاج کا اکھڑ تھا۔ پیار سے بات نہیں کرتا تھا۔ ہر وقت غصے میں رہتا تھا اور ایما کو مارتا پیٹتا بھی تھا۔

اس وقت ایما نے تنگ جینز پر کھلی ڈلی سی موٹی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ جس کو اس نے اپنی کمر سے ایک بے حد خوب صورت براؤن بیلٹ سے کس رکھا تھا۔ اس طرح سے کہ شرٹ نے بیلٹ کے اوپر اور نیچے بے حد شکنیں ڈال دی تھیں اور ان شکنوں میں کھڑی وہ مومی گڑیا سے بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ پتا نہیں ولیم کو وہ کیوں اتنی ناپسند تھی۔ جو بات بات پر اسے پیٹنے کے بہانے ڈھونڈتا تھا۔ ورنہ یہ بات تو پیٹرسن کے دوست بھی کہتے تھے کہ پوری بلڈنگ کے بچوں میں سے پیٹرسن کی ممی سب سے زیادہ پیاری ہیں اور حقیقتاً ایما اس اعزاز کی مستحق بھی تھی۔ وہ ہر لباس میں خوب صورت لگتی تھی۔ اس پر ہر چیز جچتی تھی۔ جینز، ٹی شرٹ اور اونچی

ہیل جو اسے شروع سے ہی پسند رہی تھی جس کو پہنے ہوئے وہ اس اتراہٹ سے چلا کرتی تھی کہ اطالوی ماڈلز کو مات دیا کرتی تھی۔ اسکرٹ، آف شولڈر بلاؤز اور فلیٹ جوتوں میں کسی اسکول کی سینئر اور انتہائی قابل ٹیچر لگا کرتی تھی۔ پونی ٹیل باندھ لیتی تو ایسے لگتا جیسے ٹینس کی ماہر کھلاڑی ہو......لیکن قباحت یہ تھی کہ نہ تو وہ ماڈل تھی، نہ ٹیچر اور نہ ہی ماہر کھلاڑی...... بلکہ وہ کسی حد تک اناڑی کھلاڑی تھی۔ جو اپنی زندگی کا کھیل بہت برے طریقے سے کھیل رہی تھی۔

گھر کے باہری دروازے میں چابی گھومنے کی آواز آئی تو ایما چوکنی ہوگئی۔ کچن سے چاول سے بھری ڈش لا کر اس نے جلدی سے ٹیبل پر رکھی اور باقی کے لوازمات لینے بھی اندر دوڑی۔ پیٹرسن نے اپنے کھلونوں سے توجہ ہٹا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ جہاں اب لیم کھڑا تھا۔ پیٹرسن مسکرایا لیکن ولیم نے حسب عادت نہ پیٹرسن کو دیکھا اور نہ ہی مسکرایا۔ وہ ایما کی طرف دیکھ رہا تھا جو ٹیبل پر ہی پلیٹ میں رکھے چھلے ہوئے کھیرے کو بے سلیقہ پن سے گول قتلوں کی صورت کاٹ رہی تھی۔

''آج جلدی آ گئے۔'' ایما نے گردن موڑ کر مسکرانے کی اداکاری کی اور ولیم آس کیس کو سائڈ پر رکھ کر ایما کے سامنے ہوا۔ پیٹرسن نے اپنے لیگو باکس چھوڑ دیے۔ روز کا تماشا شروع ہونے جا رہا تھا۔ ایسے میں اسے کھیل سے زیادہ دونوں کا ''شو'' دیکھنے میں دلچسپی ہوا کرتی تھی۔

''آج کہاں گئی تھیں تم......'' ولیم پیار سے پوچھ رہا تھا۔ لیکن ایما اور پیٹرسن دونوں ہی جانتے تھے کہ اگلے ہی پل اب یہ آواز ایسی کرخت ہونے والی ہے کہ دو کمروں کے پورے گھر میں پھیل کر گونجے گی۔

''کب...... کہیں بھی نہیں...... میں تو گھر پر ہی تھی۔'' ایما نے کندھے جھٹک کر جواب دیا تھا اور پیٹرسن اپنی ماں کے اس جھوٹ پر دنگ رہ گیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ولیم کو اس جواب سے فریب دیا جا رہا ہے۔ ایما اسے سکول سے لانے کے فوراً بعد باہر کہیں چلی گئی تھی اور شام کو ولیم کے آنے سے ذرا پہلے ہی واپس آئی تھی۔ کھانا وہ بازار سے لیتی ہوئی آئی تھی۔ جسے آتے ہی اس نے گھر کے کھانے پکانے کے برتن میں ڈال کر گرم کر لیا تھا۔ اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ اس نے کھانا گھر میں بنایا ہے۔ اب تو پیٹرسن اس کی ایسی طویل غیر موجودگیوں کا اس قدر عادی ہو چلا تھا کہ جس دن ایما باہر نہ جاتی اسے لگتا دو کمروں کے گھر میں آج اس کی آزادی ختم ہوگئی ہے۔

''میں نے خود دیکھا ہے تمہیں سٹی اسکوائر پر۔'' ولیم نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ بات نجانے کتنی بڑی تھی۔ نہ تو اس نے لباس بدلا تھا اور نہ ہی شوز اتارے تھے۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ بس اب اپنی بیلٹ اتارے گا اور اسے روز کی طرح ایما کی کمر پر بے درپے مارنا شروع کر دے گا۔

''اوہ...... اچھا...... سچ یاد آیا...... گھر میں سبزی ختم ہوگئی تھی۔ وہ ہی لینے گئی تھی۔ بوجھو تو آج میں نے تمہارے لیے کیا بنایا ہے۔'' ایما چہک کر بولی۔

''سٹی اسکوائر میں کوئی ایک بھی سبزی کی دکان نہیں ہے۔''

ایما چپ کر گئی تھی۔

''پھر سبزی پاس سے بھی مل جاتی ہے۔تمہیں اتنی دور جانے کی کیا ضرورت تھی اور یہ...... یہ کیا ہے۔''اس نے ڈش کا ڈھکن اٹھا کر دیکھا۔''چاولوں میں کوئی ایک بھی سبزی موجود نہیں ہے۔''

ایما اپنی انگلیاں مروڑنے لگی۔

''مجھے کچھ میک اپ لینا تھا۔میں بڑے عرصے سے گھر کے خرچ سے پیسے پس انداز کر رہی تھی۔ مجھے پتا ہے کہ تمہیں میک اپ پسند نہیں ......لیکن میں ایک عورت ہوں میرا دل چاہتا ہے بننے سنورنے کو......''

''تم وہاں کسی آدمی کے ساتھ تھیں۔'' ولیم کا ہاتھ اس کی بیلٹ تک گیا تھا۔وہ جانتا تھا کہ اس سے مسلسل مکر کیا جا رہا ہے۔

''وہ میری سہیلی کا بھائی تھا۔مل گیا تو بات کر لی......اس میں کیا برا کیا۔''

''اس کا ہاتھ تمہاری ننگی گردن پر تھا اور وہ فحش قہقہے لگا رہا تھا۔''

ایما کو اندازہ ہو چکا تھا کہ اب وہ مزید جھوٹ نہیں بول سکتی۔ ولیم نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے گال پر جڑا تھا۔ایما کا منہ دوسری طرف کروٹ بدل گیا تھا۔ولیم نے اگلے ہی پل اپنی بیلٹ اتار کر ایما کی کمر پر پے در پے وار کرنے شروع کر دیئے تھے۔ پیٹرسن اپنی جگہ پر ساکت بیٹھا رہا تھا۔ یہ کھیل اب اتنا پرانا ہو چکا تھا کہ اسے ازبر ہو چکا تھا۔ پھر بھی ہر بار اس سے اپنی دہشت پر قابو پانا مشکل ہو جاتا تھا۔

آتش دان کی آگ بھڑک رہی تھی۔سرخ رنگ سیاہی میں تبدیل ہو رہا تھا۔

مار کھاتی ایما ولیم سے بچتے ہوئے ایک کونے میں رکھے صوفے کی پشت کے پیچھے جا کھڑی ہوئی تھی۔

''تنگ آ گئی ہوں میں اس زندگی سے......اس سے بہتر میں مرجانا چاہتی ہوں۔'' درد اور اذیت سے وہ چلائی تھی۔

''تو مرجاؤ......تمہیں مرنے سے روکا کس نے ہے۔''

''اپنے بچے کو تم جیسے تنگ نظر آدمی کے پاس چھوڑ کر کیسے مرجاؤں......''

''بچے کا خیال ہے تمہیں؟''

''تم سے زیادہ......چند کھلونے لا کر دے دینے سے تم سمجھتے ہو کہ تم نے باپ ہونے کا فرض پورا کر دیا۔'' ایما نے چلاتے ہوئے کہا تھا۔ غصے اور لڑائی کی حالت میں بھی وہ اپنے پورے ہوش حواس میں ہوتی تھی۔ بات کا رخ پیٹرسن کی طرف موڑ دینے سے اس کا مقصد یہ تھا کہ ولیم اس موضوع سے ہٹ جائے۔

''تم اپنے ماں ہونے کے فرائض بخوبی نبھا رہی ہو......''

''پوچھو پیٹرسن سے......تم سے زیادہ خیال ہے مجھے اس کا......تمہیں تو یہ بھی یا نہیں ہو گا کہ تم نے اسے پیار کی نگاہ سے آخری بار کب دیکھا تھا۔''

''اور تم تو اس کا وجود ہی نہیں چاہتی تھیں۔''

ایما لاجواب ہو گئی تھی۔

''بہت سمجھایا تھا مجھے میرے دوستوں نے......اس گندگی کو اپنی زندگی میں نہ لاؤ......مجھے ہی خبط تھا گند کو صاف کرنے کا......''

''میری سہیلیوں نے بھی کہا تھا کہ یہ تنگ نظر آدمی تمہاری زندگی اجیرن کر دے گا۔''

''میں تنگ نظر ہوں یا بدکردار......تمہیں اجازت دوں کہ تم باہر دنیا کے مردوں کو لبھاؤ......انہیں اپنی اداؤں سے خوش کرو۔''

''ایسے گھٹیا انداز میں تم ہی باہر کی دنیا کو دیکھ سکتے ہو۔''

''جس انداز میں تم دیکھتی ہو وہ میں سوچ بھی نہیں سکتا۔'' ولیم برابر چلایا۔ دونوں ایک دوجے پر پھنکار کر اب ٹھنڈے ہو چکے تھے۔

ایما نے صوفے پر بیٹھ کر سگریٹ سلگا لیا۔ یہ انداز خاص ولیم کو چڑانے کے لیے ہوتا تھا کہ اب بھونکتے رہو......مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔

''گھٹیا عورت......تم نے دوبارہ گھر سے باہر قدم نکالا تو میں تمہیں قتل کرنے میں ایک منٹ کی دیر بھی نہیں کروں گا۔ یہ سوچ بنا کہ پھر مجھے کیا سزا ملتی ہے۔'' ولیم چنگھاڑتا ہوا کہہ کر اندر اپنے کمرے میں جا کر بند ہو گیا۔

ایما نے اب بڑے اطمینان سے ایک گہرا کش لے کر دھواں اس انداز میں چھوڑا تھا کہ دھوئیں کے بہت سے چھوٹے بڑے کھوکھلے دائرے ایک کے اوپر ایک اس کے منہ سے نکلتے چلے گئے تھے اور وہ ساری کاریگری انسانی نہیں بلکہ ٹیکنیکلی لگتی تھی۔

پیٹرسن اسے مرعوبیت سے دیکھنے لگا۔ اسے ایما کی یہ ادا بڑی پسند تھی۔ اس کا بڑا دل کرتا تھا کہ وہ بھی اسی طرح سگریٹ پیے اور اس کے دھویں کے لچھے بنائے لیکن ولیم کے ڈر کی وجہ سے ابھی وہ سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا۔

ایما اب مسکراتے ہوئے ان لچھوں کو دیکھ رہی تھی۔ بڑی محنت کے بعد وہ اس کرتب میں کامیاب ہو پائی تھی۔ سراسر بازاری اور بے معنی کرتب میں......جو سڑکوں پر پھرنے والے آوارہ ہپیوں کی سستی شعبدہ بازی سمجھی جاتی تھی۔

☆......☆......☆

اس دن کے بعد سے گھر میں تالا لگنے لگا تھا۔ ولیم نے ایما کے باہر جانے پر پابندی لگا دی تھی۔ اس نے گھر کی ضرورت کی ایک ایک چیز گھر میں لا کر رکھ دی تھی۔ ایما کو کسی بھی ضرورت کے لیے گھر سے باہر جانے کی اس نے ضرورت ہی نہیں رہنے دی تھی۔ پیٹرسن کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ اسکول سے خود ہی اکیلا یا دوستوں کے ساتھ گھر آئے اور جائے گا۔ اور دروازے کے بجائے

وہ گھر میں کھڑکی کے راستے داخل ہوگا۔ پیٹرسن کو گھر کی چابی نہیں دی گئی تھی تا کہ اس چابی سے ایما "فائدہ" نہ اٹھا سکے۔ وہ کھڑکی اتنی چھوٹی تھی کہ اس میں سے بس پیٹرسن ہی گزر سکتا تھا۔ ایما نہیں......لیکن ولیم، ایما کی صلاحیتوں کو شاید اچھی طرح سے جانتا نہیں تھا۔ جب ایما نے کچھ کرنا ہوتا تھا تو وہ کر گزرتی تھی چاہے حالات کتنے ہی ناگزیر کیوں نہ ہوں۔

ماضی کی بات کی جائے تو ایما "کال گرل" کے پیشے سے منسلک تھی اور ولیم ایک چھوٹی سی نیشنل کمپنی میں معمولی سی جاب کرتا تھا اور بے داغ ماضی رکھتا تھا۔ دونوں میں نجانے کہاں محبت ہوئی تھی اور کب اتنی پروان چڑھ گئی تھی کہ ایما ولیم کی خاطر اپنا گھر بار تک چھوڑ دینے پر آمادہ ہوگئی تھی۔ شادی سے پہلے اس نے ولیم سے کچھ بھی نہیں چھپایا تھا۔ ولیم کو جب پتا چلا تھا کہ ایما "کال گرل" رہ چکی ہے تو بہت سے دن ذہنی کشمکش میں گزارنے کے بعد بالآخر اس نے ایما سے شادی کر لی تھی۔ وہ اسے گندی دنیا سے باہر لانا چاہتا تھا۔ تب ایما بھی ایسا ہی چاہتی تھی۔

ولیم بنا ماں باپ کے تھا اور ایما نے اس شادی کے لیے اپنے سارے خاندان کو چھوڑ دیا تھا۔ تھوڑا عرصہ تو خوشی خوشی گزرا تھا۔ پیٹرسن کی پیدائش ہوئی۔ دونوں میاں بیوی خوش باش جوڑوں کی طرح رہ رہے تھے لیکن پھر گھر کے اخراجات بڑھنے لگے تو دونوں میں تلخ کلامی پیدا ہونے لگی۔

ایما نے کبھی اپنے گھر میں پیسے کی تنگی نہیں دیکھی تھی۔ وہ اگرچہ اتنے امیر گھرانے سے نہیں تھی لیکن اتنی غریب بھی نہیں تھی کہ ایک ایک چیز کو ناپ تول کر خرچ کرتی......اس نے ولیم سے کہا تھا کہ وہ بھی گھر سے باہر نکل کر کام کرنا چاہتی ہے۔ ولیم نے اسے بخوشی اجازت دے دی تھی لیکن ایما کی ہڈیاں فیکٹری میں ہوتے سخت کام کے لیے بنی ہی نہیں تھیں اور نہ ہی کسی ریسٹورنٹ وغیرہ میں کام کرنے کے لیے...... یا وہ کسی بھی طرح کے مشقت طلب کام کے قابل نہ رہی تھی۔ اسے خود نہ پتا چلا کہ وہ کب اور کیسے پرانی روش پر پھر سے چلنے لگی تھی۔

ولیم کو ایما پر صرف شک ہی ہوا تھا جس کے بنا پر گھر میں آئے دن لڑائی ہونے لگی تھی اور اس نے ایما کے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی تھی۔ اگر اس کا شک یقین میں بدلا ہوتا تو وہ ایما کو جان سے مار دیتا۔ ولیم نے اپنے پڑوس کے دوستوں سے بھی کہہ رکھا تھا کہ وہ ایما کو گھر سے باہر نکلتا دیکھیں تو اسے لازمی بتائیں۔

ایما کے دل میں چور نہیں تھا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے اسے گھر میں قید ہونا پڑا اور گھر سے نکلنے کی کوششیں بھی ترک کرنی پڑیں۔ ایما دو کمروں کے اس چھوٹے سے گھر میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ اپنی مرضی سے کہیں باہر آ جا نہیں سکتی تھی۔ اس ساری صورت حال نے اس کے اندر تلخی ہی تلخی بھر دی تھی۔ گھر میں ایک ایک روپے کی بچت نے اسے نیم پاگل کر دیا تھا یا شاید اس کے جسم کی خراب عادتوں نے......وہ غصہ ہوتی تھی تو پیٹرسن کو مارا کرتی تھی۔ کیونکہ اپنا غصہ اتارنے کے لیے اس کے پاس اس گھر میں

روئی روئی سے بنا بھالو تک موجود نہیں تھا اور گھر میں کراکری کی بھی اتنی فراوانی نہیں تھی کہ وہ انہیں پھینک پھینک کر توڑتی جاتی اور اپنی تلخی کو رفو کرتی جاتی۔

وہ ولیم سے طلاق بھی نہیں چاہتی تھی اور اس کے ساتھ بھی نہیں رہنا چاہتی تھی۔ وہ تو بس پیسے کی فراوانی چاہتی تھی۔ آسائشوں سے بھری زندگی چاہتی تھی۔ جس کی اسے عادت تھی۔

☆......☆......☆

اسکول سے واپس آ کر پیٹرسن نے بیگ کو سائڈ پر ڈالا۔ یونیفارم تبدیل کیا اور پھر اپنے لیگو باکس اٹھا کر آتش دان کے پاس آ بیٹھا۔ اس سارے وقت کے دوران فون کی گھنٹی مسلسل بجتی رہی تھی۔ پیٹرسن کو اجازت نہیں تھی کہ وہ فون سے...... فون سننے کی ڈیوٹی صرف ایما کی تھی کیونکہ فون آتا بھی اسی کے لیے تھا۔

ایما واش روم صاف کر رہی تھی۔ گھر اتنا بڑا نہیں تھا کہ وہ واش روم میں فون کی آواز نہ سن سکتی۔ کھیلتے ہوئے پیٹرسن کو گھنٹی کی آواز سے کوفت ہونے لگی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ فون اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کی اس حرکت سے اس کو تو کوئی آنچ نہیں آنی تھی لیکن ایما کی جان ضرور چلی جانی تھی۔ ولیم کے ہاتھوں......

فون کوئی پانچویں بار بند ہو کر دوبارہ بجنا شروع ہوا تھا جب ایما بڑے اطمینان سے فون تک آئی تھی۔ اس کی چال، اس کی حرکات میں کسی قسم کی تیزی نہیں تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ کال کس کی آ رہی ہے۔

ولیم کی عادت تھی وہ دن کے اوقات میں وقفے وقفے سے فون کر کے چیک کیا کرتا تھا کہ ایما گھر پر موجود ہے کہ نہیں...... ایما کے ''ہیلو'' کہتے ہی فون بند کر دیا جاتا تھا۔ اپنے زندگی کے دوسرے بہت سے کاموں کی طرح یہ کام بھی سر انجام دینا ایما کے لیے نفرت انگیز تھا جو اس کے تن بدن میں آگ لگا دیتا تھا کہ اسے فون کر کے چیک کیا جائے کہ وہ گھر پر ہے کہ نہیں۔

یہ کام ولیم کے لیے بھی کوئی کم اذیت ناک نہیں تھا کہ وہ اپنی ہی بیوی کو فون کر کے چیک کر رہا ہے کہ آیا وہ گھر پر موجود ہے یا کسی اور مرد کے ساتھ تو باہر گھومنے نہیں نکلی ہوئی...... ایما فون اٹھانے میں دیر کرتی تھی تو وہ آ کر اس سے باز پرس کرتا تھا۔ کبھی کبھی اسے مارتا بھی تھا۔ مارنے کی عادت ولیم کو بھی ہوتی جا رہی تھی اور پٹنے کی ایما کو...... اب وہ جان بوجھ کر فون سننے میں دیر کرتی تھی۔ ولیم آتے ہی اسے مارنا شروع کر دیتا تھا کہ وہ دن بھر کہاں رہی ہے۔ جبکہ ایما کے گھر سے باہر جانے کے آثار معدوم ہوتے تھے۔ یہ دونوں کا انتشار تھا جسے ولیم مار اور ایما چڑچڑاہٹ کے ذریعے باہر نکال رہی تھی۔ ولیم کی ٹھوکروں میں ایما ہنستی رہتی اور ولیم غصے سے مزید پاگل ہوتا رہتا تھا۔ پیٹرسن دور سہما کھڑا رہتا تھا۔ اپنے لیگو باکس کی طرح ادھورا سا...... جس سے وہ کبھی کوئی شبیہ ابھار ہی نہیں سکا تھا۔

''ہیلو......'' ایما نے فون کان سے لگا کر بڑی ادا سے کہا تھا۔ اسے پتا تھا کہ آگے ولیم ہی ہوگا۔ جو ابھی وہاں سے ہی اس

پر چلانا شروع کر دے گا یا شام کو گھر آ کر...... وہ آگے سے گالیاں سننے کے پورے پورے موڈ میں تھی۔ لیکن نجانے آگے سے اسے کیا کہا گیا تھا کہ اندر ہی اندر چہکتی ایما لمحے بھر میں گم صم ہو گئی تھی۔ ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گرا تھا اور وہ پتھر کی طرح ساکت ہو گئی تھی۔

''ممی کیا ہوا......'' پیٹرسن بھاگ کر ایما کے پاس پہنچا تھا۔ اس نے ایما کو اپنے نازک ہاتھوں سے جھنجوڑا تھا۔ ایمام چونک کر بھی بت بنی رہی تھی۔

''ولیم ایکسیڈنٹ میں مر چکا ہے۔'' ایما نے نہایت اطمینان سے اسے بتایا تھا۔ ولیم کو دی جانے والی اس کی بہت سی بد دعاؤں میں سے کسی ایک کو سن لیا گیا تھا۔ وہ اس احساس جرم کے احسات تلے خاموش تھی یا روز روز کی مارنے دونوں کی محبت کو پتھر کر دیا تھا جس کے باعث ایما کے ساکن وجود میں ارتعاش ہو کر بھی کچھ بر آمد نہ ہوا تھا۔

پیٹرسن سمجھ نہ سکا کہ اسے رونا چاہیے یا ایما کی طرح مطمئن ہو کر چپ بیٹھے رہنا چاہیے۔

''ہمیں آج ہی یہ گھر خالی کرنا ہوگا۔ تین دن بعد نئے ماہ کا آغاز ہے۔ ہم اس گھر کا کرایہ نہیں دے سکیں گے۔ میرے پاس بہت کم پیسے ہیں۔ میں نے کل ہی کچھ جوتے خرید لیے تھے۔ جوتے پھٹ گئے تھے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ میں کیسے گھر میں ان گھسے پٹے جوتے میں الجھی پھرتی تھی۔ پھر بازار گئی تو وہاں آف سیزن سیل لگی ہوئی تھی۔ سب جوتوں کے پرائز گر گئے تھے۔ اس لیے میں نے بہت سے لے لیے اور ساری بچت ختم ہو گئی۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں پیٹرسن...... مال والوں کو آف سیزن سیل نہیں لگانی چاہیے تھی، یا کم از کم اس دن تو ہر گز نہیں جس دن مجھے وہاں جانا تھا۔'' ہذیان بکتی ایما منہ ہی منہ میں بڑبڑائی تھی اور پھر اوندھے منہ گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ یعنی وہ ولیم سے ابھی بھی محبت کرتی تھی۔

بہت سے لمحے بہت اچھی طرح رو لینے کے بعد پھر وہ آنکھیں صاف کرتی ہوئی ایک عزم سے اٹھی تھی۔

''اپنا سامان سمیٹ لو پیٹی...... ہمیں ''گرینڈ فادر'' کے گھر جانا ہوگا۔'' ایما نے فیصلہ کن کہا تھا۔

سیاہ چہرے پر نیلی اور نشیلی آنکھوں والا ''گرینڈ فادر'' پہلے سے ہی ان دونوں کی آمد کا منتظر تھا۔



ناول **شام رنگ سیاہ** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **20** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 6

وہ ولیم کی آخری رسومات میں شریک نہیں ہوسکا تھا۔شاید ایما نہیں چاہتی تھی کہ وہ اپنے باپ کا مرا ہوا چہرہ دیکھے۔جس چہرے نے کبھی اسے مسکرا کر نہیں دیکھا تھا،اس کا سرد چہرہ بھی اس کے دل میں کوئی جذبات نہیں جگا سکتا تھا۔

گھر کا تھوڑا بہت سامان سمیٹ کر اور پیٹرسن کو ساتھ لے کر وہ ''گرینڈ فادر'' کے پاس آ گئی تھی۔ان ہی گرینڈ فادر کے پاس جن کا گھر اس نے ولیم سے شادی کے وقت چھوڑا تھا۔اسے پھر سے قبول کرلیا گیا۔پیٹرسن اس گھر میں اس دن پہلی بار آیا تھا۔جب سے وہ پیدا ہوا تھا وہ کبھی اپنے نانا کے گھر نہیں گیا تھا۔ایما نے بھی کبھی وہاں جانے کے بارے میں ذکر نہیں کیا تھا۔حتیٰ کہ کبھی ان کے بارے میں بات تک نہیں کی تھی۔وہ جانتا تک نہیں تھا کہ ایما کے کوئی ماں باپ بھی ہیں۔پھر اس گھر میں پہلی بار ہی جا کر اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ اس گھر میں آج سے پہلے کیوں نہیں لایا گیا تھا یا ایما کے بھی یہاں آنے پر پابندی کیوں تھی۔

گرینڈ فادر کا گھر کسی ''قحبہ خانہ'' سے کم نہیں تھا۔وہاں ہر اس طرح کا جرم ہوتا تھا جس طرح کے جرم پورے ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔وہاں کوئی ایک غیر قانونی یا غیر اخلاقی کام نہ ہوتا تھا بلکہ جرائم کی ایک دنیا آباد تھی۔جسم فروشی، چرس، منشیات، مساج، جوا، شراب، سٹہ بازی اور ہر وہ کام جو مہذب دنیا میں غیر اخلاقی تصور کیا جاتا ہے۔

وہاں چھوٹے چھوٹے لاتعداد کمرے تھے۔جہاں نجانے کون کون رہائش پذیر تھا۔بے تحاشا لڑکیاں تھیں، بے تحاشا مرد تھے اور بچوں کی تعداد تو گنتی میں نہ آتی تھی۔جن میں اب ایما اور پیٹرسن بھی شامل ہو چکے تھے۔پیٹرسن نے اپنی اب تک کی زندگی میں ایسا گھر اور ایسا گھرانہ نہیں دیکھا تھا۔وہاں پہنچ کر اسے احساس ہوا تھا کہ وہ اتنے گندے ماحول کا کبھی عادی نہیں رہا ہے۔شروع شروع میں اس کا وہاں دم گھٹنے لگتا تھا لیکن پھر فطرت کے قانون کے مطابق اس کا وہاں دل لگ گیا تھا۔

یہاں بڑے کمرے میں جوا ہوتا تھا۔جس کی سرپرستی نانا کرتے تھے،جن کو سب گرینڈ فادر کہتے تھے۔حتیٰ کہ ان کے اپنے بچے بھی......ان کو ڈیڈ یا پاپا کہنے کے بجائے گرینڈ فادر ہی کہتے تھے۔

گرینڈ فادر نسلی طور پر سیاہ فام تھے اور فطری طور پر کم گو......ان کا چہرہ چھوٹے چھوٹے لاتعداد دانوں سے بھرا ہوا تھا۔سر کے بال گھنگریالے تھے اور بڑھ کر بھی اپنی جگہ قائم رہتے تھے۔ان کے سیاہ چہرے پر نیلی آنکھیں تھیں جو ہر وقت کسی نشے کے خمار میں ڈوبی نظر آتی تھیں،لیکن گرینڈ فادر نشہ نہیں کرتے تھے۔وہ ایک ہوش مند آدمی تھے۔تب ہی ان کا ''کام'' دن بدن ترقی کر رہا

تھا۔ پورے گھر پر ان کا رعب، ان کی غیر موجودگی میں بھی چھایا رہتا تھا۔ ان کی آمد کے بنا وہاں تاش بھی نہیں بانٹے جاتے تھے۔ شور ایک دم سے تھم جاتا تھا اور پولیس والے بھی لمحے بھر کو اپنا مدعا بھول جاتے تھے۔

اس گھر میں شراب کھلے عام چلتی تھی۔ اس کی ساری خالائیں جسم فروشی کرتی تھیں۔ تھوڑے عرصے بعد پیٹرسن کو اندازہ ہوا کہ ایمانے بھی پھر سے یہ کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ جس سے وہ پہلے ہی منسلک تھی اور جس کی وجہ سے اس کا باپ اسے مارتا پیٹتا تھا۔ پیٹرسن ابھی اتنا بڑا نہیں ہوا تھا کہ اچھے اور برے میں تمیز کر سکے...... پھر بھی شہر کی دس سالہ پڑھائی نے اس کے ذہن پر کچھ مثبت اثرات چھوڑے تھے۔ ان سب میں وہ ان کی طرح کا نہیں لگتا تھا۔ اس کے سارے کزن دن بھر کھیلتے تھے یا ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ وہ کہیں بھی پڑھنے نہیں جاتے تھے اور نہ ہی انہیں کچھ لکھنا پڑھنا آتا تھا۔ وہ ان سب میں الگ تھلگ تھا۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے میں رکھ رکھاؤ تھا۔ اس سب کے باوجود وہ ان سب میں اپنے رنگ کی وجہ سے بھی نمایاں تھا۔ وہاں سب سیاہ فام تھے اور ایک صرف وہ ہی اپنے باپ کی وجہ سے سفید تھا اور دلکش نقوش کا حامل تھا۔

وہ اس گھر کی مختلف سرگرمیوں کو دیکھتا تھا اور خاموش رہتا تھا۔ نہ ہی اس نے اور نہ ہی ایمانے اسے پھر سے اسکول میں داخل کروانے کی بات کی تھی۔ یہاں ہر کام گرینڈ فادر کی مرضی سے ہوتا تھا۔

ایک دن بڑے کمرے میں تاش کی ٹیبل سجی ہوئی تھی۔ پیٹرسن بھی وہاں ہی موجود تھا۔ پتے بانٹے گئے تو اس نے سرسری طور پر خود کلامی کے سے انداز میں بتانا شروع کر دیا تھا کہ کس کس کے پاس کون کون سے پتے پہنچے ہیں۔ گرینڈ فادر نے اس کی خود کلامی سن لی تھی۔ انہوں نے اپنے پاس موجود پتوں کو دیکھا تھا۔ پھر ساتھ بیٹھے آدمی کے پتوں کو اور پھر چونک کر پیٹرسن کو...... اس سے پہلے تک وہ پیٹرسن کے وجود سے ہی غافل تھے۔ جب سے وہ اس گھر میں آیا تھا۔ کسی نے اس پر توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ پیار کرنا تو دور کی بات...... وہ کسی خودرو پودے کی طرح بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ایما بھی جیسے بھول گئی تھی کہ وہ ایک بیٹے کی ماں ہے۔ وہ ساری رات چمگادڑوں کی طرح جاگتی اور سارا دن مگرمچھوں کی طرح بیڈ پر پڑی رہتی تھی یا نشے میں مدہوش رہتی تھی۔

تاش کے بعد ایک اور واقعہ ہوا تھا۔ گرینڈ فادر اپنے کمرے میں بیٹھے پیسے گن رہے تھے۔ وہ پیسے گڈی کی صورت میں تھے۔ پیٹرسن نے صرف انہیں دیکھا تھا اور بتا دیا تھا کہ وہ پیسے کتنے ہیں۔ پیٹرسن کی بات کی تسلی کرنے کے لیے گرینڈ فادر نے ان پیسوں کو گنا تھا اور وہ اتنے ہی تھے جتنا پیٹرسن نے کہا تھا۔ اس نے محض دیکھ کر ہی بتا دیا تھا کہ وہ روپے کتنے ہیں۔

اس کے بعد گرینڈ فادر نے اس کے اور بھی بہت سے امتحان لیے تھے۔ انہوں نے پیٹرسن کو ایک جاپانی گیم ''گو'' سکھائی تھی۔ جسے وہ چند دنوں میں ہی سیکھ گیا تھا اور اتنا ماہر ہو گیا تھا کہ گرینڈ فادر کو مات دینے لگا تھا۔ تاش کے بہت سے کرتب تو اس نے لمحوں میں سیکھ لیے تھے۔ گنتی کے الٹے سیدھے حروف یاد کرنے میں اس کی یادداشت کمال کی تھی۔ جو جو کتابیں اس نے پڑھی تھیں

وہ ان کی تحریر کو ان کے صفحہ نمبر کے ساتھ بتا دیا کرتا تھا۔اور ان سب امتحانوں کے بعد گرینڈ فادر نے بالآخر جان لیا تھا پیٹرسن ہی وہ لڑکا ہے جو ان کے کام کو ترقی دے گا۔ ان کا جانشین......جس کا انہیں برسوں سے انتظار تھا۔ اس خاندان کا دوسرا گرینڈ فادر......''ڈان......''

ولیم کو روڈ ایکسیڈنٹ میں مروا کر انہوں نے بالکل ٹھیک کیا تھا۔ چاہیے تو انہیں صرف ایما کی واپسی تھی لیکن ایما اپنے ساتھ جو یاقوت لائی تھی وہ انمول ہونے کے ساتھ ساتھ گراں قدر مال تھا۔

گرینڈ فادر کی مردم شناس آنکھوں نے پڑھ لیا تھا کہ پیٹرسن عام بچہ نہیں ہے۔ وہ صرف کام کو سیکھے گا ہی نہیں بلکہ اگر وہ اس پر توجہ دیں تو وہ انہیں حیران کر سکتا ہے۔ انہوں نے پیٹرسن کو بہت کم عمری میں ہی بہت کچھ سکھانا شروع کر دیا تھا۔ جو سب کا سب مجرمانہ تھا۔ پیٹرسن بھی اچھے برے کی تمیز کیے بنا ہر ہر چیز کو کسی مشین کی طرح سیکھتا چلا جا رہا تھا۔ گرینڈ فادر کا بتایا ہر کام وہ خوشی خوشی کرتا تھا۔ اسے خود پر توجہ دیا جانا بہت اچھا لگتا تھا۔ ماں کی محبت کی محرومیوں کے بعد اس نے جس شخص سے پیار وصول کیا تھا وہ اس کی زندگی بن گیا تھا۔ گرینڈ فادر......جس سے وہ دنیا میں سب سے زیادہ پیار کرنے لگا تھا کیونکہ پیار کیا ہوتا ہے یہ بات اسے گرینڈ فادر سے ہی پتا چلی تھی۔

بچہ شفاف پانی کی طرح بے رنگ ہوتا ہے۔ اس میں جو رنگ ملا دیا جائے وہ اسی کو اپنا لیتا ہے۔

سقراط نے ایک بار کہا تھا کہ اسے ایک پانچ سال کا بچے دے دیا جائے اور اس کی زندگی کا ہدف......وہ بڑا ہو کر ویسا ہی بنے گا جیسا کہ پانچ سال کی عمر میں اس کا ہدف طے کر دیا گیا ہو گا۔ پیٹرسن بھی بچہ ہی تھا۔ اسے اس بات کا بھی اندازہ تک نہیں تھا کہ اس کی فطری حیران کن خوبیوں کو جس رخ پر موڑا جا رہا ہے اس سے وہ خوبیاں، خامیوں میں ڈھل رہی ہیں۔ وہ، وہ سب کرتا جا رہا تھا جو گرینڈ فادر اسے کہتے چلے جا رہے تھے۔

ایما کو کسی بات سے کوئی غرض نہ تھی کہ اس کا باپ اس کے بیٹے کے ساتھ کیا کرنے والا ہے یا اس کی رگوں میں ایک شریف مرد کا خون ہے۔ جس نے ایما کو بھی اس چنگل سے آزادی دلوانے کے لیے اس سے شادی کی تھی اور جو بدقسمتی سے موت کے چنگل سے نہ بچ سکا۔

ایما کی لاپروائی کے بعد گرینڈ فادر ہی مکمل طور پر پیٹرسن کے مالک بن گئے تھے۔ اسے گرینڈ فادر کے ساتھ والا بہت خاص کمرہ دیا گیا تھا۔ جہاں پڑھنے کو بہت سی کتابیں تھی۔ باقی لڑکوں کے ساتھ مل کر اس کا کھیلنا منع تھا۔ وہ ہر وقت گرینڈ فادر کی جاری کردہ سرگرمیوں میں مصروف رہتا تھا۔

رفتہ رفتہ گرینڈ فادر کو اندازہ ہوا کہ یہ لڑکا کمال کی یادداشت بھی رکھتا ہے۔ چیزوں کو پرکھنے میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔

انہیں لگا یہ لڑکا اس سے کہیں زیادہ سیکھنے کی اہلیت رکھتا ہے جتنا وہ اسے سکھا رہے ہیں۔ جتنا وہ سوچ رہے ہیں، جتنی وہ توقع کر رہے ہیں اور یہ کہ پیٹرسن اور......اور......مزید کا مستحق ہے۔ یہ کوئی چھوٹا موٹا علاقائی یا شہری ڈان بننے کے قابل نہیں ہے بلکہ اسے اس کا مقام ملنا چاہیے اور اسی سمیت ان کا بھی۔ اسے پوری دنیا کا ''انڈر ورلڈ ڈان'' بننا چاہیے۔

اور ایسے ہی موقعے پر گرینڈ فادر کے شاطر ذہن میں ایک منصوبہ آیا تھا۔

پیٹرسن کو جان سے مار دینے کا......

☆......☆......☆

مہنگے سگار سے نکلتے کثیف دھویں کے مرغولوں نے کھڑکی کے شفاف شیشے کی سطح کو دھندلا کر دیا تھا جس کے پار سارے سرسبز مناظر جل کر اب دھواں چھوڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ماؤتھ آرگن والا لڑکا کہیں دور جا چکا تھا لیکن اس کے بے ڈھب ساز کی دھنیں ابھی تک فضا میں پھیلی کوک رہی تھیں۔

پیٹرسن نے اپنے کانوں کو اس منحوس ساز سننے سے روکا......لیکن وہ ساز تو جیسے اس کی سماعتوں میں قید ہو گیا تھا یا شاید وہ ساز نہیں تھا وہ ایما کی گنگناہٹ تھی جو وہ اکثر گرینڈ فادر کے گندے سے گھر کی غلیظ سی بالکونی میں کھڑے ہو کر گنگنایا کرتی تھی اور جس سے پیٹرسن کو سخت چڑ ہوا کرتی تھی۔ کیونکہ ایسے موقعوں پر ایما اکیلی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی ضرور ہوتا تھا اور وہ چہرہ ہر بار کسی نئے شخص کا ہوتا تھا۔ اسے اپنے باپ سے سخت نفرت سہی......لیکن یہ سوچ کر اسے ایما پر طیش آتا تھا کہ اس نے اس کے ساتھ فریب کیا ہے اور اس کی موت کے بعد اس کا فریب، مکر سے جا ملا ہے۔

''جیفرسن......''اس نے تیز آواز سے جیفرسن کو پکارا۔ فارم ہاؤس والے پرسکون محل میں اس کی آواز دور تک پھیلی تھی۔

''جی......بھائی......''جیفرسن اگلے ہی پل بوتل کے جن کی طرح حاضر ہو گیا۔

''وہ لڑکی......جو سمبل کے درختوں کے نیچے بیٹھتی ہے۔''

''ڈائنا......کی بات کر رہے ہو؟''

''ہاں......اس سے پوچھو کیا وہ پرانے خون کے ساتھ ساتھ پرانی یادیں بھی جسم سے نکال دیتی ہے۔''

''جو حکم......پیارے بھائی۔''

جیفرسن مسکراتا ہوا منظر سے غائب ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

''زندگی میں اکثر اوقات ہمارا سامنا دوراہے سے ہوتا ہے۔ جس میں سے ایک راستہ تو سیدھا ہوتا ہے اور ایک بل کھاتا

ہوا، کٹھن...... جو کہ سچا راستہ بھی ہوتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا راستہ کون سا ہے۔ ہمیں کس راستے پر چلنا ہے۔ کس راستے پر چلنے میں ہی بھلائی ہے لیکن اس کے باوجود ہم غلط راستے کا انتخاب کر لیتے ہیں جو بظاہر تو مختلف نظر آ رہا ہوتا ہے لیکن اس کی پستی نظروں سے اوجھل ہوتی ہے۔ ایسا اس لیے بھی ہوتا ہے کہ ہم سیدھے راستے پر بار بار جا کر تھک چکے ہوتے ہیں۔ ہم پھر سے اکتا دینے والا سفر شروع نہیں کرنا چاہتے۔ ایسا سفر جس کی ناکامیوں کا ہمیں پہلے سے ہی علم ہوتا ہے۔

اچھائی والے راستے کی ناکامیاں...... جو بے صبرے لوگوں کی دائمی نامرادیاں لگتی ہیں لیکن درحقیقت وہ فتح اور بقا ہوتی ہیں۔"

☆......☆......☆

سبین نے اپنے بال کٹوا دیئے تھے اور وہ نئی طرز کے کچھ ایسے کپڑے پہننے لگی تھی جس میں عریانیت تو ہرگز نہیں تھی، لیکن دلکشی کو جدت کے ساتھ کچھ اس طرح منسلک کیا گیا تھا کہ دیکھنے والا سمجھ جاتا تھا کہ اب یہ شلوار قمیص پہننے والی سبین نہیں رہ گئی۔ بابا نے اسے دیکھا تھا اور وہ بس دیکھ کر ہی رہ گئے تھے۔ لباس میں کچھ ایسا نہیں تھا جس پر وہ اسے منع کرتے لیکن پھر بھی ان کے اندر جیسے چھن سے کچھ ٹوٹ گیا تھا۔

امریکا سے واپس آئے اسے پورا ایک ماہ ہونے کو آیا تھا۔ انتظار اس کی آنکھوں میں بھرا ہوا تھا۔ وہ میران سمیت وہاں کی ایک ایک چیز کو یاد کر رہی تھی۔ ربیکا آنٹی کو، گیسٹ ہاؤس والے اپنے کمرے کو، جائک کو، سمبل کے سرخ اور نارنجی پھولوں والے درختوں کو...... اور سورج کی کرنوں کو سموئے رش جھیل کو۔

وہ واپس جانے کے لیے بے تاب تھی اور میران سے ملنے کے لیے بے چین...... دونوں اب اکثر فون پر گھنٹوں باتیں کرتے رہتے تھے۔ اور یہ باتیں سبین کو اور زیادہ بے قرار کر دیتی تھیں۔ ہر آن اسے یہ بھی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں کسی دن ڈینی کی کال آ جائے گی اور وہ اسے یہ کہہ دے گا کہ "گروپ" نے اسے امریکا بلانے سے منع کر دیا ہے۔ وہ کسی لڑکی سے اسمگلنگ نہیں کروانا چاہتے، چونے سے نہیں کروانا چاہتے یا کچھ بھی اور...... لیکن اس کے سارے شکوک باطل ثابت ہونے والے تھے۔ وہ امریکا جانے والی تھی اور بار بار جانے والی تھی۔ اپنے پوری طرح برباد ہو جانے تک۔

اس کا ڈر اور وہم بدھ کے روز ختم ہوا جب ڈینی نے اسے کال کی تھی۔

"اتوار کی فلائٹ ہے تمہاری...... تیار رہنا...... اور اس بار تمہیں "فیصل مسجد" کا ماڈل تیار کرنا ہے۔ جو تم نے آرٹ کونسل کے میوزیم میں دینا ہے۔ ایک ایک چیز کا بہت اچھے سے خیال رکھنا...... پچھلی بار کی طرح...... ضرورت سے زیادہ خود اعتماد ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کام میں بس ایک ہتھیار چلتا ہے۔ احتیاط کا...... اس کی گن لوڈ نہ کی ہو تو پھر موت یقینی ہوتی ہے۔"

ڈینی اسے ہدایت دیتا جا رہا تھا جسے وہ چاہ کر بھی توجہ سے سن نہیں پا رہی تھی۔ امریکا جانے کے خیال سے ہی اس کے دماغ میں سب سے پہلا خیال میران کو کال کرنے کا آیا تھا۔

''تم مجھے سن رہی ہوناں......؟'' ڈینی بات کرتے کرتے درمیان میں رکا تھا۔

''ہاں......''

''لگتا نہیں......خیر ہر کام اچھی طرح سے کرنا، مہارت سے......شکایت کا موقع مت دینا......''

ڈینی نے کال ابھی بند بھی نہیں کی تھی کہ اس نے جلدی سے کال منقطع کر کے میران کا نمبر ملایا تھا۔

''سبین میں ذرا مصروف ہوں۔ بعد میں بات کرتا ہوں۔'' وہ چھوٹتے ہی بولا تھا۔

''میں اتوار کو آ رہی ہوں۔'' سبین نے کہا تھا اور میران کی ساری مصروفیت کافور ہو گئی تھی۔

سب ویسا نہیں ہوتا جیسا ہم سوچتے ہیں۔ زندگی اپنے رخ لمحہ بہ لمحہ عیاں کرتی ہے۔ اسے لک چھپ کھیلنے کی عادت ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ آپ کی منصوبہ بندی کے الٹ جاتی ہے۔ شاید زندگی کو سنسنی پسند ہے۔ وہ انسان کی سوچ کے مطابق چل کر خود کو بور کرنا ہی نہیں چاہتی......اس لیے وہ، وہ کرتی ہے جو کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا۔

وہ پہلی بار ایئر پورٹ سے بہت آسانی سے باہر نکل گئی تھی۔ سمجھتی تھی کہ اگلی بار بھی ایسا ہی ہوگا بلکہ ہر بار ایسا ہی ہوگا لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ مشکل کا شکار ہوئی تھی۔ بس چھوٹی سی مشکل......جس نے اس کی ہمت کو سلوٹ کیا ہوا تھا اور وہ پہلے سے زیادہ بے خوف ہو گئی تھی۔ نہیں جانتی تھی کہ اس کی تقدیر اسے انتباہ کر رہی تھی جسے وہ اپنی کامیابی سمجھ رہی تھی......یا شاید وہ سارا کھیل ہی ایسا سازشی تھا کہ اسے ڈگمگا بھی رہا تھا اور لمحہ بہ لمحہ چلنا بھی سکھا رہا تھا۔ وہ دکھا بھی دے رہا تھا اور سہارا بھی بن رہا تھا۔ چلتے چلتے یا تو وہ گر سکتی تھی یا مزید تیز دوڑنا سیکھ سکتی تھی۔ لیکن ایک بات طے تھی۔ اس راستے کی جیت اور ہار دونوں میں اس کے لیے خسارہ ہی خسارہ تھا۔

''آپ ہمارے ساتھ چلیں......'' فلائٹ کے بعد وہ کنویئر پر اپنے سامان کا انتظار کر رہی تھی جب ایک لڑکی نے اس سے کہا تھا۔ وہ لڑکی ایئر پورٹ پولیس یونیفارم میں تھی۔ اس کے ہاتھ میں ماؤتھ فون تھا جس کے ذریعے وہ مسلسل کسی سے رابطے میں تھی۔ سبین جان گئی کہ وہ اس کے بارے میں ہی بات کر رہی تھی۔

''کیوں......'' وہ کمال مہارت سے اداکاری کرنے لگی۔ ڈینی کی بتائی ہوئی اداکاری......معصوم فرشتوں کی معصومیت ادھار لے کر اس نے اپنے چہرے پر جلدی سے نقش کر لی تھی۔

''آپ پلیز بنا کوئی سوال پوچھے ہمارے ساتھ آئیں۔'' لڑکی سپاٹ لہجے میں بولی۔ اس کے لہجے نے سبین کی سٹی گم کر دی تھی۔ وہ دل ہی دل میں ایسے موقعوں کے لیے کی گئی ڈینی کی نصیحتیں یاد کرنے لگی۔

''کچھ بھی ہو جائے......حواس گم نہ کرنا......مطمئن نظر آنا......کوئی ایسی ویسی بات ہو بھی گئی تو ''ڈان'' تمہیں نکال لیں گے۔اتنے آرام سے کہ انڈے میں سے بچے کو نکلتے بھی تکلیف ہوتی ہوگی۔

ڈینی کی یہ بات یاد کر کے وہ مطمئن ہو گئی تھی۔فیصل مسجد کا ماڈل پکڑے وہ اس لڑکی کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔دو تین راہداریاں عبور کر کے وہ ایک روم میں پہنچا دی گئی تھی۔جہاں اس کا سامان پہلے سے ہی موجود تھا۔دو پولیس کے حکام اس سامان کی تلاشی لے رہے تھے اور ٹھیک ٹھاک طریقے سے لے رہے تھے۔

''یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟'' وہ ایک دم سے ان کی طرف بڑھی۔لڑکی نے ہاتھ آگے کر کے اسے وہاں جانے سے روک دیا۔سبین رک گئی۔

''آپ یہاں ہی کھڑی رہیں ورنہ یہاں سے آپ کو سیدھا جیل بھی جانا پڑ سکتا ہے۔'' بات اس انداز سے کی گئی تھی کہ وہ اپنی جگہ پر چپ کر کے کھڑی ہو گئی تھی۔

''یہ آپ کے ہاتھ میں کیا ہے؟''

''فیصل مسجد کا ماڈل ہے۔''

''کس لیے......''

''مجھے اسے آرٹ کونسل کے میوزیم میں دینا ہے۔''

''کیوں......؟''

''میں ''امن'' تنظیم کی رکن ہوں اور یہ ایک اسلامی تحفہ ہے جسے مجھے آرٹ کونسل میوزیم میں دینا ہے۔اس سے پہلے میں ایک اور اسلامی تحفہ سینٹ جین چرچ میں بھی دے چکی ہوں۔دنیا بھر میں امن کا پیغام پھیلانے کے لیے ہماری تنظیم ایسے کام کرتی ہے۔''

''صرف یہ دینے آپ کو نیو یارک آنا پڑا؟''

''نہیں، میں یہاں تبلیغ کرنے آئی ہوں۔بہت سی جگہوں پر ہمارے سیمینارز ہیں۔یہ میرا کارڈ......'' وہ بیگ میں ہاتھ ڈال کر کارڈ نکالنے لگی۔

''کسی بھی چیز کو ہاتھ مت لگایئے۔بس سیدھی کھڑی رہیں۔'' سختی سے کہا گیا۔اسے ہتک کا احساس ہوا تھا۔

''اسے یہاں پر رکھ دیں۔'' اسے فیصل مسجد کا ماڈل ایک طرف رکھنے کو کہا گیا۔اس نے ایسا ہی کیا۔ایک جنٹل مین ایک کتے کو لایا۔کتا ماڈل سونگھتے ہی بھونکنے لگا،سب نے کڑی نظروں سے سبین کی طرف دیکھا۔اپنے ماتھے کے پسینے کو باہر نہ نکلنے دینے کے لیے سبین نے اپنی ساری قوت صرف کر دی تھی۔پھر یک لخت اس کے ذہن نے کام کیا اور اسے ڈینی کی ہدایات یاد آئی تھیں۔

''اسے مسجد کے قریب مت لاؤ...... یہ ہمارے لیے مقدس ہے۔'' وہ چلائی تھی۔اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔کیا اسے اسلام سے اتنی ہی محبت تھی؟

''اس میں کیا ہے؟'' ایک لیڈی نے ابرو اٹھا کر اس سے پوچھا تھا۔اس کا انداز ایسا تھا کہ ہم جان گئے ہیں کہ اس میں ایسا کیا ہے۔کتا بھونکتا ہی جا رہا تھا۔

''میں کہتی ہوں کہ اسے ہماری مقدس چیز سے دور رکھو...... میں ''امن'' تنظیم کی رکن ہوں۔ جسے امریکا کی طرف سے خصوصی طور پر اجازت نامہ دیا گیا ہے۔آپ سب میرے ساتھ یہ سلوک نہیں کر سکتے۔''

سب اس کی صورت کو دیکھنے لگے تھے۔اس کے ہاتھ کی تسبیح، سر پر اسکارف، مکمل حجاب زدہ حلیہ......وہ اس وقت کمال کی مومنانہ سراپے میں تھی۔

''تم سمجھ رہی ہوناں کہ یہ کتا کیوں بھونک رہا ہے؟'' لیڈی کی بھنویں نیچے آ رہی تھیں۔

''نہیں......کیا مطلب ہے؟''

''یہ کہ اس میں کوئی ممنوعہ چیز ہے۔جیسے کہ حشیش وغیرہ......''

''اس میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ایک اسلامی تحفے کے اندر بھلا یہ سب کیوں ہوگا۔''

''پھر یہ کتا کیوں بھونک رہا ہے۔''

''چونکے کو کا جو پت کے تیل میں گوندھا گیا ہے۔کتوں کو کا جو پت کے تیل سے نفرت ہوتی ہے۔اس کی سانسیں پھول جاتی ہیں۔اس کے تنفس میں تیزی آ جاتی ہے۔انہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی انہیں لڑانے کے لیے للکار رہا ہے۔اس لیے وہ بھونکنا شروع کر دیتے ہیں۔'' وہ سانس روکے جھوٹ پر جھوٹ بول رہی تھی۔ پورا ایک گھنٹہ لگا تھا اسے ڈینی کی بتائی یہ سب باتیں یاد کرنے میں۔

کسی کو نہیں پتا تھا کہ وہ سچ بول رہی ہے یا جھوٹ...... جو بھی تھا وہ سب اس سے متاثر ہوئے تھے۔

''لیکن یہ کتے صرف ممنوعہ اشیاء کے لیے سدھائے گئے ہیں۔''

''میں نے کتوں کی فطرت پر پی ایچ ڈی نہیں کی ہوئی...... اتنا سب کچھ بھی اس لیے جانتی ہوں کہ ہمارے گاؤں میں کتے کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں اور جہاں یہ چونے کا کام ہوتا ہے وہاں آ جائیں تو بھونکنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ سب باتیں بھی مجھے میرے استاد محترم نے ہی بتائی تھیں۔''

ان میں سے ایک نے ماڈل کو پکڑ کر بڑے غور سے دیکھا تھا۔

''یہ کمال کا ہے؟ کس نے بنایا ہے؟'' وہ لیڈی اس ماڈل کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے وہ اس کی ایک ایک چیز کو یاد کر لینا چاہتی ہو۔اس نے ایسا کر بھی لیا تھا۔اس کی آنکھوں نے اس ماڈل کا پرنٹ اپنے ذہن پر نقش کر لیا تھا۔

''میرے استاد محترم نے، اپنے ہاتھوں سے۔''

''کیا ایک دن میں؟''

''نہیں......انہیں کافی دن لگ گئے تھے۔'' وہ جانتی تھی یہ گفتگو بے معنی نہیں کی جارہی، لیڈی اس دوران ماڈل کی تصویر اپنے ذہن پر نقش کر رہی ہے۔

''یہ تم آرٹ کونسل کے میوزیم کے لیے لائی ہوناں......''

''جی......''

''کب دو گی انہیں؟''

''کل ہی......میں کل سب سے پہلا یہ ہی کام کرنے والی ہوں۔'' پرسوں کے بجائے اس نے کل کا نام لے دیتا تھا۔ اس کمرے میں اسے گھٹن ہو رہی تھی۔وہ جلد سے جلد وہاں سے نکلنا چاہتی تھی۔

''ٹھیک ہے۔تم جاسکتی ہو۔'' اسے باہر جانے کی اجازت مل گئی تھی۔وہ باہر نکل آئی تھی۔آگے اسے بہت احتیاط سے چلنا تھا۔وہ جانتی تھی کہ اس کے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے۔

☆......☆......☆

گیسٹ ہاؤس پہنچ کر اس نے سب سے پہلے ڈینی کو کال کر کے ساری بات بتائی تھی۔ڈینی نے اسے کہا تھا کہ وہ جلد سے جلد فیصل مسجد کا ایک اور ماڈل تیار کر لے اور اس میں رتی برابر بھی فرق نہ آنے دے۔سبین نے ایسا ہی کرنا چاہا تھا۔اس نے آرام کرنا بھی گوارا نہیں کیا لیکن ماڈل بناتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔اس کے دل میں اس قدر ڈر بیٹھ چکا تھا کہ وہ ایک ایسا ماڈل جسے وہ ہزاروں بار بنا چکی تھی نہیں بنا پا رہی تھی۔

میران کی کال آرہی تھی لیکن اس نے اسے بھی نہیں اٹھایا۔اس وقت اس کے ذہن میں ایک ہی بات تھی کہ اگر وہ وہاں پکڑی جاتی تو اس کا کیا حال ہوتا۔اس کے بابا کا......چھوٹی کا......وہ اس وقت جیل میں ہوتی......اور میران سمیت بہت کچھ کھو چکی ہوتی......سوچتے سوچتے وہ پاگل ہوئے جارہی تھی۔

ماڈل تیار ہو گیا تھا۔جیسے تیسے کر کے اس نے یہ کام کر لیا تھا اور پھر اسے ایک بڑے سے اوون میں پکا بھی لیا تھا۔شیشہ بھی وہاں ہی لگ گیا تھا۔پرانا ماڈل ابھی وہاں ہی تھا۔اسے ایک انچ کی بھی غلطی نہیں کرنی تھی۔وہ جانتی تھی کہ لیڈی اس کا انچ انچ

دیکھ چکی ہے۔اسے ہر صورت بالکل ویسا ہی بنانا تھا اور اس نے یہ کام کر لیا۔ بالآخر......

ماڈل تیار ہوا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ جیسے جیل جانے سے بچنے کی پوری تیاری کر چکی ہو۔

میران کو کال کر کے اس نے اپنے بے حد مصروف ہونے کے بارے میں بتایا اور یہ کہ کل بھی اس کے پاس ٹائم نہیں ہوگا۔

''تمہارا اجلاس کہاں پر ہو رہا ہے۔ مجھے بتاؤ میں بھی وہاں ہی آجاتا ہوں۔'' اس نے شوخی سے کہا تھا۔

''وہاں صرف لڑکیوں کو جانے کی اجازت ہوتی ہے۔ مردوں کا داخلہ بند ہوتا ہے۔''

''اوہ......سمجھ گیا۔'' وہ ہنسا تھا۔ سبین کے دل میں گڑھا سا پڑ گیا، اس کے جھوٹ کسی دن دنیا کے سامنے آ گئے تو وہ کہاں جا کر مرے گی۔ وہ سوچنے لگی تھی اور اگر صرف میران کے سامنے آ جاتے ہیں تو......اس روح فنا کر دینے والے پہلو پر تو وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

اگلے روز حسب معمول وہ حائک کے ماؤتھ آرگن سے نکلتے سروں سے بیدار ہوئی تھی۔ حائک اس کی کھڑکی تلے سے نکل نہ جائے اس لیے وہ جلدی سے کھڑکی تک گئی اور اس نے گلدان میں سے ایک پھول نکال کر اس کی طرف اچھالا۔ نتیجہ ویسا ہی تھا جیسا کہ سبین کو توقع تھی۔ حائک نے اس پھول کو دیکھا تک نہیں تھا۔ سبین بے اختیار ہی ہنس پڑی۔

ناشتا کر کے اور تیار ہو کر وہ آرٹ کونسل کے میوزیم گئی اور اس نے فیصل مسجد کا ''نقلی'' ماڈل انہیں دے دیا۔ وہاں بھی اس نے وہی جھوٹ بولا جو دو بار ایر پورٹ، ایک بار سینٹ جین چرچ اور بابا، میران کے آگے نجانے کتنی بار بول چکی تھی۔

اس کی جھوٹی این جی او کے جعلی اجازت نامے اور اس کے نقلی کارڈ کو دیکھ کر عجائب گھر کی انتظامیہ نے اس کے جھوٹ پر یقین کر لیا۔ وہ لوگ ماڈل دیکھ کر اور پا کر بہت خوش ہوئے۔ سبین کی اچھے سے خاطر مدارت بھی کی گئی۔ پھر ان سب نے این جی او کے بانی استاد محترم کی صحت یابی کے لیے مل کر دعا کی۔ اس استاد کی صحت یابی کے لیے جس کا دنیا میں کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ دعا کے لیے سبین کے ہاتھ اٹھے ہونے کے باوجود بھی جھول کر رہ گئے تھے۔ گناہ گار، جھوٹی، فریبی، دغا باز، مکار......اس پر آخر کس کس چیز کی مہر لگنے والی تھی۔

گیسٹ ہاؤس واپس آ کر اس نے ڈینی کو ساری صورت حال سے آگاہ کر دیا۔ ڈینی نے اسے کہا کہ ابھی وہ اسی گیسٹ ہاؤس میں رہے، کہیں مت جائے جبکہ وہ تو جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ اسے میران سے ملنا تھا لیکن وہ ڈینی کی بھی کوئی بات نہیں ٹال سکتی تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ اس پر اپنا کوئی رعب رکھتا تھا بلکہ اس لیے کہ وہ کسی حد تک اس کا خیر خواہ تھا اور اسے ویسا ہی کرنے کو کہتا تھا جو اس کے حق میں بہتر ہوتا۔ اسے ڈینی کے اگلے حکم تک یہاں ہی رہنا تھا۔ یہ سوچ کر اس پر گھبراہٹ طاری ہو رہی تھی۔ یہاں کرنے کو کوئی کام بھی نہیں تھا۔ وہ بور ہو رہی تھی۔ کرنے کو کام ہوتے بھی تو اس نے بے چین ہی ہونا تھا کیونکہ اسے جلد سے جلد میران سے ملنا تھا۔

رات میں ڈینی کی کال آئی۔ جس نے سبین کی جان ہی نکال دی۔

''پولیس آرٹ کونسل کے میوزیم میں گئی تھی، انہوں نے تمہارے ماڈل کو توڑ کر دیکھا ہے۔ جو کام وہ تمہارے سامنے نہیں کر سکے انہوں نے تمہارے پیچھے اسے بڑی ہی جاں فشانی سے کیا ہے۔''

''پھر......؟''

''پھر کیا......ظاہری بات ہے کہ اس میں کچھ نہیں تھا۔ کیا وہ اس ماڈل کی بالکل ہو بہو نقل تھا۔''

''بالکل......'' اس نے سو فیصد یقین کے ساتھ کہا۔

''بس پھر اسی بات نے تمہیں بچا لیا ہے۔'' ڈینی ہنسا تھا۔ ''اب تم تفتیش کے دائرے سے نکل گئی ہو......تم سمجھ رہی ہو ناں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔''

''نہیں......'' وہ واقعی نہیں سمجھی تھی۔ ڈینی ہنستا ہی جا رہا تھا۔

''تم پر صرف ایئر پورٹ انتظامیہ کو شک تھا۔ جیسا کہ وہ ایشیا سے آئے ہوئے لوگوں پر کرتے ہیں کہ یہ لوگ بدنام جو بہت ہوتے ہیں۔ لیکن اب تم نے ان کا شک دور کر دیا ہے۔ اب وہ تمہیں کبھی نہیں روکیں گے۔ تم ان کے دائرے سے نکل گئی ہو۔ سمجھو آج تمہاری شرافت کی مسند رپورٹ بن چکی ہے۔ پولیس کو اور بھی کام ہوتے ہیں بھئی...... وہ ایک ہی بندے کو بار بار چیک نہیں کر سکتی......خیر اب تم جہاں چاہے جا سکتی ہو۔ ویسے تمہیں کہاں جانے کی جلدی تھی۔ تمہارے تو کوئی رشتے دار بھی نہیں ہیں وہاں......''

''بس ہے کوئی......'' اس نے اس انداز سے کہا تھا کہ ڈینی لمحے بھر کو خاموش ہو گیا تھا۔

''مت بھولنا سبین کہ پیچھے تمہارے گھر میں تمہارا ایک بوڑھا باپ بھی ہے۔ میں خود برا ہوں۔ تمہیں اچھائی کی تلقین نہیں کر سکتا لیکن جس طرح تم نے مجبوری میں یہ کام کیا ہے اس طرح ہی میں نے بھی یہ کام کرنا شروع کیا تھا۔ اب میں اتنا گندا ہو چکا ہوں کہ یہ صاف معاشرہ مجھے قبول نہیں کر سکتا۔'' ڈینی نے بڑی فلسفیانہ باتیں کی تھیں۔ وہ ڈینی کے منہ سے ایسی باتوں کی توقع نہیں کر سکتی تھی۔

''میں سمجھ سکتی ہوں۔''

''سمجھ سکتی ہو تو اب اپنا اچھا برا بھی سمجھنا......میں یہ نہیں چاہتا کہ تم بھی ساری زندگی میری طرح یہ کام کرتی رہو۔ تم نے دس بار کا معاہدہ کیا ہے۔ تم دوسری بار نیو یارک آئی ہو۔ تمہارے آٹھ چکر اور رہ گئے ہیں۔ وہ پورے ہو جائیں تو بھول جانا کہ کبھی تم نے یہ کام کیا تھا۔ ایک اچھی زندگی گزارنا...... پیچھے پلٹ کر نہ دیکھنا......زندگی کے اس باب کو بھول جانا......'' ڈینی کی آواز بھیگی ہوئی تھی۔ اس کے دل کو دھچکا لگا۔ کون کون کیا کیا چھپا رہا تھا؟

زندگی کہ اس باب کو وہ تب بھولتی ناں جب زندگی بھی اسے بھولنے کی اجازت دیتی۔ اسے کیا اندازہ تھا کہ وہ اس دور کو

کبھی فراموش کر ہی نہیں سکے گی اور یہ باب اس کی زندگی کے آنے والے سارے بابوں کو تاریک کر دے گا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکی۔

''ماڈل کو دھیان سے رکھنا...... نیویارک میں ہمارے گروپ پر آج کل بہت سخت نگرانی ہے۔ گیسٹ ہاؤس والوں نے بھی ہاتھ کھینچ لیے ہیں۔ وہ تمھیں صرف سہولیات دینے پر ہی راضی ہوئے ہیں۔ اس لیے جیسے ہی سہولت محسوس ہوگی کوئی تم سے یہ ماڈل لے جائے گا اور مت بھولنا کہ کچھ ہوا بھی تو ''ڈان پیٹرسن'' کا ہاتھ تمھارے سر پر ہے۔ سمجھ گئیں؟''

''ہاں......'' اس کے کہنے سے پہلے ہی دوسری طرف سے فون بند ہو گیا تھا۔ ڈینی شاید اپنی آواز کی لرزش اور اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رکھ پا رہا تھا۔

وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ اپنی اور ڈینی کی مکمل منصوبہ بندی سے بچ رہی ہے اور امریکا کی پولیس کیا، اسکارٹ لینڈ یارڈ کی ٹیم بھی آجائے تو اسے نہیں پکڑ سکتی۔ وہ اس وقت خدا کی رحمت اور ڈھیل کو بھول رہی تھی۔ خدا کی ڈھیل کو بھولنے والوں کی یہ ہی سرشت ہوتی ہے کہ وہ ڈھیل کو اپنا فخر بنا لیتے ہیں اور پھر سب سے بڑی دلدل میں جا گرتے ہیں۔ جس میں وہ بھی عنقریب گرنے والی تھی۔

☆......☆......☆

''ہر خوشی کا ایک محصول ہوتا ہے۔ جو انسان کو لازمی ادا کرنا پڑتا ہے۔ خوش رنگ پھول کے ساتھ کانٹا ضرور ہوتا ہے۔ لمبا سفر پاؤں پر چھالے ضرور ڈالتا ہے۔ بلندی خوف میں مبتلا کرتی ہے۔ مضبوط پتھر کا کر دیتی ہے۔ نرمی توڑ دیتی ہے۔ ہماری دوغلی دنیا میں ہر چیز دورخی ہے۔ اور اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا...... لیکن میری بدقسمتی کہ میں نے زندگی کا ہمیشہ ایک ہی رخ دیکھا۔ اسے آپ میری کم فہمی کہہ لیں یا کوتاہ عقلی...... میں نے صرف خوشی کو محسوس کیا، اس کے محصول پر توجہ نہ دی۔ پھولوں کے خوش نما رنگوں کو دیکھا، کانٹوں کو بصارت سے اوجھل کر دیا۔ بلندی پر جانا چاہا تو خوف کا نہ سوچا...... مضبوطی کو پتھر ہو جانے سے شبیہہ نہ دی اور نرمی...... وہ تو مجھے کبھی حاصل ہی نہیں ہو سکی......''

☆......☆......☆

دھرتی پر رات کا رنگ دھویں کی مانند پھیل رہا تھا۔ ملگجی کہر گاڑھی سیاہی میں بدلنے جا رہی تھی۔ آسمان کے شکم میں ٹنگا چاند روشنی کے مینار کی طرح کھڑا اپنی میٹھی ضیاریزی میں مصروف تھا۔

سبین نے کلب کے دروازے پر ہاتھ رکھا تو اسے قدرے مایوسی ہوئی۔ شیشے کے دروازے پر ''کلوز'' کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ بے چینی میں وہ کچھ زیادہ ہی جلدی آگئی تھی ممکن تھا کہ ابھی اندر میران موجود نہ ہوتا۔ وہ باہر ہی کھڑی کلب کے کھلنے کا انتظار کرنے لگی تھی۔ جب کلب کے گارڈ نے نہ صرف اسے اندر جانے کی اجازت دی تھی بلکہ اس کے لیے دروازہ بھی خود سے کھول تھا۔ سبین کو

مسرت کا احساس ہوا تھا۔تو کیا سب اسے میران کے حوالے سے جاننے لگے تھے؟

میران کلب میں ہی تھا۔کاؤنٹر پر وہ گلاس اور مشروب کی بوتلیں سجا رہا تھا۔سبین بنا آواز کیے چپکے سے اس کے پاس پہنچی تھی۔کچھ کلب کا فرش بھی ایسا تھا کہ تیز چلنے سے بھی آواز پیدا نہ ہوتی تھی۔دل تو کیا کہ پیچھے سے جا کر اس کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دے اور پھر اسے خود کو بوجھنے کا کہے اور بوجھ کر وہ اسے خود سے دور نہ جانے دے......ایک عرصہ ہوا وہ کسی ایسے کندھے کی تلاش میں تھی جہاں سر رکھ کر وہ سکون کی نیند سو سکے۔

لیکن یہ خیال کیسا بے وقوفانہ تھا۔کیا وہ اس کے ہاتھوں کا لمس اور اس کی آواز سے اسے پہچان نہیں پانے والا تھا۔

''پائن ایپل......دو گلاس۔'' کام کرتے میران نے آواز کی سمت دیکھا اور پھر اس کی طرف......وہ مسکرایا تھا۔

''میں تو روز ہی بنوا کر رکھ رہا تھا۔تم ہی نہیں آ رہی تھیں۔'' اس نے کہا اور کام چھوڑ کر کاؤنٹر کی سطح پر ہی ہاتھ رکھ کر قلابازی کھا کر باہر نکل آیا......اس نے شاید اس کے دل کی آواز کو سن لیا تھا۔

''ارے......'' وہ جو کہنا چاہتی تھی ابھی کہہ بھی نہیں پائی تھی۔

''اتنے دنوں کے بعد آئی ہو......؟'' بچوں کی طرح منہ پھلا کر اب وہ شکوہ کرنے کے انداز میں بولا۔

''بس کام ہی بہت تھا۔'' وہ خلاؤں میں کھوتے کھوتے بچی تھی۔

''مجھے اندازہ ہے کہ تمہیں جگہ جگہ جا کر تبلیغ کرنی ہوتی ہے۔''

میران کی بات سن کر اس کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور ایک گیا تھا۔

''جوس ملے گا کہ نہیں......'' اس نے بات بدلی۔''اب یہ نہ کہنا کہ روز تو بنوا رہا تھا لیکن آج ہی بنوانا بھول گیا۔''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔تمہارے لیے پائن ایپل لینے مجھے کوسٹاریکا بھی جانا پڑا تو چلا جاؤں گا۔''

''کیا وہاں کے پائن ایپل بہت مشہور ہیں؟''

''ہاں......کہتے ہیں وہاں کے پائن ایپل زمین پر نہیں اگتے بلکہ انہیں شہد کی مکھیاں اپنے چھتے میں بناتی ہیں۔''

''پھر تو مجھے وہاں کا پائن ایپل ضرور کھانا چاہیے۔''

''ویسے ممی بھی مجھے اکثر پیار میں پائن ایپل کہتی ہیں۔'' وہ شرارت سے آنکھ دبا کر بولا۔''کوسٹاریکا کا ہی......''

سبین کے گال سرخ ہو گئے۔اس کا انداز ہی ایسا تھا۔کوئی پیارا ہونے کے ساتھ ساتھ شوخ، شرارتی، بردبار، پر مزاح کیسے ہو سکتا ہے۔ایک حسن ہی خوبی کافی نہیں تھی جو اللہ نے اسے مزید خوبیوں سے نواز دیا تھا اور فراخی سے نوازا تھا۔یاسین کی آنکھ کی خوب صورتی تھی جو اسے اس میں کوئی کمی نظر ہی نہیں آ رہی تھی۔وہ اسے ہر طرف سے کامل ہی کامل نظر آتا تھا۔

''ربیکا آنٹی کیسی ہیں؟''

''ٹھیک ہیں۔'' میران کا شوخ چہرہ یک لخت بوجھل نظر آنے لگا تھا۔ اس اس کے چہرے کے رنگ بدلے تھے۔

وہ دونوں ہی ایک دوجے سے بہت کچھ چھپا رہے تھے۔

☆......☆......☆

سفید پروں والی وہ چھوٹی سی فاختہ چونے سے نہیں بلکہ اصلی حالت میں حنوط کی ہوئی لگ رہی تھی۔ دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ ابھی سانس لے گی اور ابھی اڑ جائے گی۔ ربیکا اسے ہاتھ میں پکڑے محبت سے دیکھتی جا رہی تھی۔

''سبین تو اپنے فن کی انتہا پر ہے۔ دیکھو ذرا کس قدر پیاری فاختہ بنائی ہے اس نے۔'' ربیکا نے تائید طلب نظروں سے میران کو دیکھا تھا۔

''جی......اس نے یہ کام اپنے بابا سے سیکھا ہے۔ وہ واقعی یہ سب بہت اچھا کر لیتی ہے۔''

''تم اسے کب پرپوز کر رہے ہو میران؟'' ربیکا نے ایک دم ہی میران سے پوچھا تھا۔ میران ربیکا کے سوال پر سٹپٹا گیا تھا۔

''اس کام میں دیر مت کرنا......محبت دنیا کی واحد چیز ہے جس میں جتنی عجلت کر لی جائے اتنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ اس میں عجلت سے کام خراب نہیں ہوتا......بلکہ مزید نکھر جاتا ہے۔''

''جی ممی۔''

''میں نے بھی بہت احتیاط کی تھی کہ کہیں عیسٰی ناراض نہ ہو جائے۔ اسے میری کوئی بات بری نہ لگ جائے۔ وہ مجھ سے دور نہ ہو جائے۔ لیکن پتا ہے کہ شادی کے بعد عیسٰی نے کیا کہا......اس نے کہا کہ اگر میں اس سے محبت کرتی تھی تو میں نے اسے کہا کیوں نہیں......پہلے ہی دن کیوں نہیں بتا دیا۔ ہاہاہا......دیکھو ذرا میری بے وقوفی......اتنی احتیاط کرنے کا کیا فائدہ ہوا۔ اگر میں اسے پہلے دن ہی کہہ دیتی کہ میں اس کی محبت میں ڈوب چکی ہوں تو یقیناً ہمارے پاس ایک ساتھ گزارے جانے والے دنوں کی تعداد زیادہ ہوتی......میری کم عقلی دیکھو ذرا......کتنی بزدل تھی ناں میں......عجلت میں کچھ کھو دینے کا ڈر تھا اور احتیاط کر کے بھی میں نے کیا پایا......نقصان ہی نقصان......خسارہ ہی خسارہ......اپنی نادانی میں......کس قدر گراں مایہ مال کھویا ہے میں نے......'' ربیکا بولتے بولتے رونے لگی تھی۔

''اور اب جب وہ کھو چکا ہے تو میں پھر سے اتنی ہی احتیاط کر رہی ہوں کہ اسے جانے ہی نہیں دے رہی......''

''میں اسے جلد ہی پرپوز کر دوں گا ممی......'' اس نے بات بدلنے کی غرض سے کہا تھا۔

''ہاں......جلدی کرنا......اس طرح تم دونوں کے پاس ایک ساتھ وقت گزارنے کے لیے دنوں کی تعداد بڑھ جائے

گی۔یقیناً سبین تمہاری پہل کے انتظار میں ہو گی۔"

"آپ کیسے جانتی ہیں؟"

"بس میں جانتی ہوں۔کیونکہ میں بھی کبھی ایک لڑکی رہ چکی ہوں۔میں سمجھ سکتی ہوں کہ تصور ہی تصور میں وہ کس قدر آگے نکل چکی ہو گی۔اتنی کہ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں تمہارے ساتھ اپنی پوری زندگی بتا دی ہو گی، جیسے میں نے بتا دی تھی۔عیسیٰ کے ساتھ......روز سوچتی تھی کہ اس عمر میں پہنچ کر ہم کیا کیا کریں گے۔اس عمر میں ہمارے کیا مشاغل ہوں گے۔فلاں عمر میں ہم دنیا کی سیاحت کو نکلیں گے۔فلاں عمر میں ایک این جی او کھولیں گے۔"

"تو اب آپ اپنے یہ خواب پورے کریں ناں......بابا کے نام کی این جی او کھولیں۔دنیا کی سیاحت کو جائیں۔وہاں جگہ جگہ جا کر ان کا نام پکاریں......انہیں بتائیں کہ آپ وہاں آ گئی ہیں۔"

"میں عیسیٰ کے بن کہیں بھی کیسے جاؤں؟"

"عیسیٰ تو آپ کے دل میں ہیں۔" میران نے انہیں لاجواب کیا۔

"ہاں......زندگی نے مہلت دی تو پلان کرتی ہوں۔"

میران وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ربیکا کی موت کی باتیں سننے سے بہتر تھا کہ وہ اس کو سنتا ہی ناں۔

☆......☆......☆

سمبل کے درخت اپنے نارنجی اور سرخ پھولوں پر نازاں تھے۔یہ دو تتلیاں تھیں جنہیں وہ اپنی شاخوں پر اگاتے تھے اور جو اڑ کر کہیں نہیں جاتی تھیں۔انہی درختوں کی چھاؤں تلے بیٹھی دائنا تاج محل کے اس ٹکڑے کو ہاتھ میں پکڑ کر کتنی دیر تک مبہوت رہی تھی جو سبین نے اسے دیا تھا۔سفید چونے سے بنا وہ چھوٹا سا آرائشی پیس اس قدر پیارا تھا کہ دائنا اسے چومنے کے لیے بے چین ہو گئی۔سبین نے اسے خاص بنایا تھی دائنا کے لیے ہی تھا۔وہ بے ضرر لڑکی اسے اس قدر پیاری لگی تھی کہ اس کا دل بے اختیار ہی اسے کوئی تحفہ دینے کو چاہا تھا۔

"اس کا معاوضہ کیا ہے؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"تمہاری مسکراہٹ......" سبین نے جواباً پیار سے کہا۔

"اگر اس کا معاوضہ مسکراہٹ ہے تو مجھے ساری زندگی مسکراتے رہنا پڑے گا۔"

سبین دل کھول کر ہنسی اور میران نے قہقہہ لگایا۔

"ویسے عجیب بات نہیں ہے سبین! تم میرے لیے تو وہاں سے کچھ نہیں لائیں اور دائنا جس سے تمہاری یہ دوسری ملاقات

ہے،اس کے لیے تاج محل لے آئی ہو......ممی کے لیے فاختہ لائی ہو......بس ایک میں ہی رہ گیا ہوں۔''

''تمہارے لیے میں خود ہی آئی ہوں ناں......اور رہی تاج محل کی بات تو تمہیں تاج محل کی حفاظت کرنا نہیں آتی......ہماری پہلی ہی ملاقات پر تم نے میرے تین تاج محل توڑ دیئے تھے۔یاد ہے تمہیں......؟''

''وہ سب تو یاد نہیں......لیکن تم یاد رہیں۔تمہارا وہ بے چینی سے اپنی چادر کے کونے میں انگلیاں مروڑنا،ماتھے پر شرمندگی کے مارے پسینہ،دیکھنے والی تھی تمہاری شکل ویسے اس دن۔''

''خود کی شکل یاد ہے تمہیں......چوزے لگ رہے تھے۔''

''اچھا......اتنا ہی برا لگ رہا تھا تو تم نے مجھے یاد کیوں رکھا ہا تھا؟'' اس نے شوخی سے چبھتا ہوا سوال کیا۔سبین کا ماتھا ایک بار پھر پسینے سے بھیگ گیا۔

''بولو......''

وہ کیا بولتی......اس کے پاس میران کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''میرے خیال سے اب ہمیں نکلنا چاہیے۔دیر ہو رہی ہے۔''

''بالکل نہیں......آج تم سے بہت ہی ضروری کام ہے۔''

''کیا......؟''

''مجھے لیڈیز خریداری کرنی ہے اور تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔''

میران نے اس کے سارے بہانے دور کر دیئے تھے اور وہ ایسا ہی تو چاہتی تھی۔

☆......☆......☆

مال میں قدرے رش تھا اور رش کے باوجود بھی ماحول پر سکون تھا۔ہر کوئی بڑے ہی منظّم انداز میں چل پھر رہا تھا۔وہ دونوں بھی کتنی دیر سے وہاں موجود تھے۔لیکن کافی دیر گزر جانے کے باوجود بھی نہ تو میران نے کچھ خریدا تھا نہ اس کے کچھ خریدنے کا ارادہ ہی ظاہر تھا۔

''میران! مجھے ونڈو شاپنگ کرنے میں کبھی بھی دلچسپی نہیں رہی......اور میں اس میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔'' وہ تھکن زدہ لہجے میں بولی۔

''یار......ایک چیز لینی ہے بس اس میں تمہاری رائے چاہیے۔''

''ہم کافی دیر سے گول گول گھومے جا رہے ہیں۔تم وہ ''ایک'' چیز خرید کیوں نہیں لیتے......اور آخر وہ ایک چیز ہے کیا۔''

''رنگ......''اس نے کہا۔سبین کی سٹی گم ہوگئی۔

''بتاؤ......لڑکیوں کو کیسی رنگز پسند آتی ہیں؟'' وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھنے لگا تھا۔

''کیوں......؟'' وہ سٹپٹا گئی۔''تم کیوں پوچھ رہے ہو۔کس کے لیے لینی ہے؟'' بھلا وہ کس ناتے سے پوچھ رہی تھی۔

''بس ہے کوئی۔'' وہ ذومعنی مسکرایا۔سبین کی دل کی کھال سکڑی......تو کیا میران کی زندگی میں پہلے سے کوئی اور بھی تھا۔ اس نے اب تک اس کے سامنے کسی لڑکی کا ذکر تو نہیں کیا تھا بلکہ باتوں باتوں میں یہ ہی کہا تھا کہ وہ اس سے محبت کرنے لگا ہے۔ رش جھیل کے خوب صورت منظر کا حوالہ دے کر، جگنوؤں کی باتیں کرتے ہوئے۔تتلیوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے اس نے ہردم یہ ہی اشارہ دیا تھا کہ وہ سبین کو چاہتا ہے۔پھر اب وہ کیوں کہہ رہا تھا کہ ہے کوئی......سبین کو یاد آیا کہ اس نے ایک بار ''میری'' نامی اپنی کسی پڑوسن کا ذکر کیا تھا۔جس کے ساتھ مل کر اس نے ربیکا کی سینی ٹوریم سے واپسی پر کمرہ بھی تیار کیا تھا۔سبین ایک بار میری سے مل چکی تھی۔شکیل سے وہ ایسی تو نہ لگتی تھی کہ میران کے ساتھ کمرہ تار کرتے کرتے وہ اپنا مستقبل بھی تیار کر چکی ہو۔

''میران......کیا تمہاری کوئی اور بھی گرل فرینڈ ہے؟''

''اور بھی سے تمہارا کیا مطلب ہے۔میری بس ایک ہی گرل فرینڈ ہے۔''

''کون......؟'' سبین اپنا نام سننے کے لیے بے چین تھی۔

''میری ممی......''

''اللہ......'' سبین گہرا سانس لے کر رہ گئی تھی۔شکر ہے اس نے ممی کا ہی نام لیا تھا ورنہ ''میری'' کی یہ رات اس کی زندگی کی آخری رات ثابت ہونے والی تھی۔نہیں......سبین اسے قتل کرنے کا ارادہ تو نہیں رکھتی تھی لیکن بددعا دینے میں اسے کوئی جرم محسوس نہ ہوتا تھا۔

''تو رنگ تمہیں ربیکا آنٹی کے لیے لینی ہے؟''

''ہاں......'' وہ بظاہر بے پروائی سے بولی۔لیکن سبین جانتی تھی کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔کیونکہ اس کی مسکراہٹ اس کی غلط بات کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔اور سبین کو یہ الہام بھی ہو چکا تھا کہ میران نے رنگ اس کے لیے ہی لینی ہے۔اگر یہ خام خیالی تھی تو وہ چاہتی تھی کہ وہ ساری زندگی اسی خام خیالی میں گزار دے۔

''لڑکیوں کو ڈائمنڈ کی رنگز پسند ہوتی ہیں۔'' اس نے کندھے اچکا کر شوخی سے کہا۔

''ڈائمنڈ'' کا لفظ سنتے ہی میران کو کھانسی آ گئی۔

''لیکن میرے پاس تو اتنے پیسے نہیں ہیں۔'' وہ ایک دم سے بے چارہ......بہت ہی بے چارہ نظر آنے لگا۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں۔تم نے پوچھا میں نے بتا دیا۔''اس نے پھر سے کندھے اچکائے۔

''ڈائمنڈ کی گنجائش نہ ہوتو......''

''ڈائمنڈ نہیں تو کچھ بھی نہیں...... پھر چاہے جو مرضی ہو...... بے شک کانسی ہی کیوں نہ ہو۔''

''کیا گولڈ نہیں چل سکتا......''

''ہرگز نہیں......'' وہ ایسے بولی کہ اگر تم نے مجھے گولڈ کی رنگ دی بھی تو میں قبول نہ کروں گی۔میرا سوچ میں پڑ گیا۔

''لیکن تم کیوں اتنا پریشان ہورہے ہو......تم نے ربیکا آنٹی کو تو دینی ہے۔تم ان کے بیٹے ہو۔تم جو بھی دو گے وہ خوش ہو کر لے لیں گی۔''وہ اس کا مذاق بناتے ہوئے بولی۔

''اور اگر کسی اور کو دینی ہوئی تو......''اس کی شوخ آنکھیں چمکیں۔

خدارا وہ کہاں جائے ان سے بچ کر......

''کس کو......؟''خود کے نام کا یقین ہونے کے باوجود بھی وہ بے یقین سی ہوگئی۔

''گرل فرینڈ کے علاوہ میری ایک فرینڈ بھی ہے۔اس جان کی جان میں میری جان ہے۔''

سبین کی جان میں جان آئی تھی۔

''اس سے پوچھو......شاید وہ بھی یہ ہی کہے کہ تمہاری جان میں اس کی جان ہے۔''وہ جذب سے بولی۔

''وہ میں جانتا ہوں۔''

''جانتے ہو تو پھر چاہے کانسی کی رنگ بھی نہ خریدو...... باریک ٹہنیوں کا گول چھلا بنا کر اس کی انگلی میں پہنا دو......وہ اسے ہی ہیرے سے زیادہ قیمتی سمجھے گی۔''سبین نے کہا۔

میران اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔اس تتلی کے سارے رنگ وہ اپنی ذات میں اتار لینے کا خواہش مند تھا اور اس کی آنکھوں میں اپنے نام کے جگنو روشن کرنا چاہتا تھا۔

''اچھا رنگ کا مسئلہ تو میں کسی نہ کسی طرح حل کرلوں گا۔اب بتاؤ ڈنر کہاں پر ہو۔''

سبین نے اچنبھے سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''بھئی مجھے ممی کو ڈنر کروانا ہے۔کافی وقت ہوگیا وہ گھر سے باہر نہیں نکلیں۔مجھے بتاؤ کہ میں انہیں کس طرح کے ہوٹل میں لے کر جاؤں۔لڑکیوں کو کیا چیزیں پسند آتی ہیں۔''

''افوہ میران......وہ تمہاری ممی ہیں۔تم انہیں جہاں بھی لے کر جاؤ گے انہیں خوشی ہوگی۔''

''افوہ میران......اگر اس جملے کے علاوہ تم کچھ بول سکتی ہو تو بولو۔'' وہ چڑ گیا۔

''تو سنو......لڑکیوں کو رومینس اچھا لگتا ہے۔ یہ میٹر نہیں کرتا کہ وہ کہاں بیٹھی ہیں اور کیا کھا رہی ہیں......لیکن یہ ضرور میٹر کرتا ہے کہ سامنے والا اس ماحول کو کس حد تک رومینٹک بنا رہا ہے۔ اس کی باتیں، اس کی گفتگو، اس کی نظریں، اس کا کلون، اس کا لباس، اس کی چاہت، وارفتگی، محبت، شوخی......تم سمجھ رہے ہو ناں......''

''ہاں......مجھے لگتا ہے کہ میں کسی ہولی وڈ کی فلم میں سائن ہونے جا رہا ہوں۔'' میران نے بے چارگی سے کہا تو سبین نے اونچے اونچے قہقہے لگائے تھے۔

''اگر تم ربیکا آنٹی کے لیے کچھ زیادہ ہی کرنا چاہتے ہو تو ان کے لیے کوئی کینڈل لائٹ ڈنر ارینج کروادو......''

''کینڈل لائٹ ڈنر......میں نے بھی بہت سن رکھا ہے۔ یہ کس بلا کا نام ہے۔''

''لڑکیوں ک اس بلا سے پیار ہوتا ہے کیونکہ اس بلا کے پنجے نہیں ہوتے۔ پنکھڑیاں ہوتی ہیں۔''

''آخر کیوں......؟''

''انہیں وہ رنگ پسند ہوتے ہیں جو سند یافتہ نہ ہوں...... جو گہرے نہ ہوں...... دبیز ہوں۔ لپٹے ہوئے، لپٹائے ہوئے، شام کے رنگوں کی طرح......لرزاں اور جھولتے ہوئے رنگ......وہ اپنے رومینس کو کسی پر بھی آشکار نہیں کرنا چاہتی ہیں۔ تب ہی تو ایسے جوڑے تنہائی میں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں اور کینڈل لائٹ ڈنر کرتے ہیں۔ ایسے لمحوں میں وہ کوئی بھی کھرا رنگ نہیں دیکھنا چاہتے۔ سارے عالم کو مدہوش دیکھنا چاہتے ہیں۔''

''تم کیا سمجھ رہی ہو سبین...... میں ایسا ویسا لڑکا نہیں ہوں...... مجھے ممی کو ہی لے کر جانا ہے۔'' مسکراہٹ ہونٹوں کے کونے میں دبائے وہ گویا ہوا۔ سبین شرم سے پانی پانی ہوگئی۔ انجانے میں دل کی باتیں اس کی زبان پر آ گئی تھیں۔

''خیر......مجھے سمجھ میں آ گیا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔'' اس نے توقف کیا۔ ''کیا تم بھی ہمارے ساتھ چلو گی سبین......''

''نہیں...... یہ تم ماں بیٹے کا پرسنل ڈنر ہے۔ مجھے اس میں مداخلت کرنا اچھا نہیں لگے گا۔'' اب کے وہ بہت احتیاط سے بولی جبکہ اندر ہی اندر کہیں وہ جانتی تھی کہ وہ ڈنر صرف اس کا اور میران کا ذاتی ہوگا جس میں وہ کسی اور کی مداخلت کو برداشت نہیں کرے گی۔ اس نے اس ڈنر پر پہننے والے کپڑوں کے بارے میں بھی سوچ لیا تھا۔ بالوں کا انداز اور میک اپ کے بارے میں بھی......میران کے نام کی انگوٹھی پہننے والے اس دن کو وہ ہر طرح سے شاندار بنانے والی تھی۔

''تم چلو......ممی کو بہت اچھا لگے گا اور مجھے بھی......اور یہ کسی بھی طرح کی مداخلت نہیں ہے۔''

''اگر تم ضد کر ہی رہے ہو تو......''

''میں کوئی ضد نہیں کر رہا......اگر تم نہیں آنا چاہتیں تو اٹس او کے۔''

''ہائے...... یہ اسے ایک دم سے کیا ہو گیا۔'' وہ سوچ کر رہ گئی۔

''میرا مطلب اگر تمہیں کوئی کام ہو تو......(تم جہاں بھی ہو گی میں تمہیں وہاں سے اٹھا لاؤں گا سبین......)''

''کوئی کام نہیں ہے۔ٹھیک ہے میں آ جاؤں گی۔'' ڈھیٹ بن کر اس نے حامی بھری تھی۔

(پاگل لڑکا......میں اس دن گندے مندے حلیے میں ہوئی تو کیا خاک اچھی لگوں گی کینڈل لائٹ ڈنر کرتے ہوئے) سوچ کر وہ خود سے مسکرائی تھی۔تو بالکل آخر خدا کی رحمت (میران) اس کے نام ہونے والی تھی۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے......

☆......☆......☆

گیسٹ ہاؤس واپس آ کر اس نے اپنی وارڈ روب چیک کی تو ہاں کام کا کوئی ایک بھی سوٹ موجود نہیں تھا۔

''اللہ یہ کیسے کسی اہم کام کے وقت کام کے لباس کہیں جا چھپتے ہیں؟'' وہ سوچ رہی تھی اور پریشان ہو رہی تھی۔فون پکڑ کر اس نے ڈینی کو کال کی۔

''ڈینی مجھے کچھ پیسے چاہئیں۔''

''کتنے......؟ میں تمہارے گھر بھجوا دوں؟''

''نہیں مجھے یہاں ہی چاہئیں۔''

''وہاں......؟'' ڈینی لمحے بھر کو چپ ہوا تھا۔

''پیسے پاکستان آ کر ملیں گے ڈیئر......'' وہ ترنگ میں بولا تھا۔

''ڈینی پلیز، تم کچھ کروا سکتے ہو تو کروا دو۔''

''کتنے؟''

''جتنے دینے میں تمہیں سہولت ہو......مطلب زیادہ سے زیادہ۔''

''تمہیں اتنے پیسوں کی کیا ضرورت آ گئی وہاں۔''

''بس مجھے چاہئیں......پلیز......'' پہلے رعب اور پھر وہ اپنائیت سے بولی۔

''اچھا......چلو میں کچھ کرتا ہوں۔'' وہ جیسے خود ہی بات سمجھ گیا تھا۔

اگلے دن صبح میں سبین کے پاس پیسے موجود تھے۔

''تم بہت اچھے ہو ڈینی......'' کال کر کے وہ شکریہ کہنا نہیں بھولی تھی۔ڈینی ہنسا تھا۔

میران کی کال آئی تھی اور سبین نے اسے کہہ دیا تھا کہ وہ آج بری طرح مصروف ہے۔

''دراصل میں نے بھی تمہیں ہی بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ آج میں بھی کافی مصروف ہوں۔تو تم سے ملاقات نہیں ہو سکے گی۔نہ کلب میں اور نہ کہیں باہر......ویسے تم کہاں جا رہی ہو؟''

''میں اجلاس کے لیے نکل رہی ہوں......اور تم......؟''

''مجھے آج کلب والے اپنی مین برانچ میں بھیج رہے ہیں۔وہاں بے حد کام ہوتا ہے۔''

''اوکے......ٹھیک ہے۔''

فون بند کر کے وہ سٹی مال میں آ گئی تھی۔آج کے دن وہ اس خاص دن کی ساری تیاری کر لینا چاہتی تھی۔وہ ایک ایک چیز نئی، پرفیکٹ اور خوب صورت خریدنا چاہتی تھی تا کہ وہ اپنے اس خاص دن کو پوری طرح سے یادگار بنا لے۔بہت دیر اور بہت سی دکانیں گھوم لینے کے بعد بھی اسے اپنے لیے کوئی سوٹ پسند نہیں آیا۔

اسے یاد تھا ایک بار اس کے کالج میں کوئی فنکشن تھا۔تب اماں نے اسے کافی سارے پیسے دیئے تھے۔اتنے ہی جتنے اس نے مانگے تھے۔اس کا خیال تھا کہ اتنے پیسوں میں تو وہ کوئی بھی پیارا سا سوٹ خرید سکتی ہے۔اس کے باوجود اسے بازار میں وہ وہ سب پسند آ رہا تھا جتنے پیسے اس کے پاس نہیں تھے۔اب اس کے پاس ہر طرح کے لباس کو خریدنے کے لیے پیسے موجود تھے اور اسے کچھ اور پسند ہی نہیں آ رہا تھا۔پرانے حالات کی ستم ظریفی کو یاد کرتے ہوئے اور نئے کی فراخی کو سوچتے ہوئے اسے بالآخر ایک سوٹ پسند آ ہی گیا تھا۔

سلک کا ایک ہلکے کریمی رنگ کا تنگ سا لباس، جس کے بازو فل تھے،لیکن سینے کا گلا گہرائی کے بجائے اطراف سے بڑھا ہوا تھا اور تقریباً کندھوں کو چھو جاتا تھا۔اس کے نیچے اسی رنگ کا تنگ پاجامہ اور اوپر گہرے سرخ رنگ کا دوپٹا......سارے لباس پر بہت نفاست سے باریک اسٹونز کا کام کیا گیا تھا۔جس نے لباس کی دلکشی کو تاروں جیسی جھلمل کرتی چمک دی ہوئی تھی۔اس نے ٹرائے روم میں لباس پہن کر دیکھا تھا۔اور اوکے کر دیا تھا۔پھر قیمت کا ٹیگ دیکھے بنا ہی اسے پیک کروانے کے لیے کاؤنٹر پر رکھ دیا تھا۔

لباس کے بڑے مسئلے سے فارغ ہونے کے بعد وہ چھوٹے چھوٹے مسائل کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہوئی تھی۔جیسے کہ جوتے، جیولری، میک اپ اور ہینڈ بیگ...... جوتوں کی سلیکشن میں بھی کم و بیش اس نے لباس جتنا ہی وقت لیا تھا۔پھر ایک سنہری رنگ کے اونچی ہیل والے جوتے پسند کیے تھے۔جن کی لشک بتا رہی تھی کہ وہ سو سال بعد بھی اسی طرح چمچماتے نظر آئیں گے۔گھر میں اماں اسے اونچی ہیل والے جوتے نہیں پہننے دیتی تھیں۔انہیں سخت ناپسند تھے ایسے جوتے۔

''عجیب لگتی ہیں لڑکیاں اونچی ہیل والے جوتے پہن کر.....'' اماں کہا کرتی تھیں اور سبین کی تو اماں سے ایسی ضد تھی کہ اسے اونچی ہیل والے جوتے پسند نہ تھے تو پھر بھی وہ اماں کو چڑانے کے لیے اونچی ہیل والے جوتے ہی لیتی تھی۔ آج بھی اس نے خاصی لمبی ہیل کا انتخاب کیا تھا۔ جسے پہن کر وہ گھوم گھوم گئی تھی۔ اس نے خود میں بہت اعتماد محسوس کیا تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔

جیولری کے بعد جب میک اپ کی باری آئی تو اسے خیال آیا کہ کیوں نہ وہ خود تیار ہونے کے بجائے کسی بیوٹیشن سے ہی تیار ہو جائے۔ کسی ماہر بیوٹیشن سے..... کینڈل لائٹ ڈنر والے دن وہ بہت خوب صورت دکھنا چاہتی تھی اور ساری زندگی میک اپ کی عدم دستیابی کے بعد اب فراوانی میں اسے استعمال کرنا خطرہ مول لینے کے برابر تھا اور وہ کوئی غلطی ہرگز ہی تو نہیں کرنا چاہتی تھی۔

بیوٹیشن کو موقع کی نوعیت سمجھانے میں اسے بہت وقت لگ گیا تھا۔ نہ شادی تھی، نہ برتھ ڈے پارٹی، نہ ہی کوئی اور تقریب..... وہ آخر اسے کیا بتاتی۔ ڈیٹ کا لفظ اس کے منہ سے نکل نہیں پا رہا تھا۔ یہ لفظ خود کے لیے استعمال کرنا اسے عجیب لگ رہا تھا۔

''بس مجھے اس دن سب سے زیادہ پیارا لگنا ہے۔'' اس نے بانہیں کھول کر کہہ دیا تھا۔ بیوٹیشن مسکرائی تھی۔

ایڈوانس پے منٹ کر کے وہ ایک ترنگ میں جھومتے ہوئے پالر سے باہر نکلی تھی جب اسے سامنے ہی میران کھڑا نظر آیا تھا۔ دونوں کا سامنا ایسی صورت حال میں ہوا تھا کہ دونوں ہی ایک دوسرے سے پرے نہیں ہٹ سکتے تھے۔ پہلے تو دونوں ہی گھبرائے، پھر فطرت کے قانون کے عین مطابق میران نے مرد ہونے کے ناتے جلد ہی خود پر قابو پا لیا۔

''سبین..... تم یہاں..... تم تو کہہ رہی تھیں، تمہیں اجلاس میں جانا ہے۔'' وہ پوچھ رہا تھا اور سبین سے جلدی میں کوئی جواب نہ گھڑا جا رہا تھا۔

''دیکھو ذرا..... میں اتنے عرصے سے یہاں رہ رہا ہوں۔ مجھے آج تک پتا ہی نہیں چل سکا کہ یہاں کوئی ایسا وسیع ہال بھی موجود ہے جہاں اجلاس وغیرہ ہو سکتے ہیں۔''

سبین جانتی تھی اب وہ اس کا مذاق بنا رہا ہے۔

''یہ سوال تو میں بھی تم سے پوچھ سکتی ہوں۔ تم نے تو کہا تھا کہ آج بے حد مصروف ہو..... کلب والے تمہیں مین برانچ میں بھیج رہے ہیں۔ پھر اب تم یہاں کیا کر رہے ہو.....؟'' اب سٹی گم ہونے کی باری میران کی تھی۔

''میں دراصل آج رنگ لینے ہی آیا تھا۔ اس دن تو پیسے ہی کم تھے۔ ہم لے ہی نہیں سکے۔''

''آج لے لی ہے؟''

''بالآخر.....''

''گولڈ کی......؟''

''نہیں......ڈائمنڈ کی۔قرض لینا پڑا ہے مجھے اس رنگ کے لیے۔''اس کے لہجے میں جتانے والا عنصر تھا۔جیسے وہ سبین کو ہی تو بتا رہا ہو کہ تمہاری رنگ نے مجھے قرض دار کر دیا ہے۔

''ماؤں کے لیے اتنا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔''کندھے جھٹک کر،مسکراہٹ چھپا کر سبین نے لاپرواٸی ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ہاں......یہ تو ہے۔جن سے''محبت''ہو ان کے لیے اتنا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔''میران سے بھی مسکراہٹ پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

''دکھاؤ مجھے......کس طرح کی رنگ پسند کی ہے تم نے......''وہ اس کے ہاتھ میں پکڑے بیگ کو پکڑنے لگی تھی جب میران نے ایک دم سے بیگ پیچھے کیا تھا۔

''نہیں......سب سے پہلے اسے ممی دیکھیں گی۔''

''اوہ......ٹھیک۔''وہ اس کا مزید مذاق نہیں بنا سکتی تھی کیونکہ اس کے بیگ بھی ابھی اس کے ہاتھ میں ہی تھے۔جہاں میران کی نظر پڑ چکی تھی اور اب وہ اسے بخشنے والا ہرگز نہیں تھا۔

''تم نے کیا لیا ہے......''اور توقع کے عین مطابق اس نے سوال کیا اور صورت حال کے عین مطابق سبین کا رنگ فق ہو گیا۔

''بابا کے لیے کچھ چیزیں لی ہیں۔''وہ یہ ہی جھوٹ بول سکتی تھی۔

''جہاں تک میں جانتا ہوں۔''زارا''صرف لیڈیز چیزوں کا برانڈ ہے۔''

''اچھا یہ......؟اس کی بات کر رہے ہو۔''اس نے کھوکھلا قہقہہ لگاتے ہوئے زارا کے بیگ کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں......یہ......اس کی بات کر رہا ہوں۔''اس نے بھی زارا سے اشارہ ہٹنے نہ دیا۔

''اس میں تو زویا کے لیے ایک ڈریس ہے۔''

''اچھا......چلو مان لیتا ہوں۔''وہ کندھے اچکا کر بولا۔

اندر ہی اندر مسکراتے وہ دونوں جانتے تھے کہ وہ دونوں''بابا''اور''ممی''کے نام پر کیا کھیل کھیل رہے ہیں۔

اس کھیل کا اختتام ہفتے کی شام کو ہوا تھا اور بہت اہتمام سے ہوا تھا۔اس سے بھی زیادہ''شاندار''اہتمام سے جتنا سبین اور میران نے سوچ رکھا تھا۔

☆......☆......☆

پلاٹینیم کے باریک چھلے کے اوپر جکڑا وہ ہیرے کا چھوٹا سا ٹکڑا اپنے سارے کونوں سے سفید دھنک چھوڑ رہا تھا۔ جیسے اکثر بھیگی راتوں میں چاند چھوڑتا ہے۔ اور سورج کی دھنک کو دیکھ چکے لوگ چاند کی دھنک کو دیکھنے کے لیے بھی پھر ہر دم بے چین رہتے ہیں۔ لیکن چاند کی دھنک صرف قسمت والوں کو ہی نظر آتی ہے۔

سبین نے بھی ایک بار میران سے کہا تھا کہ اسے چاند والی قوس قزح دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ کہتے ہیں وہ اس قدر مبہوت کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہے کہ اسے دیکھ لینے کے بعد پھر سورج والی قوس قزح کو تو دیکھنے کا دل ہی نہیں کرتا۔

میران کا قدرت پر اتنا تو بس نہیں تھا کہ وہ سبین کے لیے آسمان پر چاند کی دھنک بنا سکتا یا چاند کے آگے یہ فرمائش ڈال سکتا، لیکن اس نے اس کے لیے ہیرے کی ایک ایسی رنگ ضرور خریدلی تھی جو ہر طرف سے بالکل چاند والی دھنک ہی چھوڑ رہی تھی۔

''یہ بہت پیاری ہے۔ سبین کو بہت پسند آئے گی۔'' ربیکا پتا نہیں کب کمرے میں آئی تھی۔ وہ شیشے کے سامنے کھڑا شرٹ کے بٹن بند کر رہا تھا جب اس کے جملے پر اس نے اس کی طرف پلٹ کر دیکھا تھا اور مسکرایا تھا۔

''وہ خود بھی بہت پیاری ہے۔''

''مجھے خوشی ہوگی کہ وہ میرے گھر میں آجائے گی لیکن تم اسے پہلے ہی بتا دینا کہ کچھ بھی ہو جائے تم پاکستان نہیں جاؤ گے۔ خواہ کیسا ہی مسئلہ ہو جائے۔ تم کسی بھی صورت پاکستان نہیں جاؤ گے۔''

''میں اسے کہہ دوں گا۔'' میران کی آواز سپاٹ تھی۔ ربیکا بدستور رنگ کو دیکھے جا رہی تھی۔

''وہ انکار نہیں کرے گی۔ میرے بیٹے کو دنیا کی کوئی لڑکی انکار نہیں کر سکتی...... کیونکہ وہ پوری عیسیٰ کی شبیہہ ہے۔''

میران کو اپنی تیاری پر توجہ رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

''اگر اس نے کیا بھی تو میں اسے زبردستی اٹھا کر لے آؤں گی۔ میں تمہیں تو کم از کم کوئی اور تو میرے بیٹے کو خوش رکھے۔''

''مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے ممی۔''

''دیکھو ذرا...... تم سے بھی اپنے باپ کی طرح جھوٹ نہیں بولا جاتا۔ تم دونوں کو ہی یہ عام سا کام کرنا کبھی آیا ہی نہیں۔''

میران خاموش ہو گیا تھا۔ ربیکا اس میں عیسیٰ کی پرچھائی تلاش کر رہی تھی۔ وہ جانتا تھا۔ ایسی حالت میں اس کے لیے میران بنے رہنا بہت مشکل ہو جاتا تھا اور بدقسمتی سے وہ عیسیٰ بھی تو نہ بن سکتا تھا۔

ربیکا کمرے سے چلی گئی تو وہ سکون سے تیار ہونے لگا۔ بالوں پر جیل لگا کر اس نے انہیں سیٹ کیا...... پھر کرون کے اطراف پرفیوم کا اسپرے کیا، ایک سے دل نہیں بھرا تو اس نے کافی سارے اسپرے کیے۔ ربیکا لمحے بھر بعد پھر سے اس کے پاس آگئی تھی۔

''یہ لو......'' اس نے میران کی طرف ایک ٹائی بڑھائی تھی۔

''یہ کیا ہے؟'' وہ جانتا تھا کہ یہ یقیناً بابا سے متعلق ہی کچھ ہوگا اور ایسا ہی ہوا تھا۔

''تمہارے بابا کی ہے۔انہوں نے شادی پر پہنی تھی۔'' وہ یک ٹک ٹائی کو دیکھنے لگا۔ جہاں ربیکا کی نظریں پہلے سے گڑی ہوئی تھیں۔

''یقیناً ان پر بہت پیاری لگی ہوگی۔''

''بہت......'' وہ بہت کو کھینچ کر اور رغبت سے بولی تھی۔ایک لمحہ لگا تھا ربیکا کو پھر سے ماضی میں جانے کے لیے۔

''اسے بس شلوار قمیص پہننے کی عادت تھی۔اس کے باوجود وہ مغربی لباسوں میں بہت خوب صورت لگا کرتا تھا۔جیسے وہ اس کے لیے ہی بنے ہوں۔وہ ان لباسوں کو اپنی سمجھ کے مطابق پہنا کرتا تھا۔ٹائی کو وہ گردن سے کس لینے کے بجائے ڈھیلا چھوڑ دیا کرتا تھا اور یقین کرو......اس کے اس انداز کو کتنے ہی لوگ فالو کرتے تھے اور کتنی عورتیں محض ٹائی کسنے کے بجانے اس کے قریب ہوا کرتی تھیں۔'' ربیکا ہنستے ہوئے بے دم ہونے والی تھی۔اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر وہ ڈگمگا سی گئی۔میران نے بمشکل انہیں سنبھالا تھا۔

''میں اس کی وفا کی اکیلی دعوے دار ہوں۔مجھے اس بات پر فخر ہے۔''

''میں اسے اپنی شادی پر پہنوں گا۔اور ڈھیلی کر کے ہی پہنوں گا۔'' اس نے تحمل سے کہا۔

''نہیں......آج پہن لو۔'' وہ بچوں کی طرح اصرار کرنے لگی۔

''آج میری شادی تھوڑی ہے۔''

''تمہاری شادت میں نہ ہوئی تو......'' ربیکا نے کہا تھا۔ایک کانٹا سیدھا میران کے دل میں اتر گیا تھا۔

''میں چاہتی ہوں کہ میں تمہیں اس میں دیکھوں۔''

''آپ ایسی باتیں کر کے مجھے دکھی کر دیتی ہیں۔''

''تو تم مجھے خوش کر دو......اسے پہن لو۔'' وہ خود اسے ٹائی باندھنے لگی تھی۔

''سبین خوش قسمت ہے۔میں اسے ایک عیسیٰ دے رہی ہوں۔ہر وہ لڑکی خوش قسمت ہے جس کا عیسیٰ اس کے ساتھ ہے۔'' ربیکا ٹائی باندھ کر آنکھوں کے آنسو چھپاتی اس کے کمرے سے چلی گئی تھی۔

کافی لمحے وہ اسی حالت میں ساکت کھڑا رہا تھا۔پھر بوجھل ہاتھوں سے اس نے اپنی گردن کے اطراف میں لپٹی ٹائی پر ہاتھ پھیرا تھا۔جہاں سے ربیکا کے خشک ہو چکے آنسوؤں کی بو آ رہی تھی۔

باہر نکل کر وہ ربیکا کے کمرے کے سامنے سے گزرا تو اسے اس کے کمرے سے عجیب سی آوازیں آئی تھیں۔اس نے جھری سے اندر جھانک کر دیکھا تھا۔منظر توقع کے عین مطابق تھا۔

ربیکا بری طرح سے اپنے کمرے کے فرنیچر کے دراز کھنگال رہی تھی۔ پھر وہاں سے ہٹ کر وہ وارڈ روب کو کریدنے لگی تھی۔

میران جانتا تھا کہ اسے کس چیز کی تلاش ہے۔

''اس وقت؟'' اس نے گھڑی میں وقت دیکھا تھا۔

☆......☆......☆

سبین شام کے وقت پارلر گئی تھی۔ میران کے بتائے وقت سے ٹھیک دو گھنٹے پہلے...... جبکہ جس طرح کی تیاری وہ چاہ رہی تھی اس کے لیے اسے دو دن بھی بہت کم لگ رہے تھے۔ خیر بیوٹیشن نے اپنی بھاری قیمت کو حلال کیا تھا۔ اس نے سبین کو اس کی توقع سے بھی بڑھ کر تیار کیا تھا۔ سبین کے خاص دن کو خاص بنانے کے لیے اس نے خاص ٹیکنیک استعمال کی تھیں۔ اس نے خود کو آئینے میں دیکھا تھا اور دیکھتی رہ گئی تھی۔ تو کیا وہ ساری زندگی بدصورت نہیں تھی بلکہ صرف غریب تھی؟ اپنے خوب صورت ہونے کا ایسا والہانہ احساس اسے آج پہلی بار ہو رہا تھا۔

سفید اور سرخ رنگ اس پر بہت پیارا لگ رہا تھا اور اونچی ہیل والے سنہری جوتے بھی...... وہ بے حد دلکش لگ رہی تھی۔ اتنا تو وہ اپنی شادی والے دن بھی پیار نہیں لگ رہی تھی۔

''ہونہہ...... کیا وقت یاد آ گیا تھا اس وقت......'' اچھے کے ساتھ ساتھ برے وقت کی یاد بھی اچانک ہی آ جاتی ہے۔

''صرف سفید رنگ کے گن پر میں اپنے بیٹے کو قربان نہیں کر سکتی......'' خود کو دیکھتے ہوئے اسے تائی کا فقرہ یاد آیا تھا۔ اچھا ہوا جو اس نے اس دن تائی کا منہ نہیں نوچ لیا۔ عین ممکن تھا کہ اس کا ہاتھ اب تک ناپاک ہی رہتا۔

اس کا ارادہ تھا کہ وہ پارلر سے ہی سیدھی ہوٹل میران کی بتائی ہوئی جگہ پر چلی جائے گی، لیکن عین وقت پر اسے ڈینی کی کال آ گئی۔

''گیسٹ ہاؤس میں ہی رہنا...... کوئی لڑکا ابھی تم سے ماڈل لے جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ پر اسے کہو کہ وہ جلدی آئے۔ مجھے کہیں جانا ہے۔''

''کہاں......؟'' ڈینی پوچھ کر خود ہی چپ ہو گیا۔ وہ ایک طرح سے اس کے نیو یارک قیام میں خود کو اس کی اچھائی برائی کا ذمہ دار سمجھ رہا تھا۔ سبین کو اس کی یہ ادا پسند تھی۔

چار و ناچار وہ واپس اپنے گیسٹ ہاؤس آ گئی تھی اور لڑکے کا انتظار کرتے ہوئے مفصل انداز سے خود کو دیکھنے لگی تھی۔ سارا کمال ڈریس کا تھا یا پارلر کا......؟ یا اس خوشی کا تھا جو اس کے اندر سے پھوٹ رہی تھی اور اس سمیت پورے کمرے کو روشن کر رہی تھی۔ وہ آنے والے وقت میں میران کے ساتھ زندگی کے ایک ایک دن کا تصور باندھنے لگی تھی۔

بہت سا وقت بنا چاپ کیے گزرتا چلا جا رہا تھا۔اس کی چپ چال میں ایک فریب تھا۔وہ آنے والے کڑے وقت کی سرگوشی کا راز دفن کیے ہوئے تھا۔شاید وقت بھی تماش بین ہوتا ہے۔اسے نسل انسانی کو اپنی انگلیوں پر نچانے میں مزا آتا ہے۔

کیا خوش گوار وقت ہوگا جب وہ اور میران ایک ہی گھر میں ایک ہی چھت تلے ہوں گے۔وہ مستقبل کے سہانے سپنے بننے لگی تھی۔ایک لڑکی کی آنکھوں کے سپنے......جو وہ جہاں بھی ہو،جس بھی خطے،علاقے کی ہو،یہ ہی سپنے دیکھتی ہے۔

☆......☆......☆

میران سڑکوں پر بھاگتا ہوا پھر رہا تھا۔وہ اس ہپی لڑکے جس کا نام جیڈن تھا کو تلاش کر رہا تھا اور وہ اسے کہیں نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

بلیک پینٹ کوٹ اور وائٹ شرٹ میں وہ ایک ایسا دولہا لگ رہا تھا جس کی دلہن عین قبولیت کے وقت کہیں جا چھپی تھی اور اب وہ دیوانہ وار اسے سڑکوں پر تلاش کرتا پھر رہا تھا۔دائیں بائیں کے ہجوم میں سے ہر کوئی اسے دیکھ رہا تھا۔

''جیڈن کہاں ملے گا۔''اس نے اسی کی نسل کے ایک لڑکے سے پوچھا تھا۔

''کون جیڈن......؟''

''جو پینٹ کی سائڈ پر چین لٹکاتا ہے اور ہونٹوں پر ہلکی سی لپ اسٹک بھی......''وہ بہت جلدی میں تھا۔جیسے اسے پتا ہو کہ اس نے دیر کی تو ممی جان دے دے گی یا لے لے گی۔کہیں وہ خود ہی گھر سے باہر نہ نکل آئے۔اسے ابھی سبین سے ملنے بھی جانا تھا۔ہوٹل کی ساری تو مکمل تھی لیکن جو عمل تھا وہ دونوں کی وہاں موجودگی سے منسلک تھا۔اس کے دل میں مستقبل کے خواب تھے۔وہ اس وقت صرف خوشی کو سوچنا چاہتا تھا اور یہ جیڈن تھا کہ کہیں مل ہی نہیں رہا تھا۔

''وہ اس پلازے کے تہ خانے میں ہے۔پارکنگ والی سائڈ پر ملے گا۔''ایک لڑکے نے اسے بتایا تھا۔

اگلے ہی پل وہ پلازے کے اندر تھا۔جیڈن کسی پرانی کار کی چھت پر بیٹھا تیز بو والا سگریٹ پی رہا تھا۔

''پلیز جلدی کرو......''اس نے پیسے نکالتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ کم ہیں۔''

''تم نے پچھلی بار اتنے ہی پیسوں میں دی تھی۔''

''اب ریٹ بڑھ چکے ہیں۔''دھواں چھوڑتے ہوئے وہ ادا سے بولا۔

''''میں باقی پیسے بعد میں دے دوں گا۔''میران نے سادگی سے کہا۔جیڈن نے اس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا کہ جیسے فیصلہ کر رہا ہو کہ وہ خود پاگل ہے سامنے والا۔

''زیادہ پیسے دے سکتے ہو تو ٹھیک ورنہ جاؤ یہاں سے......یہ کوئی بینک نہیں ہے کہ میں تمہیں ادھار دوں یا باقی پیسے بعد میں کی رسید بنا کر دوں۔''جیڈن نے اسے ہاتھ کے اشارے سے دفعہ ہو جانے کا کہا تھا۔

”دیکھو دوست...... میں اس وقت بہت مشکل میں ہوں۔ پلیز میری مدد کرو...... مجھے یہ اپنے لیے نہیں چاہیے اور مجھے اس وقت کہیں اور بھی پہنچنا ہے۔ میں بہت جلدی میں ہوں۔“

لفظ ”دوست“ نے جیڈن پر کچھ اور ہی طرح سے اثر کیا تھا۔ آگے کے الفاظ تو جیسے اس نے سنے ہی نہیں تھے۔ چھلانگ لگا کر وہ کار کی چھت سے نیچے اتر آیا تھا۔ پھر وہ میران کے قریب ہا تھا اور اس نے اس کی گردن پر ہاتھ پھیرا تھا۔ میران نے اسے ایسا کرنے دیا تھا۔

”تو پھر میرا ایک کام کر دو...... میں تمہیں یہ مفت میں دے دوں گا۔“

”دفع ہو جاؤ......“ میران نے اسے دھکا دیا تھا۔ یہ سوچنے بنا کہ اسے اس کی کتنی ضرورت تھی۔ جیڈن اونچی اونچی ہنسی ہنسنے لگا تھا۔

”تم تو ناراض ہی ہو گئے۔ میں وہ نہیں کہہ رہا......“

”پھر کیا......؟“ وہ نہ سمجھا۔

”ہم سب اس وقت پولیس کی نظروں میں ہیں۔ ہماری نگرانی کی جا رہی ہے ورنہ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں اس تہ خانے میں دنیا کے امن کے بارے میں سوچنے کے لیے بیٹھا ہوں۔“

”میں تمہارے کس کام آ سکتا ہوں۔ جلدی بتاؤ۔“

”تمہیں ایک گیسٹ ہاؤس جانا ہے۔ زیادہ دور نہیں ہے۔ یہاں سے پندرہ منٹ کی مسافت پر ہے۔ وہاں سے تمہیں ایک پارسل لانا ہے۔ ہمارے ایک ایجنٹ سے...... وہ کسی مسجد وغیرہ کا ماڈل ہوگا۔ تم وہ پارسل لے آؤ۔ میں یہ تمہیں مفت دے دوں گا۔“

”اور اس پارسل میں کیا ہوگا؟“ میران نے پوچھا تھا۔ جیڈن نے اس کی طرف ایسے دیکھا تھا جیسے کہہ رہا ہو کہ تم تو نہیں جانتے۔ میران نے ایک لمحے کو سوچا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس پارسل میں کیا ہوگا، لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ وہاں جا کر اس کی قسمت اسے کس طرح پٹخ کر دے مارے گی۔

”فکر نہ کرو...... پولیس تمہارے پیچھے نہیں ہے۔ نہ ہی تم ان کی پکڑ میں آؤ گے۔ ایسا ویسا کچھ ہو بھی گیا تو میرا نام لے لینا۔ میں یہاں تہ خانے میں ہی تمہارا انتظار کروں گا۔ یقین رکھو مجھ پر...... قیامت بھی آ گئی تو تم مجھے یہاں ہی کھڑا پاؤ گے۔“

میران کا فون بج رہا تھا۔ سبین کی کال تھی۔ وہ یقیناً لیٹ ہو چکا تھا۔ اسے لیٹ نہیں ہونا تھا۔ آج کے یادگار دن کو برا نہیں کرتا تھا۔ جیڈن سے پتا پوچھ کر وہ گیسٹ ہاؤس کے لیے چل پڑا۔

☆......☆......☆

سبین میران کو کال کر رہی تھی کہ وہ تھوڑا لیٹ ہو جائے گی لیکن میران کال ہی نہیں اٹھا رہا تھا۔ اس نے ڈینی کو پھر کال کی تھی کہ وہ ماڈل منگوا بھی لے۔ اسے جلدی کہیں جانا ہے۔ بات کے دوران ہی اس کے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

''لگتا ہے وہ آ گیا ہے۔'' اس نے فون بند کیا اور فیصل مسجد کا ماڈل اٹھا کر دروازے تک پہنچی۔

''کون......؟'' اس نے انگلش میں پوچھا تھا۔

''بیلا ڈونا......'' آنے والے نے کوڈ بولا تھا۔ سبین نے تسلی کر کے دروازہ کھول دیا۔ یہ سوچے بنا کہ اس دروازے کا کھلنا اس کی قسمت کو بند کر دے گا۔

فیصل مسجد کا ماڈل اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا تھا۔ لمحے بھر کے لیے تو اسے یقین ہی نہ آیا کہ اس کے سامنے میران کھڑا ہے۔ میران بھی اسی بے چینی سے سبین کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دونوں کس بات کا یقین چاہتے تھے؟

پھر دونوں کو ہی اس عجیب اتفاق پر یقین آ گیا۔ میران کی آنکھیں بے یقینی سے نفرت کی گہری کھائیوں میں جا رہی تھیں اور سبین کی بے یقینی سے چوری ثابت ہو جانے کی طرف۔

''وہاں سے تمہیں ایک پارسل لانا ہے۔ ہمارے ایک ایجنٹ سے......وہ کسی مسجد وغیرہ کا ماڈل ہو گا۔'' یہی لڑکے کی آواز میران کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ اور ارض و سما میں بھی......

''اس لڑکی کا نام بیلا ڈونا ہے۔'' جیڈن نے میران کے پیچھے سے آواز لگائی تھی۔

''بیلا ڈونا......؟'' میران نے ان الفاظ کو دہرایا تھا۔

سبین کی چور نظریں جھک گئی تھیں۔ میران کی آنکھوں میں نفرت کے سمندر تھے۔ وہ اس سمندر میں ڈوب رہی تھی اور اسے موت نہیں آ رہی تھی۔

''بیلا ڈونا......'' اب کی بار میران نے ایک ایک لفظ پر اذیت کا زور دیتے ہوئے کہا تھا۔

لفظوں سے جان نکل سکتی تو بیلا ڈونا کے یہ الفاظ سو بار کیا ہزار بار سبین کی جان نکال چکے ہوتے۔

کھڑکی سے باہر رہزن رات معصوم شام کو لوٹ رہی تھی۔ سرمئی رنگ سیاہ ہو رہے تھے۔



ناول شام رنگ سیاہ ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی 20 تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 7

سوگ مرگ میں ڈوبی فضا میں زنگ لگی آہنی گھنٹیاں بجتی چلی ج رہی تھیں۔ فانی زندگی کی ابدی محبت کا قافلہ دور جا رہا تھا۔
سبین وہیں کھڑی تھی۔ ایک پریشان حال بت کی مانند...... اس میں اتنی سکت ہی باقی نہیں بچی تھی کہ وہ قافلے والوں کے ساتھ جا کر مل جائے۔ ان زنگ خوردہ آہنی گھنٹیوں پر لبیک کہہ دے۔ لق ودق صحرا میں وہ اکیلی کھڑی تھی۔ وہ دونوں طرف سے پھنس چکی تھی۔ قافلے والوں کے ساتھ جاتی تو آگے رہزنوں کے ہاتھوں لوٹ لی جاتی۔ یہاں ٹھہرتی تو شدت نار سے مر جاتی...... وہ نار جو میران کے چہرے سے برس رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے، اس کے تنفس سے...... اس کے لہجے سے...... اس کی کس کس چیز میں آگ نہیں تھی۔ سبین جل جل کر راکھ ہو رہی تھی۔ میران کی آنکھیں سبین کے وجود میں گڑتی جا رہی تھیں۔ اور سبین کو کہیں جائے پناہ نہیں مل رہی تھی۔ ان آنکھوں کی دھار ایسی کٹیلی تھی کہ سبین کو محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر نیزوں سے چھلنی چھلنی کر رہا ہو۔
''سبین...... یا...... بیلا ڈونا...... کیا کہوں میں تمہیں سبین......؟'' میران ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولا تھا۔ سبین کی پلکیں اس کے گالوں سے جڑ گئیں۔ اسے لگا اس نے ساری زندگی نظریں اٹھا کر دنیا کو کبھی دیکھا ہی نہیں...... اور نہ ہی وہ آئندہ کبھی دیکھ سکے گی۔
''کیا یہ واقعی تم ہی ہو سبین...... یا تم بیلا ڈونا ہو...... سبین صرف تمہارا روپ ہے؟''
مجرم بنی وہ خاموش تھی۔ اپنی صفائی میں بولنے کے لیے اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اپنی تہی دامنی کا احساس ایسا ذلت آمیز تھا کہ اسے محسوس ہوا اتنی غربت اس نے لاہور کے گن پت روڈ میں اپنے گھر میں رہتے ہوئے آج تک نہیں دیکھی ہے جتنی ان چند لمحوں میں دیکھ لی تھی۔
''تم اصل میں کیا ہو سبین......؟'' وہ نفرت سے پوچھ رہا تھا۔
''میران......''
ایسی نقاب کشائی جس کی اسے توقع بھی نہیں تھی پر اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ وہ بمشکل میران کا نام پکار سکی تھی۔ میران اس کی شکل دیکھنے لگا تھا۔ وہ کب سے اس کی شکل ہی تو دیکھ رہا تھا۔ مختلف احساسات سے اور مختلف جذبوں سے...... پہلے حیرت سے، پھر بے یقینی سے، پھر نفرت سے اور اب...... لاتعلقی سے...... اس کی آنکھوں کی تہوں میں کہیں آنسو دفن تھے۔ جو باہر نکلنے کو بے

تاب رہے تھے۔ بے چارگی میں وہ اس وقت کسی عمر رسیدہ شخص کی مانند نظر آنے لگا تھا۔ ہونٹ کاٹتے ہوئے ضبط، تنہائی کی انتہا پر پہنچا ہوا، اور مرگ کے نزدیک...... اس کے ہونٹ...... گل مہر کے پھولوں جیسے سرخ، دہکتے ہوئے اور نمی والے ہونٹ...... جیسے وہ کوئی گاڑھا مشروب پی کر ہونٹ صاف کرنا بھول گیا ہو۔

''تمہیں پتہ ہے سبین...... میری ماں نشہ کرتی ہے۔ حشیش کا نشہ...... تمہیں میں نے آج تک یہ بات نہیں بتائی...... کیونکہ میرے نزدیک یہ ایسی لعنت تھی کہ میں سوچا کرتا تھا جس دن تمہیں ممی کے بارے میں یہ سب پتا چلے گا تم مجھے چھوڑ دو گی...... اور میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ تم خود یہ کام......'' بے چارگی سے کہتا وہ کس پر ترس کھا رہا تھا۔ سبین پر......؟ یا خود پر......؟

''میں ہمیشہ سوچا کرتا تھا کہ اللہ کے ہر کام میں اس کی کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے۔ ممی کو نشہ کرتے دیکھ کر سوچتا تھا کہ اس برے کام میں خدا کی کیا حکمت ہو سکتی ہے۔ عرصے سے میں خدا کے آگے یہ سوال رکھ رہا تھا اور جواب نہ ملنے پر کڑھ رہا تھا۔ مجھے اللہ کی حکمت آج پتا چلی ہے۔ اس نے میری ماں کو میری آزمائش بنا کر مجھے ایک گڑھے میں گرنے سے بچا لیا ہے۔''

''گڑھا......'' میران کا اشارہ سبین کی طرف تھا۔ محبت کے لازوال عروج سے وہ پستی کا بے مثال گڑھا بن گئی تھی۔

''میران...... پلیز میری بات سنو۔'' سبین رندھی ہوئی آواز سے بولی۔ گڑھے میں صرف وہ ہی نہیں گرا تھا۔ سبین بھی تو کھائی میں جا گری تھی۔

''تم جانتی ہو۔ آج مجھے ممی کو ڈنر نہیں کروانا تھا۔ میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔ مجھے تمہیں ڈنر پر لے کر جانا تھا۔ آج تمہیں پروپوز کرنا تھا۔ آج میں تمہارے ساتھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ چاہتا تھا کہ ہم دونوں مل کر اپنا مستقبل پلان کریں۔ کہ ایسے میں اچانک ممی کی طبیعت خراب ہو گئی۔ انہیں ان کی روز کی ''ڈوز'' کی طلب ہوئی اور مجھے کوفت...... کیا اس کام میں بھی اللہ کی حکمت تھی۔ تم تو یقیناً جانتی ہو گی کہ عادی نشہ آور کے نشے کا خیال بھی ایسے ہی رکھنا پڑتا ہے جیسے کسی مریض کی دوائی کا...... کیونکہ اگر انہیں بروقت ان کی طلب فراہم نہ کی جائے تو ان کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ اس لیے مجھے ممی کے لیے جلد سے جلد ان کی ڈوز کا بندوبست کرنا تھا۔ اور دیکھو...... اللہ مجھے کہاں لے آیا...... تمہاری حقیقت بتانے......''

وہ اسے چوک میں بٹھا کر کوڑوں سے مار لیتا لیکن یہ طنز...... خدارا اس کی جان کیوں نہیں نکل جاتی۔

''مجھے یہاں آتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ یہ ڈر اس برے کام کی وجہ سے ہے جو مجھے آج ممی کی وجہ سے کرنا پڑ رہا ہے۔ جبکہ حقیقت میں میری قسمت مجھے ڈرا رہی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ پولیس مجھے پکڑ نہ لے...... مجھے جیل نہ ہو جائے۔ لیکن یہ زیادہ اچھا نہیں تھا کہ پولیس ہی مجھے پکڑ لیتی۔ نشہ آور چیزوں کی خرید میں مجھے عمر بھر کی قید ہو جاتی۔ وہ صورت حال اس قدر افسوس ناک نہ ہوتی جتنی یہ ہے۔ اب تو میری بری تقدیر نے مجھے ایسے اپنے قابو میں کر لیا ہے کہ جہاں سے مجھے ساری زندگی

ضمانت مل سکتی ہے اور نہ رہائی۔"

تو وہ لمحے بھر میں زندگی بھر کا فیصلہ کر چکا تھا۔

"میں ایک ایسی لڑکی کو شادی کے لیے پروپوز کرنے جا رہا تھا جو ایک بدنام گینگ کا حصہ ہے اور جو سب سے یہ کہتی ہے کہ وہ "امن" نامی این جی او میں کام کرتی ہے۔ دنیا میں "فتنہ" پھیلا کر وہ "امن" کا نام لیتی ہے۔ محترم استاد کا نام لے کر کہتی ہے کہ وہ ان کے دین کی تبلیغ کرنے یہاں آتی ہے۔ تمہیں ایسا جھوٹ بولتے شرم نہیں آتی تھی سبین...... تم شرم سے ڈوب نہیں مرتیں۔ مگر تمہیں شرم کیسے آتی...... یہ لفظ تو ہم لوگوں کے لیے بنے ہیں۔ تم تو ان لفظوں کی قید سے آزاد اور بہت او پر پرواز کرنے والی لڑکی ہو۔"

ہوٹل کی تیسری منزل پر کھڑی وہ زمین کے پھٹنے کا انتظار کرنے لگی تھی۔

"مجھے لگتا تھا کہ دنیا میں لڑکیوں کا سب سے گندہ پیشہ کال گرل بن جانا ہے۔ مجھے کال گرلز لڑکیوں سے نفرت محسوس ہوتی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ ایسی لڑکیوں کو خودکشی کر لینی چاہیے لیکن یہ کام نہیں کرنا چاہیے۔ خواہ ان کی کتنی ہی بڑی مجبوری کیوں نہ ہو...... لیکن تم نے...... تم نے میری اس بات کی تردید کر دی۔ تمہاری وجہ سے میں اب کال گرلز کو بھی عزت دینے لگوں گا۔ کیونکہ میں ایک اور گندے پیشے سے روشناس ہو چکا ہوں۔ مذہب کا نام لے کر شر پھیلانے کے پیشے سے۔"

"میران...... میری بات سنو...... خدا کے لیے۔" وہ پھر سے بمشکل کہہ پائی تھی۔

"بولو...... میں تمہاری ایک بات سن کر ہی یہاں سے جاؤں گا سبین...... تا کہ تمہیں یا مجھے زندگی بھر یہ شکوہ نہ رہے کہ ہم نے ایک دوسرے کو اپنی صفائی میں بولنے کا موقع نہیں دیا۔ تو بولو سبین...... اوہ سوری...... مس بیلا ڈونا...... بولیے...... میں سن رہا ہوں۔"

وہ اسے اپنی سنانے کے لیے ہی تو بے چین تھی لیکن اب اس سے کچھ بھی بولا نہیں جا رہا تھا۔

"میں اتنی بری نہیں ہوں میران......" اس کے ہونٹوں سے آواز کے بجائے آنسو نکلے تھے۔ وہ بھی روانی سے نہیں بلکہ آہستگی سے جیسے اس کے آنسو بھی اس سے لاتعلق ہو گئے ہوں۔ آج انہوں نے بھی اسے سر بازار تنہا چھوڑ دیا ہو۔ اس کے جسم کا روم روم اس سے متنفر ہو کر دور کھڑا اس پر ہنس رہا تھا۔ اس کا دل آنے والے لمحوں کا سوچ کر غم سے پھٹنے لگا تھا۔ یہ لڑکا جو دروازے سے لگا اس سے اتنی نفرت کا اظہار کر رہا تھا کیا وہ آگے اپنی ایک سانس بھی سبین کی سانس کے ساتھ شریک کرنا کفر نہیں سمجھے گا۔

"چلو ثابت کرو...... ثابت کرو کہ مجھے سب غلط فہمی ہو رہی ہے اور جو میں دیکھ رہا ہوں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔"

وہ ایک بار پھر چپ ہو گئی تھی۔ اس کے پاس سوائے اعتراف کے اور کچھ نہ بچا تھا۔ اس کے پاس ایسا کوئی وکیل صفائی بھی نہیں تھا جو اس کے جرم پر بحث ہی کر سکتا۔ اس کی سزا اسے اپنے سامنے بالکل واضح نظر آ رہی تھی۔ ادھوری محبت کی عمر قید کی سزا......

"کیا تم P.360 کے لیے کام نہیں کرتیں؟"

وہ خاموش کھڑی رہی۔

''بولو......'' غصے سے اس نے سختی سے سبین کا بازو تھام لیا تھا۔''بولو، اب جواب کیوں نہیں دے رہیں۔تمہارا نام ہی بیلا ڈونا ہے؟''

میران کے ناخن اس کے بازو میں گھسنے لگے تھے۔

''ہاں۔''

''تم پاکستان سے یہاں تبلیغ کے لیے نہیں آئی ہو؟''

''ہاں۔''

''تم اسمگلنگ کرتی ہوناں P.360 کے لیے؟''

''ہاں۔''اس کے پاس اس کے سارے سوالوں کے جواب''ہاں'' کی صورت میں ہی تھے۔اعتراف کی صورت...... اس نے کہیں سن رکھا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے''نہیں'' کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے۔حالات کیسے ہی ناگزیر کیوں نہ ہوں۔''نہیں'' کا لفظ استعمال کرنے سے اجتناب کرنا چاہیے اور ہمیشہ''ہاں'' کہنی چاہیے۔''نہیں'' مشکلاتا لاتا ہے اور''ہاں'' آسانیاں۔اس لیے اس نے سب سوالوں کے جواب''ہاں'' میں دے دیئے تھے۔اس کے باوجود وہ جانتی تھی کہ وہ ان عذابوں میں دھکیلی جانے والی ہے جو''نہیں'' بول کر بھی اس کے ساتھ نتھی نہیں کیے جا سکتے تھے۔

سب سن کر میران کی آنکھوں میں آنسو سے بھر آئے تھے۔نوکیلی چونچوں والے گدھ تھے جو ان کی مردار محبت پر بیٹھ کر ٹھونگیں مارنے لگے تھے۔وہاں اب ماس بھی جل چکا تھا۔صرف ہڈیاں بچی تھیں۔وہ جانتی تھی۔اب ان ہڈیوں کا وہ کیسا بھی تعویذ بنوا لے۔وہ میران کو حاصل نہیں کر سکے گی۔

''تو بولو......اب میں اور کیا سنوں تمہارے منہ سے......مس بیلا ڈونا......''اس نے اس کا ہاتھ جھٹکا تھا۔اس کی آواز رندھی ہوئی تھی اور یہ رندھی ہوئی آواز آری کی طرح فضا کو چیرتی ہوئی چلی گئی تھی۔

سبین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا اپنی صفائی کے لیے......ڈینی نے تو کہا تھا کہ اگر وہ ایئرپورٹ سے بچ جاتی ہے تو وہ خود کو کامیاب سمجھے......ڈینی نے اسے یہ کیوں نہیں بتاتا تھا کہ وہ جذبات میں بھی پھنس سکتی ہے۔ پھر وہاں سے اسے کس طرح باہر نکلنا ہے اس نے یہ سیکھنے کی ضرورت کیوں محسوس نہیں کی تھی۔ڈینی نے یہ تو بتا دیا تھا کہ جب کتے بھونکیں تو وہ کہہ سکتی ہے کہ ایسا کاجوپت کے تیل کی وجہ سے ہے۔لیکن یہ کیوں نہیں بتایا تھا کہ جب بھیڑیئے اس کی محبت کی چیر پھاڑ کر رہے ہوں تو اسے کیا کرنا ہے۔کس شہتوت کی ٹہنی سے انہیں دور کرنا ہے۔

''یہ لو۔'' پاکٹ سے ڈائمنڈ کی رنگ نکال کر میران نے اس کے آگے کی تھی۔

''یہ میں نے ممی کے لیے نہیں لی تھی۔ بلکہ تمہارے لیے ہی لی تھی۔ ''ڈائمنڈ'' کی رنگ۔''

وہ بات جو وہ پہلے سے ہی جانتی تھی وہ اسے بتا رہا تھا۔ اس نے سوچا تھا تب وہ بناوٹی حیرت کا اظہار کر کے خوشی سے پاگل ہو جائے گی۔ لیکن اب وہ حیرت کا اظہار کیے بنا اور خوش ہوئے بغیر ہی پاگل ہو رہی تھی۔

''تم نے ٹھیک ہی کہا تھا سبین۔ لڑکیوں کو ڈائمنڈ ہی پسند ہوتے ہیں اور اگر انہیں ڈائمنڈ نہ ملے تو وہ کچھ بھی کر گزرتی ہیں۔''

وہ اس کی بات اسی کو لوٹا رہا تھا، طنز کے ساتھ۔ وہ جان ہی نہ پائی کہ اس کی بات اس طرح اس کے منہ پر بھی آ لگے گی۔

میران نے زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ انگوٹھی اس کی ہتھیلی پر دے ماری تھی۔

''ڈائمنڈ...... '' جسے اردو میں ''الماس'' کہتے ہیں۔ یہ الماس ایک بار پھر سے اس کے پاس تھا۔ اس الماس کو پانے کے لیے اس نے کیا کچھ نہ کیا تھا۔ چونے کے بے وزن ذروں کو اس نے بھاری الماس میں بدلنے کے لیے جان کی بازی لگا دی تھی۔ اسے لگا اس کی زندگی بھر کی ساری خرابیوں کی جڑ یہ الماس ہی رہا ہے۔ بابا جس چونے کو الماس برادہ کہتے تھے، سبین اس چونے کو الماس سے بھی بڑھا کر ''ناگ منی'' میں بدلنا چاہتی تھی۔ خالی خولی ''الماس'' پر تو اس کا گزارا ہی نہیں ہوا تھا۔ اور ''ناگ منی'' کی چمک میں ڈوبی اس کی آنکھیں اتنی بے خبر تھیں کہ بے دھیانی میں اب اسی منی والے ناگ نے اسے ڈسا تھا اور ایسا ڈسا تھا کہ اسے اب پوری دنیا سے اس کا مہرہ نہیں مل سکتا تھا۔ وہ سراپا زہر آلود ہو چکی تھی۔

''یہ دے دو۔'' اس نے اب اس کے ہاتھ سے فیصل مسجد کا ماڈل پکڑ لیا تھا اور پھر بغور اسے دیکھنے لگا تھا۔

''مساجد تو امن کا گہوارہ ہوتی ہیں اور تم اس کے ذریعے۔ خیر میرا اب تم سے یہ سب باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ میری ماں وہاں مر رہی ہے اس کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔ محبت تو مر ہی چکی ہے۔ بہتر ہے کہ میں اب اپنی ماں کو بچا لوں۔''

وہ جانے کے لیے مڑا۔ سبین اسے روکنا چاہتی تھی لیکن اس کے پاس اسے روکنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ وضاحت نہ ہی کوئی چھپا ہوا سچ جو اس کا بھرم رکھ لے۔ مان تو ٹوٹ ہی چکا تھا۔ اس نے اسے آواز دینا چاہتی اور تب ہی اسے محسوس ہوا کہ اس کی آواز بھی بند ہو چکی ہے۔ اس کا برا نصیب اس کی آواز کا گلا گھونٹ چکا تھا۔ اس کے حلق میں ریت ہی ریت تھی۔ وہاں موت کا فرشتہ بیٹھ چکا تھا۔ فیصل مسجد کے ماڈل کی طرح میران اس کی سانوسوں کی سرگم کو بھی اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا۔ بنا سانسوں کے اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ وہ چونے کا ایک ایسا بیش قیمت بت بن چکی تھی جو اگر ٹوٹ بھی جائے تو اسے اس کی قیمت کی بنا پر دوبارہ ٹکڑے جوڑ جوڑ کر بنا لیا جاتا ہے۔ لیکن تب اس میں دراڑیں رہ جاتی ہیں۔ انہی دراڑوں کے ذریعے نمی اور ہوا اس بت میں داخل ہوتی رہتی ہے۔ اور پھر ایک دن اچانک، بنا کسی ضرب، بنا کسی وجہ کے وہ بت ایک بار پھر خود بخود ہی ٹوٹ کر نیچے گر جاتا ہے۔

گر کر ٹوٹنے اور ٹوٹ کر گرنے کے دونوں عمل کے بعد اس بت کی بیش قیمتی، دو کوڑی پر آ جاتی ہے۔
جب رشید نے اسے طلاق دی تھی تو تب وہ گر کر ٹوٹی تھی اور اب جب میران نے اسے چھوڑا تو وہ ٹوٹ کر گری تھی۔ اس کی قیمت دو کوڑی کی بھی نہیں رہی تھی۔ وہ جانتی تھی۔
کمرے کی موت جیسی خاموشی میں سبین نے سنا ایک آواز سب پر حاوی ہو رہی تھی۔ اس کے دل کی تیز دھڑکنوں پر بھی...... چکی چلنے کی آواز......
''گھوگھو......گھوگھو......'' فضا کی سب سے بڑی چکی کا قطب کسی نادیدہ ہاتھ نے گھما دیا تھا۔ نفرت انگیز آواز چاروں طرف پھیل رہی تھی۔ اماں دو کہیں خلاؤں سے سبین کو دیکھتی ہوئی اس پر طنزیہ ہنسی ہنس رہی تھیں۔

☆......☆......☆

''محبت کی پہلی کرن عنکبوت کی مانند ہوتی ہے۔ اپنی نازک اندامی پر لرزاں......اور آخری، کوہ آتش کے لاوے جیسی...... سب جلا کر راکھ کر دینے والی......جیسے بجھنے سے پہلے دیا بھرپور طریقے سے پھڑ پھڑاتا ہے۔ لیکن محبت میں آخری کرن کی نوبت ہی کیوں کر آتی ہے؟ کیا محبت ایک غیر فانی جذبہ نہیں ہے؟ یا یہ ہمارا ہی کوئی عمل ہوتا ہے جو اس غیر فانی جذبے کو بھی قتل کر دیتا ہے اور ہم مقتول کی صفوں میں جا کھڑے ہوتے ہیں۔
آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں اعداد و شمار میں سدا کی کوری رہی ہوں۔ مجھے لگا تھا کہ میں کرن کرن جوڑ کر اپنی زندگی کا ایک سورج مرتب کر رہی ہوں۔ میں اپنے عمل اور اعمال سے بے بہرہ رہی، بھول گئی تھی کہ محبت کے سورج پر جب نفرت کا گہن لگتا ہے تو پھر وہ ساری زندگی کو سیاہ کر کے رکھ دیتا ہے۔
اور پھر کسی صبح کی نوید باقی نہیں رہتی......''

☆......☆......☆

اس نے اپنی لپ اسٹک کو نوچ نوچ کر اتار دیا تھا۔ جو اتر نے سے زیادہ پھیل گئی تھی اور اس نے اس کے گالوں کو اس کی محبت کی طرح بدصورت کر دیا تھا۔ کانوں میں پہنے بندے......نیکلس اتارتے ہوئے اس نے خود کو ہی نوچ ڈالا تھا۔ جس باعث اس کی گردن میں اور کانوں پر خون کی سرخ دھاریاں پڑ گئی تھیں۔ اگرچہ خون نہیں نکلا تھا لیکن پھر بھی وہ لہولہان ہو گئی تھی۔ نوک دار ہیل والے جوتے......کیسی ڈگمگائی تھی وہ ان میں......کہ اب اس سے اٹھا ہی نہیں جا رہا تھا۔ اماں ٹھیک سوچتی تھیں کہ اونچی ہیل کے جوتوں میں لڑکیاں طوائف لگتی ہیں۔ اس نے ضد میں سب سے اونچی ہیل لی تھی اور میران نے اسے کہا تھا کہ وہ اس کی نظر میں اتنی بری ہو گئی ہے کہ اب وہ طوائف کو بھی شریف سمجھنے لگا ہے۔

''مس بیلا ڈونا!'' میران کی آواز اس کے کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی۔ کیا تھا اس آواز میں......کتنا رنج تھا، دکھ تھا، غصہ تھا اور سب سے بڑھ کر......نفرت تھی۔

''P.360 کی ایجنٹ......''

وہ واش روم میں چلی گی اور اس نے شاور کا نل پوری طرح سے کھول دیا۔ باہر کی شدید سردی کے باوجود اسے انت کی گرمی کا احساس ہو رہا تھا۔ کوئی اسے جیسے جہنم کی آگ میں دھکیل رہا تھا۔ وہ دھار چھوڑتے پانی کے نیچے کھڑی ہو گئی۔ جو اسے اتنا نوک دار لگ رہا تھا کہ اس کا جسم کاٹ رہا تھا۔

''مس بیلا ڈونا......مس بیلا ڈونا......'' کی صدا لگاتا ہوا وہ چلا گیا تھا۔ کبھی نہ واپس آنے کے لیے......وہ جانتی تھی۔ اس پر آگ برسا کر وہ بجھانا بھول گیا تھا اور آگ تھی کہ اسے جلا کر ختم نہیں کر رہی تھی بلکہ جھلسا جھلسا کر تڑپا رہی تھی۔

اتنا دکھ اسے تب بھی نہیں ہوا تھا جب رشید نے اسے سب مہمانوں کے بیچوں بیچ کھڑے کھڑے طلاق دے دی تھی۔ یہ لفظ......یہ مس بیلا ڈونا کے لفظ اس طلاق کے تین الفاظ سے بھی زیادہ اس کی سماعتوں میں گرم سیسے کی مانند اتر رہے تھے۔ ان تین لفظوں میں عدت، تین صدیاں ایک کال کوٹھری میں بند رہ کر بھی پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے سب کھو دیا تھا۔ اب ہوئی تھی اصل میں کھونے کی شروعات......طلاق کے بعد اس نے بیلا ڈونا بن جانے کی حامی بھر لی تھی۔ اب میران کو کھو دینے کے بعد وہ کیا بننا چاہتی تھی۔ پھر سے سبین......جو کہ اب ناممکن تھا۔ وہ جانتی تھی۔

تیز شاور کے پانی کی آواز پورے واش روم میں پھیلی ہوئی تھی۔ پھر اس آواز پر ایک اور آواز آہستہ آہستہ سبقت لے گئی۔ اس کے رونے کی آواز......اسے یاد تھا، آخری بار وہ اماں کے مرنے پر اتنی بری طرح سے روئی تھی۔ رشید سے طلاق کے بعد بھی پر وہ ویسا نہیں روئی تھی۔ یعنی اسے اماں کی موت سے بھی زیادہ اپنی محبت کی موت کا دکھ ہوا۔ واش روم سے باہر اس کا فون بار بار، وقفے وقفے سے مسلسل بج رہا تھا۔ لاہور سے بابا کی کال آ رہی تھی۔ لیکن اسے اس وقت ''مس بیلا ڈونا'' کے علاوہ اور کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔

☆......☆......☆

''یہ لیں......آپ اسے ہی تلاش کر رہی تھیں ناں؟'' ربیکا کے کمرے میں آ کر اس نے ایک پیکٹ ماں کی طرف بڑھایا تھا۔ حشیش سے بھرا ہوا وہ پیکٹ اوپر سے بے حد میلا کچیلا تھا۔ اس پیکٹ میں کیا تھا وہ باہر سے ہی دیکھ کر بتا سکتی تھی۔

مارے شرمندگی کے ربیکا اپنے بیڈ سے چپک کر رہ گئی تھی۔ میران نے خود ہی اس پیکٹ کو اس کے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا تھا اور پھر خود باہر جانے لگا تھا۔ اس کی چال میں شکستگی ہی شکستگی تھی۔ ربیکا نے چونک کر میران کو دیکھا تھا۔ تھوڑی سی دیر میں ایسا

کیا ہو گیا تھا؟ وہ کیوں ایک دم سے اتنا ٹوٹا ہوا، بکھرا ہوا نظر آنے لگا تھا۔

''تم گئے نہیں......؟'' ربیکا نے اس سے پوچھا تھا۔اصل بات کی طرف ربیکا کا دھیان اب گیا تھا۔

''نہیں۔'' وہ کہیں اور ہی دیکھ رہا تھا۔ربیکا نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔تو اس کے اندازے درست تھے۔وہ واقعی ٹوٹ چکا تھا۔

''کیوں......؟ کیا ہوا ہے؟'' ربیکا اٹھ کر اس کے پاس آئی۔میران کا چہرہ اس نے اپنے ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔

''پاپا کی یہ ٹائی مجھے راس نہیں آئی ممی......جیسے انہیں راس نہیں آئی تھی۔'' اس نے گولڈن ٹائی اتارتے ہوئے بھیگی آواز میں کہا اور وہاں ہی بیڈ پر بیٹھ گیا۔اس کے اس طرح بیٹھنے سے ربیکا کی جان نکل کر رہ گئی تھی۔

''کیا ہوا؟ اس نے انکار کر دیا کیا؟''

''کاش وہ انکار ہی کر دیتی۔''

''پھر کیا کہا ہے اس نے۔'' ربیکا پریشان ہو رہی تھی۔

''وہ ان لڑکیوں میں سے نکلی ممی جنہیں صرف ڈائمنڈ پسند ہوتے ہیں۔''

ربیکا کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''وہ ڈائمنڈ کی چمک کو تو پسند کر لیتی ہیں، اسے ہاتھ میں تو پہن لیتی ہیں لیکن یہ بھول جاتی ہیں کہ وہی ڈائمنڈ جسم پر سجنے کے بجائے جسم میں اتر جائے تو موت کا باعث بن جاتا ہے۔''

''میران......'' ربیکا کچھ نہیں سمجھ رہی تھی پھر بھی وہ اپنے بیٹے کو اپنے سینے سے لگانا چاہتی تھی۔

''میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔پلیز مجھے تنگ مت کیجئے گا۔''

''میں تمہیں کیسے نہ تنگ کروں۔تم مجھے جان کنی میں چھوڑ کر جا رہے ہو۔میرے لیے یہ لینے گئے تھے۔اپنے لیے دکھ کیوں لے آئے ہو۔''

''میں تو خوشیاں ہی لینے گیا تھا ممی......دکھ خود ہی مجھے تلاش کرتے ہوئے مجھ تک آ پہنچے ہیں۔''

''میں خود جا کر سبین سے بات کرتی ہوں۔''

''نہیں ممی......آپ سبین سے اب کوئی بات نہیں کریں گی۔''

''تو پھر میں کیا کروں؟''

''اس گھر کا نام بدل دیں۔''

''اس سے کیا ہوگا۔'' ربیکا کچھ نہ سمجھی۔

''اس گھر کا نام سن شائن ہے۔ لیکن یہاں پر کوئی بھی اجلا دن نہیں آیا۔ ہمیشہ سب الٹ ہی ہوا ہے۔ اب اس گھر کا نام ''ڈارک نائٹ'' رکھ دیں۔ شاید اس طرح سے اجلا دن آ جائے۔ کیونکہ ویسے بھی اس گھر میں اندھیری رات چھائی ہوئی ہے۔'' کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

''میران......'' ربیکا پیچھے سے پکارتی ہی رہی تھی لیکن میران نہیں رکا تھا۔ ربیکا جانتی تھی کہ آج کی رات وہ جاگتے ہوئے گزارے گا۔

جاگتے ہوئے تک اسے قبول تھا لیکن روتے ہوئے...... ایسا وہ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

☆......☆......☆

تھوڑا سا دھندلا سا چاند جیسے کہیں نقب لگانے کے بعد اب مجرم سا بنا کھڑا تھا۔ ازلوں کے بے رنگ آسمان نے جیسے بالآخر سیاہ رنگ کو قبول کر لیا تھا۔ رات کے پر جل رہے تھے، اور آنے والے دن کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔

میران کا فون بج رہا تھا اور کوئی تیسری چوتھی بار بج رہا تھا۔ ہوٹل سے فون تھا۔ جہاں اس نے اپنے اور سبین کے لیے ٹیبل بک کروا رکھی تھی اور کس اہتمام سے اسے پروپوز کرنے کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لڑکیوں کو ایسی چیزیں کس قدر مسحور کرتی ہیں۔ وہ سبین کو سب سے زیادہ مسحور کرنا چاہتا تھا۔ اس کی سوچ سے بھی زیادہ......

''سر آپ کی ٹیبل کی بکنگ سات بجے کی تھی۔ اب نو بج رہے ہیں۔ اٹس ٹو لیٹ......؟''

''سب ختم کر دو۔'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکا تھا۔

''کیا......؟'' آگے سے حیرت سے پوچھا گیا تھا۔ میران نے کال کاٹ کر موبائل آف کر دیا تھا۔

اس نے کپڑے تبدیل نہیں کیے تھے اور نہ ہی شوز...... وہ جوتوں سمیت ہی بیڈ پر لیٹ گیا تھا۔ ہر چیز بھول کر سونے کے لیے...... لیکن یہ سب اتنا آسان ہوتا تو غم ہی کیا تھا۔ سولی پر نیند آ سکتی ہے لیکن دکھ میں نیند آ جاتی تو برائی ہی کیا تھی۔ اپنے گھر کا آرام دہ بستر آج میران کو کانٹوں کی طرح چبھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سبین کو بھولنے میں کافی وقت لگ جائے گا۔ کافی زیادہ...... اسے ایک دن بھی ضائع نہیں کرنا تھا۔ اس لیے اس نے بھولنے کا آغاز آج رات سے ہی کر دیا تھا۔

دور ہوٹل کے شاور کے نیچے بیٹھی سبین بھی جاگ رہی تھی۔ شدید سردی میں وہ آج پتھر کی ہو چکی تھی۔ بابا کہتے تھے کہ چونا اچھی طرح پکانا ہو تو اسے میٹھی دھوپ میں سکھاتے ہیں۔ وہ اس کا الٹ کر رہی تھی۔ ٹھنڈے پانی میں، سخت سردی میں وہ اپنا وہ بت بنانا چاہتی تھی جو بے ڈھب ہو اور جس کی بری شبیہہ کی مثال پوری دنیا میں کہیں موجود نہ ہو۔

دونوں سے میلوں دور بابا پریشانی کے عالم میں بار بار سبین کو کال کر رہے تھے۔ بات تو کوئی خاص نہیں تھی۔ پر پتا نہیں کیوں ان کا دل گھبرا رہا تھا۔ وہ آج ہر صورت سبین سے بات کرنا چاہتے تھے۔

محبت جو روح کا جذبہ ہے۔ مسکراہٹ والے فرشتے کا...... آج وہی مسکراہٹ والا فرشتہ ان سب پر طنز سے ہنس رہا تھا۔

سبین اس طنز سے چھلنی چھلنی ہو رہی تھی۔ میران پاگل ہو رہا تھا۔ بابا کو ہول اٹھ رہے تھے۔ ربیکا کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔

رات کے پر جو جل رہے تھے ایک دم سے بھڑک اٹھے تھے۔ تیز آگ کی لپٹیں سب کچھ اپنی لپیٹ میں لے رہی تھیں۔

☆......☆......☆

دھوپ سے اجلا دن ڈرڈر کر دھرتی پر آشکار ہو رہا تھا۔ اس کی چال میں سہمی ہوئی تھی۔ جیسے آنے والے وقت کی تباہی کو وہ پہلے سے ہی جانتا ہو۔ صبح کے تمام راگ بھی دم سادھے بیٹھے تھے۔ سبین کے وجود کی طرح...... جو اپنے بیڈ پر ایسے ڈھیر ہوئی پڑی تھی جیسے اس کی روح اس سے ناراض ہو کر کہیں چلی گئی ہو......

پھر حسب معمول اس خاموشی میں حائل کے ماؤتھ آرگن کی آواز گونجنے لگی۔ آج سبین کو اس کے ماؤتھ آرگن کی آواز ایسی محسوس ہو رہی تھی جیسے جنگل کے تمام جانور آپس میں جنگ کرتے ہوئے چیخ و پکار کر رہے ہوں۔ اس کا دماغ چٹخنے لگا تھا۔ آج وہ حائک پر پھول پھینکنے کے لیے بھی نہیں اٹھی تھی۔

اس کا فون بج رہا تھا اور کل رات سے وقفے وقفے سے مسلسل بج رہا تھا۔ اسے پتا تھا کہ اتنے تسلسل سے اسے کال کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔

''سبین کہاں ہو تم...... میں کل رات سے تمہیں فون کر رہا ہوں۔'' بابا نے چھوٹتے ہی کہا تھا۔ ان کے لہجے میں اس کے لیے فکر تھی۔ وہ کل رات سے اسے فون کر رہے تھے۔ پریشان تو تھے ہی۔ اب وسوسوں کا شکار بھی ہو چکے تھے۔ ان کی بیٹی ان سے اتنی دور تھی۔ دوسرے شہر۔ وہ دوسرے ملک میں ہے۔ یہ حقیقت تو شاید ان کی روح ہی فنا کر دیتی۔

''میں سو رہی تھی۔'' اس نے آواز کو حد درجہ نارمل رکھتے ہوئے کہا تھا۔ پھر بھی بابا جیسے بہت کچھ محسوس کر گئے تھے۔

''کیا بات ہے۔ تم رو رہی ہو؟''

وہ صرف رو تو نہیں رہی تھی۔ وہ تو ماتم کر رہی تھی۔

''نہیں۔'' ایک بار پھر سے رونے کے لیے وہ تیار ہو گئی۔

''سبین! کیا بات ہے۔ مجھے بتاؤ۔''

''اماں یاد آ رہی ہیں۔'' اس نے کہا تھا۔ بابا نے ایک تسلی آمیز سانس لی۔ بیٹی دوسرے شہر میں موجود ہو تو ایک باپ کو کیسے

نیند آتی ہے یہ کوئی باپ بننے کے بعد ہی جان سکتا ہے۔ سبین نہیں جان سکتی تھی کیونکہ وہ ابھی اس تجربے سے نہیں گزری تھی۔

''اور یہ تم کون سا نمبر دے کر گئی ہو...... پی سی او، والا تو کہہ رہا ہے کہ یہ کسی اور ملک کا نمبر ہے۔ یہ پاکستان کا نمبر ہی نہیں ہے۔ اسی لیے پچھلی بار تم سے بات کرنے کے بہت زیادہ پیسے بھی بن گئے تھے۔''

''انٹرنیشنل کمپنی ہے بابا! ان کے نمبر ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میں اسے آ کر پیسے دے دوں گی۔'' اس نے رکھائی سے کہا تھا۔ اسے فرق نہیں پڑتا تھا کہ بابا اس کے اس جھوٹ سے کیا مطلب اخذ کرتے ہیں۔

''سبین!''

''جی بابا!''

''تم ٹھیک نہیں ہو۔ مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے۔ تمہارا یہ رونا ماں کی جدائی کا رونا نہیں ہے۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے بابا کہ میں ٹھیک ہوں یا نہیں۔ یہ ماں کی جدائی والا رونا ہے یا کسی اور چیز کا۔''

''میری تسلی کرو میری جان۔ نہیں تو میری جان نکل جائے گی۔''

''کس بات کی تسلی چاہتے ہیں آپ بابا! آپ نے ہمیشہ زندگی میں مجھے آگے بڑھنے کا کہا ہے۔ جب اماں کی بیماری کا پتا چلا تب بھی، جب وہ مر گئیں تب بھی۔ جب رشید نے مجھے طلاق دے دی تب بھی۔ جب ہم بھوک سے فاقے کرتے رہے تب بھی اور میں ڈھیٹوں کی طرح آپ کی بات مانتی رہی۔ آپ کی جان تب نہیں نکلی تو اب کیا نکلے گی۔ آپ کو فرق ہی کیا پڑتا ہے۔'' وہ ہمیشہ کی طرح اپنا غصہ بابا پر نکالنے لگی تھی۔

''تو کیا میں نے کچھ برا کیا تمہارے ساتھ...... میں خود بھی تو نامساعد حالات میں آگے بڑھتا رہا ہوں۔''

''آپ نامساعد حالات میں آگے بڑھتے رہے لیکن آپ نے ان کو بدلنے کی کوشش نہیں کی۔''

''سبین۔'' بابا لاچاری سے بولے تھے۔

''میں آپ ک کیسے سمجھاؤں کہ بعض اوقات زندگی میں کچھ حادثات ایسے ہوت ہیں تو وہاں زندگی آگے نہیں بڑھ سکتی، بلکہ ختم ہی ہو جاتی ہے۔ تب ہم زندگی کو رینگ کر بھی آگے نہیں بڑھا سکتے۔''

''ہاں...... میں تمہارا مجرم ہوں۔ ساری غلطی میری ہی ہے۔ لیکن تم خود کو ہلکان مت کرو۔ تم واپس آ جاؤ سبین۔'' بابا کو کچھ سمجھ نہیں آیا تو انہوں نے سیدھے طریقے سے اسے کہا تھا۔ ''ہم جیسے تیسے کر کے کارخانہ لگا لیں گے۔ میں الرجی کے باوجود بھی ماڈلز پر رنگوں کا کام کر لوں گا۔''

''میری زندگی کو سیاہ کر کے اب آپ رنگوں کا کام کریں گے؟'' اس نے بھرپور طنز کیا تھا۔ دوسری طرف بابا کا سانس

اکھڑ کر رہ گیا تھا۔

''تم نے ابھی تک اپنے بابا کو کو معاف نہیں کیا؟''

''ساری زندگی میں آپ کی منت کرتی رہی کہ چچا کریم سے پیسے لے کر کارخانہ لگا لیتے ہیں۔افشاں اور نگوں کا کام کر لیتے ہیں۔لیکن آپ ٹالتے رہے، دراصل آپ پرانی عادتوں کے مارے ہوئے تھے۔آپ کو چونے کے ساتھ ساتھ ان سانچوں سے بھی محبت کا تاپ چڑھا ہوا تھا۔آپ کارخانہ لگانا ہی نہیں چاہتے تھے۔آپ ڈائی چلانا ہی نہیں چاہتے تھے۔آپ چونے کا کام اپنے ہاتھوں سے کرنا چاہتے تھے۔محبت سے...... ہمارے دلوں میں نفرت بھر کر آپ چونے سے عشق لڑاتے رہے۔ مجھے بہانے بہانے سے ٹالتے رہے۔'' بابا مجرموں کی طرح چپ کر گئے۔سبین جو کہہ رہی تھی ٹھیک کہہ رہی تھی۔

''تم واپس آ جاؤ۔میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب ہم کارخانہ لگا لیں گے۔کریم سے ادھار لے کر میں ڈائی لگوا لوں گا۔گولڈن پتی لے آؤں گا۔میں نگوں کا کام بھی کر لوں گا، افشاں کا کام بھی......اس عمر میں اب افشاں میری سانسوں کو کیا نقصان پہنچائے گی۔جب سانسیں ہی کم رہ گئی ہیں۔''

''سانسوں کا حساب کتاب صرف عمر سے تو نسبت نہیں رکھتا۔کیا پتا میری سانسیں آپ سے بھی کم رہ گئی ہوں۔''

''سبین!'' بابا تڑپ کر رہ گئے تھے۔''ایسے نہ کہو......تم کیوں آج میری جان لینے پر تلی ہوئی ہو۔میں تو تمہیں سینے سے لگا کر خود کو ٹھنڈک بھی نہیں پہنچا سکتا۔اتنی دور ہو تم......تم......تم واپس آ جاؤ جان......''

''میرے واپس آ جانے سے کیا ہو گا۔کیا سب ٹھیک ہو جائے گا؟ شاید ہم کارخانہ لگا لیں گے۔زویا کا علاج بھی ہو جائے۔ہم گھر کو پھر سے خرید لیں گے......لیکن کیا وہ بھی میری زندگی میں پھر سے واپس آ جائے گا۔'' اس نے روانی میں ہی کہہ دیا تھا۔پھر جب اگلے ہی پل وہ اپنی واردات سے آگاہ ہوئی تو تکیے میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

بابا خاموش ہو گئے تھے اور اب اس کا رونا سن رہے تھے۔

''کون ہے وہ......؟'' بڑی دیر کے بعد انہوں نے پوچھا تھا۔

''رشید سے بہتر ہے۔'' اس نے ان پر طنز کیا تھا کہ وہ جو بھی ہے ان کے تلاش کردہ سے بہتر ہے اب تھا۔

''جو وہ بہتر ہے تو پھر اب پریشان کیوں ہو؟'' انہوں نے بھی اسے لاجواب کیا تھا۔

''آپ پوچھتے کیوں ہیں۔آپ سمجھ کیوں نہیں جاتے کہ میں کیوں پریشان ہوں؟ کیسے باپ ہیں آپ، آپ کو یہ بھی نہیں پتا کہ آپ کی اولاد کیوں پریشان ہے۔آپ اولاد کے دل تک بھی نہیں پہنچ سکتے......آپ چونے تک کو جان گئے ہیں۔ایک بے ضرر پتھر کو......لیکن اپنی اولاد کے جیتے جاگتے دل کو نہیں پرکھ سکتے......رشید نے مجھے سب کے سامنے طلاق دی تھی اور کہیں کا

نہیں رہنے دیا تھا اور اب میران نے......اس نے تنہائی میں میری محبت کو دھتکارا ہے اور مجھے زندہ دفن کر دیا ہے۔"

"کیوں......؟ ایسا کیا ہو گیا تم سے؟ تم نے کہا کہ میں اب تمہارے لیے رشتے نہ دیکھوں۔ تم میرے فیصلے پر آنکھیں بند کر کے ہاں نہیں کر سکتیں......تمہاری اپنی آنکھیں تو کھلی تھیں۔ پھر ایسا کیوں ہوا......؟ بابا کی بات میں طنز نہیں تھا۔ پھر بھی اسے بابا کی یہ بات اندر تک سلگا گئی تھی۔

"شاید اب تم نے جان لیا ہو کہ کوئی باپ کبھی بھی اپنی اولاد کا برا نہیں چاہتا۔ یہ تو بس حالات ہوتے ہیں جو......"

"حالات کو کبھی آپ قابو میں نہیں کر سکے۔ برے حالات میں مجھے دھکیل کر آپ کہہ رہے ہیں کہ میری آنکھیں تو کھلی تھیں۔ ہاں میری آنکھیں کھلی تھیں اور ان میں سوائے اپنی زندگی کے رونے کے علاوہ کچھ نہ تھا اور نہ ہی اب ہے۔ ان میں گھر کی پریشانیاں تھیں، چھوٹی بہن کی خراب دماغی حالت تھی، وہ بھوک تھی، حسرتیں تھیں، خواہشیں تھیں۔ میں کیسے دیکھتی کہ میں سیدھے راستے پر ہوں یا غلط راستے پر۔" وہ پوری بات نہ بتا سکی اور زاروقطار رونے لگی تھی۔

"کیا کہا ہے اس نے تم سے...... مجھے بتاؤ۔"

"میں نہیں بتا سکتی......میں طلاق کے وقت بھی نہیں بتا سکتی تھی، چھوٹی کو دیکھتی ہوں تب بھی کچھ نہیں بتا سکتی اور اب آپ کو بھی نہیں بتا سکتی۔" اس نے فون بند کر دیا تھا اور تکیے میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ بابا پر غصہ تو اس نے نکال دیا تھا لیکن اب اپنی خود ترسی کس پر نکالتی جو اسے توڑ کر رکھ رہی تھی۔

☆......☆......☆

بہار کا پیلا، سرسبز اور گہرا دن پورے فارم ہاؤس پر چھایا ہوا تھا۔ حد نگاہ پھیلے ہوئے صنوبر کے درخت قد آدم کھڑکی سے اندر جھانک رہے تھے۔ ان کا سبزہ اتنا جاذب نظر، اور اس قدر روشن تھا کہ پورا جنگل کمرے میں اترا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ فضا میں پرندے بھید بھری سرگوشیاں کر رہے تھے۔ جنہوں نے ماحول کو پرترنم رنگ فراہم کیا تھا۔

پیٹرسن نے اپنی شرٹ کے بٹن کھولتے ہوئے اسے اپنے جسم سے الگ کیا تھا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے سر کے پیچھے جوڑ لیا تھا۔ اس کا خوب صورت بدن کھل کر آشکار ہوا تھا۔ چوڑی چھاتی پر سنہری بال چمک رہے تھے۔ شانے کی گولائیاں گردن کو چھو رہی تھیں۔ بازو کی مچھلیاں کھنچاؤ سے کسی چٹان کی طرح سخت ہو گئی تھیں۔ جسے دیکھتے ہوئے دائنا کا تنفس لمحے بھر کو تعطل کی لپیٹ میں آیا تھا۔ مرتبان میں جونکیں نکالتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ کانپ گئے تھے۔ اتنا خوب صورت مرد اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ بڑی مقدس نظروں سے پیٹرسن کو دیکھ رہی تھی۔

اپنی پوری زندگی میں دائنا یہ کام کرنے کبھی کسی کے گھر نہیں گئی تھی۔ جونکیں لگانے کا کام اس نے جب کیا تھا سمبل کے

درختوں کی چھاؤں تلے بیٹھ کر ہی کیا تھا۔لیکن آج صبح جب کچھ لوگوں نے اسے کہا کہ اسے ''ایڈم راہل'' کے پاس جانا ہے تو وہ خوشی خوشی راضی ہوگئی تھی۔ایڈم راہل جیسی بلند پایہ شخصیت کو وہ بھلا کیسے انکار کرسکتی تھی۔اوراب چورنظروں سے ایڈم کو دیکھتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ ایڈم کو دیکھنے کے لیے بھی اس کا وضو کے ساتھ ہونا بھی ضروری ہے۔کیسا پاک دل والا تھا یہ جوان......اس کی روح بھی یقیناً ایسی ہی پاکیزہ ہوگی۔

دائنا کی یہ غلط فہمی جلد ہی ختم ہونے والی تھی۔

پیٹرسن دائنا کی ایک ایک جنبش کو پرکھ رہا تھا۔وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔بچپن سے جوانی تک کے سفر نے اس کی آنکھوں میں کوئی ردوبدل نہیں کیا تھا۔وہ ابھی بھی ویسی ہی تھیں جیسی پیٹرسن اپنے بچپن میں دیکھا کرتا تھا۔کس قدر بڑی، روشن اور چمک دار......جیسے اس کی آنکھیں سورج کی کرنوں کی ہم جولی ہوں۔کیا دائنا کو احساس تھا کہ اس کی آنکھیں دیکھ کر کوئی بھی مرد اس پر فدا ہوسکتا ہے۔ان آنکھوں کے جہاں میں جھانک کر وہ اپنی دنیا بھول سکتا ہے۔اگر اسے اندازہ ہوتا تو وہ یقیناً اپنی آنکھوں کا نقاب کیے رکھتی یا شاید اسے اندازہ تھا اور غرور بھی۔تب ہی تو وہ اپنی پلکوں کو ایک ادا سے کھولتی اور بند کرتی تھی......یا یہ ادا بھی اس کی لاعلمی کی مرہون منت تھی۔

دائنا نے شیشے کے مرتبان میں سے ایک جونک نکال کر پیٹرسن کے سنہری بالوں سے بھرے سینے پر رکھی تھی۔ایک آہ سی پیٹرسن کے وجود سے نکلی......جسے دباتے ہوئے وہ مسکرا اٹھا تھا۔دائنا کے ہاتھ کا لمس جادو انگیز تھا۔ایما کے بعد یہ واحد لڑکی تھی جس کا لمس جادو انگیز تھا۔ایما کے بعد یہ واحد لڑکی تھی جس کا لمس اس نے اپنے جسم پر محسوس کیا تھا۔

باہر صنوبر کے درختوں پر برفانی ہوائیں چھانے لگی تھیں۔لہراتے پتے منجمد ہورہے تھے۔شاخوں کے دانت بجنے لگے تھے۔راگ گاتے پرندوں کے گلے بیٹھنے پر آگئے تھے۔اجلے دن پر نجانے کس جادوگر کا بس چل گیا تھا کہ سب پر سایہ پھیلنے لگا تھا۔دور کہیں کوئی دیوانہ ماؤتھ آرگن بجا رہا تھا۔ہمیشہ کی طرح آج بھی اس کا راگ کامل منحوسیت کی انتہا پر پہنچا ہوا تھا۔حسب معمول پیٹرسن کو اس راگ سے ایک بار پھر ایما یاد آگئی۔

اس کے سینے پر جونکیں رکھی جارہی تھیں اور ایک ایک جونک پر اس کی سسکاری اس کے وجود میں دفن ہورہی تھی۔جونکوں کے دانت کچھ ایسے بھی نوکیلے نہیں ہوتے کہ وجود کو چیخ بنادیں،لیکن اپنی یادوں میں وہ ایک ایسے سفر پر تھا جس میں اسے لگ رہا تھا کہ اس کے جسم پر بہت سے سانپ چپکے ہوں اور اسے ڈس رہے ہوں۔تڑپ کر اس نے کروٹ بدلنی چاہی تھی لیکن بدل نہیں سکا تھا۔تب اس نے خود کو بے حد بے بس پایا تھا۔جیسا ایک بار بچپن میں محسوس کیا تھا۔

☆......☆......☆

''ایما کہاں ہے؟'' ولیم نے گھر میں آتے ہی ننھے پیٹرسن سے پوچھا تھا جو ٹیبل پر بیٹھا اپنے لیگو باکس سے حسب معمول غیر واضح شبیہہ ابھار رہا تھا۔

''گھر پر نہیں ہیں۔''

''کب سے گئی ہے؟''

''میں اسکول میں تھا جب وہ چلی گئی تھیں۔ گھر آیا تو وہ گھر پر نہیں تھیں۔''

''لیکن وہ گھر سے باہر کیسے جاسکتی ہے۔ کیا اس نے گھر کے تالے کی دوسری چابی بنوا رکھی ہے؟''

''مجھے نہیں پتا......''

ابھی وہ دونوں باپ بیٹا یہ گفتگو ہی کر رہے تھے کہ ایما اندر داخل ہوئی تھی۔ اونچی پنسل ہیل پر تنگ جینز......اور اس کے اوپر شوخ پیلے رنگ کا کھلا ڈلا سوئیٹر......جس پر ایما نے سنہری اور باریک بیلٹ باندھ رکھی تھی۔ لہریہ دار لہراتے بات اور سرخ رنگ کی لپ اسٹک......اس سب میں وہ بے حد پیاری لگ رہی تھی۔ نجانے ولیم ہی اب کیوں اسے محبت کی نظر سے نہیں دیکھتا تھا۔

''کہاں گئی تھیں تم......؟'' ولیم نے پہلا سوال داغا تھا۔

''صبح بتایا تو تھا کہ ازابیلا کے گھر چھوٹی سی گیٹ ٹوگیدر ہے۔ تم نے خود تو اجازت دی تھی مجھے وہاں جانے کی۔'' ایما بے نیازی سے کندھے اچکا کر بولی تھی۔

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مجھے تو یہ بھی نہیں یاد کہ تم نے ازابیا کے گھر جانے کا ذکر کیا تھا۔''

''تم شیو کر رہے تھے۔ لگتا ہے بے دھیانی میں ٹھیک سے تم نے میری بات سنی نہیں۔''

''تمہارے پاس گھر کی چابی کہاں سے آئی؟''

''کیا ہو گیا ہے ولیم......تم نے خود تو دراز میں سے دوسری چابی نکال کر مجھے دی تھی۔'' ایما نے بڑے طریقے سے جھوٹ بولا تھا۔ دراز میں سے چابی نکالنے کی چوری کو ولیم کے سر ہی ڈال دیا تھا۔ ولیم سوچ میں پڑ گیا تھا۔

''ازابیلا نے کھانا بھی دیا ہے۔ میں ابھی گرم کر کے لاتی ہوں۔''

ایما اپنے طور پر ولیم کو مطمئن کر کے اندر چلی گئی تھی۔ ولیم یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایما نے صبح اس سے ایسا کوئی ذکر کیا بھی تھا کہ نہیں......پیٹرسن اپنے لیگو باکس سے کھیلتا ہوا ولیم کو دیکھ رہا تھا۔ اندر واش روم میں ایما اب نہاتے ہوئے گنگنا رہی تھی۔

''پاپا!'' پیٹرسن، ولیم کے پاس گیا تھا۔ ولیم نے سوالیہ اس کی طرف دیکھا۔

''ممی آپ سے جھوٹ بول رہی ہیں۔''

ولیم نے چونک کر ننھے پیٹرسن کی طرف دیکھا تھا۔

''وہ روز آپ سے جھوٹ بولتی ہیں۔ وہ روز گھر سے باہر جاتی ہیں۔ آپ جب جب آفس سے یہ دیکھنے کے لیے فون کرتے ہیں کہ وہ گھر پر ہیں کہ نہیں تو انہوں نے مجھے ہدایت دی ہوئی ہے کہ میں فون اٹھا کر ریکارڈ شدہ کیسٹ کے پاس رکھ دوں۔ جہاں ممی کی آواز ریکارڈ ہے۔ وہ آپ کی دراز سے گھر کی دوسری چابی چرا کر باہر جاتی ہیں۔ اکثر ان کے دوست اس گھر میں بھی آ جاتے ہیں۔ ممی ان کے آنے پر میک اپ کرتی ہیں، نیا لباس پہنتی ہیں۔ پھر وہ جانے سے پہلے ممی کو پیسے دے کر جاتے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک عجیب سا پاگل لڑکا آیا تھا۔ اس نے مجھے بھی چھونے کی کوشش کی...... مجھ سے زبردستی کرنے کی کوشش کی...... ممی نے مجھے سختی سے منع کیا تھا کہ میں یہ سب آپ کو......''

پیٹرسن چپ ہو گیا تھا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ ولیم کی آنکھوں کے انگارے آگ چھوڑنے لگے تھے اور دوسرا اس وجہ سے کہ دروازے پر ایما کھڑی سب سن رہی تھی اور اب پیٹرسن کو غضب ناک نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

اس دن کی رات وقت سے پہلے ہی شروع ہو گئی تھی، اور یہ رات اتنی لمبی تھی کہ صدیوں کو نگل سکتی تھی۔

ایک ایک ضرب پیٹرسن کے کورے بدن پر ایسے پڑ رہی تھی جیسے وہاں سانپ اپنے پھن مار رہے ہوں۔ ایما اسے اپنے بیلٹ سے ایسے مار رہی تھی جیسے تھوڑی دیر پہلے اسے ولیم نے مارا تھا، اور اتنا مارا تھا کہ ایما کے جسم سے جگہ جگہ سے خون نکل آیا تھا۔ پیٹرسن ایما کی دسترس سے دور ہونا چاہتا تھا، آپ اپنا بچانا چاہتا تھا لیکن چھوٹے سے گھر میں وہ جہاں جہاں بھی جا رہا تھا ایما جھٹ سے اسے دبوچ لیتی تھی۔ پیٹرسن کے جسم سے جا بجا خون نکلنا شروع ہو چکا تھا، لیکن ایما نے یہ سب نظر انداز کیا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس کے اپنے ہی خود ساختہ دکھ تھے۔

کتنی مشکل سے اس نے اس سارے کام کو رازداری دی تھی۔ ولیم کی نظر میں پاک دامن رہ کر وہ چپکے چپکے یہ کام کر رہی تھی۔ تھوڑے بہت پیسوں سے اپنی ننھی ننھی خواہشات پوری کر رہی تھی اور پیسے ملتے ہی کتنے تھے۔ اس ''کام'' میں بھی ایسے کون سے پیسے تھے کہ وہ اپنے لیے محل تعمیر کروا لیتی...... ایک اچھی برانڈ کی نیل پالش اور لپ اسٹک کی خواہش کس لڑکی کو نہیں ہوتی...... اکثر وہ اپنے گاہکوں سے ہی کہہ دیا کرتی تھی کہ وہ اس کے لیے آتے وقت فلاں برانڈ کی نیل پالش لے آئیں، ہیئر اسپرے، لپ گلوز، مسکارا یا آئی شیڈز...... اسے پیسے دینے کے بجائے باہر سے کھانا کھلا دیں۔ پین کیک، پیزا یا ایسا ہی کچھ...... خوش قسمتی سے کوئی زیادہ ہی دیالو قسم کا گاہک نصیب ہو جاتا تو وہ اسے اپنے لیے ڈریس لانے کا کہہ دیا کرتی تھی۔ کتنی چھوٹی چھوٹی خواہشات تھیں اس کی...... اور اس پیٹرسن نے سارا کام خراب کر دیا تھا۔ ولیم نے اسے جس بے دردی سے مارا تھا۔ اب اگر وہ خود اسے اس کام کی اجازت دیتا بھی تو عین ممکن تھا کہ وہ اگلے چھ ماہ تک یہ کام کر ہی نہ سکتی......

اب وہ پیٹرسن کو مار کر اپنا بدلہ لے رہی تھی۔ پیٹرسن، ایما کی چھوٹی سی چمڑے کی بیلٹ سے پٹتا جا رہا تھا۔ وہ بیلٹ لیڈیز کی ہونے کی وجہ سے باریک تھی اور پیٹرسن کے وجود پر کوڑے کی طرح لگتی تھی۔ پیٹرسن کو ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے جسم پر بہت سے سانپ چپکے ہوں اور اپنا زہر اس کے وجود میں منتقل کر رہے ہوں۔ پیٹرسن زہریلا ہو رہا تھا۔ وہ جتنا ایما کے واروں سے بچنا چاہتا تھا ایما اتنی ہی شدت سے اسے پیٹنا جاری رکھے ہوئے تھی۔

پیٹرسن کی شدت سے خواہش تھ کہ وہ ایما کا ہاتھ تھام لے یا اس کی گردن......لیکن اس کی دسترس میں دونوں ہی نہیں آ رہے تھے۔ مار اسے ادھ موا کر رہی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ ایک وقت میں اس نے بچنے کی کوشش ترک کر دی۔ ایما کے لیے اب اسے مارنے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ پیٹرسن اپنا دفاع نہیں کر رہا تھا۔ اس لیے وہ پوری شدت سے اس پر اپنا غصہ اتارتی جا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ وہ اسے گالیاں بھی دیتی جا رہی تھی۔

بے ہوش ہونے سے پہلے اپنی باقی ماندہ طاقت کو جمع کرتے ہوئے پیٹرسن نے ایک دم سے وہ تیز تیز چلتا ہوا ہاتھ تھام لیا تھا۔

☆......☆......☆

پیٹرسن نے ایک دم سے وہ تیز تیز چلتا ہوا ہاتھ تھام لیا تھا۔ دائنا چونک کر پرے ہوئی تھی۔ پیٹرسن نے جس طریقے سے اس کا ہاتھ تھاما تھا، اس پر کسی بھی لڑکی کا یہ ہی ردعمل ہو سکتا تھا۔ دائنا نے جیسے نیند سے جاگ کر جھرجھری سی لی تھی اور اب وہ حیرت سے ایڈم کو دیکھ رہی تھی۔ کیا یہ محض اتفاق تھا یا ایڈم نے واقعی ہی میں اسے چھونے کی کوشش کی تھی۔ ایڈم سے یہ توقع کرنا سراسر گناہ تھا۔ دائنا نے بڑے نامحسوس طریقے سے اپنا ہاتھ الگ کروایا تھا اور پھر سے خود کو کام میں منہمک کرنے کی کوشش کی تھی۔ جس میں وہ ناکام رہی تھی۔

ایما کی یاد کی ساری تلخی کو پیٹرسن نے ایک مسکراہٹ کے راستے ختم کیا تھا۔ اب وہ محبت سے دائنا کو دیکھ رہا تھا۔

دائنا اچھل کر بیڈ سے اتری تھی۔ شیشے کا مرتبان لکڑی کے فرش پر جا گرا تھا۔ کانچ ٹوٹ کر دائیں بائیں بکھر گئے تھے۔ پانی نے سارے فرش کو بھگو دیا تھا اور دور کھڑی دائنا، ایڈم کو ایسے دیکھ رہی تھی جیسے کسی بھول کو دیکھ رہی ہو۔

اپنی جگہ پر حیرت زدہ تو پیٹرسن بھی تھا۔ جیفرسن نے تو کہا تھا کہ دائنا ''پیشہ ور'' ہے۔ پھر اب وہ ایسے کیوں پیش آ رہی تھی جیسے وہ اس کے ساتھ کچھ غلط کر رہا ہو۔ جیسے اس کے ساتھ یہ سب پہلی بار ہو رہا ہو۔

''کیا ہوا......؟'' اس نے دائنا سے پوچھا تھا اور دائنا انکار میں ایسے سر ہلانے لگی تھی جیسے مایوسی سے اس کی جان نکلی جا رہی ہو۔

''کیا ہوا دائنا......؟ لگتا ہے تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ یاد کرو مجھے۔ میں تمہارا دوست ہوں۔ بچپن میں ڈیڈ کے ساتھ آیا کرتا

تھا۔ یاد کرو...... میں تمہیں سمبل کے پھول اکٹھے کر کر کے دیا کرتا تھا۔ تمہاری آنکھیں...... یہ مجھے کبھی نہیں بھولیں...... دائنا...... یہ مجھے کبھی نہیں بھولیں......'' وہ ایک بار پھر سے دائنا کے پاس ہوا تھا۔ اس نے دائنا کی آنکھوں کو دیکھا۔

''میرے قریب مت ہو سر ایڈم! میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔''

''اور میں تم سے محبت چاہتا ہوں۔''

دائنا نے پیٹرسن کی طرف ایسا دیکھا جیسے وہ دل ہی دل میں اس کے منہ پر تھوک رہی ہو۔

''میرے پاس آؤ دائنا...... تمہیں پوری قیمت دی جائے گی۔ تم گھبرا کیوں رہی ہو...... بلکہ اصل سے بھی زیادہ...... میں نے آج تک کسی کا حق نہیں رکھا۔''

''میں تھوکتی ہوں آپ کے پیسوں پر......''

پیٹرسن نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ یہ دائنا کیا کہہ رہی تھی۔ اور کیوں......؟ جیفرسن نے تو کہا تھا کہ وہ ایڈم کا نام سنتے ہی پر جوش ہو گئی تھی۔ پھر اب...... کیا برا لگ رہا تھا اسے اس سب میں۔

''کیوں؟ ایسا کیا کیا ہے میں نے؟'' پیٹرسن نے محبت سے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا تھا۔

''میں کہتی ہوں مجھے ہاتھ مت لگایئے...... دور ہو جایئے مجھ سے......'' دائنا چلائی تھی۔

''لیکن وجہ تو بتاؤ'' وہ اسے خود سے دور جانے ہی نہیں دے رہا تھا۔ اسے عورتوں سے دلچسپی ہی کب رہی تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے خود کو اس کام کے لیے راضی کیا تھا۔ جیفرسن نے کہا تھا کہ اسے عورت کا تجربہ ضرور کرنا چاہیے۔ اس طرح وہ ایما سے نفرت کی شدت کو کسی اور لڑکی کی طلب کے جذبے میں بدل سکتا ہے۔ پیٹرسن نے اب کی بار جیفرسن کی بات مان لی تھی۔ اور اب یہ دائنا بھی کہ......

''آپ کیا ہیں ایڈم......؟ کیا ہیں آپ......'' دائنا بے یقینی اور دکھ سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''تمہارے بچپن کا دوست...... دیکھو...... پہچانو مجھے......'' دائنا کا ہاتھ پکڑ کر اس نے اپنے چہرے پر پھیرا تھا۔ جب دائنا نے ایڈم کو ایک دھکا دیا تھا، خود سے الگ کر کے وہ یک ٹک ایڈم کو دیکھنے لگی اور دکھ سے سر ہلانے لگی تھی۔ پھر جیسے ہونے والے واقعے کا یقین آتے ہی وہ تیزی سے دروازے کی طرف بھاگی تھی۔ لیکن دروازہ لاک تھا۔ وہ جلدی سے کھڑکی کی طرف گئی تھی۔ اگلے ہی پل اس نے کھڑکی کھول دی تھی۔ وہ کیا کرنے لگی تھی یہ بات سمجھنے میں اب کوئی ابہام نہیں رہ گیا تھا۔

کھڑکی کے کھلتے ہی دور گونجتے کسی ماؤتھ آرگن کی آواز بھی کمرے میں اتری تھی۔ پیٹرسن نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لینے چاہے تھے۔ وہ آگے بڑھ کر کھڑکی کو بند کرنا چاہتا تھا اور دائنا کو اس کام سے روکنا چاہتا تھا جو وہ کرنے والی تھی۔

''دائنا تم کیا کر رہی ہو......'' وہ جلدی سے دائنا کے پاس ہوا تھا۔اس نے دائنا کو پکڑنا چاہا، دائنا اس کے بازوؤں میں مچلی تھی۔

''چھوڑ دیں مجھے سر ایڈم......''

''تمہیں واپس جانا ہے تو تم دروازے کے راستے جا سکتی ہو......'' پیٹرسن نے باوقار انداز سے کہا لیکن دائنا کو جیسے اب ایڈم کی بات پر یقین نہیں رہا تھا۔عزت بچانے کے لیے وہ بدستور اپنی کوشش جاری رکھے ہوئے تھی۔

''جیفرسن......ڈیوڈ......آرک......'' پیٹرسن نے چلاتے ہوئے سب کو پکارا تھا۔دائنا اس سب کا مطلب بھی کچھ اور سمجھی تھی۔ایڈم سے الجھتے ہوئے خوف اس کے چہرے پر پھیلنے لگا تھا۔

دور گونجا کوئی ماؤتھ آرگن اب فارم ہاؤس کے اس کمرے کے عین نیچے آ گیا تھا جہاں وہ دونوں موجود تھے اور آپس میں دست درازی کر رہے تھے۔ماؤتھ آرگن بجانے والا وہ کوئی اور نہیں حائک ہی تھا۔دائنا کا بھائی......

''حائک......'' دائنا نے چلاتے ہوئے حائل کو پکارا تھا جبکہ وہ جانتی بھی تھی کہ اس کا بھائی گونگا اور بہرہ ہے۔

''کیا کر رہی ہو تم پاگل لڑکی......میں کہہ تو رہا ہوں کہ تم دروازے کے راستے واپس چلی جاؤ......پھر چلا کیوں رہی ہو تم......ڈیوڈ......جیفرسن......کہاں مر گئے ہو سب۔'' پیٹرسن نے مچلتی ہوئی دائنا کے منہ پر ایک زناٹے دار تھپڑ مارا تھا۔جس سے پیٹرسن کی وحشت جھلکتی تھی۔دائنا کی زور آوری میں مزید قوت آ گئی تھی۔دونوں ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا ہو رہے تھے۔

''حائک......'' دائنا نے کھڑکی کی شیلف پر پڑا ٹائم پیس نیچے دے مارا تھا جو حائل کے سر پر لگتے لگتے بچا تھا۔ماؤتھ آرگن کا ساز تھما۔حائک نے سر اٹھا کر اوپر کھڑکی کی طرف دیکھا تھا۔کھڑکی کے منظر نے اسے اپنی جگہ ساکت کر دیا تھا۔اوپر ایک لڑکی کسی آدمی سے الجھ رہی تھی۔آدمی کے سینے پر جونکیں لگی ہوئی تھیں اور جونکوں کا کام صرف اس کی بہن کرتی تھی۔

ساری بات سمجھنے میں حائک کو ایک لمحہ بھی نہیں لگا تھا۔

''حائک......'' دائنا نے پھر چلاتے ہوئے اس کا نام پکارا تھا۔

''مدد کرو......'' وہ چلا رہی تھی۔حائک سننا نہیں چاہتا تھا لیکن سمجھنا جانتا تھا۔وہ سمجھ سکتا تھا کہ دائنا اسے کیا کہہ رہی ہے۔اس کے باوجود وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا تھا۔وہ زندگی بھر اتنا درویش رہا تھا کہ سب دیکھتے ہوئے بھی اسے لگ رہا تھا کہ اسے کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔وہ اتنا ساکت الوجود تھا کہ اب اس میں ایک دم سے پھرتی آ ہی نہیں رہی تھی۔

''دائنا......آرام سے میری بات سنو۔'' پیٹرتن نے طریقے سے بات کرنا چاہی۔''مجھے لگتا ہے کہ ہم دونوں کو کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔مجھے بتایا گیا تھا کہ تم کال گرل ہو اور......'' پیٹرسن نے جیفرسن کی بتائی بات دائنا سے کہی تھی اور دائنا نے اس کی طرف

ایسے دیکھا تھا جیسے وہ اس کا منہ نوچ لے گی۔ ''کال گرل'' کے الفاظ کسی گالی کی طرح اس کے پورے وجود کو تپا گئے تھے۔ غصہ، نفرت، طیش، غضب......اس لفظ کے بدلے میں وہ ایڈم کو قتل کر دینا چاہتی تھی۔

نیچے حائک کھڑا سب دیکھ رہا تھا۔ ایک مرد کو جو ایک لڑکی کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا، اور ایک لڑکی کو جو اس مرد سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لڑکی تو اس کی بہن تھی اور مرد......ایک وحشی......اپنی بے بسی پر حائک کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ اس کی دو معذوریوں نے اس کے اندر ایک تیسری خامی کو بھی پروان چڑھا دیا تھا۔ کم ہمتی کو......اس میں کسی چھ سال کے بچے جتنی بھی بہادری نہیں تھی۔ اسے نہ زندگی کی پروا تھی اور نہ دنیا والوں کی......وہ دنیا سے اس قدر کنارہ کش رہا تھا کہ اسے سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسے موقعے پر جب کوئی درندہ آپ کی بہن کی حرمت پر حملہ کر رہا ہو، تو کیا کرتے ہیں۔

صنوبر کے درختوں نے ایک دم سے آگ پکڑ لی تھی۔ ان کی گیلی ٹہنیاں جلنے سے زیادہ دھواں دے رہی تھیں۔ پرندے اڑ کر دور جا چکے تھے کہ وہاں اب گدھ براجمان ہونے والے تھے۔ تب ہی یک لخت عجیب بات ہوئی۔

حائک کے قدموں تلے بچھی نرم گھاس پر دائنا کا وجود کسی بلی کی طرح آ گرا۔

پیٹرسن نے نیچے جھانک کر دیکھا تھا اور پھر اگلے ہی پل کھڑکی بند کر دی تھی لیکن کھڑکی بند کرنے سے پہلے تک اس کے جسم پر لگی ساری جونکیں خود بخود ہی جھڑ کر اپنی مالکن دائنا کے وجود پر آ گری تھیں۔

حائک رینگتا ہوا دائنا کے بے حس و حرکت وجود کے قریب ہوا۔ اس وجود میں ابھی سانسیں باقی تھیں۔ دونوں ہاتھوں میں دائنا کو اٹھا کر وہ گھر کی طرف چل دیا تھا۔

☆......☆......☆

پتہ نہیں کون سا موسم چل رہا تھا۔ شدید گرمیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ خزاں میں ابھی کافی وقت تھا، لیکن سبین کو لگا کہ جیسے خزاں وقت سے بہت پہلے ہی آ گئی ہو۔ درختوں کے پتے جھڑ چکے ہوں۔ پھول مرجھا گئے ہوں۔ تتلیاں مر گئی ہوں اور سانسیں......تھم گئی ہوں۔

شام کو وہ کلب گئی تھی۔ میران سے ملنے کے لیے......بہت ہمت کی تھی اس نے وہاں جانے کی......اتنی ہمت اور سوچ بچار اس نے اس سے پہلی ملاقات کے وقت بھی نہیں کی تھی جتنی آج کی تھی۔

''کیا میران اندر ہے؟'' اس نے گارڈ سے پوچھا تھا۔

''ہاں......'' گارڈ نے کہا تھا جبکہ وہ چاہتی تھی کہ گارڈ نہ کہہ دے۔ وہ تو بس اپنا فرض پورا کر رہی تھی۔ اسے تلاش کرنے کا، اندر اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسے کہیں بھی نہ ملے......اس کی تلاش میں دیوانی بن جانا تو اسے منظور تھا لیکن اس کے سامنے مجرم نہیں۔

وہ معمول کی طرح عزت پا کر اندر آ گئی تھی۔لیکن یہاں سے وہ بے عزت ہو کر باہر جائے گی، وہ جانتی تھی۔

میران بار کاؤنٹر کے پیچھے سر جھکائے کام کرنے میں مصروف تھا۔ بار کے اسٹول پر لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔لیکن آج وہ ان کے سامنے نہ تو مسکرا رہا تھا نہ شوخی سے کرتب کر رہا تھا۔اس کے ہاتھ کسی مشینی پرزے کی طرح بوتلوں کو دائیں بائیں گھما رہے تھے۔جام الٹے کر کے سیدھے کر رہے تھے۔اس کا ذہن ان کرتبوں کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔وہ وہاں موجود ہوتے ہوئے بھی لاپتا تھا۔اس میران میں سے اصل میران کو تلاش کرنا ناممکن تھا۔

سبین مردہ چال سے چلتے ہوئے اس کے سامنے آ گئی تھی۔میران نے اسے دیکھا اور کام کرتے اس کے ہاتھ ایک لمحے کو رکے تھے۔وہ بھی شاید جانتا تھا کہ وہ یہاں آئے گی۔اسے اتنا تعجب نہیں ہوا تھا لیکن اس نے رویہ وہی اپنایا تھا جو اس نے ایسے موقعے کے لیے کل ہی سوچ لیا تھا۔کل سے تھکی ہوئی، اور رات بھر کی جاگی ہوئی، سبین کے پاس اتنی ہمت باقی نہیں بچی تھی کہ وہ اس کے سامنے پڑے کسی اسٹول پر بیٹھ ہی جائے۔

محبت کے عروج کو زوال آتے آتے ہی آنا ہے۔میران کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس میں ابھی اتنی ہمت باقی ہے کہ وہ آنے والے ایک دو مہینے اس لڑکی کو برداشت کر لے اور بالآخر جب یہ لڑکی سمجھ جائے تو خود ہی اس کے پاس نہ آئے۔ وہ سوچے سمجھے عمل کے مطابق اندر چلا گیا تھا۔سبین اسٹول پر بیٹھ گئی اور اس کا انتظار کرنے لگی۔اس کا انتظار لمحہ بہ لمحہ طول پکڑنے لگا تھا۔جب اس نے ایک ویٹر سے اس کے بارے میں پوچھا۔

”میران کلب سے جا چکا ہے۔“

ویٹر نے جیسے ہاتھ میں پکڑا گندہ کپڑا اس کے منہ پر مل دیا تھا۔اس سے زیادہ تذلیل کا وہ سوچ کر آئی تھی لیکن وہ کم از کم اس سے بات تو کرتا۔ایسی بے رخی جو دل کو چیر دے۔اس موت سے بھی بدتر تھی جو کانٹوں پر آئے۔

کلب سے باہر شام مردہ خانے میں حنوط ہونے کی تیاری کر رہی تھی۔رات کے ڈنک جھوم جھوم کر دن کو کاٹ رہے تھے۔

وہ دق کے مریض کی طرح چلتے ہوئے باہر آئی تھی اور ایک قریبی پارک میں نصب بینچ پر بیٹھ گئی۔وہ صبح سے بھوکی تھی اور اسے اب بھی بھوک نہیں لگ رہی تھی۔وہ رات بھر سوئی نہیں تھی اور اسے آج رات بھی نیند نہیں آنے والی تھی۔کل سے اس کی حالت اجڑی ہوئی تھی اور یہ آج بھی سنورنے میں نہیں آ رہی تھی۔اس نے میران کے ساتھ کینڈل لائٹ ڈنر کرنے کا سوچا ہوا تھا لیکن ان شمعوں نے اس کے وجود کو ہی چنگاری دکھا دی تھی۔

”تم اب مجھ سے کیا بات کرتے میران......ساری دنیا کو پانے کے لیے میں نے پوری کائنات کو لوٹ لینا چاہا تھا۔جس میں، میں نے تمہیں بھی مفلس کر دیا۔پھر اب تم مجھ سے کیا بات کرتے......تم کہتے کہ تم نے میرے جھوٹ معاف کر دیئے ہیں۔تم

جھوٹ تو معاف کر سکتے تھے لیکن گناہ کیسے معاف کرتے۔" بینچ پر بیٹھ کر وہ اپنے آپ سے خود ہی سوال کرنے لگی تھی اور خود ہی ان کے جواب دینے لگی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مذہب کے نام پر وہ اسے بے وقوف بناتی رہی تھی۔ اس نے محبت میں کفر کے درجے کی غلطی کی تھی۔ اب توبہ کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ قیامت برپا ہو چکی تھی۔

بالآخر رات نے پورے عالم پر اپنا شکنجہ کس لیا تھا۔ اسٹریٹس لائٹس خود کار طریقے سے روشن ہو گئی تھیں۔ دائیں بائیں کی دکانوں میں مصنوعی روشنی کی اتنی بہتات تھی کہ وہ دن کو بھی مات دے رہی تھی۔ سڑکوں پر بے مقصد ٹہلتی وہ نجانے کہاں سے کہاں نکل آئی تھی۔ ازل سے خاموش وقت اس لمحے گونگا ہو چکا تھا۔ ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ میران کے گھر کے سامنے کھڑی تھی۔ ''سن شائن'' کے سامنے...... ایسا لاشعوری میں ہوا تھا یا بے خودی میں...... وہ نہیں جانتی تھی۔ لیکن میران کے ساتھ سینی ٹوریم کا سفر کرتے ہوئے اتنا جان گئی تھی کہ ذہن بھی ویسی ہی غلطیاں کرتا ہے جیسا ہم اسے حکم دیتے ہیں۔ جیسا ہم اسے کرنے کو کہتے ہیں۔ جیسا ہم چاہتے ہیں۔ شاید وہ میران کے گھر ہی آنا چاہتی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ سوچ تھی کہ کلب سے تو وہ اٹھ کر گھر آ گیا تھا۔ اب گھر سے کہاں جا سکتا تھا۔

''ٹھیک ہے اب واپس پلٹنے کا فائدہ......''

وہ ان خزاں رسیدہ پتوں کی طرح اس کے گھر کے چرنوں میں ہی کیوں نہ بیٹھ جائے جہاں اس کا محبوب رہتا ہے۔

ہمت کر کے اس نے دستک دی تھی۔ وہ دروازے کی خوردبین کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔ یہ سوچ کر کہ وہ اس کی حالت پر ترس کھا کر ہی دروازہ کھول دے اور اگر دروازہ ربیکا نے کھولا تو...... میران بھی اسی کی طرح سڑکوں کی خاک چھان رہا ہوا اور ابھی تک گھر میں ہی نہ موجود ہوا تو وہ ربیکا سے کیا کہے گی؟

لیکن دروازہ میران نے ہی کھولا تھا۔ خوردبین سے اسے دیکھ لینے کے بعد اس کے تاثرات میں سختی آئی تھی۔ وہ شاید وہاں سبین کی آمد کی توقع نہیں کر رہا تھا کہ اس جھوٹی لڑکی کی اتنی ہمت ہو سکتی ہے کہ یہ ڈھیٹ بن کر اس کے گھر میں بھی آ جائے۔ اسے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں نفرت ابلی...... سبین خود میں سمٹ کر رہ گئی۔

''میران......'' اس نے جلدی سے پکارا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ دروازہ بند کر دے گا اور اسے دروازے کے پیچھے سے اس کی منت سماجت کرنی پڑے گی۔

''ششش......'' میران نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش ہو جانے کو کہا تھا۔

''ممی سو رہی ہیں۔'' کہہ کر وہ دروازے سے پرے ہٹ گیا تھا۔ ربیکا کے بے وقت سونے کا ایک فائدہ تو ہوا تھا۔ وہ اندر آ گئی تھی۔ ایک خاموش فضا میں...... دونوں ڈائننگ ٹیبل پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ میران ڈائننگ ٹیبل پر پڑے مصنوعی پھولوں

سے کھیلنے لگا تھا کیونکہ تازہ پھولوں سے کھیلنے کا انجام وہ بھگت چکا تھا۔

''اب کیا کہنا چاہتی ہو' کیا کل میں نے تمہیں پوری طرح سے بولنے کا وقت نہیں دیا تھا۔ کیا میں نے تمہیں، بنا تمہارے صفائی کا موقع دینے کے دھتکارا ہے۔''

تو کیا وہ اسے دھتکار چکا تھا؟ سبین کی خشک آنکھیں ایک بار پھر سے نم ہونے لگیں۔ سبین سے محبت کرنے کا فیصلہ بھی اس نے جلدی میں کیا تھا اور دھتکارنے کا بھی...... عجلت بھری محبت میں اس کی خوبصورتی اور معصومت پنہاں تھی اور جلد بازی سے دھتکارنے میں......؟ کیا کیا نہیں تھا۔

''میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں میران کہ میں نے یہ کام خوشی سے نہیں کیا۔'' گناہ کے اعتراف کے آغاز کے ساتھ ہی اس نے رونے کا آغاز بھی خود بخود ہی ہوا تھا۔

''کوئی بھی برا کام خوشی سے نہیں کیا جاتا مس سبین۔'' وہ تم سے سبین اور اب مس سبین پر آ گیا تھا۔ یہ اس کی سب سے بڑی تذلیل تھی۔ جدائی کے فیصلے سے بھی بڑی تذلیل...... لاتعلقی...... ''تم'' سے واپس ''آپ'' والی تذلیل شاید ہی دنیا میں کوئی اور ہو۔

''برے وقت کو اچھے طریقے سے برداشت کرنا ہی تو بڑائی ہے۔ تم خدا کی آزمائش پر پورا نہیں اتری ہو......''

''تم نہیں جانتے میران کہ میرے ساتھ کیا کیا ہوا...... زندگی نے میرے ساتھ......''

''تم پھر یہ نہیں جانتیں کہ میرے ساتھ کیا کیا ہوا ہے سبین...... زندگی نے میرے ساتھ کیا کھیل کھیلا ہے۔ جو بھی تمہارے ساتھ ہوا مجھے نہیں جاننا...... میں نے کبھی بھی تم سے تمہارے ماضی کے بارے میں نہیں پوچھا...... نہ ہی اپنے بارے میں بتایا...... کیونکہ مجھے یہ فرق نہیں پڑتا تھا کہ تم کیا تھیں اور میں کیا تھا، مجھے یہ تھا کہ اب ہم کیا ہونے والے ہیں۔ میں نے تم سے کبھی یہ نہیں پوچھا کہ تمہارا کوئی دوست تھا، تم کسی کو پسند کرتی تھیں۔ کیونکہ مجھے ان باتوں سے کوئی واسطہ نہیں...... تم اب میری ہو مجھے اس سے غرض تھی۔ ہم دو سے ایک ہونے والے تھے سبین اور تم نے...... تم نے......''

وہ یہاں اپنا دکھ کم کرنے آئی تھی۔ اور اس کا دکھ سن کر دکھی ہو گئی تھی۔ وہ اس سے زیادہ دکھی تھا۔ اس نے اسے ٹھیس پہنچائی تھی۔ وہ اپنے دردناک ماضی کو بیان کر کے کیسے سرخ رو ہو سکتی تھی۔ اس کا بھیانک حال اپنے ماضی سے زیادہ دردناک بنا دیا تھا اس نے۔

''میران...... میں نے بہت برا وقت دیکھا ہے۔ اس برے وقت میں ثابت قدم رہنا بہت مشکل تھا۔''

''کیا تمہیں کھانے کو رزق مل رہا تھا؟''

''ہاں......''

''کیا تمہارے پاس رہنے کو گھر تھا؟''

''ہاں......''

''پھر باقی کا برا وقت تمہارا خود کا پیدا کردہ ہے۔تم کیا سمجھتی ہو مس سبین کہ میں نے اپنی زندگی میں سب ٹھیک ہی دیکھا ہے۔یا ہم سب کی زندگیاں ہر وقت خوشیوں سے بھری رہتی ہیں؟''

سبین خاموش ہو گئی تھی۔میران کے بارے میں جاننے کا اسے آج موقع ملا تھا۔وہ بھی کن حالات میں......

''میرا باپ میرے بچپن میں مر گیا۔میری ماں اسی باپ کی جدائی کے غم میں پاگل ہو گئی۔میں والی بال کا اسٹار بننا چاہتا تھا لیکن ممی کے علاج کی وجہ سے مجھے یہ کھیل چھوڑنا پڑا......میں وہ لڑکا جو زندگی میں بہت کچھ کرنا چاہتا تھا، نام کمانا چاہتا تھا۔کم عمری سے ہی کچن کے گندے برتن دھونے لگا۔کپڑے واش کرنے لگا، اندر گھر کے کام اور باہر کے کام کرنے لگا۔کیونکہ ممی کسی بھی طرح کے کام کے قابل نہیں تھی۔

پھر ممی کے علاج کی وجہ سے مجھ پر قرض چڑھ گیا۔میں نے دن رات محنت کر کے اسے ادا کیا۔دو دو نوکریاں کیں......کھانے سے لاپروائی برتی، سونے کی فکر نہیں تھی......تم کیا سمجھتی ہو کہ برے حالات کا سامنا صرف تم نے ہی کیا ہے۔اسکول میں ایک لڑکی نے مجھے یہ کہہ کر دھتکار دیا تھا کہ میری ماں نشہ کرتی ہے۔ہر وقت ایک مرے ہوئے شخص کو پکارتی رہتی ہے اور میں بھی ایک دن اسی کی طرح نشہ کرنے لگوں گا۔وہ نہیں چاہتی کہ اس کا پارٹنر ایک نشہ باز ہو......اور تم......تم کہتی ہو کہ بس تم نے ہی......''

وہ سب بتاتے ہوئے دکھی ہو رہا تھا۔سبین اسے دیکھ رہی تھی۔وہ لوگ اپنی مقتول محبت پر رو رہے تھے اور کوئی انہیں چپ کروانے والا نہیں تھا۔کوئی کسی کا سہارا نہیں بن سکتا تھا۔

''میں کمزور تھی میران......میں تمہاری طرح ہمت کا مظاہرہ نہیں کر سکی......میری ماں ایک گمنام بیماری سے مر گئی، کیونکہ دن رات محنت کر کر کے اس نے اپنا برا حال کر لیا تھا۔میری ماں سارا سارا دن چکی چلاتی تھی، جس سے اس کے ہاتھوں میں گڑھے پڑ گئے تھے اور کمر میں درد رہنے لگا تھا۔پھر بھی وہ کام کرتی رہتی تھی اور چونا پھانکتی تھی۔میرے باپ کو چونے سے اتنی محبت تھی کہ اس نے اس محبت میں گھر کی خوشیوں تک کو قربان کر دیا۔ماں مرنے سے پہلے چاہتی تھی کہ میری شادی ہو جائے۔اس کی خواہش پر میں نے اپنے تایا زاد رشید سے نکاح کر لیا جبکہ میرے دل میں تم تھے۔''

میران نے جھکا سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''تم نے صرف میرے ماڈل ہی نہیں توڑے تھے۔مجھے بھی اپنی یادوں سے توڑ دیا تھا۔میں تمہارا نام کبھی نہیں بھولی، اس پہلی ملاقات کا ایک ایک جز میں نے یاد رکھا۔میں نے خدا سے رو رو کر دعا کی تھی کہ مجھے تم مل جاؤ......کسی بھی طرح......خدا نے میری بات سن لی......لیکن شاید مجھے ساتھ یہ دعا بھی کرنی چاہیے تھی کہ تم مجھے ہمیشہ کے لیے مل جاؤ......مجھے ٹھیک سے دعا مانگنی

کبھی آئی ہی نہیں میران......" وہ رونے لگی تھی۔

"رشید نے مجھے شادی سے بارہ گھنٹے پہلے طلاق دے دی۔ صرف اس بات پر کہ ہمارا گھر اس کے نام نہ ہو سکا تھا۔ تائی نے مجھے کھڑے کھڑے اس کے منہ سے طلاق دلوا دی۔ ایک ایسی لڑکی جو شادی کر کے اگلے گھر جانے والی تھی، وہ مطلقہ ہو کر اپنے گھر میں رہ گئی اور بدنام بھی ہو گئی۔"

رشید سے شادی اور طلاق کی بات سن کر میران کی آنکھوں کی پتلیاں پھیلی تھیں۔

"بتاؤ...... میں نے کیا غلط کیا؟ میں لڑکی تھی، میں کمزور تھی۔ میں یہ نہ کرتی تو مر جاتی......"

"کیا تم گارنٹی دیتی ہو کہ تمہارے پاس پیسے ہوتے تو تم اپنی ماں کو بچا لیتیں۔ یہاں کتنے ہی لوگ امیر ہوتے ہوئے، بہت سا پیسہ رکھتے ہوئے بھی اپنے پیاروں کو نہیں بچا سکتے۔ تم کہتی ہو کہ تمہاری ماں دن رات کی محنت کی وجہ سے مر گئی۔ ان لوگوں کی موت کو کیا جواز دو گی جن کی موت محلوں جیسے گھروں میں آ جاتی ہے۔" میران پوچھنے سے زیادہ اسے لاجواب کر رہا تھا۔

"رشید نے تمہیں طلاق دی کیونکہ خدا نے تمہارے لیے مجھے چنا تھا۔ خدا تمہاری خواہش کو پورا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے تمہاری دعائیں سن لی تھیں۔ لیکن تم نے......" یہ اس کی سب سے بڑی چوٹ ہوئی تھی۔ فقرہ درمیان میں چھوڑ دینے کی......

"مجھے معاف کر دو میران......"

"مجھ سے کس بات کی معافی مانگ رہی ہو......؟"

میں نے تم سے جھوٹ بولے اس لیے......"

"میں تمہارا جھوٹ معاف کر سکتا ہوں لیکن تمہارا فریب نہیں۔ میں خدا نہیں ہوں مس سبین! میں ایک عام سا انسان ہوں۔ جسے دکھ ہوتا ہے جو ٹوٹتا ہے، جسے محبت ہوتی ہے، پھر روگ لگتا ہے اور وہ اس روگ کو جوگ بنا لیتا ہے۔"

"تم مجھے ایک موقع دو...... میں تلافی کر دوں گی۔"

"میں سب بھول جاؤں...... اس بات کی گارنٹی دیتی ہو......"

"میری محبت تمہیں سب فراموش کروا دے گی میران...... بس تم مجھے ایک بار معاف کر دو......"

"معافی مانگنی ہے تو جاؤ اپنے بابا سے معافی مانگو...... جن کو دھوکا دے کر تم یہاں موجود ہو...... کیونکہ میرا تم نے صرف دل ہی توڑا ہے۔ لیکن اپنے بابا کا مان توڑ دیا ہے۔ ان کے فخر کو روند دیا ہے تم نے...... کبھی سوچا ہے کہ انہیں پتا چلے گا تو ان کا کیا بنے گا۔"

"میں انہیں پتا نہیں چلنے دوں گی۔ میں دو بار آ چکی ہوں۔ مجھے صرف آٹھ بار مزید آنا ہے۔"

میران نے اس کی طرف ایسے دیکھا تھا جیسے اسے اس کے وجود کا بالکل ہی یقین نہ آ رہا ہو...... وہ جو اس کے دل میں

ایک احساس کا کونا تھا اور اب وہ بھی تاریک ہونے لگا تھا۔ سبین نے میران کی آنکھوں کے تاثرات پڑھ لیے تھے۔

"معاہدہ ہو چکا ہے میران...... اب میں کچھ بھی نہیں کر سکتی......" اس نے وضاحت دی تھی۔ میران کی آنکھوں میں دکھ ختم ہوا تھا اور اس کی جگہ غصے نے لے لی تھی۔ تو یہ لڑکی ابھی بھی باز نہیں آ رہی تھی۔

"تو جاؤ اپنا معاہدہ پورا کرو مس سبین...... لیکن پھر دوبارہ کبھی میرے پاس واپس مت آنا......" اس نے آواز نیچی رکھتے ہوئے انتہائی غصے سے کہا تھا اور آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا تھا۔

اس نے آنسو بھری آنکھوں سے میران کو دیکھا تھا اور پھر اٹھ کر باہر آ گئی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے پاس اور کوئی حل نہیں تھا کیونکہ اگر وہ اٹھ کر باہر نہ آتی تو عین ممکن تھا کہ وہ اسے دھکے مار کر گھر سے باہر نکال دیتا۔

☆......☆......☆

ربیکا اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی تھی۔ میران مین ڈور بند کر کے نجانے کتنی ہی دیر وہاں کھڑے رہنے کے بعد اپنے کمرے میں جانے لگا تھا جب اس کی نظر ربیکا پر پڑی تھی۔ اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ بے وقت سوئی نہیں اگرچہ بے موقع اٹھ ضرور چکی ہے۔

"آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں۔ سوئیں نہیں......" وہ نارمل ہونے کی لاحاصل کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"جاگ گئی ہوں۔" ربیکا کا انداز سپاٹ تھا۔ "اس گھر میں میرے علاوہ کوئی اور عورت بھی رو سکتی ہے۔ یہ بات میرے گمان میں بھی کہاں تھی۔" یعنی ربیکا نے ساری گفتگو سن لی تھی۔

"اس گھر میں ایک واحد مرد بھی ہے ممی...... وہ بھی روتا ہے۔ کبھی اس پر بھی توجہ دیں۔" اس نے جتاتے ہوئے انداز میں کہا تھا اور ربیکا کو جیسے کسی نے گھونسا مارا تھا۔ یک ٹک وہ میران کی شکل دیکھنے لگی تھی۔ پچیس سالوں میں اس نے پہلی بار کوئی شکوہ کیا تھا۔

"مجھے کچھ بتاؤ میران......"

"آپ سب سن تو چکی ہیں۔"

"ہاں...... لیکن کچھ سمجھ نہیں سکی......"

"سبین سے پہلی ملاقات میں، میں نے اس کے ماڈل توڑ دیئے تھے۔ اب بدلہ لے کر اس نے میرا دل توڑ دیا ہے۔"

"کیوں...... وہی تو پوچھ رہی ہوں کہ کیوں؟"

"اس گھر کی تقدیر ہی ایسی ہے ممی...... یہاں کوئی خوش نہیں رہ سکتا۔ کسی کا دل ثابت نہیں رہ سکتا۔ سب کو اکیلے رہنا پڑے گا۔ آپ کہتی تھی ناں کہ محبت میں جلد بازی کرنی چاہیے تاکہ محبت کے دنوں کی تعداد زیادہ ہو...... میں آپ کو بتاتا ہوں ممی...... کہ

محبت میں جلد بازی کر دیا احتیاط...... ہاتھ میں صرف وہ ہی دن آتے ہیں جو بری قسمت کے شکنجے کی قید سے آزاد ہوتے ہیں۔"

"لیکن اس نے کیا کیا ہے؟"

"جو کیا ہے وہ سب مجھ پر عیاں ہو چکا ہے۔ اگر آپ مجھے خوش دیکھنا چاہتی ہے تو دوبارہ کبھی اس کا ذکر مت کیجیے گا۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے میران...... میں اس لڑکی کا ذکر نہ کروں...... وہ عیسیٰ کے ملک سے ہے۔"

ربیکا نے روانی میں کہا تھا۔ میران نے تڑپ کر ربیکا کی صورت دیکھی تھی۔ ربیکا نے نظریں جھکا لی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ انجانے میں اس کے منہ سے کیا بات پھسل گئی ہے۔ تو یہ بات تھی اس کی سبین کو پسند کرنے کی...... کیونکہ وہ عیسیٰ کے ملک سے تھی۔ یعنی ہر کوئی اپنی اپنی پسند میں فریب کر رہا تھا۔ کوئی بھی سچائی سے تعلق نہیں جوڑے ہوئے تھا۔ سب مصلحت کا شکار تھے۔

"سن شائن" کے بورڈ والا وہ گھر اس لمحے تاریکی میں اس قدر ڈوب گیا تھا کہ اس کے ماتھے پر لکھی سورج کے حرفوں جیسی تحریر بھی گم ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کے سارے روشن نشان راکھ ہو گئے تھے۔

وہ رات...... اپنے اپنے کمروں کے آرام دہ بستروں پر لیٹے ہوئے چار اشخاص نے جاگ کر گزاری تھی۔

میران نے...... جس نے جان لیا تھا کہ والی بال کے بعد اب اسے محبت کا یہ بے رنگ کھیل بھی چھوڑنا پڑے گا کیونکہ اس پر دھوکا دہی کا بہت سا قرض چڑھ گیا تھا۔ جسے اتارنے کے لیے اسے دن رات دو دو نوکریاں کرنی تھیں۔ ایک بھولنے کی...... اور دوسری فراموش کرنے کی......

ربیکا نے...... جس نے پچیس سال کے لمبے عرصے کے بعد آج اس گھر میں عیسیٰ کی آوازوں کے علاوہ کسی اور مرد کی آواز سنی تھی۔

سبین نے...... جس کو اب معلوم ہوا تھا کہ "ناگ منی" کو آگے سے دیکھنے سے تو آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں لیکن پیچھے سے دیکھنے سے دل سیاہ ہو جاتا ہے۔

اور دور...... جنوب ایشیا کے ایک پرانے سے شہر لاہور کے، پرانے سے علاقے گن پت روڈ پر موجود، پرانے سے گھر کی پرانی چارپائی پر لیٹے ہوئے بابا نے...... جنھوں نے بالآخر مان لیا تھا کہ جس چونے میں سانس لے کر انہوں نے اسے اپنی نس نس میں اتارا تھا۔ وہ "پس" بن کر ان کی اپنی اولاد کے لیے ناسور بن گیا تھا۔

لیکن ان سب کا اب کیا فائدہ......؟ اب کیا حاصل؟

☆......☆......☆

"بابا کہا کرتے تھے کہ کسی تال کی کائی دیکھنے میں تو ناگوار لگتی ہے، لیکن درحقیقت وہ مہربان ہوتی ہے۔ اس نے تالاب

کے اندر کے تعفن پر اپنی ڈھال بنائی ہوتی ہے۔اسے خود میں چھپایا ہوتا ہے۔لیکن کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ تعفن جب حد سے زیادہ بڑھ جائے تو وہ کائی کی سطح کو پھاڑ کر باہر نکل آتا ہے۔تعفن اور کائی کی جدو جہد میں تعفن جیت جاتا ہے کیونکہ اس کی نکاسی کا کوئی مناسب راستہ باقی نہیں بچتا۔

اسی طرح ذرات کے اندر بھی ایک تعفن ہر وقت پنپتا رہتا ہے اور ہر لمحہ باہر نکلنے کے لیے بے چین رہتا ہے۔جس پر ہمارے جسم نے ایک ڈھال بنائی ہوتی ہے۔اس جسم سے کبھی غلط کام نہیں لینا چاہیے۔اس میں کبھی چھید نہیں کرنا چاہیے،نہیں تو ذات کا تعفن شخصیت کی دھجیاں اڑا کر باہر نکل آتا ہے اور جسم کا بہترین مصرف ہے ہر دم سجدہ شکر بجالانا......خدا کی رضا میں مطمئن رہنا۔اس طرح اندر کا تعفن خود بخود ہی فنا ہو جاتا ہے۔

مجھے بابا کی ایسی باتوں سے اتنی سخت چڑ ہوتی تھی کہ میں ہمیشہ ان کا الٹ ہی کیا کرتی تھی۔جسم سے غلط کام لے کر میں نے اندر کے تعفن کو باہر نکالنے کا ایک الگ ہی حل تلاش کیا تھا۔آگے جھک کر سجدہ کرنے کے بجائے میں نے پیچھے مڑ کر ہون جلالیا تھا۔خدا کی رضا میں مطمئن رہنے کی نسبت میں نے منکر ہو کر خود کو راضی کرنا چاہا تھا۔کائی میں چھید کر کے میں خوشبوؤں کی آس لگائے ہوئے تھی۔

میں نہیں جانتی تھی کہ اس سب سے تعفن ختم نہیں ہو رہا تھا بلکہ گھٹ رہا تھا۔

اور میرا دم گھٹ رہا تھا۔''

☆......☆......☆

بچپن میں جب اس کے دکھ حد سے زیادہ بڑھ جاتے تھے تو وہ کھڑکی پھلانگ کر آرٹ کالج کے باغ میں نکل جایا کرتی تھی،اور اکیلے میں خوب خوب رویا کرتی تھی۔اب اس کے اس گیس ہاؤس والے کمرے میں کھڑکی تو تھی لیکن سامنے کوئی باغ نہیں تھا۔اس گنجان شہر میں جہاں کئی خوبیاں تھیں۔وہاں یہ خامی بھی تھی جو اسے بہت کھل رہی تھی۔وہ کہیں سنسان سی جگہ پر جا کر چپکے سے رونا چاہتی تھی جہاں اسے کوئی نہ جانتا ہو،کوئی اسے نہ سن سکے۔

وہ وہاں جانا تو نہیں چاہتی تھی لیکن پھر بھی نجانے کیوں وہ رش جھیل پہنچ گئی تھی کوئی اور نہ سہی......وہ دائنا کے کندھے پر سر رکھ کر ہی رو سکتی تھی۔اسے شروع سے آخر تک کی ایک ایک بات بتا سکتی تھی۔پھر پوچھ سکتی تھی کہ وہ کہاں کہاں غلط ہے۔وہ اس گناہ میں اس برح طرح گھر چکی تھی کہ ابھی تک سمجھ ہی نہیں پا رہی تھی کہ اس نے جو کیا ہے غلط کیا ہے۔یا وہ سب کرنا اس کی مجبوری تھی۔

جائز مجبوری......

دھوپ درختوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے ہر بازی جیت رہی تھی۔پتوں کے سائے سکڑ کر چیونٹیوں کی طرح قطار

درقطار اپنے بلوں میں گم ہوتے جاتے تھے۔میران اس جگہ کے ایک ایک حصے سے واقف تھا۔لیکن سبین کو سمبل کے درختوں والے اس حصے کو تلاش کرنے میں خاصا وقت لگ گیا جہاں دائنا اپنی چھوٹی سی دکان کھولے ہر وقت موجود ہوتی تھی اور وہاں پہنچ کر سبین نے بے ساختہ ہی ایک دلدوز چیخ ماردی تھی۔اس کی چیخ کی گونج اتنی بھیانک اوراس کی قوت اتنی پرشدت تھی کہ جھیل کے پانی میں اس کی چیخ کی تیزی سے بھنور پیدا ہوگیا تھا۔اس کی چیخ اتنی بلند تھی کہ سمبل کے درختوں پر گول دائرے میں گھومتے پرندے بھرا مار کر دور نکل گئے تھے۔

سمبل کے سارے نارنجی اور سرخ پھول،خوف ناک حد تک سیاہ ہوکر زمین پر گر چکے تھے۔پتوں سے عاری درخت برہنہ ہوکر وحشت پھیلا رہے تھے۔آنکھیں پھاڑے سبین سمبل کی اس سوکھی شاخ کو دیکھنے لگی جہاں دائنا کی لاش لٹک رہی تھی۔



قسط نمبر 8

دائنا کی ماں زہرہ ایک پیشہ ور عورت تھی۔نہیں......وہ اپنی مرضی سے اس کام سے منسلک نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کے شوہر حلبی نے اسے اس کام کے لیے مجبور کیا تھا۔

زہرہ کا تعلق افریقہ سے تھا۔وہ اس قبیلے سے تھی جہاں مرد کماتے تھے اور عورتوں کو گھر میں بٹھا کر راج کرواتے تھے۔وہ باہر کی مشکلات کا سامنا کرنے کے لیے عورتوں کو نہیں بھیجتے تھے۔زہرہ نے بھی شادی سے پہلے ایسے ہی سپنے سجائے تھے۔شادی کے بعد وہ اور اس کا مرد حلبی امریکا آ گئے تھے۔جہاں سورج ہی دوسرا تھا۔دونوں نے بھاگ کر شادی کی تھی۔انسانی اسمگلنگ کے ذریعے وہ امریکا منتقل ہوئے تھے۔امریکا نے جلد ہی ان کے سہانے سپنوں کی الٹی تعبیر دے دی تھی۔الٹی اور زہریلی تعبیر......

زہرہ کو اپنے قبیلے کی عادت تھی۔وہ چاہتی تھی حلبی کمائے اور وہ گھر کا کچن چلائے۔لیکن حلبی امریکا کا کچھ جلدی ہی عادی ہو گیا تھا۔وہ دیکھتا تھا کہ باہر تو عورتیں بھی کما رہی ہیں اور مردوں سے زیادہ کما رہی ہیں۔وہ زہرہ کو مارتا اور کہتا کہ وہ بھی باہر جا کر کمائی کرے۔

زہرہ کو باہر جا کر مردوں کی طرح محنت کرنی پڑی......وہ اور کیا کرتی جبکہ نہ تو ان کے پاس کوئی اچھا ٹھکانہ تھا اور نہ یہ کھانے کو وافر......یہاں اسے ایک پارلر میں پہلی جاب ملی تھی۔جہاں جونکیں لگانے کا کام ہوتا تھا۔اتفاق تھا کہ زہرہ کا قبیلہ بھی یہ ہی کام کرتا تھا اور زہرہ بنا کسی ڈگری اور تعلیم کے اس کام میں بہت ماہر تھی۔پھر ایک دن جب پارلر پر کوئی موجود نہیں تھا تو وہ ساری جونکیں اٹھا کر وہاں سے بھاگ گئی تھی۔یہ اس کے "ذاتی کاروبار" کی پہلی انوسٹمنٹ تھی۔

کچھ دن وہ چھپتی رہی......پھر اس کے خیال سے جب اس کی مالکن نے اس کے خلاف چارہ جوئی کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تو وہ گھر سے باہر نکلی......وہ ساحل پر جاتی......وہاں مردوں اور عورتوں کو جونکیں لگاتی......زہرہ یہ کام سرِعام کرتی تھی۔اس کا حلیہ بھی افریقی جادوگروں جیسا تھا۔کوئی اس سے اس کام کے لائسنس کے بارے میں نہیں پوچھتا تھا۔لوگ اس سے کام لیتے اور پیسے دیتے تھے۔اس برقت محنت کا فوری نتیجہ اسے اچھا لگتا تھا۔

ایک دن گھر کو لوٹی تو حلبی الٹیاں کر رہا تھا۔وہ آج کل شراب بہت پینے لگا تھا اور زہرہ کو پہلے سے زیادہ مارنے پیٹنے بھی لگا تھا۔پھر بھی زہرہ اس سے بہت محبت کرتی تھی۔اس نے حلبی کا علاج کروانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔اس کے باوجود حلبی

کو نہیں بچا سکی تھی۔ حلبی مر گیا اور اس کے مرنے کے بعد وہ دو جڑواں بچوں کی ماں بنی......دائنا اور حائک کی......

دونوں بچوں کی شکلیں باپ پر گئی تھیں اور فطرت نجانے کس پر چلی گئی تھی۔ حائک پیدائشی گونگا اور بہرہ تھا۔ اور دائنا اتنی چپ کہ لگتا جیسے زندگی بھر بول نہیں سکے گی۔ اس کے چہرے سے اس کا اندرونی کوئی جذبہ جھلکتا تھا۔

زہرہ نے دونوں کا علاج کروانے کی تھوڑی بہت کوشش کی لیکن جب دونوں کو ہی کوئی فرق نہ پڑا تو اس نے وہ کوشش ترک کر دی تھی۔ نہ اس کے پاس پیسہ تھا اور نہ ہی وقت......ایک دن کی چھٹی کا مطلب تھا ایک دن بھوکا رہنا......

حائک پیدائش کے وقت سے ہی بہت سی محرومیوں میں پلا بڑھا تھا۔ جسمانی کمزوریوں کے ساتھ ساتھ اسے گھر کی ادھوری زندگی کے ساتھ سمجھوتا کرنا پڑا تھا۔ زہرہ نے ایک دن کوڑے سے اسے ایک ماؤتھ آرگن لا دیا تھا۔ یہ ماؤتھ آرگن ہی اس کی کل زندگی بن گیا تھا۔ وہ ہر وقت اسی کے ساتھ کھیلتا رہتا اور اسے ہی بجاتا رہتا......گونگا اور بہرہ ہونے کے باوجود اور کچھ نہ سننے کے باوجود وہ نجانے اسے کیسے صحیح بجا لیتا تھا۔ کیسے اس نے اس کی دھنیں سیکھ لی تھیں۔ وہ تو صرف ماؤتھ آرگن سے نکلتی اپنے ہی حلق کی پھونک کو کم یا زیادہ ہونے سے کھیلتا رہتا تھا۔ اسی میں اس نے اچھا ماؤتھ آرگن بجانا سیکھ لیا تھا۔ بہت سوں نے اس کی دھنوں کی تعریف کی تھی لیکن نہ تو وہ تعریفوں کے لفظ سن پایا تھا اور نہ ہی دھنیں......بس اتنا ضرور تھا کہ وہ اگلے کو خوشی سے مسکرا کر بات کرتے ہوئے سمجھ جاتا تھا کہ وہ اس کے ماؤتھ آرگن کی تعریف کر رہا ہے۔ کوشش کے باوجود بھی وہ جواب میں خود نہ مسکرا سکتا تھا۔ اسے مسکرانا نہیں آتا تھا۔ جیسے دائنا کو زیادہ بولنا نہیں آتا تھا۔

یہ ماؤتھ آرگن دو تین بار خراب بھی ہوا تھا لیکن ہر بار وہ اسے خود ہی ٹھیک کر لیتا تھا۔ جیسے کہیں چوٹ لگ جانے پر وہ خود ہی اپنی پٹی کر لیا کرتا تھا۔ تھوک لگا کر اس پر کاغذ رکھ لیتا تھا۔

ماؤتھ آرگن کے ساتھ آوارہ گردی کر کے آنے کے بعد وہ گھر آ کر ایسے بیٹھ جاتا تھا جیسے نجانے کتنا کام کر کے آیا ہو۔ ماؤتھ آرگن کو وہ سائڈ پر رکھتا تھا اور پھر مرتبان میں پڑی جونکوں کی طرف جاتا تھا۔ گھر آنے کے بعد یہ کھیل اس کا واحد کھیل ہوتا تھا۔ ماؤتھ آرگن اور جونکیں وہ ان دونوں سے ہی خوش ہوتا تھا اور زہرہ کو اس کے ان دونوں کھیلوں سے چڑ تھی۔

''حائک......دور رہو ان سے......'' گندے پردے کے پیچھے سے زہرہ کی آواز آتی تھی اور وہ وہاں سے ہی کوئی وزنی برتن یا ایسا ہی کچھ حائک پر دے مارتی تھی۔

''کتنی بار کہا ہے ان کے قریب مت جایا کرو......''

یہ کتنی بار کا کہنا تب شروع ہوا تھا جب مرتبان ایک دفعہ حائک سے گر کر ٹوٹ گیا تھا اور جونکیں دہلیز کے ساتھ بہتی گندی نالی میں جا گری تھیں۔ زہرہ کو اپنی جوڑی شدہ رقم میں سے دوبارہ جونکیں خریدنی پڑتی تھیں۔ جوڑی ہوئی رقم کو خرچ کرنا اس کے

لیے ایسے ہی تھا جیسے وہ اپنے جسم کے کسی حصے کو کاٹ کر الگ کر رہی ہو...... جو نکیں ملتی بھی مشکل سے ہی تھیں۔ اسے خریدنے کے لیے بھی اسے کافی دور جانا پڑا تھا۔ اور اتنے دنوں میں جو کام کا حرج ہوا تھا اس کا قلق سب سے زیادہ تھا۔ اس دن کے بعد سے وہ حائک کو کبھی مرتبان کے پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتی تھی۔

حائک گھر میں ایک بے ضرر سا شخص تھا۔ اس کے گونگا اور بہرہ ہونے کے باوجود زہرہ چاہتی تھی کہ وہ کما کر لائے اور کبھی وہ بھی اپنے قبیلے کی عورتوں کی طرح گھر میں بیٹھ کر آرام سے کھا سکے...... حلبی کے بعد وہ اپنی امیدیں حائک سے ہی جوڑ سکتی تھی۔ لیکن اس کا یہ خواب خواب ہی رہا تھا۔ کبھی یہ نوبت آئی ہی نہیں کہ وہ گھر پر بیٹھ کر آرام سے کھا سکتی......

دائنا کو اس نے یہ کام سکھا دیا تھا۔ کام تو اس نے حائک کو بھی سکھانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ کوئی کام سیکھ ہی نہیں پایا تھا۔ زہرہ جانتی تھی کہ یہ گونگا بہرہ ہونے کے ساتھ ساتھ کند ذہن بھی ہے۔ حائک بھی اپنے حال پر پڑا ہوتا ہوا اپنا حال اور مستقبل دونوں برباد کر رہا تھا۔ لیکن شاید اسے اس بات کا اندازہ تک نہیں تھا کہ حال کیا ہوتا ہے۔ مستقبل کس بلا کا نام ہے۔ وقت کی بھی کوئی اہمیت ہوتی ہے۔ اس کی تو نہ کوئی خواہش تھی اور نہ ہی چاہت...... کھانا مل جاتا تو ٹھیک...... نہیں ملتا تھا تو اسے کوئی شکوہ نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ بھوکا ہے۔

زہرہ ویسے بھی اب اکثر کھانا کم ہی بناتی تھی۔ خود وہ باہر سے کھا کر آیا کرتی تھی اور دائنا اور حائک کی اسے کوئی پروا نہیں ہوا کرتی تھی۔ بہت پروا کی تھی اس نے ان دونوں کی...... وہ جان چکی تھی کہ اس کے نصیب میں کسی کے حوالے سے کوئی خوشی تھی ہی نہیں...... کام سے آنے کے بعد زیادہ تر وقت تو وہ سوتی ہی رہتی تھی۔ ایسے میں دونوں بہن بھائی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ اسے جگا کر کھانا مانگ سکیں۔ نیند زہرہ کی کمزوری تھی۔ وہ نیند میں ملکہ بننے کے سپنے دیکھا کرتی تھی اور یہ سپنے اسے اپنے دونوں بچوں سے زیادہ عزیز تھے۔ نیند سے جگا دینے پر وہ انہیں اس بری طرح سے مارتی تھی کہ مہینوں دونوں کے جسموں پر سے نشان نہ جاتے تھے۔ ایسے میں حائک اور دائنا دونوں ریسٹورنٹ کے باہر پڑے کوڑے کے ڈرموں سے کھانا حاصل کرتے تھے۔

پھر یوں ہوا کہ سمبل کے درخت جہاں زہرہ بیٹھا کرتی تھی وہ تمام درخت آندھیوں کی زد میں آ گئے۔ زہرہ سپنے دیکھتے دیکھتے ہمیشہ کے لیے دونوں کو اکیلا چھوڑ گئی اور سمبل کے درختوں تلے زہرہ کی جگہ دائنا نے سنبھال لی......

زہرہ کے مرنے کا دونوں بہن بھائیوں کو بالکل دکھ نہیں ہوا۔ بلکہ انہوں نے محسوس کیا کہ زہرہ کے مرنے کے بعد ان کی زندگیاں زیادہ آسان ہو گئی تھیں۔ زگھر میں پہلے سے زیادہ محبت تھی۔ دائنا، حائک کا ایسے ہی خیال رکھتی تھی جیسے کوئی ماں اپنے بچے کا رکھ سکتی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ حائک کو توجہ کی کتنی ضرورت ہے۔ وہ کند ذہن نہیں تھا بس توجہ کی کمی کا شکار تھا۔ وہ اب اس کی اچھی پرورش کر رہی تھی۔ حائک بھی خوش تھا۔ وہ دن بدن نکھرتا جا رہا تھا۔ اسے اب وقت پر کھانا بھی ملتا تھا اور صاف کپڑے بھی...... وہ

اپنی بہن سے اپنی ماں کی نسبت زیادہ پیار کرتا تھا۔ بہن بھی اس سے بہت پیار کرتی تھی۔
لیکن پھر ایک ایسا وقت بھی آیا جب اسی بہن نے اس کے منہ پر تھوک دیا تھا۔

☆......☆......☆

وہ ماؤتھ آرگن بجاتا جا رہا تھا۔ وہ صبح کے وقت اپنی بے نشان منزل کی طرف نکل جایا کرتا جب دائنا اپنے کام کے لیے چلی جایا کرتی تھی اور شام کو اس کے آنے کے وقت ہی واپس گھر پہنچا کرتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی بھی صورت اپنی روٹین تبدیل نہیں کرتے جبکہ ان کے پاس اسے تبدیل کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہوتی...... وہ بلا مقصد ہی اپنی روٹین پر کاربند رہتے ہیں۔

شام کے قریب وہ ہزار بار کے دیکھے ہوئے ایک بہت ہی خوب صورت علاقے سے گزر رہا تھا جب اس کے قریب ایک ٹائم پیس آ کر گرا تھا۔ اس نے اوپر دیکھا تھا اور حیرت سے اسی جگہ پتھر کا ہو گیا تھا۔

کھڑکی میں ایک مرد ظاہر ہوا تھا جس کی پشت کھڑکی سے باہر کی طرف تھی۔ وہ مرد صرف پینٹ پہنے ہوئے تھے اور کسی کے ساتھ دست درازی کر رہا تھا۔ حائک کے لیے یہ کوئی بڑی بات نہ ہوتی جب اس نے دیکھا کہ مرد کے سینے پر جونکیں لگی ہوئی تھیں۔ حائک کے پیروں کے نیچے سے وہ خوب صورت منظر والی زمین نکل گئی تھی۔ وہ مرد کسی کے ساتھ دست درازی کر رہا تھا؟ جونکوں کا کام تو دائنا کرتی تھی۔

جلد ہی کھڑکی پر دائنا کا چہرہ بھی نمودار ہو گیا۔ وہ حائک کو مدد کے لیے کہہ رہی تھی اور حائک کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس کی معصوم سی دنیا میں عجیب طوفان آیا تھا۔ اسے پتا ہی نہیں تھا کہ باہر کے لوگ کیسے ہیں۔ وہ تو سب کو اپنی طرح کا سمجھتا تھا۔ بے ضرر...... اب ایک مرد کو اپنی بہت کے ساتھ زبردستی کرتے دیکھ کر وہ اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑا رہ گیا تھا۔ باہر کی دنیا کا یہ بھیانک روپ وہ قبول ہی نہیں کر پا رہا تھا۔ یہ تمام تر احساس اس قدر عجیب اور بھیانک تھا کہ اسے لگا کہ وہ دنیا کا بے غیرت ترین مرد ہے۔ اس نے اپنی بہن کو بھیڑیوں کی دنیا میں اکیلا چھوڑا ہوا تھا۔ اوپر دائنا کبھی کھڑکی سے پرے ہو جاتی تھی کبھی پھر سے نمودار ہوتی تھی اور حائک کی سانس کبھی آ رہی ہے اور کبھی جا رہی ہے۔

دائنا، حائک کو بے یقینی سے دیکھ رہی تھی کہ حائک کچھ کر کیوں نہیں رہا......؟ وہ یہ بات بھول چکی تھی کہ حائک کچھ کرنے کے لیے نہیں بنا...... زہرہ ٹھیک کہتی تھی کہ اس کی رگوں میں بزدل کوے کا...... حرام خور گدھ کا...... اور بے غیرت باپ کا خون تھا۔ جس نے ساری زندگی شراب اور سستی بازاری عورتوں کے پیچھے گزار کر اسے دنیا کے مردوں کے سامنے پیش کر رکھا تھا۔

دائنا کی آنکھوں میں ایک نفرت سی چمکی تھی۔ کیا حائک اتنا ہی کم ہمت تھا؟ لیکن وہ اس کے جتنی کم ہمت نہیں تھی۔

اور پھر اگلے ہی پل اس نے کھڑکی میں سے چھلانگ لگا دی تھی۔

☆......☆......☆

بارہ گھنٹوں کے اذیت ناک انتظار کے بعد دائنا کو ہوش آیا تھا۔ جس جگہ وہ لوگ رہتے تھے وہاں کی ہی ایک سیاہ فام عورت کو بلوا کر حائک نے دائنا کے زخموں کی پٹی کروا دی تھی۔ اس عورت نے دائنا کو جو خوراک کھلانے کو کہا تھا وہ گھر میں موجود نہیں تھی اور ریسٹورنٹ کے باہر پڑے ڈرموں سے بھی نہیں میسر آسکتی تھی۔ حائک خاموشی سے دائنا کے پاس بیٹھ گیا تھا اور اس کے ہوش میں آنے کا منتظر تھا۔

ہوش میں آنے کے بعد دائنا نے اپنے پاس بیٹھے حائک کو دیکھ کر اسے اشارے سے پاس آنے کو کہا تھا۔ حائک ہمدردی اور پیار کے جذبوں سے مغلوب ہو کر دائنا کی طرف بڑھا تھا اور تب دائنا نے منہ بھر کر تھوک حائک کے منہ پر پھینک دیا تھا۔

☆......☆......☆

بوجھل رات دو دنوں سے دھرتی پر چھائی ہوئی تھی۔ دن تھا کہ نکلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

دائنا نقاہت سے زمین پر لیٹی ہوئی حائک کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ اس کے لیے بازار سے کچھ کھانے کو لینے گیا تھا۔ لیکن اتنی دیر گزر چکی تھی۔ حائک ابھی تک گھر واپس نہیں آیا تھا۔ دائنا میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اٹھ کر خود سے اپنے کھانے کے لیے کچھ کر سکتی......وہ وہیں زمین پر لیٹی انتظار کے کوفت زدہ لمحوں سے گزر رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد گھر کے دروازے پر بھاری بوٹوں والی ایک چاپ رکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ دائنا کو لگا تھا کہ شاید حائک واپس آ گیا ہے لیکن حائک اتنی مضبوط قدمی سے نہیں چلا کرتا تھا۔

''کیا حائک کا گھر یہ ہی ہے۔'' باہر سے صدا آئی۔ دائنا جلدی سے اٹھی۔ ٹاٹ کا پردہ پیچھے کر کے وہ گھر سے باہر آئی۔

''جی......''

''تم اس کی بہن ہو......دائنا''

''جی......کیوں......کیا ہوا ہے؟''

''تمہارے بھائی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔''

''کیا......؟'' دائنا بے اختیار ہی چلا اٹھی تھی۔

''جلدی کرو......میں تمہیں لینے آیا ہوں۔ اس نے بے حد مشکل سے مجھے تم تک پہنچنے کے اشارے سمجھائے ہیں۔''

''کہاں ہے حائک......''

''وہ ہسپتال میں ہے۔میری کار اس بستی سے ذرا فاصلے پر کھڑی ہے۔یہاں کے تو راستے ہی عجیب تھے۔''

''کچھ نہیں ہوتا میں پیدل چل لوں گی۔''

اور اس آدمی کے ساتھ وہ اپنی بستی سے باہر نکل آئی تھی۔سنسان سڑک پر...... جہاں سے شہر کی روشنیاں مزید دور دکھائی دیتی تھیں۔

آدمی نے دروازہ کھولا۔دائنا نے کار کے اندر جھانک کر دیکھا تھا۔کار میں پہلے سے ہی ایک آدمی موجود تھا۔اور تب ہی دائنا کو اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا تھا لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔وہ تیزی سے وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی لیکن اگلے ہی پل دائنا کو دبوچ لیا گیا تھا۔ایک نم رومال اس کے منہ پر رکھ دیا گیا تھا اور آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی۔اسے پتا تھا کہ وہ کہاں لے جائی جا رہی ہے اور کیوں......؟اور اس کے سارے خیالات سچ ثابت ہونے والے تھے۔

وہ رات بہت طویل تھی۔اس رات میں دائنا کی ساری زندگی بیت گئی تھی۔گداز بیڈ پر کسمساتے ہوئے اس نے اپنا آپ خدا کے حوالے کر دیا تھا کیونکہ اس وقت اس فارم ہاؤس کے ایک بند کمرے میں اس کی مدد صرف خدا ہی کر سکتا تھا۔اس کی آنکھوں پر پٹی تھی اور وہ اپنے اوپر جھکے مرد کو نہیں دیکھ سکتی تھی۔پھر بھی وہ جانتی تھی کہ وہ کون تھا۔وہ ہی یہ کام کر سکتا تھا۔ایڈم راہل......

جو دنیا کے سامنے ایک نیک نام شخص بنا ہوا تھا۔جو اپنے نام کے ساتھ گوتم بدھ کے بیٹے کا نام جوڑتا تھا لیکن درحقیقت وہ راون تھا جس نے سیتا کو اغوا کر لیا تھا۔اسے دائنا کا انکار کرنا کیا اتنا ہی برا لگا تھا کہ اس نے اپنی ہوس پوری کرنے کے لیے اسے اغوا ہی کروا لیا تھا۔

رات صبح سے مل رہی تھی جب سارا کام ختم ہوا تھا اور دائنا کے آنسو بھی تب تک ختم اور خشک ہو چکے تھے۔گاڑی میں پھر سے لاد کر اسے سمبل کے ان درختوں تلے پھینک دیا گیا تھا جہاں وہ اپنی دکان سجاتی تھی۔

اصل حقیقت کیا تھی وہ دائنا بے چاری جان ہی نہیں سکی تھی۔اس کو اغوا کرنے اور پھر اس کے ساتھ زیادتی کرنے والا وہ ایڈم راہل نہیں تھ۔وہ تو......وہ تو......کوئی اور تھا۔

☆......☆......☆

چوتھا باب ثعلب مصری

”کہتے ہیں پھولوں میں ثعلب مصری اپنی خوب صورتی پر حد درجہ نازاں اور مغرور پھول ہوتا ہے۔ جیسے ہی یہ مرجھاتا ہے یہ اپنے سارے فعل باطل کر لیتا ہے۔ یہ اپنا ہی متضاد ہو جاتا ہے۔ اس لیے اس کی خوش نمائی کا پورا پورا فائدہ اٹھا لینا چاہیے۔ اسے ایک قیمتی مہرے سے بھی تشبیہہ دی جاتی ہے۔

جیسے زہر چوس زہر کو چوس لیتا ہے ایسے ہی تازہ ثعلب مصری غموں کو چوس لیتا ہے۔ یہ غم مہرہ ہے۔ بس اسے چند لمحے ہاتھ کی مٹھی میں مضبوطی سے تھامنے رکھنا پڑتا ہے اور پھر یہ اپنا معجزہ دکھا دیتا ہے۔ یہ سارے دکھوں کو کسی فوم کی طرح جسم میں سے چوس لیتا ہے۔“

بابا نے میرے ہاتھ میں ثعلب مصری کا وہ پھول اس دن پکڑایا تھا جس دن اماں کی موت ہوئی تھی اور میں آرٹ کالج کے باغ میں بیٹھی رو رہی تھی۔ اس وقت مجھے بابا کی یہ بات سخت ناپسند آئی تھی۔ مجھے دلا دینے کے بجائے وہ میرے ہاتھوں میں ثعلب مصری کا پھول پکڑا رہے تھے۔ ایک پھول بھلا کسی کے غم دور کر سکتا ہے؟

☆......☆......☆

عجیب سا دن تھا وہ...... ہوا چل رہی تھی پھر بھی دم گھٹ رہا تھا۔ سورج طلوع ہو چکا تھا پھر بھی رات جانے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ سبز گھاس کی بو دائنا کے نتھنوں میں گھس رہی تھی۔ وہ گھاس دائنا کے نجانے کتنے ہی آنسو پی چکی تھی۔

صبح جب اسے مکمل ہوش آیا تو وہ خود اپنا سامنا کرنے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔ دنیا کا سامنا اب بھلا وہ کیسے کر سکتی تھی۔ برگد کی جٹاؤں کی رسی بنا کر اس نے سمبل کی شاخ سے باندھ کر اپنے لیے ایک پھندا بنا اور پھر اس پھندے سے لٹک کر خودکشی کر لی تھی۔ سبین نجانے کتنی ہی دیر اس کی لاش کو دیکھتی رہی۔ ایک چیخ کے بعد پھر بہت سی چیخیں اس کے وجود میں گم ہو گئی تھیں۔ دائنا نے خودکشی کیوں کی تھی یہ بات اس کے جسم سے عیاں تھی۔ ایک معصوم لڑکی اپنی حرمت کھو کر اپنی زندگی ختم کر چکی تھی۔ سبین کو اور کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو اس نے قریب ہی اگے ثعلب مصری کے پھولوں میں سے ایک پھول توڑ کر دائنا کے مردہ ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ جس سفر پر دائنا روانہ ہو چکی تھی اس کے لیے بہت ضروری تھا کہ ثعلب مصری اس کے سارے دکھ چوس لے۔

اس دن اسے بابا کی بے بسی کا ادراک ہوا تھا۔ دراصل جب انسان بالکل تہی دامن ہوتا ہے تو وہ ایسے عقیدوں کو بہت

دل و جان سے چاہنے لگتا ہے جو اس کی تہی دامنی کی لاج رکھ لیں۔ بابا اس دن اتنے ہی بے بس تھے جتنی وہ اب تھی۔

☆......☆......☆

میران کے سامنے اپنے آشکاری، بابا سے ہوئی تلخ کلامی اور پھر سمبل کی شاخ سے لٹکتی دائنا کی لاش......سب سوچ سوچ کر سبین پاگل ہو رہی تھی۔ گیسٹ ہاؤس پہنچ کر اس نے جلدی سے ڈینی کو کال کی تھی۔ اب یہاں اس کا ایک لمحہ بھی مزید رہنا اسے دیوانہ کر سکتا تھا۔ اسے واپس جانا تھا۔ اپنے گھر......لاہور کے گندے سے علاقے کے ایک گندے سے گن پت روڈ پر واقع اپنے چھوٹے سے غلیظ گھر......گیسٹ ہاؤس کا پرستائش کمرہ نجانے کیوں اسے ایک دم سے کاٹ کھانے کو دوڑنے لگا تھا۔

''ڈینی مجھے واپس پاکستان جانا ہے۔'' ڈینی کے ہیلو کہتے ہی اس نے عجلت سے کہا تھا۔

''کچھ ہوا ہے کیا؟'' ڈینی نے بھی اس کی آواز سے وہی اندازہ لگایا تھا جو بابا لگا چکے تھے۔

''بہت کچھ......پلیز ڈینی! میری واپسی کا انتظام کروا دو......'' وہ بری طرح سے رونے لگی تھی۔ اتنے برے برے واقعات اس کے ساتھ ہی کیوں ہو رہے تھے۔ دائنا مر چکی تھی اور اس کی محبت فنا ہو رہی تھی۔ اسے تو یہ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایک ساتھ کس کس بات پر روئے۔ کس بات کا زیادہ غم منائے۔

''کچھ بتاؤ تو سہی......''

''اسے میری حقیقت پتا چل چکی ہے۔'' اس نے اپنی بے قراری کے حوالے سے صرف میران کی ہی بات کی تھی۔ دائنا کی لاش کی بات کرنے کا تو اس میں حوصلہ ہی نہیں تھا۔ دوسری طرف ڈینی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا وہ اس یک طرفہ بیان پر سبین کو کیسے دلاسا دے اور کیا کہے۔

''اسے سب پتا چل چکا ہے ڈینی......میرے اسمگلنگ کرنے......اور امن کا نام لے کر میرے شر پھیلانے کا......''

''تم نے اسے اپنی مجبوریاں بتائی تھیں سبین۔''

''میری مجبوریاں ہی میری کمزوری بن گئی ہیں ڈینی......وہ اتنا سچا ہے کہ میں جھوٹی پڑ گئی ہوں۔ وہ اتنا بے جھول ہے کہ اس کے آگے میرا ہر جواز جھول دار ہو گیا ہے۔ وہ اتنا کھرا ہے کہ میں ملاوٹ زدہ ہو کر رہ گئی ہوں۔''

''مجھے نہیں پتا سبین کہ وہ کون ہے۔ کیسا ہے۔ کیا سوچ رکھتا ہے۔ لیکن جس طرح مجبوری میں تم نے یہ کام کیا ہے میں جانتا ہوں۔ میں سمجھ سکتا ہوں تو وہ کیوں نہیں......تم نے اسے سب کچھ بتانا تھا۔ یقیناً اس نے سمجھ جانا تھا۔''

''میں نے اسے سب بتایا تھا لیکن اس نے مجھے اپنے دکھ سنا دیئے......اور اس کے دکھوں کے آگے میری مصیبتوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہ گئی......اس کی زندگی اتنی تلخ گزری ہے کہ میرے سارے غم بھی میری طرح چھوٹے پڑ گئے ہیں۔'' ہاتھوں

میں منہ چھپا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

''اس نے کہا کہ میں کال گرل سے بھی زیادہ بری لڑکی ہوں۔ مجھ سے ملنے کے بعد اب وہ کال گرل کو بھی عزت دینے لگا ہے۔ بولو ڈینی......کیا میں کسی کال گرل سے بھی زیادہ بری ہوں۔''

ڈینی خاموش ہو گیا۔ وہ کچھ بھی کہنے سے قاصر تھا۔

''تم مجھے واپس بلا لو ڈینی......اب میں یہاں مزید ایک دن بھی نہیں رہ سکتی......''

''لیکن......لیکن......تم واپس نہیں آ سکتیں سبین......میری مجبوری سمجھنے کی کوشش کرو......پندرہ دن میں سے پانچ دن گزر چکے ہیں۔ دس بھی کسی نہ کسی طرح گزار لو......''

''کیسے گزار لوں ڈینی......مجھ سے تو یہاں ایک لمحہ بھی نہیں گزارا جا رہا......''

''تم واپس آ کر اپنے لیے ہی مشکلات پیدا کرو گی سبین......سمجھنے کی کوشش کرو......میں تمہارے ساتھ اتنا اچھا نہیں ہو سکتا کہ اپنے لیے کوئی مشکل پیدا کروں۔'' بالآخر اس نے دوٹوک کہہ دیا۔

وہ جانتی تھی کہ اس کے پاس وہاں رہنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ کل کی ساری رات کی طرح آج کی رات بھی جاگ کر گزارنی تھی اور آنے والے دس دن بھی......

صبح ہوئی تو اس نے حائک کے ماؤتھ آرگن کی آواز سنی......لیکن ابھی تو وہ سوئی ہی نہیں تھی کہ یہ آواز اس کو جگاتی......ہمیشہ کی طرح وہ سوئی ہوتی تو جاگتی......وہ آواز جو اس کو ہر روز صبح بہت بھلی لگا کرتی تھی ایک دو روز سے اس کے اعصاب پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ پتا نہیں حائک اچھا ماؤتھ آرگن بجانا بھول گیا تھا کہ اس کے کان اب کسی بھی اچھی ساعت کو بری میں بدلنے پر قادر ہو گئے تھے۔ جب سے اس نے میران کے منہ سے ''بلاڈونا'' کے الفاظ سنے تھے تب سے اس کی ساعتوں پر کچھ بھی اچھا ہی نہیں لگ رہا تھا۔

اٹھ کر وہ کسلمندی سے چلتی ہوئی کھڑکی تک آئی تھی۔ حائک کا ماؤتھ آرگن آج کوک رہا تھا۔ اس کی تعریف نہیں کی جا سکتی تھی لیکن پھر بھی سبین نے عادتاً پاس پڑے گلدان میں سے پھول نکال کر نیچے پھینکنا چاہا تھا۔ اور پھول چھوتے ہی اس کے ہاتھ سن ہو کر رہ گئے تھے۔

گلدان کے سرخ پھول نجانے کب مرجائے تھے، کب سیاہ ہوئے تھے، کب ان کی خوشبو ختم ہوئی تھی۔ اور اب ان میں سے غلیظ بو آ رہی تھی۔ قدرت کی ایسی سازش پر سبین اپنی جگہ پتھر کی ہو گئی تھی۔

حائک اپنی مستی میں مگن، ملہار کی دھن بجاتا ہوا دور جا رہا تھا۔ سبین نے حائک کی قسمت پر رشک کیا تھا۔ جو ہر طرح کے

ماحول میں خوش تھا۔ جو گونگا تھا اور بہرہ بھی......اور سب سے بڑی بات......اپنی ان دونوں خامیوں سے بے نیاز بھی......

سبین نہیں جانتی تھی کہ یہ گونگا بہرہ حائک، کل رات سے اپنی بہن دائنا کو تلاش کر رہا ہے۔ اس کی دھن آج اسی لیے اداس ہے کہ اس کی بہن لا پتا ہے۔ یہ دھن آج تیز بھی اسی لیے ہے کہ حائک تو چلا چلا کر دائنا کا نام نہیں پکار سکتا، لیکن وہ اتنا ضرور جانتا ہے کہ اس کی بہن اس کی دھن سن کر اس تک ضرور پہنچ جائے گی۔

کاش سبین جانتی کہ حائک، دائنا کا بھائی ہے۔ تو وہ اسے بتا دیتی کہ اس کی بہن آج صبح ہی سمبل کے درخت پر پھندا ڈال کر خودکشی کر چکی ہے اور اب اس کی لاش سرد خانے میں اپنے کسی وارث کی منتظر ہے۔

☆......☆......☆

باقی کے دس دنوں میں وہ تین بار میران کے پاس گئی تھی۔ اس کے کلب...... وہ جاتی اور وہاں ایک کونے میں بیٹھ جاتی......وہ مسکرا رہا بھی ہوتا تو اسے دیکھ کر خاموش ہو جاتا......اور پھر اپنے آپ کو کام میں اس قدر غرق کر لیتا کہ اسے سبین کے اٹھ کر واپس چلے جانے کی خبر نہ ہوتی......کبھی وہ کچن میں جاتا اور پھر واپس پلٹ کر نہ آتا......سبین تب بھی وہاں ہی بیٹھی رہتی......وہ ماضی کے خیال کے تحت مسکراتی رہتی کہ وہ بار کے پیچھے اپنے کرتب دکھا رہا ہے، مسکرا رہا ہے، اور اس کی آنکھوں میں اس کے لیے محبت ہی محبت ہے۔

وہ ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ لیتی اور اسے دیکھتی رہتی......

''تم یہاں نہ آیا کرو......'' ایک دن اس نے اس کے پاس آ کر کہا تھا۔ ''مجھے اذیت دینے میں کوئی کمی رہ گئی تھی جسے تم یہاں آ کر پورا کرتی ہو؟''

ہاں......وہ واقعی اسے اذیت ہی تو دے رہی تھی۔ محبت کے اصولوں میں اگر ایک اصول دوسرے کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھنے کا بھی تھا تو وہ اس اصول پر پوری نہیں اتری تھی۔ وہ اگلے دن پھر سے کلب نہیں گئی تھی لیکن رش جھیل ضرور چلی گئی تھی جہاں وہ بیٹھتا تھا۔ جہاں اس نے پہلی بار پانی کے شفاف آئینے میں اس کا عکس دیکھتے ہوئے دعا کی تھی کہ اسے بے شک میران ملے یا نہ ملے لیکن اس کی یہ پرچھائیں کبھی اس سے دور نہ جائے۔ وہ جب جب یہاں آئے......اسے جھیل کے پانی میں اس کا عکس دیکھنے کو مل جائے۔ وہ اس عکس کو دیکھ دیکھ کر ہی ساری زندگی گزار دے گی۔

اب وہ اسے دیکھ دیکھ کر ایسے اپنے دن گزار رہی تھی کہ اپنی زندگی ہی ختم کر رہی تھی۔

وہ شروع سے ہی ایسی بے سلیقہ رہی تھی۔ دعا مانگنا اسے کبھی آیا ہی نہیں تھا۔ اسے ابھی تک یہ ہی پتا نہیں چل سکا تھا کہ اسے مانگنا کیا ہے؟ کیسے مانگنا ہے؟ کتنا مانگنا ہے۔ اسے وہ مل جاتا جو وہ مانگتی تھی لیکن پھر اس سے برے طریقے سے جاتا بھی تھا جو

اس کے وہم گمان میں بھی نہیں ہوتا تھا۔

اس نے اس سارے وقت کو اس وقت کی دعا کی قبولیت جانا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ تو صرف ایک حصہ تھا۔ قبولیت کے اصل لمحے تو ابھی آنے والے تھے۔ جو اس سب سے کہیں گنا زیادہ اذیت ناک ثابت ہونے والے تھے۔

رش جھیل میں چمکتے سورج کو دیکھ کر ہی اس نے پہلی بار جانا تھا کہ لوگ سورج پرست کیوں بن جاتے تھے۔ وہ بھی سورج پرست تھی۔ ہر چمکتی ہوئی چیز کو دیکھ کر اس کے پاس جانے کی آرزومند ہو جاتی تھی۔

ایک دن اس کے وہاں جانے سے پہلے ہی میران وہاں جاتا تھا۔ ندی کے پانی میں مشکل کا حل ڈھونڈنے آیا تھا۔ سبین ہمت کر کے اس کے پاس ہی بینچ پر بیٹھ گئی تھی۔ وہ آج گھاس پر نہیں بیٹھا تھا۔ وہ قدرت کو انجوائے نہیں کر رہا تھا۔ محبت کا لطیف لینے کے بعد شاید اس کا ہر طرح کے لطف سے دل اچاٹ ہو گیا تھا۔

وہ جھیل کے پانی میں کنکر ڈال رہا تھا۔ کنکر سے ساکن جھیل میں حرکت پیدا ہوتی تھی اور پھر خاموش......اس کی ذات کی سی......خاموشی......اس کے اپنے قریب بیٹھنے پر بھی اس نے اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

''میں کل واپس جا رہی ہوں۔''

وہ اب بھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔

''ہوسکتا ہے کہ پھر کبھی نیویارک نہ آؤں۔ انہوں نے کہا ہے کہ اب وہ مجھے ہر بار الگ الگ شہر میں بھیجیں گے۔''

کنکر اس کے ہاتھ میں ہی رک گیا تھا۔ ایک لمحے کو......پھر دوبارہ اس نے پہلے سے بھی زیادہ شدت سے اسے پرے اچھالا تھا۔

''مجھے ہر صورت آٹھ بار اور آنا ہے۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے......میں نے ڈینی سے بات کی تھی لیکن اس نے کہا ہے کہ اب کچھ نہیں ہوسکتا......مجھے آنا ناں ہی پڑے گا۔ ورنہ میری جان کو خطرہ ہے۔'' وہ ایک بار پھر سے اپنی صفائی دینے کی کوشش کرنے لگی تھی۔

اب اس کے ہاتھ سست ہو چکے تھے۔ جیسے اس میں اتنی ہمت بھی نہ ہو کہ وہ ایک خشک ٹہنی یا پتے کو بھی اٹھا کر پانی میں پھینک سکے۔

''میں بہت شرمندہ ہوں کہ میں نے تم سے جھوٹ بولا اور جھوٹ بھی مذہب کو لے کر بولا......مجھے کچھ بھی کہہ دینا چاہیے تھا۔ کچھ بھی......لیکن یہ جھوٹ نہیں بولنا چاہیے تھا۔'' وہ رو رو کر اس قدر تھک چکی تھی کہ اب اس کی آنکھوں کے آنسو بھی خشک ہو چکے تھے۔

ہوا میں میران کے تنفس کی جنبش پھیلی تھی۔ جس میں جذبات تھے اور بے قراری بھی......

''تمہیں کوئی ایسا کام ہی نہیں کرنا چاہیے تھا کہ تمہیں جھوٹ بولنا پڑے۔'' وہ پہلی بار بولا تھا۔ سبین نے شکر ادا کیا تھا۔

''میں مجبور تھی...... میں یہ نہیں کہوں گی کیونکہ یہ میں بہت بار کہہ چکی ہوں لیکن میں یہ ضرور کہوں گی کہ اب میں مجبور ہوں۔ مجھے ہر صورت آٹھ بار اور آنا ہے۔ میں تو بہ بھی نہیں کر سکتی...... ورنہ وہ لوگ مجھے مار دیں گے۔ یہ بات تم سے زیادہ اور کون جان سکتا ہے۔ تم اسی شہر کے باسی ہو......''

کنکر پھر ندی میں جاتے جاتے رک گیا تھا۔

''اب مجھ سے کیا چاہتی ہو؟''

''میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے معاف کر دو...... محبت بے شک مت کرو......''

کیا یہ سب اتنا ہی آسان تھا جتنا وہ کہہ رہی تھی۔

''میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ لیکن تمہیں میری ایک بات ماننی پڑے گی۔ اگر تم بھی مجھ سے محبت کرتی تھیں تو......''

''بولو...... میں تمہاری ہر بات ماننے کے لیے تیار ہوں۔'' اندر ہی اندر وہ پر جوش ہو کر بولی۔

''دوبارہ کبھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کرو گی۔'' سر اٹھا کر اس نے سبین کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

ایسا مطالبہ......؟ سبین نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اسے بری بھی کر رہا تھا اور کال کوٹھری کی سزا بھی دے رہا تھا۔ معاف بھی کر رہا تھا تو دار کے اوپر چڑھ جانے کو بھی کہہ رہا تھا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ اسے سر عام پھانسی دے دیتا۔

''اگر محبت کرتی ہو تو دو وعدہ......'' اس نے اپنا ہاتھ آگے کیا۔ وہ محبت کے نام پر قتل چاہ رہا تھا۔ محبت کا بھی اور اس کا بھی...... اور چاہتا تھا کہ اس پر کوئی نام بھی نہ آئے۔ سبین ہی وعدہ دے دے۔

بات محبت کی آ گئی تھی۔ اب اسے ہر صورت ثابت قدم رہنا تھا۔

''میں وعدہ کرتی ہوں۔'' اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا اور سسکاری بھر کر رہ گئی۔ یہ ہاتھ اس نے عمر بھر کے لیے تھام لینا چاہتا تھا لیکن اب تھام کر وہ عمر بھر نہ ملنے کی قسم کھا رہی تھی۔

''میں وعدہ کرتی ہوں دوبارہ کبھی تمہیں اپنی شکل نہیں دکھاؤں گی۔''

''مجھ سے ملنے کی کوشش بھی نہیں کرو گی۔'' میران کی شاید تسلی نہیں ہو پا رہی تھی۔

''ہاں...... تم سے ملنے کی کوشش بھی نہیں کروں گی۔''

''مجھے بھول جاؤ گی۔''

''ہاں...... پوری کوشش کروں گی۔''

''ہرصورت ان سب باتوں پر قائم رہو گی۔''

''ہاں...... ہرصورت ان باتوں پر قائم رہوں گی۔''

''مجھے یاد بھی نہیں کرو گی۔''

سبین نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹنا اسے مشکل لگ رہا تھا۔ میران نے اس کی طرف دیکھا۔ ٹھیک ہے۔ آخری نہ سہی...... لیکن وہ چار وعدے لے چکا تھا۔ اس کی تسلی کے لیے یہ ہی بہت تھا۔

اور اگلے ہی پل سبین وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ اسی وقت سے وعدوں کی پاسداری شروع ہو گئی تھی۔

بنا پیچھے دیکھے وہ آگے ہی آگے بڑھتی رہی...... تصور کی آنکھ سے وہ دیکھ سکتی تھی کہ میران اب قدرے مطمئن تھا۔

اس کا اطمینان اسے مار رہا تھا۔

☆......☆......☆

''زخم چندن کا رڑھ کے درخت کی طرح کے ہوتے ہیں۔ یہ چلتے کم ہیں اور سلگتے زیادہ...... ان میں مہک بھی ہوتی ہے تو مہلک...... دھواں بھی ہوتا ہے تو کڑوا...... ان کی شاخیں اتنی لمبی ہوتی ہیں کہ یہ ہمارے دل سے نکل کر ہمارے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ یہ ایک بار جڑ پکڑ لیں تو پھر ان کو کاٹا نہیں جا سکتا...... ان کے اپنے اندر لاتعداد نئے بیج ہوتے ہیں۔ اور مجھے لگتا ہے اب ان نئے بیجوں کو اپنی ذات میں سے نکالنے میں مجھے ساری زندگی لگ جائے گی۔''

☆......☆......☆

سورج آنکھ مچولی کھیلتا ہوا نمودار ہو رہا تھا۔ رات کہیں گھات لگا کر چھپنے کی تیاری کر رہی تھی۔ ننھی سی کرن کی کسی ایک برچھی نے سبین کے پپوٹوں پر رقص کیا تو وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

اس کے لباس اور بالوں پر خشک تنکے لگے ہوئے تھے۔ رات وہ کسی باغ میں ہی سو گئی تھی۔ جیسے کہ ایک بار وہ آرٹ کالج میں باغ میں سو گئی تھی۔ اس رات رشید نے اسے یک مشت تین بار طلاق دی تھی۔ اب میران نے اس سے چار وعدے لیے تھے۔ اس واقعے کا اعادہ ہونا تو بنتا تھا۔ وہ تو یہاں بہت اونچائی حاصل کرنے آئی تھی اور خاک اس کی مقدر بن گئی تھی۔

کمرے میں واپس آ کر وہ بیڈ پر ڈھے گئی۔ اس کے دماغ میں پچھلے تمام واقعات چل رہے تھے۔ میران کا اسے پیار سے پکارنا...... اس سے چھپا کر اسی کے لیے ڈائمنڈ رنگ خریدنا، خود کو سٹاریکا کا پائن ایپل کہنا...... پھر شرارتاً گردن کی پشت پر کھجانا...... روتے روتے وہ بے حال ہو چکی تھی۔

یادوں کی طرح اس نے اپنا سارا سامان بھی جلدی سے پیک کر لیا تھا۔ وہ نیویارک کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنے والی تھی۔ اب اسے کبھی نیویارک آنے کا کہتا تو بھی اس نے مر کر بھی نیویارک نہیں آنا تھا۔ وہ اپنی جان دے سکتی تھی لیکن اب یہاں دوبارہ نہیں آ سکتی تھی۔ وہ گروپ کو یہ تو کہہ سکتی تھی کہ وہ اسے کوہ قاف بھیج سکتے ہیں۔ لیکن نیویارک...... ہرگز نہیں...... روشنیوں کا یہ شہر اس کے لیے اسکی محبت کا مدفن ثابت ہوا تھا۔

سامان پیک کرتے ہوئے اس کے ہاتھ میں رنگ آ گئی تھی۔ ڈائمنڈ کی رنگ...... میران کی طرف سے دی ہوئی۔

''یہ میں نے ممی کے لیے نہیں لی تھی۔ بلکہ تمہارے لیے ہی لی تھی۔ ''ڈائمنڈ'' کی رنگ......''

''تم نے ٹھیک ہی کہا تھا سبین...... لڑکیوں کو ڈائمنڈ ہی پسند ہوتے ہیں اور اگر انہیں ڈائمنڈ نہ ملے تو وہ کچھ بھی کر گزرتی ہیں۔'' اس نے نخوت سے کہا تھا۔ یاد کرتے ہوئے سبین کے دل کی حرکت بند ہوتی جا رہی تھی۔

وہ اس رنگ کو کیسے سنبھال کر رکھ سکتی تھی۔ اس رنگ کے ساتھ کیسی تلخ یاد وابستہ تھی۔ پھر بھی اس نے رنگ کو اپنی انگلی پر پہن کر دیکھا تھا۔ لاکھ کوشش کے باوجود بھی اس کا تخیل اس لمحے کی سچائی کو نہیں چھو سکا تھا جب میران نے اسے یہ رنگ پہنانی تھی۔ کیسا حسین پل ہوتا تھا وہ...... کیسا خوش گوار...... سبین کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ ثبت ہو جاتی تھی جو پھر ساری زندگی اس کے چہرے سے کوئی نہیں چھین سکتا تھا۔

لیکن اب اس کے تخیل کا حقیقی ہونا ناممکن تھا۔ وہ اسے یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ محض اس کی زندگی بھر کی اکلوتی اچھی یاد کے لیے اس کو رنگ پہنا دے۔ اپنے ہاتھوں سے...... وہ نہیں کہہ سکتی تھی اور پھر ''انکار'' تو کسی صورت نہیں کر سکتی تھی۔ اب جب کہ میران کو اس کی ''ہاں'' درکار ہی نہیں تھی تو وہ اداکاری میں بھی اس کو رنگ کیوں پہناتا......؟

سبین اسے زندگی بھر شکل نہ دکھانے کا وعدہ دے چکی تھی۔ اسے بھول جانے کا...... اس سے نہ ملنے کا...... اور سب سے بڑی بات، وعدوں پر قائم رہنے کا بھی...... سچی محبت کے نام پر پکے وعدے...... اب اسے اپنے وعدوں کی لاج نبھانی تھی۔ محبت کی پاسبانی تو اس سے نبھائی نہیں گئی تھی۔ اب ضروری تھا کہ وہ تھوڑی بہت شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے وعدوں کو نبھاتی...... وہ مر کر بھی میران کو اپنی شکل نہ دکھانے کا تہیہ کر چکی تھی۔ ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہونا تھا۔ یہ ہی تھا اس کا نصیب...... اسے نیویارک آ کر دولت مل چکی تھی۔ محبت کا وعدہ تو ویسے بھی ڈینی نے نہیں کیا تھا۔ وہ کسی سے شکوہ نہیں کر سکتی تھی۔

اس نے گھڑی دیکھی، فلائٹ میں ابھی پانچ گھنٹے باقی تھے۔ لیکن پھر بھی اس نے چلنے کی تمہید باندھتے ہوئے کمرے پر الوداعی نظر ڈالی...... ائیر پورٹ پر بیٹھنا بھی بے کار تھا اور یہاں پر رکنا بھی...... یہاں کا تو ایک ایک پل کوڑیالا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ میران دروازے میں ہی کہیں کھڑا اسے ''بیلا ڈونا...... بیلا ڈونا'' کہہ رہا ہے اور دور کہیں چکی چل رہی ہے...... جو سبین کو روز

رات کو سوتے وقت اپنے بیڈ کے نیچے چلتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ بہت قباحتیں مقید ہو چکی تھیں اس جگہ پر...... اب اس جگہ سے جلد از جلد چلے جانا ہی بہتر تھا۔

بیگ کی زپ بند کرتے ہوئے وہ اپنے آنسو روک رہی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی تھی۔

اس نے دروازہ کھولا تھا اور اگلے ہی پل اس کے انسانی جسم نے جب دروازے کا سا روپ دھار لیا تھا۔ اس کے سامنے میران کھڑا تھا۔ سبین کے آنسو جو رکے ہوئے تھے جاری ہونے کے بجائے بنجر ہو گئے۔

اب وہ کون سا وعدہ لینے آیا تھا؟

''مجھ سے شادی کرو گی......؟ ابھی......؟ اسی وقت......؟'' میران نے کسی قدر عجلت سے پوچھا تھا۔ سبین کے پیروں تلے سے تین منزلہ گیسٹ ہاؤس ایک جھٹکے میں نکل گیا تھا۔

☆......☆......☆

نیو یارک کے انتہائی مصروف ائیر پورٹ پر انت کا رش تھا۔ سبین ریلنگ کو تھامے کھڑی تھی۔ اس کی فلائٹ میں ایک گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔ اسے اب اندر چلے جانا چاہیے تھا لیکن وہ اندر نہیں جا رہی تھی۔ وہاں ہی کھڑی تھی۔ جہاں میران کھڑا تھا۔ وہ بھی اسے اندر جانے کو نہیں کہہ رہا تھا۔ دونوں کے پاس کرنے کو کوئی بات نہیں تھی۔ پھر بھی سبین اس سے ڈھیر ساری باتیں کر لینا چاہتی تھی۔

ائیر پورٹ پر آنے سے پہلے وہ دونوں ایک قریبی اسلامی سنٹر میں گئے تھے۔ جہاں دونوں نے نکاح کیا تھا۔ میران کے کلب کے چند دوست تھے، جو گواہ تھے۔ اس کے علاوہ میران کی پڑوسن میری تھی، لیکن ربیکا نہیں تھی۔ سبین کے لیے وہ سب پل اس قدر غیر متوقع اور خوش کن تھے کہ وہ ابھی بھی ان کو ہی سوچے جا رہی تھی۔ میران کی نام کی قبولیت بھرنا ابھی تک اس کے لبوں پر تھا۔ وہ ساری زندگی قبول ہے۔ قبول ہے۔ کی تسبیح کر سکتی تھی۔

''تم اس شادی کو بس ایک اسٹیٹمنٹ سمجھو گی سبین۔'' دیوار پر نصب نیو سائن بورڈ پر فلائٹس کے شیڈول کو دیکھتے ہوئے بالآخر میران نے وہ سب کہنا شروع کیا تھا جو وہ نکاح سے لے کر اب تک کہنے کے لیے مناسب الفاظ کی جوڑ توڑ کر رہا تھا۔

سبین پہلے سے ہی جانتی تھی کہ وہ ایسا ہی کچھ کہے گا۔

''یہ شادی میں نے اس لیے کی ہے کہ اگر تم پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو میری بیوی ہونے کی حیثیت سے......ایک امریکی ہونے کی حیثیت سے تم پر زیادہ سختی نہیں کی جائے گی۔ تم اب میری قانونی بیوی ہو۔ یہ بس ایک کاغذی شادی ہے۔'' میران نے ایک ایک لفظ اسے سمجھاتے ہوئے ادا کیا تھا کہ وہ کسی طرح کی غلط فہمی میں نہ رہے۔ وہ اس شادی کو ایک اسٹیٹمنٹ ہی سمجھے۔

''ٹھیک ہے......تمہارا شکریہ......'' وہ بمشکل ہی یہ کہہ سکی تھی۔ اس نے اس سے شادی بھی کی تھی تو اس پر ایک احسان

چڑھاتے ہوئے۔

''پھر بعد میں......؟'' سبین نے خود سے یہ سوال کیا تھا۔ وہ میران کا پورا منصوبہ جاننا چاہتی تھی۔ اب بات جب کھل ہی رہی تھی تو ٹھیک تھی کہ مناسب طریقے سے مکمل بھی ہو جائے۔ وہ اسے کسی غلط فہمی میں رکھنے کا روادار نہیں تھا اور وہ کسی غلط فہمی کی خواہش نہ رکھتی تھی۔

''پھر......تم آزاد ہوگی۔ اپنے آٹھ دفعہ کے ٹور کے بعد......'' میران کے لہجے میں طنز تھا۔ سبین اپنی بے چارگی پر گھٹ کر رہ گئی تھی۔

''پھر ہم دونوں الگ ہو جائیں گے۔ ایک دوسرے سے......'' اس نے پرے دیکھتے ہوئے کہا۔ کوئی جہاز رن وے پر اڑان بھر گیا تھا۔ اس کا شور اتنا بلند تھا کہ میران کی یہ بات نہ سبین نے سنی اور نہ خود میران ہی سن سکا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولی تھی۔

''مجھے نہیں پتا میں نے یہ کیوں کیا ہے۔ لیکن بس......'' اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں......میں خود تمہیں چھوڑ دوں گی۔ تم سے نہ بھی چھوڑا گیا تو......'' وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ نیکی کرنے کے بعد پچھتائے۔ آخر کو اس نے اس سے وعدہ کیا تھا۔ پاسداری تو اسے نبھانی تھی۔

''خدا حافظ......اپنا خیال رکھنا......'' میران نے جاتے وقت کہا تھا۔ خود پر اچھی طرح سے قابو رکھنے کے باوجود بھی سبین کا سانس اکھڑ کر رہ گیا تھا۔

''خدا حافظ......'' وہ وہاں ہی کھڑی میران کو بہت دور تک جاتا ہوا دیکھتی رہی تھی۔

دور آسمان کے پیالے میں ٹنگا چاند بھی اب پیندے سے لگنے لگا تھا۔ اس کی دودھیا روشنی کم ہونے لگی تھی۔ آسمان کا پیالہ شاید لوہے کی دھات کا تھا۔ اس میں زنگ ہی زنگ تھا۔ کیسی اندھی روشنی دھرتی پر پھیلتی جا رہی تھی۔

سامان کی چیکنگ، بورڈنگ پاس حاصل کرنے اور پھر جہاز میں سوار ہونے تک سبین کے محسوسات بدل چکے تھے۔ وہ اب میران کی بیوی تھی۔ یہ احساس اس قدر فرحت بخش تھا کہ باقی سارے منفی خیالات کو نگل گیا تھا۔ مسکراہٹ اس کے چہرے سے جدا ہی نہیں ہو رہی تھی۔ ائیر ہوسٹس اور جہاز میں اس کے پاس بیٹھے مسافروں نے بھی اسے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

وہ اب سبین قطب الدین نہیں بلکہ ''سبین میران'' تھی۔ اللہ......کہیں وہ خوشی سے مر ہی نہ جائے۔ میران......خدا کی رحمت......یہ رحمت اب اس کے نام کے ساتھ جڑ گئی تھی۔ ایک ایسے وقت میں جب وہ سوچ رہی تھی کہ اب وہ کبھی بھی میران کو نہیں دیکھ سکے گی۔ وہ اس کا شوہر بن گیا تھا۔ وہ جو اس کی محبت کی مجرم بنی کھڑی تھی اس نے اسے اپنا محرم بنا لیا تھا۔

سبین ان باتوں کو تو سوچ ہی نہیں رہی تھی جو اس نے ائیر پورٹ پر خدا حافظ کہنے سے پہلے کہی تھیں۔ وہ اب اس کا تھا یا وہ اب اس کی تھی......اس کے لیے یہ احساس ہی کافی تھا۔

''تم اس شادی کو بس ایک اسٹیٹمنٹ سمجھو سبین......''

''ہاں میران......میں اس شادی کو بس ایک اسٹیٹمنٹ ہی سمجھوں گی۔ایک ایسی اسٹیٹمنٹ جس پر میری موت ہی مجھے تم سے الگ کروا سکے گی۔تم مجھے چھوڑنا بھی چاہو تو نہیں چھوڑ سکو گے۔میں تمہیں ایسا کرنے ہی نہیں دوں گی۔میں گم ہو جاؤں گی۔ بہری ہو جاؤں گی اور اندھی بھی......میں ایسے الفاظ نہ دیکھ سکوں گی اور نہ ہی سن سکوں گی جس کا مفہوم یہ ہو کہ اب تم اور میں ایک نہیں رہے۔ہاں......اگر تم چاہو گے تو میں اپنا وعدہ نبھاؤں گی۔میں تمہیں چھوڑ دوں گی۔لیکن طلاق لے کر نہیں......بلکہ خود کو جان سے مار کر......اور ایسا تم مجھے کرنے نہیں دو گے۔اتنا تو میں تمہیں جانتی ہی ہوں۔''

کھڑکی سے باہر کے افق کے جامنی اور نارنجی دھار کو دیکھتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے وہ خود سے باتیں کیے جا رہی تھی، کیے جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

''تمہارا بہت شکریہ میران تم نے میری بات مان لی......'' اسلامی سنٹر سے واپس آنے کے بعد اس نے ربیکا کو اپنا منتظر پایا تھا۔

''آپ کی نہ مانتا تو کس کی مانتا ممی......آپ نے کبھی مجھ سے کوئی ضد کی ہی نہیں......کرنے کو کچھ کہا ہی نہیں......میرے کان تو ہمیشہ ترستے ہی رہے کہ آپ مجھے کچھ کہیں۔غصے میں یا پیار میں......کوئی فرمائش کریں،ضد کریں،حکم دیں،یا کچھ بھی......اور دیکھیے آج آپ نے کس کام کی ضد کی جسے کرنے کو میں راضی ہی نہیں تھا۔''

''میں تو شاید ساری زندگی تمہاری گناہ گار رہوں گی میران......کیونکہ میں نے ایک بار محبت کرنے کا گناہ جو کر لیا ہے۔تم جانتے ہو نا کہ محبت کیسی چیز ہے۔اب تو تم جان ہی گئے ہو گے۔جب ہم محبت میں ہوتے ہیں تو ہمیں لگتا ہے کہ ہمیں موت بھی جدا نہیں کر سکتی ہے۔لیکن جب ہم جدا ہو جاتے ہیں تو پھر تمنا کرنے کے باوجود موت بھی نہیں آتی......کیسی کیسی متضاد چیزوں سے سامنا کرواتی ہے ناں یہ محبت......''

''ٹھیک کہا آپ نے ممی......ایک طرف میں سبین سے بے حد نفرت کرنے لگا تھا اور اب اس سے شادی کر کے آ رہا ہوں۔''

''تم سبین کو بہت زیادہ سزا دے رہے تھے۔جو آپ سے محبت کرتے ہیں ان کو اتنی بڑی سزا نہیں دینی چاہیے۔''

''میں نے اس کی سزا کو خود کاٹنا شروع کر دیا ہے ممی......وہ تو میرا نام پا کر مطمئن ہے لیکن میں اسے پا کر اسے حاصل نہیں

کر سکا۔ وہ میری دسترس میں ہے اور میں اسے چھونا گناہ سمجھ رہا ہوں۔"

"ایک دن سب ٹھیک ہو جائے گا میران......"

"نہیں ممی...... کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ کیونکہ سب وقت نے نہیں...... مجھے اس نے ٹھیک کرنا تھا اور ہمارے راستے اب مل کر بھی جدا جدا ہیں۔"

"لیکن یہ راستہ ایک ہی منزل کو جاتا ہے۔ محبت کی منزل کو......"

"میں نے آپ کے کہنے پر اس سے نکاح تو کر لیا ہے ممی...... مگر مجھے یہ مت کہیے گا کہ میں اسے اپنا بھی لوں۔"

"مجھے کہنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ وقت آنے پر تم خود ہی اسے اپنا لو گے۔"

میران نے چونک کر ربیکا کی طرف دیکھا تھا۔

"تم نے میری بات نہیں مانی...... اپنی محبت کی بات مانی ہے۔ تم چاہتے تھے کہ کوئی تم سے کہے یہ سب کرنے کو...... کوئی تمہیں فورس کرے کہ تم سبین سے نکاح کر لو، اسے اپنا لو...... اور تم نے ایسا ہی کیا ہے۔"

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن......"

"خود کو کوئی ایسا وعدہ مت دینا جو تم نبھا نہ سکو میران......" ربیکا نے اسے جلدی سے ٹوکا تھا۔ میران کو پہلی بار ایسا لگا تھا کہ آج ربیکا نہیں بلکہ اس کی ماں بول رہی ہے۔

"اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ جو میں نے ایسا نہ کیا تو غلطی کروں گا۔"

"محبت میں کوئی غلط یا صحیح نہیں ہوتا میران...... محبت بیک وقت جتنی نازک اتنی مضبوط بھی...... میں یہ نہیں کہوں گی کہ سبین جو اپنے ساتھ کر رہی ہے وہ ٹھیک ہے۔ لیکن جو تم اس کے ساتھ کر رہے تھے وہ غلط تھا۔"

"آپ مجھے غلط کہہ رہی ہیں؟"

"ہاں...... تمہیں ہی تو ایسے وقت میں راست رہنا تھا اور تم ہی اس سے بدظن ہو گئے۔ کسی کی اچھائی دیکھ کر انسان خود بھی اچھا ہونے کی سوچتا ہے۔ کیا پتا وہ تمہاری محبت کی وجہ سے ہی نیکی کی طرف مڑ جائے۔"

"اسے ہر صورت آٹھ بار...... آنا ہے۔ یہ گناہ کرنے...... ایسا گھناؤنا گناہ کرنے......"

"تو قبول کر لو اس کے گناہ کو......"

"کیسے قبول کر لوں ممی میں...... نظروں کے سامنے کی چیز کو کیسے ان دیکھا کر دوں۔"

"یوں سمجھو کہ تم نے کچھ دیکھا ہی نہیں......" "آپ نے بابا کو اپنی آنکھوں کے سامنے موت کے منہ میں جاتے دیکھا تھا

اور ابھی تک آپ ان کی موت پر یقین نہیں کر سکی ہیں اور مجھے کہہ رہی ہیں کہ میں سامنے کے منظر سے خود کو غافل کر لوں۔'' عین موقعے پر اس نے ربیکا پر لفظوں سے بھرپور چوٹ کی تھی۔ ربیکا کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ ان کے بیٹے نے ان کا اور اپنا کیا خوب موازانہ کیا تھا۔

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں میران...... میں نے پچیس سال رو کر گزار دیئے ہیں۔ میں نہیں چاہتی کہ اب کوئی اور ربیکا بنے......نہ میرا بیٹا اور نہ سبین......''

میران، ربیکا کے لہجے اور بات سے دکھی ہو گیا تھا۔

''تم سمجھو وہ یہاں ہے ہی نہیں اور نہ ہی تھوڑے عرصے تک آئے گی۔ اس کا معاہدہ جب ختم ہو جائے گا تو ہم سب کہیں دور چلے جائیں گے۔ اس جگہ، اس شہر سے کوسوں دور......ہم تینوں وہاں ایک ساتھ رہیں گے۔ پہاڑوں پر......اور ایک نئی اور بے فکر زندگی گزاریں گے۔''

ربیکا کے منہ سے ایسی خوش کن باتیں سن کر میران بے اختیار ہی مسکرایا تھا۔ ایک عرصے بعد یا شاید پہلی بار ربیکا نے مستقبل کے حوالے سے کچھ امید افزا باتیں کی تھیں اور ایسا ارادہ ظاہر کیا تھا کہ وہ بھی آنے والی زندگی میں خوش رہنا چاہتی ہے۔ مسکرانا چاہتی ہے۔

''مجھ سے وعدہ کرو کہ تم سبین کو کبھی نہیں چھوڑو گے۔ نکاح تو کر ہی چکے ہو......اب اسے اپنی بیوی بھی بنا لو گے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اسے کبھی نہیں چھوڑوں گا۔ اب خوش......؟'' ربیکا خوش تھی اور وہ اسے کسی صورت اداس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''ہم پہاڑوں پر جا کر ایک نیا گھر بنائیں گے میران......چھوٹا اور کوزی سا گھر......وہاں تمہارے اور سبین کے بچے ہوں گے۔ میں ان کے ساتھ کھیلا کروں گی اور اپنے ماضی کے سارے غم بھول جاؤں گی۔''

''کیا آپ وہاں بھی عیسیٰ کو یاد کیا کریں ڈگی؟'' وہ تسلی چاہتا تھا۔

''اسے اب یاد کرنے کی ضرورت نہیں رہی میران...... وہ میری روح میں اتر چکا ہے۔'' ربیکا کھڑکی سے پار دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

☆......☆......☆

سبین پاکستان آ گئی تھی۔ ایک بار پھر سے واپس جانے کے لیے......میران کے پاس......اپنے شوہر کے پاس......اللہ ......میران کے حوالے سے ''شوہر'' کا لفظ اسے کس قدر پیارا لگ رہا تھا۔ دن رات وہ اپنا اور میران کا نام ایک ساتھ بول بول کر

خوش ہو رہی تھی۔ بابا نے اس کی یہ خوشی نوٹ کی تھی۔

"مجھے نہیں ملواؤ گی اس سے...... مجھے بھی تو پتا چلے کہ میری بیٹی نے کس شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

لمحے بھر کے لیے اس کی مسکراہٹ غائب ہوئی تھی۔

"جی...... جیسے ہی ممکن ہو سکا۔" اور اندر ہی اندر وہ جانتی تھی کہ فی الحال یہ ناممکن ہے۔ پاکستان آنا تو دور کی بات، میران تو شاید فون پر بھی بابا سے بات کرنے کی حامی نہ بھرے۔

"کام کیسا ہوتا ہے وہاں......؟"

"بہت اچھا...... جدید بنیادوں پر...... جیسا کام ہم کرتے ہیں یہ تو بہت پرانا ہو چکا ہے بابا...... اس قدر نئے نئے انداز کے سانچے آ چکے ہیں کہ کیا کہ کیا بتاؤں...... یہ ہاتھی، گھوڑے، شیر تو ان کے آگے صفر ہو گئے ہیں۔ چاک پر بھی وہ نت نئے اسٹائل اور طریقے سے کام کرتے ہیں۔"

"تمہارا دل لگ گیا ہے کام میں......" بابا کو یوں تشویش تھی کہ یہاں تو وہ ہر وقت چڑی رہتی تھی پھر وہاں کیسے خوش ہو کر چونے کا کام کر رہی تھی۔

"جی بابا......"

"محبت سے سیکھ رہی ہو......"

"جی...... بہت اچھی طرح سے...... وہاں سب بہت خوش ہیں مجھ سے۔"

"تو پھر کچھ نیا بنا کر دکھاؤ۔" بابا نے فرمائش کرنے والے انداز میں کہا تھا۔ سبین گھبرا گئی تھی۔

"بتایا تو ہے کہ ہاں ہاتھ سے کام نہیں ہوتا...... نئی نئی طرز کے سانچے ہیں وہاں پر...... اگلی بار آؤں گی تو وہاں سے ایک سانچہ لیتی آؤں گی۔ وہ دیکھیے گا آپ......"

"اچھا......"

چار دیواری میں بند بابا کیا جانتے تھے کہ باہر دنیا کس قدر بدل چکی ہے۔ چونے سے سونے کا کام کس طرح لیا جا رہا ہے۔ مسکرا کر مطمئن سے انداز میں اسے دیکھتے ہوئے وہ باہر چلے گئے تھے۔ وہ خوش تھے کہ ان کی بیٹی نہ صرف ان کا فن سیکھ رہی ہے بلکہ اچھے سے اور جدید بنیادوں پر سیکھ رہی ہے۔

وہ کیا سیکھ رہی تھی اور کیا سیکھ کر آئی تھی یہ بات بابا کو جلد ہی پتا چلنے والی تھی۔

☆......☆......☆

ڈینی نے اب کی دفعہ سبین کو کافی سارے پیسے دے دیئے تھے۔جنہیں ایک بار پھر ہاتھ میں پکڑ کر وہ بے یقینی سے انہیں دیکھتی رہی تھی۔

''میں نے اس بار تم سے نیویارک میں بھی پیسے لیے تھے ڈینی......وہ ان میں سے کاٹ لیے ہیں تم نے۔''

''ہاں......وہ کاٹ کر ہی دے رہا ہوں۔'' ڈینی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔وہ جانتا تھا کہ اس کے اندر کیا چل رہا ہے۔

پیسے گننے میں اسے پورے پندرہ منٹ لگ گئے تھے۔پھر ان پیسوں سے کرنے والے ضروری کام کی لسٹ بنانے میں دو گھنٹے......دو گھنٹے کی تھکن کے بعد وہ سونے کے لیے لیٹ گئی تھی،لیکن اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔پتا نہیں اسے کیوں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ الماری میں پڑے پیسے رات ہی رات میں شیش ناگ کا روپ دھار لیں گے۔اور صبح جب وہ انہیں نکالنا چاہے گی تو وہ شیش ناگ اسے ڈس کر آسانی سے موت کے منہ میں بھیج دے گا۔

ان دنوں وہ بہت عجیب سی ہو رہی تھی۔اسے جو، جو چاہیے تھا اسے مل تو رہا تھا پھر نجانے کیوں وہ اتنی غیر مطمئن صورت حال میں گھرتی جا رہی تھی۔چیزیں خریدنے کے لیے اس کے پاس ڈھیروں پیسہ موجود تھا اور اس کے جسم کے اندر کانچ تھے کہ ٹوٹتے جا رہے تھے۔

اگلے دن سب سے پہلے اس نے ایک بڑی رقم چچا کریم کو دے دی تھی۔گھر کے ایڈوانس کی صورت میں......اور چچا کریم کو کہہ دیا تھا کہ وہ اس کے بارے میں بابا سے کوئی بات نہ کریں۔جب وہ باقی کی رقم بھی ادا کر دے گی تو پھر گھر کو دوبارہ سے اپنے نام لگوا لے گی اور بابا سے بھی خود ہی بات کر لی تھی۔چچا کریم کچھ نہیں بولے تھے۔گہرا سانس لے کر انہوں نے آمادگی دے دی تھی۔

بات تو کچھ ایسی نہیں تھی لیکن چچا کریم نے سبین کی اس ساری تاویل پر اسے بس سر سے پیر تک دیکھا تھا اور سبین ان کے دیکھنے سے خود میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔کیا تھا ان نظروں میں......شک ہی شک......بے یقینی ہی بے یقینی......وہ لڑکی جو دوپٹے کے اوپر بھی لمبی چادر اوڑھے ان کی دکان پر آتی تھی۔آج گلے میں رسے کی طرح دوپٹا ڈالے، فلیپر پر فراک پہنے، تراشے ہوئے لہراتے بالوں کے ساتھ خود بھی لہک لہک کر ہلتی، انہیں کہہ رہی تھی کہ وہ باقی کی رقم جلد ادا کر دے گی۔کہاں سے......کہاں سے ادا کرے گی وہ اتنی بڑی رقم......؟ ایسا کیا کرے گی وہ کہ اتنی جلدی اتنی بڑی رقم کما لے گی۔

سبین، چچا کریم کی نظروں کا مفہوم جان گئی تھی اس لیے اس نے جلدی سے دکان سے نکل جانے میں ہی عافیت سمجھی تھی۔

باقی رقم سے اس نے گھر میں بڑی تبدیلیاں کی تھیں۔چکی کو اس نے صحن سے اٹھوا دیا تھا۔اس چکی نے اسے بہت اذیت دی تھی۔جب یہ چلتی تھی تب بھی اور اب جبکہ یہ خاموش تھی اب بھی......وہ سمجھ رہی تھی کہ وہ چکی کو گھر سے نہیں اپنی زندگی سے نکال رہی ہے۔شاید ایسا ہو بھی جاتا جو چکی اس کے تحت الشعور میں نہ بیٹھی ہوتی......

بابا کے منع کرنے کے باوجود اس نے صحن میں ماربل لگوا لیا تھا۔ سرخ اینٹوں والا پکا فرش ہمیشہ کے لیے ختم کروا دیا تھا۔ جہاں جھاڑو دینا ایک اذیت ناک کام تھا اور پوچا لگانا ایک جان لیوا عمل...... کھڑکیاں، دروازے، رنگ و روغن، اس نے ایک ایک چیز بدل دی تھی۔ بابا کے اور اپنے کمرے میں ٹھنڈک والے کولر لگوا لیے تھے جبکہ بابا نے اسے ایسا کرنے سے منع بھی کیا تھا کہ نہیں ایسی بھی کوئی شدید گرمی نہیں لگتی کہ وہ اس عمر میں ٹھنڈے کولر کے مزے لیں۔ لیکن سبین کو جیسے ایک دم سے لگنے لگا تھا کہ وہ گن پت روڈ پر نہیں بلکہ کسی گرم صحرا پر رہتی ہے۔ فریج اس نے سب سے بڑے سائز کا لیا تھا اور اسے اسی دن کھانے کے نت نئے ڈبوں سے بھر لیا تھا۔ جوسز، ڈرنک کا تو ایک اسٹاک کچن کی الماریوں میں الگ سے پڑا ہوا تھا۔ نئے پنکھے، نیا کچن، نیا چولہا...... اس نے گھر کی ایک ایک چیز بدل دی تھی۔ جو وہ سوچتی تھی کہ اس کے پاس پیسے آئیں گے تو وہ یہ کرے گی۔ اس نے وہ سب کر لیا تھا۔

اس کی فیاضی صرف اس کے گھر تک محدود نہیں رہی تھی بلکہ اس نے اپنی دولت کو اپنے محلے والوں پر بھی خوب لٹایا تھا۔ ایک دم سے ہی اسے اپنی ساری کچی پکی سہیلیاں بے حد غریب و مسکین نظر آنے لگی تھیں۔ اس نے سب کو سوٹ دلائے تھے۔ کلپ، میک اپ، جوتیاں اور نجانے کیا کیا...... وہ سب اسے دعائیں دیتی نہیں تھک رہی تھیں۔ بابا اس کی ایک ایک حرکت کو دیکھ رہے تھے لیکن کہہ کچھ نہیں رہے تھے۔ وہ جیسے اس بات کے انتظار میں تھے کہ سبین انہیں خود سے کچھ بتائے۔

ایک اچھے اور مہنگے ڈاکٹر سے بات کر کے سبین نے زویا کے تالو کے آپریشن کروانے کی بھی بات کر لی تھی۔ زویا کے آپریشن میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ جیسا کہ ڈاکٹرز پہلے سے ہی کہتے آ رہے تھے۔ چند چھوٹے موٹے ٹیس کرنے کے بعد ایک دن زویا کے آپریشن کی تاریخ دے دی گئی تھی۔ ڈاکٹرز نے جتنے پیسے اسے اب کی بار بتائے تھے وہ اس نے بخوشی دے دیئے تھے۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ محض اتنے معمولی سے پیسوں کی وجہ سے زویا اتنا عرصہ بول نہیں سکی تھی۔ جو پیسے ابا امی کبھی جوڑ ہی نہیں سکے تھے وہ اس نے آسانی سے دے دیئے تھے۔

آسانی سے......؟

اس کا جواب اسے آنے والی زندگی میں ملنے والا تھا۔

دو دن کے بعد زویا کا آپریشن تھا۔ ہسپتال میں وہ اس کے ساتھ رہ رہی تھی۔ آپریشن کے وقت اس نے اسے ایسا ہی دلاسا دیا تھا جیسا اگر ماں ہوتی تو اسے اس وقت دے سکتی تھی۔ اب اگر اس نے یہ بیڑا اٹھا ہی لیا تھا تو وہ اسے پوری طرح سے نبھانا چاہتی تھی۔

آپریشن بخیر و خوبی سے ہو گیا تھا۔ زویا کو ابھی چند دن ہسپتال میں ہی رہنا تھا۔ اس کے ساتھ ہسپتال میں رہتے ہوئے رات رات بھر جاگتے ہوئے اسے رہ رہ کر وہ دن یاد آ رہے تھے جب وہ اماں کی موت پر ہسپتال میں رہی تھی۔ کیا دردناک دن تھے

وہ......کیسی تلخی تھی ان دنوں میں......وہ دنیا میں تو کافی عرصہ پہلے ہی آ گئی تھی لیکن ہوش میں اس دن آئی تھی جس دن وہ اماں کے ساتھ پہلی بار ہسپتال میں رہی تھی۔ وہ ہسپتال بھی ایسا تھا جہاں ہر طرف کافور کی بو پھیلی ہوئی تھی یا شاید اسے ہی ایسا محسوس ہوتا تھا۔

اب وقت کتنا بدل چکا تھا۔ ڈال کے پرانے پتے گر چکے تھے۔ نئے پتوں کے آنے کا وقت قریب تھا۔ نئے سبز، جاندار اور جاذب نظر پتے......سب بدلنے والا تھا۔ گھر کو آدھا تو وہ خرید ہی چکی تھی اب اس کی زندگی کی آخری پریشانی بھی حل ہونے والی تھی۔ زویا چند دنوں میں بولنے ہی والی تھی۔

ایک ہفتے کے بعد زویا کو ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ وہ دونوں گھر آ گئی تھیں۔ آخری پریشانی حل ہو چکی تھی۔

سبین نہیں جانتی تھی کہ ابھی مزید کتنی اس کی منتظر ہیں۔

☆......☆......☆

"جب انسان خوش ہوتا ہے تو وہ یہ بھول جاتا ہے کہ وہ کبھی غمگین بھی رہا ہے۔ اسی طرح وہ جب دکھی ہوتا ہے تو خوشیوں کو فراموش کر دیتا ہے۔ وہ خدا کا ناشکرا ہو جاتا ہے اور اپنی تقدیر کا بھی......وہ ان سارے لمحوں کا بھی ناشکرا ہو جاتا ہے جنہوں نے اسے خوش کن احساسات فراہم کیے ہوتے تھے۔ وجوہات، اسباب کو بھی وہ نظر انداز کر دیتا ہے۔

وہ اتنے سارے عناصر کا شکر گزار ہو کر ان کو اپنا دشمن بنا لیا ہے۔ وہ عناصر بھی پھر اچھی طرح سے دشمنی نبھاتے ہیں کہ تم کبھی خوش نہیں ہوئے تو اب بھی نہیں......تم خوشی کو ترس ہی جاؤ......

میں بھی ان ہی بدنصیبوں میں سے ہوں جو اپنی تقدیروں سے روٹھ جاتے ہیں اور پھر ان کی تقدیریں بھی ان کو خوشیاں دینے میں بخیل ہو جاتی ہیں۔ میری اب تک کی کہانی سے آپ یہ اندازہ تو لگا ہی چکے ہوں گے کہ میں نے کیسے زندگی بھر رہبروں کو رہزن بننے پر مجبور کیے رکھا ہے۔"

☆......☆......☆

ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ زویا نہیں بول رہی تھی۔ ڈاکٹرز نے جو جو مشقیں اسے زویا کو کروانے کا کہا تھا وہ اسے باقاعدگی سے کروا رہی تھی۔ اسے نئے نئے لفظ سکھا رہی تھی۔ چھوٹے بچوں والے قاعدے لا کر اسے پڑھنا اور لکھنا سکھا رہی تھی۔ کہیں کوئی کوتاہی نہیں چھوڑ رہی تھی۔ لیکن زویا تب بھی نہیں بول رہی تھی۔ وہ بس سبین کی شکل ہی دیکھتی رہتی تھی۔ سبین الف آم کہہ کہہ کر تھک جاتی اور زویا بنا آنکھیں جھپکے اس کی طرف دیکھتی رہتی......اس کا چہرہ ایسے ساکت تھا جیسے اس کے تالو کا آپریشن تو ٹھیک ہو گیا ہو لیکن دماغ بگڑ گیا ہو......

پہلے پہل تو سبین اسے آپریشن کی کمزوری اور نقاہت سمجھتی رہی......لیکن کافی دن گزر جانے کے باوجود بھی جب بات نہ

نی تو وہ پریشان ہوگئی اور ڈاکٹر کے پاس بھاگی......

''آپریشن تو کامیاب ہوگیا ہے۔باقی سب بھی ٹھیک ہے۔میں نے اچھی طرح سے چیک کرلیا ہے۔''

''جو مشقیں میں نے آپ کو بتائی تھیں آپ وہ متواتر کرواتی رہیں۔اسے بولنے کے لیے اکسایئے۔''

''جتنی محنت میں نے اس کے ساتھ کی ہے اگر کسی بے زبان جانور کے ساتھ کی ہوتی تو اس نے بھی بولنا شروع کر دینا تھا۔آپ اکسانے کی بات کر رہے ہیں میں تو اس کے ہونٹ تک ہلا ہلا کر اسے زبردستی بولنے کی طرف مائل کرتی رہی ہوں۔''

''دراصل زویا ساری زندگی خاموش رہی ہے۔آپ چاہتی ہیں کہ وہ ایک دم سے فرفر بولنے لگے۔آپ کو تھوڑے صبر کا مظاہرہ کرنا ہوگا مس سبین......''

سبین واپس گھر آ گئی تھی۔وہ مزید تن دہی سے زویا کو ڈاکٹرز کی بتائی ساری مشقیں کروانے لگی تھی۔لیکن نتیجہ وہی رہا تھا۔صفر......زویا بول نہیں رہی تھی یہ الگ مسئلہ تھا لیکن وہ جس انداز سے سبین کو دیکھ رہی تھی سبین کو اس کے دیکھنے سے خوف آنے لگا تھا۔

''پہلے زویا آپریشن نہ ہونے کی وجہ سے چپ تھی اور واب......''

''اب کیا ڈاکٹر صاحب......''

''اب وہ اپنی مرضی سے چپ ہے۔''ڈاکٹر نے وہ بات کہہ دی تھی جو اسے سبین سے ہرگز نہیں کہنی چاہیے تھی۔

''کیا......؟''سبین نے تڑپ کر زویا کی طرف دیکھا تھا۔

''زویا......؟''

جواب دینے کے بجائے زویا وہی کام کر رہی تھی جو پچھلے کافی دنوں سے کر رہی تھی۔وہ سبین کو پٹر پٹر دیکھ رہی تھی۔

گھر واپسی کا سفر اس کے لیے ایسے تھا جیسے دنیا کا چکر کاٹ کر آ رہی ہو......سب ٹھیک تھا۔آپریشن کامیاب ہوا تھا۔دوائیاں اپنا اثر دکھا رہی تھیں۔بس ٹھیک نہیں تھی تو اس کی کمائی......ابا اماں کبھی زویا کا علاج نہیں کروا سکے تھے۔وہ ہمیشہ یہ ہی سوچتی تھی کہ اس کے پاس جب بھی پیسے آئیں گے تو وہ چھوٹی کا مہنگے سے علاج کروائے گی۔اب اس نے سب سے شہر کے ایک مہنگے پرائیویٹ ہسپتال سے زویا کا علاج کروایا تھا۔لیکن چھوٹی پھر بھی نہیں بول رہی تھی۔اتنا تو چھوٹی اسے گونگی رہ کر اذیت نہیں دیتی تھی جتنی آپریشن کے بعد نہ بول کر......

''چھوٹی تو بولتی کیوں نہیں......تیرا آپریشن ٹھیک ہوگیا ہے۔بولنے کی کوشش کر......''

لیکن زویا چپ تھی۔جیسے اس نے نہ بولنے کی کوئی قسم کھالی ہو۔آپریشن کے بعد تو وہ اماں بھوک لگی ہے بھی نہیں کہہ رہی تھی،اور اس کی یہ اسیری سبین کو مار رہی تھی۔

کچھ اور سمجھ میں نہ آتا تو سبین چپکے چپکے رونا شروع کر دیتی۔ وہ کن پیسوں سے خوشیاں خریدنے نکلی تھی۔ بھول گئی تھی کہ خوشیاں پیسوں سے نہیں بلکہ خدا کی رحمت سے میسر آتی ہیں۔ اس کے پاس کافی پیسے تھے۔ وہ سب کچھ کر سکتی تھی۔ اور کیا کچھ نہیں کیا تھا اس نے...... گھر میں ٹھنڈک والے کولر تھے پھر بھی اندر کی گرمی اسے جھلسا رہی تھی۔ بان کی چارپائیوں کی جگہ نرم گداز بستر تھے اور آرام تھا کہ کہیں روٹھ گیا تھا۔ وہ پہلے سے زیادہ بے چین تھی۔ اس سے بھی زیادہ جتنی وہ کالج سے آتے وقت اماں کی چکی چلنے کی آواز اور ابا کے چونے کے برادے کے سانس کے ذریعے منہ میں جانے سے ہوتی تھی۔ گھر میں نت نئے کھانے آ رہے تھے پھر بھی اسے کچھ پسند نہیں آ رہا تھا۔ کھانے میں چونے کی بو نہیں تھی۔ پھر وہ کون سا ذائقہ تلاش کر رہی تھی؟ اس کا بڑا دل کر رہا تھا پیاز والا وہ انڈہ کھانے کا جو ماں اس کے کھانا نہ پسند آنے پر اسے جلدی سے ساتھ والوں کے گھر جا کر بنا دیا کرتی تھی۔ اسے رہ رہ کر بل والا وہ پراٹھا یاد آ رہا تھا جس میں سے چونے سے زیادہ اماں کے ہاتھوں کی خوشبو آتی تھی۔ ان دنوں وہ پاگل ہو جانے کے قریب تھی۔

فریج میں سب کچھ تھا اور اسے کھانے والا کوئی نہ تھا۔ کیک رس، باقر خانیاں باسی ہو رہی تھیں۔ جوس کی میعاد ختم ہو رہی تھی۔ ایک وقت میں وہ تین تین طرح کا کھانا منگوا رہی تھی جو جس پیکنگ میں آتا تھا اسی پیکنگ میں پڑا رہتا تھا۔ اکثر وہ محلے والوں کو دینا پڑتا تھا یا فقیروں کو......

پچھلے کافی دنوں سے ایک فقیر متواتر سبین کے گھر آ رہا تھا۔ یہ وہی فقیر تھا جسے اس نے بابا کے ماڈل دے دیئے تھے اور کہا تھا کہ وہ اسے بیچ کر پیسے کما لیں۔ اسے لگا تھا کہ شاید اب وہ فقیر بابا پھر سے ماڈل کے لالچ میں ہی آ رہے ہیں۔ یہ بات تو اس کے ذہن میں ہی نہیں آئی کہ بھلا اس فقیر بابا کو اس کے گھر کا پتا کیسے چل سکتا ہے۔

''ماڈل نہیں ہیں بابا...... میرے بابا آج کل کام نہیں کر رہے۔ آپ یہ پیسے لے لیں اور روٹی کھا لیں۔'' اس نے روٹی اور پیسے دونوں آگے کیے تھے لیکن فقیر بابا نے صرف روٹی تھامی تھی اور چلے گئے تھے۔ اس دن کے بعد سے ان کا معمول بن گیا تھا۔ وہ روز شام کو سبین کے گھر کے دروازے پر دستک دینے لگے تھے۔

اینٹوں والی گلی کے مضبوط فرش پر وہ جیسے ہی فقیر بابا کے ڈانگ رکھنے کی آواز سنتی تھی اٹھ کھڑی ہوتی تھی اور کچن میں جا کر ان کے لیے کھانے کی ڈش تیار کرنے لگتی تھی۔ یہ واحد کام تھا جس میں اسے ان دنوں سکون مل رہا تھا۔

''مجھے دعائیں دیں بابا......'' ایک دن اس نے تقریباً تقریباً روتے ہوئے کہا تھا۔ فقیر بابا نے اس کی بات پر آسمان کی طرف دیکھا تھا۔ یہ اشارہ تھا کہ وہ اس کے لیے دعا کر رہے ہیں۔ کیسا اطمینان تھا ان کے چہرے پر...... جب کہ وہ اندھے تھے اور ان کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بھی کٹی ہوئی تھیں۔

''آپ کی یہ انگلیاں کیسے کٹی ہیں بابا جی......؟'' ایک دن اس نے ہمت کر کے پوچھ لیا تھا۔ وہ اب کھانا ہاتھ میں دینے

کے بجائے گھر میں بٹھا کر کھلا دیا کرتی تھی۔

فقیر بابا نے ایک بار پھر آسمان کی طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ جو خدا کی مرضی ......سبین کا دل کٹ کر رہ گیا تھا۔ لوگ جس حال میں بھی تھے خوش تھے۔ ایک وہ ہی تھی خدا کی ناشکر گزار بندی......آنے والے دنوں میں اسے پتا چلا تھا کہ ان فقیر بابا کی زبان بھی نہیں ہے۔ شاید کسی حادثے میں ان کے ساتھ یہ سب ہو گیا تھا۔ ان کی آنکھیں چلی گئی تھیں۔ زبان، ہاتھوں اور پیروں کی انگلیاں بھی......

اس دن کے بعد وہ اپنے آپ کو مزید برا سمجھنے لگی تھی۔ وہ کتنی ناشکری تھی۔ اس نے اتنی نعمتیں جو اس کے پاس تھیں ان کا شکر ادا نہ کیا اور ان کا رونا رونے بیٹھ گئی جو اس کے پاس نہیں تھا۔

یہ ان دنوں اس کا پسندیدہ مشغلہ بنا ہوا تھا۔ ہر وقت رونے کا......

''بابا جی دعا کریں کہ زویا بولنے لگے۔'' وہ ہر ایک سے آج کل یہ ہی کہہ رہی تھی۔ وہ پاس پڑوس والیوں سے بھی دعا کے لیے کہہ رہی تھی۔ اپنی سہیلیوں سے، جاننے والوں سے......خود وہ دعا نہیں کر رہی تھی اور نہ ہی خدا کے حضور سجدے میں بیٹھ رہی تھی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ جوں ہی وہ سجدے میں جائے گی اس پر عذاب نازل کر دیا جائے گا۔ اسے اسی وقت سزا دے دی جائے گی۔ اس کی موت اور قیامت کا بھی انتظار نہیں کیا جائے گا۔ وہ ڈرتی تھی۔ خدا کے حضور ہاتھ اٹھانے سے اور جسم جھکانے سے......باہر کے فقیر بابا اور گھر کے سرپرست بابا سے اس کی بے چینی پوشیدہ نہیں تھی۔

''کیا بات ہے۔ رو کیوں رہی ہو......؟''

زویا کو بولنے کے لیے اکساتے اکساتے، سلاتے سلاتے اس کے سرہانے بیٹھ کر وہ نجانے کب رونے لگی تھی۔ اسے لگنے لگا تھا کہ اس وقت اس کی زندگی کی سب سے بڑی پریشانی ہی یہ ہے کہ زویا بول نہیں رہی......دراصل وہ زویا کے علاج سے اپنے پیسوں کو نسبت دے رہی تھی کہ اس کی کمائی اس کے لیے جائز ہے یا نہیں......میران کی باتیں......کیا وہ ٹھیک کہتا تھا۔ کیا اسے ہی گزارا کرنا نہیں آیا تھا۔ کیا اس کے پیسے حق کے پیسے نہیں تھے۔ جو وہ اپنی زندگی کا رونا روتی رہتی تھی تو کیا وہ سب غلط تھا۔ اس کے ساتھ ایسی بھی زیادتی نہیں ہوئی تھی کہ وہ ایسی کمائی کرتی......کیا وہ سب کو اللہ کی رضا جان کر نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ برداشت کا مظاہرہ نہیں کر سکتی تھی۔ اس آزمائش سے نکل سکتی تھی۔ ہر آزمائش ایک سرنگ کی طرح کی ہی تو ہوتی ہے۔ ہماری زندگی کی ٹرین تھوڑی دیر کے لیے اس سرنگ میں چلی جاتی ہے۔ اندھیرا چھا جاتا ہے اور پھر تھوڑی دیر کے بعد پھر سے روشنی نمودار ہو جاتی ہے کیونکہ سرنگ کا اندھیرا تو وقتی ہوتا ہے۔

ایسا نہیں ہوتا کہ ہم ٹرین رکوا دیں یا بدحواس ہو جائیں بلکہ ہم اطمینان سے بیٹھے رہتے ہیں کہ ہمیں یقین ہوتا ہے کہ روشنی

آئے گی۔ٹرین سرنگ میں سے باہر نکلے گی۔آزمائش بھی تو ایسی ہی ہوتی ہے۔خدا کی رحمت کی روشنی پھوٹنی ہی ہوتی ہے۔لیکن ہم میں سے کچھ لوگ بدحواس ہو کر اپنے ساتھ غلط کر بیٹھتے ہیں۔

''کیا بات ہے۔کچھ بتاؤ سبین......'' بابا نے پریشانی سے پوچھا۔آنسو صاف کر کے وہ زمین کو کھوجنے لگی۔اس کے پاس بتانے کو کچھ نہیں تھا۔بعض اوقات اسے لگتا تھا کہ بابا اصل میں سب جانتے ہیں اور ایسے سوالات کر کر کے اس کے ساتھ کھیل کھیلتے ہیں۔

''میرے سر میں درد ہے۔'' وہی......لڑکیوں کا ازلی بہانہ......

''کیا واقعی......؟'' بابا نے کس انداز میں کہا تھا۔اف......اس نے بابا کی طرف دیکھا۔وہ ان کی نظروں سے گڑ گڑ گئی۔

بابا اس کے قریب آئے......اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیلیا تھا۔

''تم کیا کر رہی ہو سبین......'' بابا نے پیار سے پوچھا۔اس کی روح کانپ گئی تھی۔

''کیا مطلب......؟''

''تمہارے پاس اتنے پیسے کہاں سے آ گئے ہیں؟ تم کیا سمجھتی ہو کہ تم مجھے بے وقوف بنا سکتی ہو۔نئے سامان کو پرانا کہہ کر......میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں اتنا ناسمجھ نہیں ہوں۔''

''مجھے گھر کے لیے کچھ چیزیں لینی تھیں۔اس لیے میں نے اس بار ان سے ایڈوانس پیسے لیے تھے۔'' اس نے ایک بار پھر جھوٹ بولا تھا۔

''یہ بات زیادہ اہم بات نہیں......ہوسکتا ہے تم وہاں واقعی بہتر کام کر رہی ہو......وہ تم سے بہت خوش ہوں۔تم نے کافی عرصے میرے ساتھ اس کام کو سیکھا ہے۔شاید میں نے ہی تمہارے ہنر کو نہیں پہچانا ہو۔لیکن اصل بات جو مجھے پریشان کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ تم خوش کیوں نہیں ہو......؟''

تو کیا بابا سب جانتے تھے؟

''تم جس جس چیز سے نالاں تھیں وہ سب چیزیں تم نے گھر سے ختم کر دی ہیں۔تم نے صحن سے خدیجہ کی چکی ہٹا دی ہے۔جبکہ تمہیں پتا بھی تھا کہ اسے دیکھ کر میں جیتا ہوں۔تمہارے ماں کے مر جانے کے بعد اب وہ ہی میری ساتھی ہے۔تم نے میرے جذبات کا ذرا برابر بھی خیال نہیں کیا......میں نے بھی تمہیں کچھ نہیں کہا کہ کسی طرح تم خوش ہو جاؤ۔تم نے صحن پر بھی پتھر لگا دیا ہے۔تم جانتی تھیں کہ چونے کا پانی میں جب سرخ اینٹوں والے فرش پر گراتا ہوں تو میری ساری مشکلات ختم ہو جاتی ہیں۔مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں نے اپنی پریشانیوں کو بہا دیا ہو۔اور اب ایک ایک اینٹ اسے اپنے اندر جذب کر رہی ہو......ایسا تو نہیں کہ تمہیں یہ باتیں یاد نہ ہوں......یہ سب باتیں میں تمہارے بچپن سے کرتا چلا آیا ہوں۔تمہیں سب یاد ہوگا۔پھر بھی میں نے

یہ ہی سوچا کہ میں ہی اپنے فلسفوں اور ذہن میں بہکا ہوا ہوں۔نئی نسل کو اس کی چنداں پرواہ نہیں ہے۔ پھر بھی میں نے تمہیں نہیں روکا...... تمہیں وہ سب کرنے دیا جو تم چاہتی تھیں۔لیکن یہ سب کر کے بھی تم خوش نہیں ہو...... ہر وقت روتی رہتی ہو۔''

''میں زویا کی وجہ سے پریشان ہوں۔''

''زویا بچپن سے ہی تو خاموش ہے۔ایک دم سے تمہیں کیا عجلت سوار ہوگئی ہے کہ وہ بولنے لگ جائے۔'' بابا اس سے پوچھ رہے تھے اور وہ خاموشی سے سب سن رہی تھی۔سب سچ تھا۔وہ جانتی تھی اور بابا بھی......

''میں نے ہفتہ ہوا کام کرنا بند کر دیا ہے۔وہ کام جس نے مجھے کسی اور کام کا نہیں چھوڑا...... میں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔ تم کہتی ہو کراچی سے کام سیکھ کر آنے کے بعد ہم اپنا کارخانہ لگا لیں گے۔تم بتاؤ یہ کیسے ممکن ہے۔جب کہ تم نے تو میرے ہاتھ پاؤں ہی توڑ ڈالے ہیں۔ذہن کو بھی بند کر دیا ہے۔''

وہ سوالیہ بابا کو دیکھنے لگی تھی۔

''کریم نے پیغام بھجوایا ہے کہ میں نے اسے مال کیوں نہیں بھجوایا۔تب مجھے پتا چلا کہ تم کریم کے پاس گئی ہی نہیں تھیں۔ وہ پیسے تم نے مجھے اپنے پاس سے دیئے تھے۔مال تم پتا نہیں کہاں پھینک آئی تھیں تا کہ میری عزت نفس مجروح نہ ہو۔میرے ہنر کو کہیں پھینک کر...... تم میری عزت قائم رکھنا چاہتی تھیں۔میں خاموش رہا۔میں نے کچھ نہیں کہا۔کریم کے سامنے اپنا بھرم رکھا اور تمہارا بھی...... کہہ دیا کہ بیمار ہوں اس وجہ سے مال نہیں بنا سکا...... پھر اس کے باوجود......''

خاموش گردن جھائے وہ سب سنتی رہی......

''بولو سبین......''

''ہاں...... میں چچا کریم کے پاس نہیں گئی تھی۔وہ پیسے میں نے آپ کو اپنے پاس سے دیئے تھے۔کیونکہ مجھے آپ کے اس کام سے چڑ ہے۔بلکہ سخت نفرت ہے۔''

''پھر تم یہ کیوں کہہ رہی ہو کہ ہم کارخانہ لگا لیں گے۔جبکہ تمہیں اس کام سے چڑ ہے۔تم ہاں اور نہیں کو ایک ہی لائن میں کیوں لکھ رہی ہو......''

''کیونکہ میں ٹوٹ چکی ہوں بابا......'' وہ ایک دم سے ٹوٹ کر بابا کے سینے سے لگی تھی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ بابا ساکت ہو گئے تھے۔انہیں اس سے اتنی جذباتی رویے کی توقع نہیں تھی۔رشید سے طلاق کے بعد وہ اب اس طرح ان کے سینے سے لگی تھی۔اتنے لمبے عرصے کی بے رخی کے بعد......

''کیوں...... کیوں ٹوٹ چکی ہو تم...... ایسا کیا کر رہی ہو تم میری جان......'' بابا شفقت میں پریشان ہو گئے تھے۔

''میں چونے کو الماس میں بدلنے کی کوشش کر رہی ہوں۔''

''کس الماس میں...... الماس تو دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک چمک والا اور ایک زہر والا...... تم اسے کس میں بدلنے کی کوشش کر رہی ہو......؟''

وہ کیا جواب دیتی...... کیا کہتی کہ نہ چمک والا اور نہ زہر والا...... بلکہ بیش بہا قیمت والا......

''اگر تم نے میرے ہنر کو ٹھیک سے جانا ہوتا تو جان جاتیں کہ چونا تو پہلے سے ہی الماس ہوتا ہے۔ پھر تم ہرگز خود کو اتنا ہلکان نہ کرتیں۔''

''وہ الماس کوڑیوں کے بھاؤ بکتا ہے اور جس میں، میں بدل رہی ہوں وہ اصل سے بھی دگنی قیمت پر بک جاتا ہے۔'' اس نے آنکھوں کے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا تھا۔ جس میں الاؤ روشن تھا۔ غصے کا، نفرت کا، دکھ کا اور بے بسی کا......

''دنیا کے بازار میں جب کسی چیز کی قیمت اس کے اصل سے زیادہ ہو تو سمجھ جانا کہ وہاں خرد موجود ہے۔ خرد کو سمجھتی ہو ناں...... ابہام والی چیز...... خدا نے سختی سے منع کیا ہے خرد سے......''

بابا کی وضاحت پر وہ جھرجھری لے کر رہ گئی تھی۔ خرد حرام تھا اور جو کام وہ کر رہی تھی وہ ناجائز...... اس نے حرام اور ناجائز دونوں کا سنگم کروا دیا تھا...... اب بھی بھلا اسے معافی مل سکتی تھی؟

''تم کراچی نہیں جاتیں۔ میں جانتا ہوں...... تم کہاں جاتی ہو مجھے بتاؤ......'' بابا اس سے حقیقت اگلوانا چاہتے تھے اور وہ انہیں کچھ بھی نہیں بتا سکتی تھی۔

''بولو سبین......''

''بتا دوں گی بابا...... آپ کو ایک دن سب بتا دوں گی۔'' وہ ساکت آنکھوں سے خلاء میں دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

''بتا دینا کہیں ایسا نہ ہو کہ دیر ہو جائے......'' بابا کہتے ہوئے اٹھے اور پھر اسے دیکھتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ وہ دہل کر رہ گئی تھی۔ ایسی بات کیوں کی تھی بابا نے......

''کہیں دیر نہ ہو جائے......'' ساری رات اس کے کان میں یہ ہی فقرہ گردش کرتا رہا تھا۔

''کس بات کی دیر...... کسی کے جدا ہونے کی......؟ یا کچھ اور...... بابا کیا سوچ رہے ہیں۔ ان کے اندر یہ سوچ کیونکر آئی کہ وہ ہم سے جدا ہونے والے ہیں۔ ساری رات وہ ان ہی باتوں کے تانے بانے میں الجھی رہی تھی۔ وہ سب سوئی اسے نہیں پتا...... سوئی بھی کہ نہیں وہ یہ بھی نہیں جانتی تھی۔

''میں اپنے دس بار کے چکر کے بعد بابا کو سب بتا دوں گی۔ یہ بوجھ مجھے ہر صورت سینے سے اتارنا ہی پڑے گا۔'' صبح تک وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ لیکن اسے بابا کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ بابا کو اگلے دن سب خود ہی پتا چل گیا تھا۔

☆......☆......☆

دھوپ سے اجلے دن میں کالے بادل ڈاکازنوں کی طرح ایک دم سے وارد ہوئے تھے اور سارے دن کو انہوں نے آن کی آن اپنی حراست میں لے لیا تھا۔ بجلی کڑکی تھی اور اس کی روشنی کے بعد اندھیرا مزید بڑھ گیا تھا۔ بارش کی ہلکی پھواروں نے زور پکڑ لیا تھا اور ان کی نوکیں سبین کا جسم کاٹ رہی تھیں۔ انارکلی بازار کے سرخ اینٹوں والے فرش پر ننھی بوندیں گر گر کر اچھل رہی تھیں۔ سبین کا ارادہ ابھی مزید خریداری کرنے کا تھا لیکن موسم دیکھ کر وہ جلد ہی گھر کے لیے واپس ہو گئی تھی۔

جس وقت وہ نت نئی چیزوں کے شاپروں سے لدی ہوئی گھر میں داخل ہو رہی تھی اس وقت تک بارش طوفانی ہونے کی تمہید باندھ رہی تھی۔ وہ جلدی سے اپنے کمرے میں چلی جانا چاہتی تھی لیکن بابا نے ہاتھ آگے کر کے اسے صحن میں پار نہیں کرنے دیا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' پہلے وہ بابا کے انداز پر چونکی تھی پھر بابا کے سوال پر......

بابا جس چیز کو ہاتھ میں پکڑ کر اس سے اس کی بابت پوچھ رہے تھے۔ وہ چیز بابا کے ہاتھ میں دیکھ کر اس کی روح فنا ہو گئی تھی۔ بابا کے ہاتھ میں دو پیکٹ تھے۔ ایک میں حشیش تھی اور ایک میں کھوکھلے کیپسول...... یہ پیکٹ کل ہی ڈینی نے اسے لا کر دیئے تھے کیونکہ دو دن بعد پھر سے اس کی نیویارک کے لیے فلائٹ تھی۔ یہ دونوں پیکٹ اس نے اپنی الماری میں کپڑوں کی تہ میں سب سے نیچے رکھے تھے۔ اب یہ بابا کے ہاتھ میں کیا کر رہے تھے؟

''یہ کیا ہے سبین......؟'' بابا کو شاید واقعی نہیں پتا تھا کہ وہ کیا تھا۔ لیکن ان کے انداز سے اتنا ضرور لگ رہا تھا کہ انہیں علم ہے کہ وہ کوئی غلط چیز تھی۔ یا وہ شاید اس کے بارے میں سبین کے منہ سے سننا چاہ رہے تھے۔ وہ سب جانتے تھے، جان گئے تھے، جاننا چاہتے تھے یا سبین کو پرکھنا چاہتے تھے۔

ان کی چھٹی حس نے ان کو بتا دیا تھا۔ اب وہ صرف سبین سے تصدیق چاہتے تھے۔ سبین اس بات کو پرکھ نہ سکی......اور یہاں ہی اس نے غلطی کی، جیسے کہ وہ ہمیشہ کرتی آئی تھی زندگی بھر......

''بابا یہ......''

سامان سائڈ پر رکھ کر اس نے آگے بڑھ کر بابا کے ہاتھ سے وہ پیکٹ لینے چاہے اور وہ کوئی جھوٹ گھڑنے ہی والی تھی کہ ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا تھا۔ تھپڑ قدرے زور آور تھا کہ اس کے گال کے اندر خون کی روانی باہر کو لپکی تھی اور اس تھپڑ کا سناٹا ایسا تھا کہ سبین کو لگا کہ اس سمیت ساری دنیا بہری ہو چکی ہے۔



ناول **شام رنگ سیاہ** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **20** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 9

تھپڑ اس قدر زوردار تھا کہ اس کے گال کے اندر خون کی روانی باہر کو لپکی تھی اور اس تھپڑ کا سناٹا ایسا تھا کہ سبین کو لگا کہ اس سمیت ساری دنیا بہری ہو چکی ہے۔ وہ اسی رخ پر جامد ہو گئی تھی جس پر اسے تھپڑ پڑا تھا۔ بابا نے اس پر بس نہیں کی تھی۔ ایک اور تھپڑ اسے دوسری طرف بھی مارا تھا۔ جو پہلے سے زیادہ زوردار تھا اور اس سے ان کے غصے کی شدت جھلک کر سبین کا خون چھلکا گئی تھی۔ اس کے گال کی جلد پھٹ گئی تھی۔

اپنی جگہ پر گم صم بیٹھی زویا ہڑبڑا کر اٹھ کر کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی جیسے برسوں کی غنودگی آج ٹوٹی تھی۔ مدہوشی سے ہوش میں آ کر اس نے ایک جھرجھری لی تھی۔ وہ ایک دم سے ہی بہت گھبرا گئی تھی۔ ایسا ماحول اس گھر میں اس سے پہلے کبھی نہیں بنا تھا۔ اس کی پٹر پٹر سبین کو تکتی آنکھوں میں آج بڑے دنوں کے بعد رحم اور ترس نمایاں ہوا تھا۔

بارش تیز ہونے لگی تھی۔ سبین کا لباس گیلا ہو رہا تھا۔ بارش کی بوندوں کی کاٹ اس کے جسم کاٹ رہی تھی۔ ہوا اسے چیر رہی تھی۔ وہ اندر کمرے میں جا کر جلدی سے پناہ لینا چاہتی تھی اور بابا تھے کہ جیسے ہاتھ میں تلوار تھامے اس کا سر قلم کر دینے کے ارادے باندھ رہے تھے۔

''کیا ہے یہ......؟'' بابا غصے سے پوچھ رہے تھے۔ وہ کیا جواب دیتی۔ بعض باتوں کا اقرار اتنا مشکل کیوں ہوتا ہے جبکہ اب بابا سب جان گئے تھے۔ اس کو کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی اس سے کہا ہی نہیں جا رہا تھا کہ یہ ''حشیش'' ہے۔ اتنا چھوٹا سا لفظ بولنے کے لیے اس کا دل بڑا نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا سر جھک گیا۔ بابا نے وہ پیکٹ اس کے منہ پر دے مارے تھے۔

''یہ کام کرتی ہو تم کراچی جا کر......؟''

''میں کراچی نہیں جاتی......'' اس نے بتایا۔ بہتر تھا کہ اب سب سامنے ہی آ جائے۔

''میں جانتا ہوں۔ میں پہلے سے ہی جانتا تھا۔ تم تھیں جو جھٹلاتی رہیں......'' بابا اسے تقریباً کھینچ کر اندر لائے تھے اور اسے نئے بیڈ کے گداز فوم پر پٹخ دیا تھا۔

''کہاں جاتی ہو تم......سب بتاؤ مجھے۔ سب......'' بابا چلائے تھے۔ وہ خود بھی اب سب بتا دینا چاہتی تھی۔ اس گناہ کا بوجھ اب اس سے اکیلے نہیں اٹھایا جا رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ اس بوجھ کو کسی اور پر منتقل کر دے یا کم از کم اس بوجھ میں کسی اور کو

شریک بنالے...... رشید سے طلاق والے دن سے شروع ہو کر اس نے اس دن تک کی ساری بات بتا دی تھی۔ ڈینی، اسمگلنگ، ڈان پیٹرسن کے گروپ میں شرکت، پیسہ، خواہشات، آرزوئیں، تمنائیں، کپڑے، جوتے، سکون، اطمینان، سب...... اس نے اب کی بار کچھ بھی چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ زویا بھی دم سادھے اسے سن رہی تھی۔ کیا وہ سب سمجھ بھی رہی تھی؟

کمزور بابا کی سوئی ہوئی آنکھیں جیسے مدتوں کے بعد جاگ گئی تھیں۔ ان میں شعلے لپکنے لگے تھے۔ وہاں سبین کے لیے پیار نہیں تھا۔ سبین کو اس بات کا پہلے سے ہی اندازہ تھا لیکن وہاں رحم بھی نہیں تھا اور یہ بات سبین کو خوف زدہ کر رہی تھی۔

سب بیان کر کے وہ خاموش ہو گئی تھی۔ وہ اب بابا کے ردعمل کے انتظار میں تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ موت کے وقت موت کا فرشتہ انسان کو کیسے دیکھے گا لیکن وہ تصور کر سکتی تھی کہ اس کا دیکھنا بھی کچھ کچھ ایسا ہی ہوگا جیسے اب بابا اسے دیکھ رہے تھے۔

زویا کبھی سبین کو دیکھتی اور کبھی بابا کو...... اس کا ذہن ابھی اتنا مضبوط نہیں ہوا تھا کہ وہ گناہ گار سے نفرت کرے۔ وہ اپنی دنیا میں مگن رہی تھی۔ ابھی اس نے باہر کی دنیا کے انداز نہیں سیکھے تھے۔ وہ کورا کاغذ تھی۔

سبین کے خاموش ہو جانے کے بعد بابا چند لمحے اسے دیکھتے رہے پھر اچانک سے دوسرے کمرے میں چلے گئے تھے۔ وہ وہیں دم سادھے بیٹھی رہی تھی۔ نئے بیڈ پر...... جو اس نے چند روز پہلے ہی خریدا تھا۔ اپنی آرام دہ نیند کے لیے...... اور اب جس کی بے آرامی اسے کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی۔

ساتھ کے کمرے سے کچھ کھٹ پٹ کی آوازیں آتی رہیں۔ وہاں بابا کیا کر رہے تھے وہ نہیں جانتی تھی۔ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

زویا اس کے پاس آئی تھی۔ اس نے سبین کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا تو سبین چونک کر زویا کو دیکھنے لگی تھی۔ اس کی خشک ہوتی آنکھوں میں پھر سے آنسو آ گئے تھے۔ زویا بھی رو رہی تھی۔ وہ جو اماں کے مرنے پر نہیں روئی تھی آج اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ سبین نے زویا کو گلے سے لگا لیا تھا اور اسے خود میں بھینچ کر رونے لگی تھی۔

''میں نے یہ کام اپنی خوشی سے نہیں کیا چھوٹی......'' وہ روتے ہوئے اسے بتانے لگی۔ زویا ایسے سر ہلا رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو کہ میں سب سمجھتی ہوں۔

''بابا کو مجھے معاف کرنا ہی ہوگا۔'' وہ شدت سے روتی جا رہی تھی۔ زویا نے اسے اپنی ننھی بانہوں میں اسے ایسے بھرا ہوا تھا جیسے کسی بچے نے کسی گڑیا کو زندہ جان کر اپنے سینے سے لگا لیا ہو۔

بجلی کی سی تیزی سے بابا دوسرے کمرے سے باہر نکلے۔ ان کے ہاتھ میں وہ بیگ تھا جو وہ امریکا لے کر جاتی تھی۔ وہ بیگ انہوں نے سبین کے پیروں میں پٹخا۔ بیگ بھرا ہوا تھا۔ اس میں سبین کے ہی کپڑے تھے۔

''نکل جاؤ یہاں سے...... ابھی اسی وقت......'' بابا چلائے تھے۔ وہ بابا کی شکل دیکھنے لگی۔ اسے بابا سے اتنے سخت رویے کی توقع نہیں تھی۔

''بابا......'' اس نے بے یقینی سے بابا کو پکارا تھا۔ آنسوؤں سے اس کا گلا اس قدر رندھ گیا تھا کہ اب درد کرنے لگا تھا۔

''میں کہتا ہوں نکل جاؤ یہاں سے...... ابھی اسی وقت......'' بابا نے پھر زور سے کہا تھا۔ وہ کیسے نکل جاتی اور کہاں جاتی...... وہ نکل جاتی اگر اپنی حیرت سے نکل جاتی...... بابا نے دیکھا کہ وہ اپنی جگہ سے نہیں اٹھ رہی تو اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچا۔ زویا ہونق بنی سب دیکھ رہی تھی اور سبین بت بنی سب سہہ رہی تھی۔

''نکل جا میرے گھر سے......'' بابا گھسیٹتے ہوئے اسے باہر صحن میں لائے تھے۔ وہ بابا بابا کہہ رہی تھی اور بابا اس کا بازو کھینچ رہے تھے۔ وہ فرش پر آدھی گری ہوئی بابا کے ساتھ ساتھ کھنچتی جا رہی تھی۔

باہر بارش تیز ہو چکی تھی۔ ہوا میں اور پانی میں جیسے طوفان ملا ہوا تھا۔ جو کسی طور ٹھہرتا تھا اور نہ ٹھہرنے دیتا تھا۔ جھوم جھوم کر گرتا پانی اب دھمال ڈالنے لگا تھا۔ آرٹ کالج کے درخت سجدے میں گرے ہوئے لگتے تھے۔ ہوا کا شور اس قدر بلند تھا کہ سبین تک اپنے رونے اور بابا کے چلانے کی آواز تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

''میری اولاد تم جیسی ہو گی اس سے بہتر تھا کہ میں بے اولاد ہی رہتا...... اچھا ہوا تمہاری ماں جلدی مر گئی۔ مجھے اس کے مرنے کا ہمیشہ دکھ رہا۔ میں نے اپنی زندگی میں اس سے وعدہ لیا ہوا تھا کہ وہ مجھ سے پہلے نہیں مرے گی کیونکہ میں اس کی موت کا غم برداشت نہیں کر سکتا تھا لیکن اس نے وعدے کی پاسداری نہ کی...... خدا نے اس سے پاسداری کا حق چھین لیا۔ لیکن آج مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ وہ مجھ سے پہلے فوت ہو گئی۔ اس پر تمہاری حرکتیں عیاں ہوتیں تو اس نے تو...... ایک ایک سانس میں مرنا تھا اور ایک ایک سانس میں جینا تھا۔ نکل جاؤ میرے گھر سے۔'' بابا اسے دروازے تک لے آئے اور پھر دروازہ کھول کر اسے باہر دھکیل دیا تھا۔ زویا نے اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا تھا۔ سبین تو نجانے کب سے رو رہی تھی۔

''بابا مجھے معاف کر دیں۔'' اس نے گھر کی چوکھٹ پکڑ لی تھی۔ گندے دروازے کی غلیظ چوکھٹ۔

''میں تمہیں قتل نہیں کر رہا...... یہ ہی تمہاری معافی ہے۔'' بابا نے اس کے ہاتھ کی گرفت اپنی پیر کی ٹھوکر سے الگ کی تھی۔

''بابا میری بات سنیں...... میرے ساتھ ایسا نہ کریں۔ بابا مجھے معاف......''

''اب کبھی ہمیں اپنی شکل مت دکھانا...... میں تمہارے لیے مر گیا اور تم ہمارے لیے مر گئیں۔ یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' بابا نے اس کے وجود کو پاؤں سے ضرب ماری تھی اور گھر سے باہر دھکا دے دیا تھا۔

''بابا میری بات سنیے...... بابا......'' وہ چلائی تھی۔ بابا نے دروازہ بند کر لیا تھا۔

شدید بارش میں لوگ اپنے گھر کی کھڑکیاں، دروازے کھولے باہر لگا تماشا دیکھ رہے تھے۔ ایک لڑکی اپنے گھر کی دہلیز پکڑے رو رہی تھی۔ بھیگ رہی تھی۔ ایسا تماشا لگا ہو تو کسے فکر ہوتی ہے اپنے بھیگنے کی۔

"بابا......" وہ دروازہ بجانے لگی تھی۔ گیلے دروازے پر ہوتی دستک چیونٹی کی بڑبڑاہٹ سے زیادہ زور آور نہیں تھی۔

کالی گھٹاؤں کے باعث نیلا آسمان کہیں گم ہو کر رہ گیا تھا۔ دھرتی پر سورج گرہن کا منظر پھیل رہا تھا۔ چاروں طرف تاریکی راج کر رہی تھی۔ اور بارش تھی کہ کسی دم رکتی تھی نہ ٹلتی تھی۔ بجلی اپنی کڑک تو چھوڑتی تھی لیکن روشنی نہیں...... سیین کو غشی آنے لگی تھی۔ اور عین اسی وقت سیین نے گلی کی اینٹوں کے فرش پر پڑتی لاٹھی کی مانوس سی آواز سنی...... فقیر بابا چند ہی لمحوں میں اس کے پاس آ گئے تھے۔ زبان، آنکھوں کی بینائی، ہاتھ اور پیروں کی انگلیوں سے محروم فقیر بابا...... سیین ان کا ہاتھ تھام کر شدت سے رونے لگی تھی۔

"آج میں آپ کو کھانا نہیں کھلا سکتی بابا جی...... لیکن پھر بھی آپ میرے لیے دعا کر دیں۔" اس نے جذبات سے مغلوب ہو کر روتے ہوئے کہا تھا۔ فقیر بابا نے اسی وقت ہاتھ اٹھا کر اس کے لیے دعا کی تھی۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا اور پھر ایک طرف کو چلے گئے تھے۔ پتا نہیں کیوں...... سیین کو یک گونا تسلی سی ہو گئی تھی۔

بارش کا زور ٹوٹنے میں نہیں آ رہا تھا۔ سورج کو بادلوں میں سے کہیں راستہ نہیں مل رہا تھا۔ زمین سے خلا تک عجیب بھول بھلیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اور سیین کے آس پاس لوگوں کا ہجوم تھا کہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ وہ پھر سے دروازے پر دستک دینے لگی، لیکن بند دروازہ کھلنے میں نہیں آ رہا تھا۔ گلی سے باہر وہ پتھر ہو چکی تھی اور دروازے کے اندر بابا...... دروازے پر ہاتھ رکھے رکھے ہی وہ نیچے ڈھے گئی تھی۔ بے بسی سے بابا بابا چلاتی ہوئی...... اس کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ وہ چاک کی وہ مورت بن گئی تھی جسے سوکھنے سے پہلے ہی سانچے سے نکال لیا گیا تھا۔ اب اس کے ٹیڑھے میڑھے خدوخال اس بات کی نشاندہی کرنے سے قاصر تھے کہ وہ اصل میں کس شکل کی مورت تھی۔ ایک لڑکی، سیین قطب الدین، سیین میران...... یا بیلا ڈونا......

روتے روتے اس کے گلے کے کانٹے پروان چڑھنے لگے تھے لیکن بابا کو آج اس پر ترس نہیں آ رہا تھا۔

تب ہی یک لخت ایک آواز اس کے کانوں میں پڑی تھی۔

"بابا...... دروازہ کھولیے......"

اس آواز کی بازگشت اتنی تیز تھی کہ پلٹ پلٹ کر آ رہی تھی اور قوت اتنی بلند تھی کہ آواز سے پہاڑ ٹوٹ سکتا تو ریزہ ریزہ ہو جاتا۔

کون تھا یہ......؟

یہ زویا کی آواز تھی۔ ڈاکٹر نے ٹھیک کہا تھا کہ اب وہ اپنی مرضی سے ہی بولے گی۔

"بابا دروازہ کھولیے...... آپی کو اندر لائیے۔" زویا چلا رہی تھی، اور بس یہ ہی فقرہ دہرائے جا رہی تھی۔

''آپی کو اندر لائیے۔دروازہ کھولیے بابا......''

بابا نے حیرت سے زویا کو دیکھا تھا۔باہر سبین بھی زویا کو آواز سن کر دم بخود رہ گئی تھی۔زویا بول پڑی تھی۔یہ خوشی کی خبر اسے کس برے وقت میں ملی تھی۔آنسوؤں سے تر چہرے کے باوجود بھی وہ مسکرا اٹھی۔

شام کے رنگوں کو چھوڑتی اندھیری رات کی بڑی شان سے آمد ہو رہی تھی۔ایسی اندھیری رات میں کیا خوب کرن پھوٹی تھی۔بابا اپنی جگہ ساکت ہو گئے تھے۔

''آپی کو اندر لائیے بابا......''زویا کی آواز گونجی جا رہی تھی۔

بابا نے دروازے کی کنڈی نیچے گرادی تھی۔دروازہ کھل گیا تھا۔وہ دروازہ تھامے ہوئے تھی۔جیسے ہی کواڑ کھلے وہ زمین پر گر گئی۔زویا نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا تھا۔

''آپی......'' کہہ کر وہ سبین کے گلے سے لگ گئی تھی اور دونوں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔

وہ رات بہت بھاری تھی۔ہر آن ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے رہے اور وہ انہیں گنتی رہی تھی۔زویا اس کے آنسو چنتی رہی۔زویا اب بول سکتی تھی۔اس کا جرم سامنے آ گیا تھا۔اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس چیز کی خوشی منائے اور کس بات کا غم......

خدا نے بہت دکھوں کے بعد ایک سچی خوشی اسے دی تھی۔زویا کے بولنے کی خوشی......اب وہ سمجھی تھی کہ خدا کے ہر کام میں کیا حکمت ہوتی ہے۔زویا کا اس موقع پر بولنا ہی اثر کر گیا تھا۔ورنہ بابا شاید اسے ساری زندگی گھر میں نہ گھسنے دیتے۔

اس کی نظر میں سب ٹھیک ہو گیا تھا......وہ سمجھ رہی تھی کہ سب سامنے آ جانا بہتر رہا ہے۔اب سب بدل جائے گا۔

یہ اس کی خام خیالی ثابت ہونے والی تھی۔

☆......☆......☆

''ڈائنا نے خودکشی کر لی ہے۔''جیفرسن نے واش روم میں داخل ہو کر دھماکا کیا تھا۔

پیٹرسن جھاگ دار پانی میں ہاتھ ٹب میں لیٹا ہوا تھا۔جہاں پانی میں پڑا اس کا وجود گوہر نایاب کی مانند دکھتا تھا۔جیفرسن کی بات سن کر مارٹینی کا جام اس کے ہونٹوں تک جاتے جاتے رکا۔اس غیر متوقع خبر نے لمحے بھر کے لیے اسے حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔

''کب......؟''

''کل صبح......''

''وجہ کیا سامنے آئی ہے؟''

''وجہ تم پوچھ رہے ہو پیٹی......اس نے تمہاری وجہ سے خودکشی کی ہے۔''

''میری وجہ سے......؟'' پیٹرسن کو شدید جھٹکا لگا تھا۔

''جہاں اس نے خودکشی کی ہے وہاں اس نے جگہ جگہ تمہارا نام لکھا تھا۔ ایڈم، ایڈم، ایڈم...... زمین پر، درختوں پر...... وہ تو شکر کرو کہ پولیس کے وہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی اس جگہ کو صاف کر لیا گیا تھا۔ ورنہ...... ورنہ نجانے کیا ہو جاتا......''

''میں نے تم سے کہا تھا کہ اس کے علاج کے لیے کچھ آدمیوں کو وہاں بھیجو...... کیا تم نے ایسا کیا......؟''

''ہمارے آدمی جب اس تک پہنچے تو تب وہ گھر پر نہیں تھی۔ اور نہ ہی اس کا وہ دیوانہ بھائی جو ہر وقت ماؤتھ آرگن بجاتا رہتا ہے۔ ڈائنا ساری رات گھر نہیں آئی...... اور پھر اگلے روز اس نے خودکشی کر لی......''

''لیکن اس نے ایسا کیوں کیا...... اور میرا نام کیوں لکھا...... جبکہ وہ واقعہ کچھ ایسا بھی نہیں تھا کہ ڈائنا خودکشی کر لیتی......''

فکرمند سا پیٹرسن باتھ ٹب سے باہر نکل آیا تھا اور اس نے اپنی کمر کے گرد سفید ٹاول لپیٹ لیا تھا۔

''اصل فکر کی بات کچھ اور ہے پیٹی......'' جیفرسن فکرمندی سے کہہ رہا تھا۔ پیٹرسن کو اس کی فکرمندی پر تعجب ہوا تھا۔

''کیا......؟''

''ڈائنا کے وجود پر سے تمہارا خون ملا ہے۔ اس کی انگلیوں کے ناخنوں پر سے جو خون ملا ہے وہ تمہارا ہے اور یہ ہی اصل میں خطرے کی بات ہے جو مجھے پریشان کر رہی ہے۔''

''ڈائنا کی انگلیوں پر میرا خون......؟''

''اس نے تم سے ہاتھا پائی کی تھی۔''

''وہ تو اس کی موت سے دو دن پہلے کی بات تھی۔''

''وہ سب میں نہیں جانتا...... لیکن ایسا ہو گیا ہے۔ رپورٹ میں پیٹرسن کا نام آ چکا ہے۔''

دونوں چلتے چلتے کمرے تک آئے تھے۔ پیٹرسن اپنے گیلے وجود سمیت صوفے پر بیٹھ گیا۔ جیفرسن اس کے سر پر ہی کھڑا رہا۔ وہ سخت پریشان تھا۔

''اب کیا کرنا ہے پیٹی...... یہ اچھا اشارہ نہیں ہے۔''

''تم اتنا گھبرا کیوں رہی ہو جیفی......''

''کیا یہ گھبرانے والی بات نہیں کہ رپورٹ میں پیٹرسن کا نام آ گیا ہے۔''

''تو پھر کیا ہوا......؟'' پیٹرسن نے کوئی پروا نہ کرتے ہوئے معنی خیزی سے کہا تھا۔ جیفرسن حیرت سے اسے دیکھنے لگا تھا۔

''پیٹرسن تو مر چکا ہے ناں...... تو پھر اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔'' پیٹرسن نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا۔

جب ساری بات جیفرسن کو سمجھ میں آئی تو وہ بھی ہنسنے لگا تھا۔

☆......☆......☆

گرینڈ فادر نے پیٹرسن کی ترقی اور اپنے خاندان کی خوش حالی کے لیے ایک ایسا ٹانک کھیلا تھا۔ جو کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔ بہت سوچنے، بہت سے لوگوں سے مشورہ کرنے کے بعد انہیں پیٹرسن کی دائمی اور حیرت انگیز ترقی کا صرف ایک ہی راستہ نظر آتا تھا۔ جس پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے پیٹرسن کو مار دینے کا منصوبہ بنالیا تھا۔ باطنی طور پر نہیں...... بلکہ صرف پیٹرسن کے نام کو...... ایک کار ایکسیڈنٹ میں انہوں نے پیٹرسن کی موت کا ڈرامہ رچایا تھا۔ ایک لاوارث لاش لے کر انہوں نے اسے پیٹرسن کے نام پر دفن کر دیا تھا اور اس کی موت کا سرٹیفکیٹ بنالیا تھا۔ اب کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ پیٹرسن زندہ ہے، جبکہ درحقیقت...... اور پس پردہ وہ زندہ تھا۔ لیکن یہ بات گرینڈ فادر اور پیٹرسن کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا تھا۔

پیٹرسن کو ایما کی فکر تھی کہ اس کی جھوٹی موت پر وہ تو پاگل ہی ہو جائے گی۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ پیٹرسن کی موت پر ایما نے ایک آنسو تک نہیں بہایا تھا بلکہ اس کا رویہ کسی حد تک خوش گوار تھا۔ وہ مطمئن تھی کہ پیٹرسن نامی بچے سے اس کی جان چھوٹ چکی ہے۔ اسی دن سے ایما کے لیے اس کی ساری محبت جل کر راکھ میں بدل گئی تھی۔

گرینڈ فادر نے پیٹرسن کو ایک یتیم خانے میں داخل کروا دیا تھا جہاں اس کی شناخت، مذہب، نسل کے سارے خانے خالی تھے۔ ایک سال پیٹرسن نے یتیم خانے میں گزارا تھا۔ جہاں گرینڈ فادر اسے گاہے بگاہے ملنے آتے رہتے تھے۔ ایڈم ایک ایسا کوہ نور تھا جوان سب کے تاج پر سجنے والا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ یہ لڑکا ان کے سارے ادھورے خواب پورے کر دے گا اور ان کی سوچ سے بھی کہیں بڑھ کر ترقی کرے گا۔ حقیقتاً ان کے سارے خواب پورے ہونے ہی والے تھے۔ پیٹرسن ان کی توقع سے بھی بڑھ کر آگے جانے والا تھا۔

یتیم خانے سے ایک سال کے بعد پیٹرسن کو ایک فیملی نے گود لے لیا تھا۔ وہ فیملی گرینڈ فادر کے دوست کی فیملی تھی اور جرائم میں گرینڈ فادر سے بھی بڑھ کر آگے تھی، لیکن ابھی ان کا خاندان گرینڈ فادر کے خاندان کی طرح بدنام نہ ہوا تھا۔ جرائم سے منسلک تمام کام کی ذمہ داری فادر ایڈورڈ کی تھی۔ جواب پیٹرسن کے نئے والد تھے۔ وہاں ایڈم نے ایک نئی شناخت پائی تھی۔ معزز گھرانے کے معزز فرد کی...... نئے گھر میں پیٹرسن کا ایک سوتیلا بھائی بھی تھا جیفرسن...... دونوں کو ایک گھر میں رہتے ہوئے ایک دوسرے سے والہانہ محبت ہو چکی تھی۔ گرینڈ فادر اسے ایک نئی شناخت دینا چاہتے تھے۔ اسے عام سے بہت خاص بنانے کا سہرا گرینڈ فادر کے سر ہی جاتا تھا۔ گرینڈ فادر نے اپنی زندگی میں ہی پیٹرسن کو ڈان مقرر کر دیا تھا۔

سب کچھ بڑی منصوبہ بندی سے کیا گیا تھا۔ سب نیویارک کی دنیا میں ایک نیا تہلکہ مچانے کو تیار تھے۔ پیٹرسن، جیفرسن،

گرینڈ فادر اور فادر ایڈورڈ کے علاوہ آٹھ لوگ اور تھے جو پیٹرسن کے اصل کے بارے میں جانتے تھے۔ ان آٹھ لوگوں کا انتخاب اس نے بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ انتہائی جانفشانی سے...... لیکن انہی آٹھ میں سے ایک اولیور بھی تھا۔ جس نے پولیس کو پیٹرسن کے بارے میں اندر کی معلومات دی تھیں اور پیٹرسن نے اسے اسی کے دیرینہ دوست برنابی کے ہاتھوں قتل کروا دیا تھا۔

پیٹرسن نے اپنی شناخت کو بھی ایک الگ رنگ دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ لوگ مذہب کو لے کر کس قدر جذباتی ہوتے ہیں۔ وہ عام دنیا کے سامنے کوئی بہت ہی خاص بننا چاہتا تھا۔ کوئی درویش...... کوئی صوفی بھگت...... لیکن کس مذہب کا صوفی......؟ وہ کسی بھی مذہب میں رہ کر صرف ان لوگوں کی ہی عزت پا سکتا تھا جس مذہب کا وہ ماننے والا تھا۔ باقی مذاہب والوں نے یقیناً اس سے اپنی نفرت کا اظہار کرنا تھا۔ ایسے ہی موقعے پر اسے خیال آیا تھا کہ اسے کسی ایک مذہب کو نہیں ماننا چاہیے بلکہ سارے مذاہب کی تقلید کرنی چاہیے تاکہ سب اسے چاہنے لگیں۔ کوئی اس سے اختلاف نہ رکھ سکے۔

پولیس نہ پیٹرسن تک پہنچ سکتی تھی اور نہ ہی ایڈم تک...... کیونکہ پیٹرسن کا تو کوئی وجود ہی نہیں تھا اور دوسری طرف ایڈم کا وجود ایسا تھا کہ کوئی اسے پیٹرسن نہیں مان سکتا تھا۔ پیٹرسن ایک ایسا نام تھا جس سے ہر کوئی خوف کھاتا تھا اور ایڈم وہ تھا جس کے پاس آ کر سب سکون محسوس کرتے تھے۔

رفتہ رفتہ پیٹرسن کا گروپ 360.p نیویارک سمیت پورے امریکا میں اپنی جڑیں پکڑنے لگا تھا۔ وہ کام جو گرینڈ فادر چھوٹے پیمانے پر کرتے تھے اب وہ بڑے پیمانے پر ہونے لگا تھا۔ جواء، شراب اور نشہ آور اشیا کی اسمگلنگ، غیر قانونی ہتھیار اور وہ سب کچھ جو قانون کے دائرے سے خارج کیا گیا تھا پیٹرسن کے گروپ میں شامل تھا۔ کام کرنے والے، اور کام کروانے والے دونوں کو پتا نہیں ہوتا تھا کہ اصل میں ڈان کون ہے۔ وہ پیغام کو اسی طرح سے آگے بڑھاتے تھے۔ ''ڈان یہ چاہتے ہیں۔ یہ ڈان کا حکم ہے۔ ڈان تم سے خوش ہوئے ہیں۔'' اور ان میں سے کوئی بھی نہیں جانتا تھا کہ ڈان ہے کون اور کہاں رہتا ہے، کیسا دکھتا ہے۔

اور اب تو اس گروپ نے دوسرے ممالک سے بھی اپنے لیے ٹیم بنانی شروع کر دی تھی۔ سبین بھی اسی ٹیم کا حصہ تھی۔ نہیں جانتی تھی کہ ٹیم میں شمولیت تو اپنی مرضی سے کی جا سکتی ہے لیکن ٹیم سے باہر نکلنے کے لیے جان کی بازی لگانی پڑتی ہے۔

☆......☆......☆

ڈینی کو اس نے اگلے روز ہی کال کر کے کہہ دیا تھا کہ اب وہ یہ کام نہیں کر سکتی۔

''سبین تم جانتی ہو کہ تم دس بار جانے کا معاہدہ کر چکی ہو......''

''میں یہ معاہدہ ختم کر رہی ہوں۔''

''ابھی تمہیں مکمل رقم بھی نہیں ملی ہوئی......'' ڈینی کے لہجے میں فکرمندی تھی اور پیسے نہ دینے کی دھمکی بھی۔

''مجھے وہ رقم چاہیے بھی نہیں۔'' اس نے دوٹوک کہا۔ ڈینی خاموش ہو گیا۔ اب وہ جان گیا تھا کہ معاملہ کیا ہے۔ جو معاملہ سبین کے لیے ٹھیک ہو گیا تھا وہ اس کے لیے بگڑنے والا تھا۔

''تم میرے لیے مشکلات پیدا کر رہی ہو سبین!''

''میں اپنے لیے آسانی دیکھ رہی ہوں ڈینی۔''

''میں نے کارزل کو تمہارے پہلے چکر پر ہی بتا دیا تھا کہ تم دس بار یہ کام ضرور کرو گی۔ اسی لیے وہ تمہیں اتنی بڑی رقم دینے پر آمادہ ہوا تھا۔ تم کافی رقم لے بھی چکی ہو...... جانتی ہو کہ باقی کی بھی ضرور ملے گی۔ کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں......؟''

''نہیں ڈینی...... میرا مطلب ہے بات اعتبار کی نہیں...... اب مجھے یہ کام کرنا ہی نہیں۔''

''ایسے مت کہو سبین...... میں نے گروپ کو تمہارے حوالے سے مکمل یقین دہانی کرائی تھی۔ تمہاری رضامندی کے بعد...... تب تم نے ہر طرح سے یقین دہانی کروائی تھی کہ تم یہ کام کرو گی۔ پھر اب...... اب کیا ہوا ہے۔ تم میری ریپوٹیشن خراب کرنے پر کیوں تلی ہوئی ہو...... پلیز ایسے مت کرو۔''

سبین جانتی تھی کہ ڈینی جو کہہ رہا ہے ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ واقعی اس کے لیے مشکلات پیدا کر رہی تھی، گروپ میں اس کی ساکھ متاثر کر رہی تھی۔ لیکن اب وہ تھوڑی تھوڑی خود غرض سی ہو گئی تھی۔ وہ صرف اپنا فائدہ سوچ رہی تھی۔ صرف اپنا نفع......

''تم جو کچھ کہہ رہے ہو ٹھیک کہہ رہے ہو ڈینی...... تم مجھے خود غرض بھی کہہ سکتے ہو اور مطلب پرست بھی...... لیکن اب میں مجبور ہوں۔ اگر تم میرے لیے کچھ کر سکتے ہو تو مجھے خوشی ہو گی۔'' وہ نہیں چاہتی تھی کہ ڈینی بھی کسی مشکل میں گرفتار ہو۔

''میں صرف یہ کر سکتا ہوں کہ تمہارا پیغام آگے پہنچا سکتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔''

ڈینی نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس نے سبین کا پیغام آگے پہنچا دیا تھا۔ اگلے دن اسے نیویارک سے فون آ گیا تھا۔

''ہیلو......''

''اڑنے کی کوشش مت کرو ننھی لڑکی...... تمہارے پر ابھی نئے ہیں۔ ان سے اڑنے کا لطف تو لیا جا سکتا ہے لیکن بلندی کو نہیں چھوا جا سکتا......'' اس کے ہیلو کہنے پر آگے سے کیا خوب کہا گیا تھا۔ وہ ایک دم سے چپ رہ گئی تھی۔ اس کا اعتماد، اس کے سوچے سمجھے الفاظ اس کے منہ میں ہی چکرا کر رہ گئے تھے۔

''اگر کسی اور گینگ میں شمولیت اختیار کر لی ہے تو تمہیں آگاہ کر دیتا ہوں کہ ہمارا گینگ اس وقت سب سے زیادہ محفوظ ہے۔ دوسرے گینگ والے ضمانت تو دیتے ہیں کہ اونچ نیچ ہو جانے پر وہ معاملہ سنبھال لیں گے۔ لیکن جب مشکل پڑتی ہے تو وہ

ایسے غائب ہو جاتے ہیں جیسے مرنے کے بعد سانسیں...... تم سمجھ رہی ہو ناں...... سب بھیانک تصور لگنے لگتا ہے۔"

"میں نے کسی اور گینگ میں شمولیت اختیار نہیں کی...... میں اب یہ کام ہی نہیں کرنا چاہتی......" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"کیوں......؟"

"میرے گھر والے...... میرا مذہب......"

"پہلے یہ سب کہاں تھا؟" سادہ سوال پوچھا گیا تھا اور وہ لاجواب ہو کر رہ گئی تھی۔

"کہنے اور سننے میں یہ الفاظ اچھے لگتے ہیں لڑکی...... لیکن شاید تم جانتی نہیں ہمارا ان دنوں ہی چیزوں سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ گھر، مذہب کیا ہوتا ہے، ہم نہیں جانتے...... اور ہم چاہتے ہیں کہ جو ہمارے ساتھ کام کرے وہ ان تمام چیزوں کو بھول کر کام کرے...... تمہیں تین گھنٹے کی مہلت دی جاتی ہے۔ سوچ سمجھ کر جواب دینا......"

"میری طرف سے انکار ہے۔" اس نے جلدی سے کہا تھا۔

"میں کہا "سوچ سمجھ" کر جواب دینا۔" اس نے سوچ کے لفظ کو لمبا کھینچتے ہوئے کہا تھا اور ایسے کہا تھا کہ سبین بمشکل اپنے اعصاب درست رکھ پائی تھی۔ فون بند کر دیا گیا تھا۔ وہ بے چینی سے بند فون کو تکنے لگی تھی۔

تین گھنٹے اس نے کمرے میں چکر کاٹتے ہوئے گزارے تھے۔ اس کا فیصلہ اٹل تھا۔ وہ جانتی تھی۔ اب اسے یہ کام کرنا تھا یا نہیں وہ یہ بھی جانتی تھی...... نہیں...... لیکن یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے فیصلے کو آگے قبول کیا جائے گا یا نہیں......

بابا آئے تھے انہوں نے اسے کمرے میں چکر لگاتے دیکھا تھا اور لمحے بھر کو جاتے جاتے رکے تھے۔ وہ بھی رک گئی تھی۔ پھر بابا چل پڑے تھے، لیکن اس کی رکی ہوئی دل کی دھڑکن نہیں چل سکی تھی۔

تین گھنٹوں میں اس کی جان خشک ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے کسی خطرے کی بو سنائی دی تھی۔ فون کرنے والے کے لہجے میں کیسی دھمکی تھی۔ کیسا اعتماد تھا کہ تم ہمیں انکار کر ہی نہیں سکتیں...... تم ہم سے بچ کر کہیں جا ہی نہیں سکتیں۔

فضا میں نیاز بو کے پودے کی مہک گھلی ہوئی تھی۔ نیاز بو...... جسے قبروں کا پودا بھی کہا جاتا ہے۔ کچھ اس کی مہک، کچھ میو ہسپتال کے مردہ خانے سے آتی کافور کی بو...... اور کچھ گھر کے نئے فرنیچر کی باس...... سبین پر وحشت طاری ہونے لگی تھی۔

پورے تین گھنٹے کے بعد ایک بار پھر اس کا موبائل بج اٹھا تھا۔ وقت کی پابندی کمال حد تک کی گئی تھی۔ سبین کانپ کر رہ گئی تھی۔ کچھ لمحے تو اس کا دل چاہا کہ وہ کال اٹھائے ہی نا...... لیکن وہ جانتی تھی کہ پھر اس سے کس ذریعے اور کس طرح بات کی جائے گی۔ وہ طریقہ کال کرنے کے طریقے سے زیادہ بھیانک ہوگا۔

''بولو...... کیا سوچا ہے تم نے......''

''میری طرف سے انکار ہے۔'' متزلزل اعتماد کے ساتھ اس نے انکار کیا تھا۔

دوسری طرف لمحے بھر کو خاموشی رہی...... سوچا جا رہا تھا کہ بات کو کس انداز میں کیا جائے یا شاید اس کے فیصلے نے دوسری طرف والے کو غصے میں مبتلا کر دیا تھا۔ سبین اس کے تیز تنفس کی آواز سن سکتی تھی۔

''کیا تم یہ سمجھ رہی ہو کہ تم پاکستان میں ہو اور محفوظ ہو...... کوئی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا؟''

''ہاں......''

''تو جان لو کہ تم غلطی پر ہو...... تم اپنی حفاظت نہیں کر سکتیں۔''

''مجھے اپنی جان کی کوئی پروا بھی نہیں۔''

''اپنی کر بھی لو تو اپنے ساتھ والوں کی نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ یہ سب بہت مشکل کام ہے۔ کس کس کو محفوظ مقام دو گی؟ خود کو......؟ اپنے بابا کو......؟ زویا کو......؟''

وہ پوچھ رہا تھا اور سبین کے پیروں تلے سے اپنا ہی نیا پرانا سارے زمانے کا دیکھا ہوا گھر نکل گیا تھا۔ بابا، زویا...... کیسے بول لیے تھے اس نے یہ الفاظ۔

''یا......'' کہتے کہتے وہ رکا تھا۔ آواز نے معنی خیز مسکراہٹ کا روپ دھار لیا تھا۔ ''یا میران کو؟''

اور اگلے ہی لمحے میں سبین کے پاس دھماکا ہوا تھا۔ فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر گیا تھا۔

اسے اب پتا چلا تھا کہ وہ کتنی بری طرح سے پھنس چکی ہے۔

☆......☆......☆

''تم نے...... ڈینی تم نے مجھے یہ سب پہلے کیوں نہیں بتایا......'' وہ چلائی تھی۔ وہ لوگ میران تک بھی رسائی رکھتے تھے اس بات نے اس کا غصہ اور جذبات بھڑکا کر رکھ دیے تھے۔

''کیا نہیں بتایا؟'' ڈینی معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

''کیسے جانتے ہیں وہ لوگ میران کو...... کیسے پہنچے وہ اس تک......؟''

''کیا بات ہے؟ تمہیں کیا لگتا ہے کہ تم کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت کر رہی ہو جہاں ہر چیز کو اخلاقی اصولوں پر چلایا جاتا ہے۔'' ڈینی کی بات نے اسے لاجواب کیا تھا۔

''اگر وہ دس چکر پورے ہونے کے بعد تمہیں تنگ کرتے ہیں تو میں تمہارا ساتھ دوں گا۔ میں تمہارے آگے کھڑا ہوں گا۔

تمہیں کچھ ہونے سے پہلے اپنے سینے پر گولی کھاؤں گا، لیکن ابھی میں کچھ نہیں کر سکتا...... تمہیں جانا ہی پڑے گا۔"

سیبن خاموش تھی۔ وہ آٹھ دفعہ تو کیا اب ایک بار اور بھی نہیں جا سکتی تھی۔

"تم ان کی بات مان لو سیبن...... ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔" ڈینی اسے کہہ رہا تھا۔ وہ بے بس تھا۔ سیبن جانتی تھی۔

"ڈینی...... سمجھنے کی کوشش کرو اب یہ ناممکن ہے۔"

"ناممکن صرف پہلی بار جانا تھا سیبن...... تم اسے اپنی ہمت سے ممکن بنا چکی ہو۔" ڈینی اسے ساتھ ساتھ لاجواب بھی کرتا جا رہا تھا۔

"دو دفعہ جا چکی ہو...... آٹھ بار اور چلی جاؤ اور اس سب سے اپنی جان چھڑواؤ۔"

"لیکن......"

"پہلے تم اپنے لیے جاتی رہی ہو...... اب اپنے کے لیے جاؤ۔"

"لیکن ڈینی......" وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ ڈینی نے کال بند کر دی تھی۔ اس سے زیادہ وہ اس کا جذباتی سہارا نہیں بن سکتا تھا۔

"کیا کہہ رہا ہے۔" بابا کمرے میں آ گئے تھے۔ رشاید وہ اس کی باتیں سن چکے تھے۔ وہ گھبرا گئی تھی۔

"کچھ نہیں۔"

"سب ٹھیک ہے ناں......؟"

"جی......" اس نے جھوٹ بولا...... اور اب کی بار بابا نے اس کے جھوٹ پر یقین نہیں کیا۔

رات آئی اور چلی گئی۔ عجیب رات تھی وہ۔ ساری رات وہ وسوسوں کے باعث سو نہ سکی۔ ذرا آنکھ لگتی تھی تو کوئی بھیانک خواب اسے پھر سے جگا دیتا تھا۔ ایک وزنی پتھر تھا جو اس کے سینے پر رکھ دیا گیا تھا۔ وہ غیر مرئی مخلوق کے کابوسی جال میں جا پھنسی تھی۔

ڈینی نے اگلے روز اسے پھر کال کی۔

"یا یہ کام چھوڑ دو یا اپنوں کی فکر...... دوراہے پر کھڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" ان میں سے کسی ایک چیز کو چن کر ہی تم آگے بڑھ سکتی ہو۔"

"مجھے اپنی کوئی فکر نہیں ہے اگر وہ مجھے جان سے بھی مار دیتے ہیں تو...... مجھے تو بابا، زویا اور...... اور میران......"

"تمہیں وہ کچھ کہیں گے بھی نہیں...... وہ ان کو نقصان پہنچائیں گے جو تمہارے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ خود میرے ساتھ بھی......" ڈینی نے فقرہ درمیان میں ہی چھوڑا تھا۔ اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ فون کی دوسری طرف وہ رو پڑا تھا۔ سیبن دھک سے رہ گئی تھی۔ تو ہر کوئی مجبور تھا۔ کسی کو دولت چاہیے تھی کسی کو جان کی حفاظت اور کسی کو جان سے زیادہ عزیزوں کی جان...... جیسے سیبن کو۔

"بولو، سیین...... پھر کیا سوچا ہے تم نے......؟" بہت دیر تک روتے رہنے کے بعد ڈینی نے پوچھا تھا۔ دم بخود سیین کو جیسے کسی نے سوئی چبھوئی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" وہ مردہ سے لہجے میں بولی تھی۔

ڈینی نے اگلے روز اسے وہ پیکٹ پھر سے لا دیئے تھے جو بابا نے نالی میں پھینک دیے تھے۔

سیین نے ایک بار پھر سے ماڈل بنانا شروع کر دیا تھا۔ ڈینی کا بتایا ہوا ماڈل...... کلمے کا طغرہ۔

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

ترجمہ: نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے...... اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رسول۔

☆......☆......☆

"یہ بات جو میں آپ کو بتانے جا رہی ہوں اسے میں نے بہت دیر کے بعد جانا ہے کہ کلمے کا پہلا عنصر "یقین" ہوتا ہے۔ خدا کی ذات پر یقین...... بنا دیکھے اس کے وجود پر یقین...... بنا جانچے اس کی رحمت کا یقین...... بنا آزمائے اس کے انصاف پر یقین...... بنا سوچے اس کی صفات پر یقین......

اور کلمے کا پہلا لفظ "لا" ہے۔ "نہیں......" یعنی انکار...... کہ خدا کے علاوہ کوئی اور معبود نہیں ہے۔ نہ کوئی اور خدا ہے اور نہ ہم کسی اور خدا کو پوج سکتے ہیں۔ نہ خدا کے علاوہ پیسا خدا ہے، نہ شہرت، نہ عزت، نہ بلندی نہ عروج...... ہمیں پہلے ان سب کا انکار کرنا ہوگا۔ لا...... نہیں...... اس کے بعد آئے گا "الہ اللہ" یعنی خدا پر یقین...... کہ عزت، پیسہ، شہرت، عروج، خالق، رازق، مالک سب وہ ہی ہے۔ لیکن پہلا لفظ انکار ہے۔ خدا کے وجود پر یقین سے پہلے آپ کو ہر صورت "نہیں" بولنا پڑتا ہے۔ اگر آپ "نہیں" نہیں بولیں گے تو آپ کا "ہاں" بھی بے کار ہے۔"

☆......☆......☆

آنے والے وقت سے:

سورج کی طلاکاری کرنیں لہریں بہتے پانی میں تحلیل ہو رہی تھیں۔ جھیل کا بھنور جو غیر مرئی تھا اس کے پاؤں ڈالتے ہی تیز ہو گیا تھا۔ پہلی شعاعیں سطح آب سے منعکس ہو کر اس کی آنکھوں میں چبھ رہی تھیں۔ اس کی پلکیں لرز کر رہ گئیں۔ چشم آب جھلک جانے کو بے تاب تھا۔ اس نے اپنا دوسرا صندلی پاؤں بھی پانی میں ڈالا...... اب وہ مکمل طور پر جھیل میں اتر آئی تھی۔ جھیل نے بھی اسے شرف قبولیت بخش دیا تھا اور اب اسے اپنی طرف کھینچنے لگی تھی۔ اس کا تنفس تیز تر ہونے لگا تھا۔

آنکھیں بند کر کے وہ چلتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔

اس کا سفید پہناوا جو باریک تھا اور اس سے پہلے ہوا میں آنچل کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا گیلا ہو کر اس کی مخروطی پنڈلیوں کے ساتھ چپک گیا تھا۔ الماس رنگی لباس...... اس نے آج جانتے بوجھتے یہ رنگ منتخب کیا تھا۔ طنز آلود مسکراہٹ اس کے لبوں پر ثبت ہو کر انہیں آلودہ کر رہی تھی۔

وہ خود پر مسکرائی تھی یا اس تقدیر پر جسے اس نے اپنے ہاتھوں سے لکھا تھا، سجایا تھا، سانچے میں ڈال کر ایک نیا قالب دیا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔ اس لمحے اسے بس ایک ہی چیز کی سمجھ تھی کہ اسے آگے بڑھنا ہے۔ پانی نے اس کے گھٹنے کو چھولیا۔ ٹھنڈے پانی کے باعث اندر ائن چکھ لینے جیسی جھرجھری اس کے بدن میں سرائیت کر گئی اور عین اسی وقت اسے اپنے محبوب کا قرب یاد آیا۔ قربت کی تمام تر دل فریب جزئیات سے پر...... انتہائے قربت محبت اور انتہائے قربت مرگ کے احساسات ہمیں ایک جیسے کیوں ہوتے ہیں؟

پانی اب اس کے پیٹ تک آ گیا تھا۔ دور سورج شام کے رنگوں میں نہا رہا تھا۔ سیاہ رنگوں میں...... صرف ایک غوطہ اور خاتمہ...... زندگی کا بھی اور شام کا بھی...... اس نے اب جانا تھا جن شیامی رنگوں کے پیچھے بھاگ رہی تھی وہ تو اصل میں سیاہ تھے۔ کس چیز کی چاہت تھی اسے...... وہ کیا حاصل کرنا چاہتی تھی۔ کیا وہ خود سے بدلہ لینا چاہتی تھی۔؟ اس نے سوچ سے آنکھیں چار کرنا چاہیں۔ ڈوبتا سورج بے بس تھا۔ ضیاریزی دن کی ناند کے پیندے سے جا لگی تھی۔ نظریں چار کر کے وہ سوچنے لگی تھی کہ وہ جیت گئی ہے۔ کسی کی ہار کو وہ اپنی جیت سمجھ رہی تھی۔ وہ زندگی بھر ایسی ہی بے وقوف رہی تھی۔ ہاں ایسی جیت وہ جیت گئی تھی۔ ویسی ہی زندگی جو وہ چاہتی تھی۔ وہ سب کچھ جس کی اسے چاہت تھی۔ اب جب چاہت مکمل ہوئی تھی تو وہ کیوں ختم ہونے جا رہی تھی۔ اس نے دکھ سے اپنے ماضی پر نظر ڈالی تھی۔ وہاں سوائے پچھتاوے کے اور کچھ نہیں تھا۔

ایک وہ پانی تھا جو اسے نیچے سے بھگو رہا تھا۔ ایک اس کی آنسوؤں کا پانی تھا جو اسے اوپر سے بھگو رہا تھا اور اندر سے بھی...... دونوں۔

اطراف میں جھلسا دینے والی تپش تھی۔ پانی اس تپش کو بجھانے کے بجائے اور بھڑکا رہا تھا۔ وہ نیم چشم کے بجائے اس کمین گاہ سے پھوٹ رہا تھا جہاں اس کی خواہشات، آرزوئیں، تقاضے اور نفرتیں آہن پوش ہو کر اس پر تیر برسا رہی تھیں۔

''میں خود کو ختم نہیں کر رہی اے خدا...... میں اپنا آپ تیرے حوالے کر رہی ہوں۔ میں موت تک کا انتظار نہیں کر سکتی...... مجھے میرے گناہوں کی سزا جلد مل جانی چاہئے۔ میں حرام موت مر کر ایک بار پھر سے تیری نافرمانی نہیں کر سکتی...... میں تو خود کو بس تیرے حوالے کر رہی ہوں۔'' وہ کہتے ہوئے خدا کے آگے اپنی خودکشی کی مناسب اور حقیقی توجیہہ پیش کر رہی تھی۔ ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہونا تھا۔ اسے اب اپنی جان خدا کے حوالے ہی کرنی پڑے گی۔ یہ ہی انت ہے۔ یہ ہی اس کے کرم کا پھل ہے۔ یہ ہی وہ رنگ ہے جسے وہ حاصل کرنا چاہتی تھی۔

فرق الکسوب کا مرض اس کے سر پر سوار تھا۔ پانی اس کے سینے سے آلگا تھا۔ اس کے مشک فامی بالوں کے کنارے پانی کو اپنے اندر جذب نہ کر سکے اور الجھتے ہوئے اوپر اٹھنے لگے۔ سورج مکھی کے پھول کی طرح وہ اپنے ہی بالوں میں بے حد خوش کن لگ رہی تھی۔ اتنی کہ اس سنسان گوشے میں اگر کسی کو خبر ہو جاتی کہ ایک بنت البحر لڑکی خود کو ختم کرنے جا رہی ہے تو دنیا اپنے سارے کام چھوڑ کر اسے تلاش کرنا شروع کر دیتی۔

''خدارا میری سانوں کی نذر کو قبول کر...... میرے پروردگار میری جان تیرے حضور پیش ہے۔ اسے دوزخ کی بھٹی میں جلایا جنت کے پھول دے۔ لیکن اسے سکون دے۔'' اور اب...... اس کا سر بھی پانی میں ڈوب چکا تھا۔ اب وہ مکمل طور پر ندی کے سپرد ہو چکی تھی۔ پانی اسے لے کر آگے بڑھنے لگا تھا۔ آخری سانیں لیتی وہ یہ ہی سب بڑبڑا رہی تھی جب پانی کے تلاطم میں اسے کچھ سنائی دیا تھا۔ نمکین کھارے پانی کے شور میں اس نے دھیان لگانے کی کوشش کی تھی اور جلد ہی آواز کی ساخت کو پا لیا تھا۔ دور کہیں سے ہلکے سر بج اٹھے تھے جواب آہستہ آہستہ اس کی سماعت میں واضح ہونے لگے تھے۔

جل دیوتا کا راگ بج اٹھا تھا۔ لیکن یہ سب تو صرف قصے کہانیاں نہیں تھیں کیا......؟

وہ سوچنے لگی اور بالکل بھی خوفزدہ نہیں ہوئی بلکہ کسی حد تک خوشی سے کھلکھلا اٹھی تھی۔ قصہ تھا یا حقیقت اسے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کے لیے یہ اہم تھا کہ اس کی نذر کو قبول کیا جا رہا تھا؟ خدا نے اس کی سانسوں کی امانت کو واپس لے لینے کا فیصلہ کر لیا تھا؟

ہاں شاید واقعی...... جل دیوتا کا راگ اب پوری آن بان سے بج رہا تھا۔ وہ اس راگ کو بہت واضح سن سکتی تھی۔ وہ اس راگ کو جانتی تھی۔ یہ راگ اس کی نس نس میں تھا۔ تو خدا کے فرشتے اپنا کام بخوبی کر رہے ہیں۔ اس کی جان جل دیوتا قبض کرے گا؟ موت کی وادیوں میں جاتے ہوئے وہ مسکرا رہی تھی۔

اسے اپنے ہاتھ میں کسی کی گرفت محسوس ہوئی تھی۔ جل دیوتا نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ وہ بھی چپکے سے اس کے سینے کے ساتھ جا لگی تھی۔ وہ خوش تھی۔ زندگی میں ایک لمبے عرصے کے بعد وہ اتنی خوش ہوئی تھی...... اور مسکرا اٹھی تھی۔

جل دیوتا کا راگ سنتے سنتے وہ میٹھی اور ابدی نیند میں گم ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

پیارے بابا......

زندگی میرے لیے وہ پہاڑ ثابت ہوئی ہے کہ پہلے جس کی بلندی نے مجھے مبہوت کیا اور جب میں نے اس پر چڑھنا شروع کیا تو میرے پاؤں آبلوں سے بھر گئے۔ اب مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں اپنے پاؤں کا علاج کروں، نیچے اتروں یا چھلانگ مار کر پستی میں گر جاؤں۔

آپ نے ایک بار کہا تھا کہ آپ کے لیے ہم بھی چونے کے مترادف ہیں۔ آپ ہمیں بھی تراش خراش کر الماس بنانا چاہتے ہیں تا کہ دنیا کے بازار میں ہماری قدر و قیمت بڑھے...... لیکن میں آپ کو بتانا چاہتی ہوں بابا کہ آپ کی یہ بیٹی بہت جلد باز ثابت ہوئی ہے۔ آپ کے بنائے الماس کو میں نے حرص اور ہوس کی ٹھنڈک دے کر پھر سے کولہ بنا دیا ہے۔ سفید الماس سیاہ ہو چکا ہے۔ میں کوئلے کی طرح کم قیمت بھی ہو چکی ہوں اور سیاہ بھی...... اب دنیا والوں کو میری قدر و قیمت سے کوئی سروکار نہیں...... آپ اتنا تو جانتے ہی ہوں گے کہ ہیرا ایک بار جل جائے تو اپنی حیثیت کھو بیٹھتا ہے۔ اس لیے آپ بھی مجھے چھو کر اپنے ہاتھ گندے مت کیجیے۔ مجھے سوچ کر اپنا ذہن غلیظ مت کیجئے گا۔ اور مجھے یاد کر کے اپنی بینائی مت کھوئیے گا۔ میرے لیے میری زندگی کی اہمیت ختم ہو چکی ہے۔ انہوں نے اس زندگی کا نام لے دیا ہے جو میری روح کا حصہ ہے۔

میران...... اس نے میرے لیے کیا نہیں کیا۔ میں اس کے لیے موت کو کیسے قبول کر سکتی ہوں۔ میں خدا کے پاس جاتے ہوئے اپنی روح کو داغ دار نہیں کرنا چاہتی...... اس لیے میں ایک بار پھر جا رہی ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔ اب میں اس گھر میں تب تک نہیں آؤں گی جب تک اس کام کو ختم نہ کر لوں یا اس کام سے خود کو قتل نہ کر لوں۔

ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجیے گا۔

آپ کے پیار کی طلب گار۔

سبین......

☆......☆......☆

آدھی رات بیت چکی تھی۔ چار سو خاموشی تھی۔ ہوا بھی جامد تھی۔ ماسوائے تتری کی آواز کے جو اللہ کی حمد پڑھنے میں مصروف تھی۔ اور اس نے بھی ماحول کو پر سکون کرنے کے بجائے خوفزدہ سا کر رکھا تھا۔

خط کو اس نے چپکے سے بابا کے بیڈ پر ان کے سرہانے رکھ دیا تھا۔ بابا سو رہے تھے یہ اس کا گمان تھا۔ اس نے بابا کے ہاتھ چومنے چاہے تھے اور پھر خود کو بڑی مشکل سے اس اضطراری حرکت سے باز رکھا۔ پھر وہ زویا کے پاس گئی تھی۔ زویا کی آنکھیں بند تھیں۔ اس نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا تھا اور اگلے ہی پل زویا نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''آپی...... مت جاؤ......'' اس نے چھوٹتے ہی کہا۔

زویا کے جاگنے اور پھر اس کی بات نے سبین کے آنسو جاری کر دیے۔

''میرا جانا بہت ضروری ہے چھوٹی......''

''ہمیں کچھ نہیں ہوگا۔ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا......''

''ایک ہے جوان کے بہت قریب ہے۔ مجھے اس کے لیے جانا ہے۔ میران کے لیے......''

''آپ اللہ سے دعا کرو......انہیں بھی کچھ نہیں ہو گا۔''

''مجھ میں دعا کرنے کی ہمت ہوتی تو مسئلہ ہی کیا تھا چھوٹی......'' وہ دبی دبی آواز سے رونے لگی تھی کہ کہیں ابو جاگ نہ جائیں۔

''بابا کا خیال رکھنا......''

''اور آپ اپنا......''

رات کے اندھیرے میں وہ ایک بار پھر گھر سے باہر جانے کے لیے نکلی تھی۔ اس نے اپنا بیگ پکڑا تھا اور گھر کی دہلیز پار کر گئی تھی۔ بڑی سڑک پر ایک ٹیکسی اسی کے انتظار میں کھڑی تھی۔ وہ ٹیکسی میں سوار ہوئی تو ٹیکسی ایئرپورٹ جانے والے راستوں پر گامزن ہو گئی۔ اپنا بیگ کھول کر اس نے اسکارف نکال کر اسے ٹیکسی میں ہی بیٹھ کر پہننا چاہا۔ وہ بیگ سے اسکارف نکال رہی تھی جب اسے بیگ پر کپڑوں کے اوپر ہی کاغذ کا ایک تہ کیا ہوا ٹکڑا نظر آیا تھا۔ تعجب سے دیکھتے ہوئے اس نے کاغذ کھولا اور دھک سے رہ گئی۔ کاغذ پر بابا کی لکھائی تھی۔

''سیین......

میں ایک ایسا بدنصیب باپ ہوں جو اپنی اولاد کی حفاظت نہ کر سکا، ساری زندگی میں نے اپنی من مانی کی......تم کو اپنی فوٹو کاپی بنانا چاہا......میں نہیں جانتا تھا کہ نئی نسل کے تقاضے کس قدر الگ ہوں گے۔ لیکن میں اتنا تہی دامن بھی نہیں ہوں کہ خدا سے تمہاری حفاظت کی دعا نہ کر سکوں۔ میں نے خدا سے کبھی کسی طلب کی ضد نہیں لگائی......اور مجھے یقین ہے کہ خدا میری پہلی ضد کو ضرور پورا کرے گا۔ وہ تمہیں کچھ نہیں ہونے دے گا۔ وہ تمہاری ہر مشکل آسان کرے گا۔

خود کو تمہارا مجرم سمجھتا ہوں۔ ہو سکتے تو مجھے معاف کر دینا......اور جلدی واپس آنا......مجھے تمہارا شدت سے انتظار رہے گا۔ میں مرنے سے پہلے تمہیں دیکھنا چاہوں گا۔

تمہارا مجرم باپ......''

خط پڑھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

☆......☆......☆

لاہور ایئرپورٹ پر ایک معمولی سا مسئلہ ہو گیا تھا۔ بورڈنگ پاس جاری کرنے والی لڑکی یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھی کہ وہ پہلے کبھی امریکا نہیں گئی اور اس کا نام ''خدیجہ'' ہی ہے۔ اور سیین اس بات پر بضد تھی کہ وہ پہلی بار امریکا جا رہی ہے۔ اور اس کا نام ''خدیجہ'' ہی ہے کیونکہ اس کے پاس اس وقت اسی نام کا پاسپورٹ تھا۔ بورڈنگ پاس جاری کرنے والی لڑکی کو اس کا نام یاد نہیں آ

رہا تھا اور نہ وہ یقیناً چلا اٹھتی کہ اس کا نام خدیجہ نہیں سبین ہے۔ وہ ذہن پر زور تو بہت ڈال رہی تھی جسے سبین ضبط سے مسکرا کر برداشت کر رہی تھی۔

شاید یہ اشارہ تھا کہ وہ آگے نہ بڑھے...... بڑے گڑھے میں گرنے سے پہلے چھوٹے گڑھے ضرور آتے ہیں۔ اندھیرا جنگل ایک دم سے شروع نہیں ہو جاتا، پہلے زہریلے پودے، خاردار جھاڑیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ خطرناک پہاڑوں سے پہلے پرپیچ گھاٹیاں ضرور آتی ہیں اور بڑے کانٹے سے پہلے چھوٹے کانٹوں سے واسطہ ضرور پڑتا ہے۔ تقدیر اسی طرح کی سرزنش کرتی ہے۔ فرشتے خطرے کا الارم بجاتے ہیں۔ انجانی قوت خبردار کرتی ہے۔ اب یہ انسانوں پر ہے کہ وہ ان اشاروں کو کس حد تک سنجیدگی سے لیتا ہے۔ وہ انہیں اپنے لیے رحمت کا پیغام بنا لیتا ہے یا اپنے غرور کو خود پر سوار کر کے اپنے لیے مشکلات کھڑی کر لیتا ہے۔

نیویارک چیکنگ کے دوران بھی چھوٹا مسئلہ ہوا تھا۔ بالکل اتنا ہی جتنا اسے توقع تھی۔ اور جتنا وہ نیویارک میں پہلے بھی دو بار جھیل چکی تھی۔ وہ، سارا وہ والا تماشا کرنے کے لیے تیار تھی جس کی اس نے کافی بار مشق کر لی تھی کہ میری مقدس چیزوں کو نہ ہاتھ لگایا جائے...... یہ کلمہ لکھا ہوا ہے۔ ایک مسلمان کے دل کو مجروح کرنے کا ان کو کوئی حق نہیں بنتا...... وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس بار اس کی نوبت نہیں آئی تھی۔ بس ایک آفیسر نے اس سے مؤدبانہ انداز میں اتنا ہی کہا تھا کہ وہ ماڈل کا ایک ٹکڑا کہیں سے بھی اتار کر اسے دے دے۔ وہ اس کی کیمیکل لیبارٹری سے تسلی چاہتا ہے۔

سبین کو اس کے مطالبے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ بلور کی گرم ہوا سے شیشے کے جوڑوں کو بہت احتیاط سے الگ کر لیا گیا تھا پھر سبین نے خود ہی ایک تیز دھار کٹر سے طغرے کی سائڈ سے ایک سیدھی پٹی اتار دی تھی۔

''اس سے یقیناً آپ کی تسلی ہو جائے گی۔''

''یقیناً......'' آفیسر نے مسکرا کر کہا تھا اور سبین آفیسر کی تسلی پر دل میں ہنسی تھی۔ بھلا حشیش سے بھرے کیپسول تو طغرے کے درمیان میں موجود تھے۔ کلمے کے حروف کے عین نیچے...... اطراف سے کاٹی گئی پٹی میں کیسے کچھ گڑبڑ ہو سکتی تھی۔

اس ساری کارروائی کے بعد ہمیشہ کی طرح اسے انتہاء عزت کے ساتھ جانے دیا گیا تھا اور اسے کہا گیا تھا کہ وہ نیویارک سے کہیں بھی جانے سے پہلے پولیس کو آگاہ کرے۔

''ضرور......'' اور اس کا نیویارک سے باہر نکلنے کا بھلا ارادہ ہی کب تھا۔

ایئر پورٹ سے باہر نکل کر اس نے ایک گہری سانس لی تھی۔ ایک بار پھر سے وہ نیویارک میں تھی۔ چاہتے ہوئے یا نا چاہتے ہوئے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اسے اب یہ زہر زہر مار کرنا ہی تھا کیونکہ اس کے پاس اس زہر کا کوئی زہر مہرہ نہیں تھا۔ اس نے اپنی آمد کے بارے میں میران کو نہیں بتایا تھا۔ وہ اسے اذیت نہیں دینا چاہتی تھی اور اس کی اذیت کا سوچ کر خود بھی

اذیت نہیں لینا چاہتی تھی۔

نیویارک میں بڑا اجلا سا دن نکلا ہوا تھا۔ دھوپ سیاہ سڑکوں اور بلڈنگوں کے شیشوں سے منعکس ہو کر مزید روشن دکھ رہی تھی۔

ایک ٹیکسی ڈرائیور نے اس کے پاس آ کر اس کا سامان تھام لیا تھا۔ تب اسے اچانک سے یاد آیا تھا کہ اسے ابھی گیسٹ ہاؤس جا کر جلدی سے کلیے کا ایک اور طغرا تیار کرنا ہے پھر ہی وہ آرام کر سکتی ہے۔ گیس ہاؤس میں آ کر اس نے دوپٹا اور اسکارٹ اتار کر سائڈ پر پھینکا تھا۔ پھر جلدی سے نیا ماڈل بنانے کی تیاری کرنے لگی تھی۔ وہ پرسوں رات سے تھکی ہوئی تھی۔ اعصابی بھی اور جسمانی بھی...... اپنا کام کر کے وہ جلدی سے سو جانا چاہتی تھی۔

سارا سامان ہمیشہ کی طرح وہاں ہی موجود تھا۔ جلدی سے اس نے کلیے کا ماڈل تیار کر لیا تھا۔ پھر اسے اوون میں سکھا بھی لیا تھا۔ بڑی احتیاط کے ساتھ اس نے اس ماڈل کا ایک اتنا ہی ٹکڑا اتارا تھا جتنے دوسرے ماڈل کا اتار کر وہ آفیسر کو دے آئی تھی۔ ڈینی کو اس نے ساری بات بتانے کے لیے کال کی تھی اور ڈینی اسے پہلے سے ہی کال کر رہا تھا۔ پرس میں رکھا اس کا فون کافی دیر سے بج رہا تھا۔ کام کے دوران اسے احساس ہی نہیں ہوا تھا۔

''سبین کہاں ہو تم......'' ڈینی کی آواز سخت گھبراہٹ لیے ہوئے تھی۔

''کیوں......؟ کیا ہوا ہے؟'' وہ بھی ایک دم سے گھبرا گئی۔ ''میں تو گیسٹ ہاؤس میں ہوں۔''

''ماڈل کہاں ہے؟''

''نیا ماڈل میں نے بنا لیا ہے۔ جو ساتھ لے کر آئی ہوں اسے کوئی لینے ہی نہیں آیا......''

''اسے لینے کوئی آئے گا بھی نہیں...... کیونکہ پولیس تم تک بس پہنچنے ہی والی ہے۔''

''کیا......؟'' اس نے ایک بلند چیخ ماری تھی۔

''ہاں...... رپورٹ میں خرابی آ گئی ہے۔''

''رپورٹ میں خرابی آ گئی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' تین منزلہ گیسٹ ہاؤس اس کے پیروں کے نیچے کانپنے لگا تھا۔

''تمہارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ تم یہ سب تفصیل سنو...... یہ سب ایک طریقے سے ہوتا ہے...... چونے کو ایک خاص کیمیکل میں ڈال دو تو وہ کیمیکل میں حل ہو کر پانی کا حصہ بن جاتا ہے اور ساری حشیش نیچے بیٹھ جاتی ہے۔''

''کیا بات کر رہے ہو تم ڈینی...... مجھے پھنسوا رہے ہو اور کس کمال طریقے سے جھوٹ بول رہے ہو......'' وہ چلائی تھی۔

''میں تمہیں پھنسوا رہا ہوں؟'' ڈینی بے یقینی سے بولا تھا۔

''اور نہیں تو کیا...... حشیش کیمیکل کی تہ میں کیسے بیٹھ سکتی ہے۔ حشیش تو کیپسول میں بند تھی اور کیپسول درمیان میں تھے۔

میں نے آفیسر کو سائڈ سے ٹکڑا کاٹ کر دیا ہے۔"

"میں خود پریشان ہوں کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔ لیکن اب تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے سبین...... اس ماڈل کا کچھ کرو۔"

"میں بتاتی ہوں کہ کیا ہوا ہے۔ گینگ نے مجھے مزا چکھانے کا سوچ لیا ہے اور تم...... تم بھی ان کے ساتھ ہی ملے ہوئے ہو۔" وہ غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔ تصور ہی تصور میں وہ پولیس کی گاڑیاں اس ہوٹل تک آتے دیکھ رہی تھی۔ اس کی کلائیوں میں پہنی چوڑیاں اسے ہتھکڑی لگنے لگی تھیں۔

"پاگل مت بنو لڑکی...... ایسا کچھ نہیں ہے۔ تم نے یقیناً کام عجلت میں کیا ہے۔ گرم چونا سانچے میں ڈال دیا ہے۔ جس نے کیپسول کو پھاڑ دیا ہے۔ حشیش طغرے میں چاروں طرف پھیل چکی ہے۔"

وہ سن ہو گئی تھی۔ ڈینی کے لہجے سے اس کی سچائی اور سبین کی کارگزاری عیاں تھی۔ ہاں یقیناً ایسا ہی ہوا تھا۔ اس نے بابا سے چھپ کر بہت عجلت میں کام کیا تھا اور جیسا ڈینی کہہ رہا تھا ایسا ہی ہوا تھا۔ جلدی میں اس نے بھاپ چھوڑتے چونے کو سانچے میں ڈال دیا تھا۔ اس کے ٹھنڈا ہونے کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔

"اب میں کیا کروں ڈینی......" وہ ایک دم سے گھبرا گئی جبکہ صورت حال تو غش کھا کر بے ہوش ہو جانے والی تھی۔

"تم...... تم...... ایسا کرو کہ......" ڈینی کی خود سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیا کرنے کو کہے، یا جو وہ سوچ رہا تھا اسے کیسے کہے...... اپنے خیال کو الفاظ کا روپ کیسے دے۔

"تمہارے پاس بچنے کا اب ایک ہی طریقہ ہے کہ تم ان کی رپورٹ کو جھوٹا کر دو...... نیا ماڈل انہیں اچھی طرح چیک کر لینے دو اور...... اور پرانے ماڈل کو غائب کر دو...... پوری طرح سے......"

"لیکن کہاں...... کہاں چھپاؤں میں اسے......"

"تم اسے کہیں بھی نہیں چھپا سکتی...... ان کے ساتھ کتے ہوں گے۔ تم جہاں بھی چھپاؤ گی وہ اس تک پہنچ جائیں گے۔"

"تم کیا کہنا چاہتے ہو ڈینی...... جلدی بتاؤ......"

"تم ایسا کرو کہ اس ماڈل کو توڑ کر...... فلیش آؤٹ کر دو......"

ڈینی نے رک رک کر کہا تھا اور ساتوں آسمان سے ستر سو بجلیاں کڑکتی ہوئی سبین کے دل پر جا گری تھیں۔

"کیا......؟ تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا ڈینی...... یہ کیا کہہ رہے ہو تم...... ماڈل توڑ کر فلیش آؤٹ کر دوں۔ تم جانتے ہو کہ وہ مقدس ماڈل ہے۔" اس نے ایسے ہی چلا کر کہا تھا جیسے وہ ایئرپورٹ پر کہتی تھی۔ جب جب کتے اس کے ماڈل کے پاس آتے تھے تو وہ چلاتی تھی کہ یہ ماڈل مقدس ہے۔ کتے اس کے پاس نہیں آ سکتے...... اب کی بار بھی وہ ایسے ہی چلائی تھی۔ کیا یہ

بھی اداکاری تھی؟ اب کے کہنے میں کتنی سچائی تھی یہ بات اس کا ضمیر جانتا تھا اور ڈینی بھی...... خدا نے اسے ایک دم سے کس مقام پر کھڑا کر دیا تھا۔ اس کا اپنا جھوٹ ہی اس کے سامنے آ گیا تھا۔ وہ وہی فقرہ دہرا رہی تھی اور ڈینی پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔

"میرا دماغ ٹھیک ہے۔ لیکن اگر تم نے میری بات نہ مانی تو تمہاری زندگی ضرور خراب ہو جائے گی۔ تمہارے پاس صرف ایک یہ ہی حل ہے۔ بعد میں اپنے اللہ سے معافی مانگ لینا......"

"نہیں......" اس نے اٹل انداز میں کہا۔

"ہم سب کو مت پھنسواؤ سین...... خدا کے لیے ویسا ہی کرو جیسا میں کہہ رہا ہوں۔ پانچ منٹ ہیں زیادہ سے زیادہ...... جلدی کرو۔"

"میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی ڈینی......"

"پاگل لڑکی...... تو تمہارے خیال میں ان باقی کے مقدس ماڈلز کے ساتھ کیا ہوتا رہا ہے جو تم لاتی رہی ہو...... جانتی ہو......؟"

"نہ جانتی ہوں نہ جاننا چاہتی ہوں۔ انہیں میں نے شہید نہیں کیا تھا اور میں یہ کام کر بھی نہیں سکتی......"

"ٹھیک ہے۔ پھر جیل میں جانے کے لیے تیار ہو جاؤ......" ڈینی نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ اس کے پیروں کے نیچے جو ہوٹل تھرتھرا رہا تھا وہ اب کہیں دور جانے لگا تھا۔ اسے وہاں ہی چھوڑ کر......

"ماڈل توڑ کر فلیش آؤٹ کر دو......" ڈینی کا فقرہ کمرے میں اندھی ابابیل کی طرح چکر کھا رہا تھا اور اس کی بازگشت رفتہ رفتہ اتنی بھیانک ہو رہی تھی کہ اسے چکی چلنے سے بھی زیادہ اس آواز سے نفرت ہونے لگی تھی۔

"میرے اللہ......" وہ سوچ کر ہی کانپنے لگی تھی اور بے قراری سے اپنے ہاتھ ملنے لگی۔ تو وہ وقت آ گیا ہے جو ہرگز نہیں آنا چاہیے تھا جس سے وہ ڈر رہی تھی۔ اس نے ماڈل کو اٹھا کر دیکھا تھا جس پر کلمہ لکھا ہوا تھا۔

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ...... (نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔)

اسے یاد تھا کہ بابا کلمے والے طغرے کی کیسے حفاظت کیا کرتے تھے۔ اسے بے حد احتیاط سے بنایا کرتے تھے۔ جب جب بابا نے کلمہ والے ماڈل بنانے ہوتے تھے پہلے اچھی طرح سے وضو کرتے تھے پھر چاک پر بیٹھتے تھے۔ چونے کو چھانتے تھے۔ ماڈل کو سوکھنے کے لیے زمین پر نہیں رکھتے تھے بلکہ چارپائی پر پھیلا پھیلا کر سکھاتے تھے۔ جب جب ماڈل چچا کریم کے پاس جاتا تھا تو کلمے والے ماڈل کا کارٹن سب سے اوپر رکھواتے تھے۔ کتنے مقدس ہوتے تھے کلمے والے ماڈل بابا کے لیے...... اور ڈینی کہہ رہا تھا کہ......

"خدارا...... میں کیا کروں......"

کھڑکی سے باہر سورج چمک رہا تھا۔ سورج بنسی جاگ رہے تھے۔ سورج کی پرستش کی جانے لگی تھی۔ وہ لوگ جو چمکتی ہوئی چیزوں کے دلدادہ ہوتے ہیں اور سورج کو خدا مان کر پوجنا شروع کر دیتے ہیں۔ سبین بھی تو ان ہی جیسی تھی۔ اسے چمک سے بے انتہا محبت رہی تھی۔ چونکے کو اس نے الہ دین کا چراغ سمجھ کر رگڑا تھا۔ اور اب وہاں سے نکلا تھا کڑوا کسیلا دھواں۔

''اسے توڑ کر بہادو...... ورنہ جیل جانے کے لیے تیار ہو جاؤ......'' ڈینی کی بات کی چکی چلتی جا رہی تھی اور وہ پس پس کر ادھ موئی ہو رہی تھی۔ طغرے پر کلمہ تھا۔ مقدس حروف...... ایک عقیدہ...... ایمان...... مذہب...... خدا اور رسول کا ایک ساتھ نام...... وہ اسے کیسے توڑ سکتی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ پاگل ہونے والی تھی۔

وہ تصور کی آنکھ سے دیکھ سکتی تھی کہ پولیس بس اس تک پہنچنے ہی والی ہے۔ اگلے چند لمحوں کے بعد اس کے ہاتھ میں ہتھکڑیاں ہوں گی۔ وہ پولیس کے ساتھ ساتھ چل رہی ہو گی۔ گینگ اسے باہر نکالنے میں ناکام رہے گا۔ اسے ساری زندگی کے لیے جیل ہو جائے گی۔ بابا، زویا اور میران...... سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائے گی۔ وہ ان کو پھر کبھی نہیں دیکھ سکے گی۔ میران اسے منہ لگانا پسند نہیں کرے گا۔ ممکن ہے اسے طلاق دے دے۔ بابا، زویا چاہ کر بھی اس سے ملنے نہیں آ سکیں گے۔ وہ ان کے ساتھ پھر کبھی وقت گزار نہیں سکے گی۔ اس کی زندگی سے خوشیاں ہمیشہ کے لیے روٹھ جائیں گی۔

ایک طرف یہ سب کچھ تھا اور دوسری طرف صرف ایک کلمہ...... چند حروف...... جسے توڑ کر، بہا کر وہ خود کو ایک بار پھر محفوظ کر سکتی تھی۔ فقط ایک طغرہ کلمے کا۔

ایک دم سے ہی سورج کہیں جا چھپا...... سیاہ پروں کی پھڑ پھڑاہٹ کی آواز اسے سنائی دی تھی۔ کمرہ تاریک ہو رہا تھا۔ اس نے ساری لائٹس آن کر دیں۔ پھر بھی کمرے میں اندھیرا چھانے لگا۔ وہ اندھی ہونے لگی۔ سیاہ پروں کی وہ پھڑ پھڑاہٹ شیطان کی تھی۔ وہ اس کے سامنے آ کر تسلی سے بیٹھ گیا تھا۔

''یہ ایک طغرہ ہی تو ہے۔ اصل کلمہ تو تمہارے دل میں موجود ہے۔'' اور جیسا کہ اس کا کام ہے۔ اس نے اسے بہکانا شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس بار وہ بہکنے والی نہیں تھی۔ ایک طرف کلمہ تھا اور دوسری طرف اس کی زندگی۔

اس نے جلدی سے فون نکال کر میران کو کال کی تھی۔

''میران......''

''میں مصروف ہوں۔ دوبارہ مجھے کال نہ کرنا......'' اس نے روکھے لہجے میں کہا تھا۔ سبین کو اس کے لہجے سے طیش آیا تھا۔

''میران میں ایک مشکل میں ہوں۔''

''اپنی مرضی سے ہو۔'' وہ ویسے ہی لہجے میں بولا۔

''میران میری بات سنو...... اس وقت صرف تم میری مدد کر سکتے ہو......''

''میں کسی قابل نہیں......'' اس نے کال بند کر دی تھی۔ اتنی گھبراہٹ میں ہونے کے باوجود بھی سبین کو شدید مایوسی ہوئی تھی اور اسے میران پر بے انتہا غصہ آیا تھا۔

دو منٹ گزر چکے تھے۔ ڈینی نے کہا تھا زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ۔

وہ بے قراری سے کمرے کے چکر لگانے لگی۔

''سوچ کیا رہی ہو...... وہ گلدان پکڑو اور اس ماڈل کو توڑ کر بہا دو...... بس اتنا سا کام ہے۔ ایک منٹ بھی نہیں لگے گا۔ اللہ بہت رحیم ہے۔ وہ تمہیں معاف کر دے گا۔ مجھ سے گارنٹی لے لو۔''

وہ چند لمحے سوچتی رہی تھی۔ اس کا دل اتنی بری طرح سے دھڑکنے لگا تھا کہ اسے لگا یہ اس کے سینے سے باہر آ جائے گا۔ ہاں وہ بعد میں اللہ سے معافی مانگ لے گی۔ اللہ یقیناً اسے معاف کر دے گا۔ اس نے کارنس پر پڑا ایک وزنی گلدان پکڑ لیا تھا اور کلمے والے ماڈل کے پاس آئی تھی۔ شیطان کے قہقہے آسمان کو چھونے لگے تھے۔

''خدارا مجھے معاف کر...... میرے پاس اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں ہے۔'' اس نے کہا تھا اور پوری شدت سے ماڈل پر گلدان کی ضرب لگانی چاہی تھی۔ پیچھے سے ہاتھ آگے لاتے ہوئے اس کی ساری جان اس کے بازوؤں میں منتقل ہو چکی تھی۔ اس کے چہرے پر ایسی سختی در آئی تھی جو پتھر کی مورتوں میں بھی نہیں ہوتی...... اور اس کی آنکھیں اس بری طرح مڑ چکی تھیں جیسے اسے بچپن سے اب تک فالج رہا ہو۔

کلمے کے حروف طغرے میں سے نکل کر اس کی آنکھوں کے آگے ناچنے لگے تھے۔ اللہ، رسولؐ، محمدؐ...... وہ اس کی ماننے والی تھی لیکن ابھی اسے ڈینی کی ماننی تھی۔

تین منٹ گزر چکے تھے۔ دو باقی تھے۔

یک لخت خاموش کمرے میں کسی چیز کے ٹوٹنے کا شور بلند ہوا۔



ناول **شام رنگ سیاہ** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **20** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 10

یک لخت خاموش کمرے میں کسی چیز کے ٹوٹنے کا شور بلند ہوا تھا۔ وہ شور گلدان کے ٹوٹنے کا تھا۔ وہ اپنی قوری طاقت سے گلدان کو کلمے والے طغرے پر مار دینا چاہتی تھی اور اس نے اپنی طرف سے ایسا کیا بھی تھا لیکن ایک انجانی قوت نے اس کے ہاتھ روک دیئے تھے۔ یہ انجانی قوت اس کے دل کی تھی۔ جو اس بار خیر کے لبادے میں لپٹے شر شیطان کی زد میں آنے سے بچ گئی تھی۔

گلدان اس کے ہاتھ سے پھسل کر فرش پر جا گرا تھا اور اب لاتعداد ٹکڑوں میں بدل گیا تھا۔ وہ گلدان چونے کا بنا ہوا تھا۔ جلدی میں اس نے کارنس سے دھاتی گلدان اٹھانے کے بجائے چونے سے بنا گلدان اٹھا لیا تھا۔ وہ چونے کو توڑنے جا رہی تھی۔ نادانستگی میں اپنی ایسی بے وقوفانہ حرکت پر وہ ہکا بکا رہ گئی اور حیرت سے ٹوٹے ہوئے گلدان کو دیکھنے لگی۔ تو کیا بس اللہ اس کا ظرف دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اسے آزما رہا تھا؟ کیا اس کی آزمائش اب ختم ہو چکی تھی۔

''میں ایسا نہیں کر سکتی...... یا اللہ ایسا نہیں کر سکتی......'' زمین پر گر کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

''پھر اور کیا کرو گی؟'' شیطان طنز سے پوچھ رہا تھا۔ جیسے بچنے کے سارے راستے وہ مقفل کر کے آیا ہو۔

باہر ہوا کا تنفس اس کے سانسوں کی طرح تیز تھا۔ دماغ میں آندھیاں چلنے کی آوازیں قید تھیں اور ذہن میں اتنی سکت بھی باقی نہیں بچی تھی کہ وہ کہیں بھٹک ہی سکے۔

بمشکل دو منٹ رہ گئے تھے۔ پولیس بس اس تک پہنچنے والی تھی۔ ایسے کم وقت میں اس نے ایک عجیب کام کیا۔ اس نے واش روم جا کر وضو کیا اور کمرے کے فرش پر ایک صاف چادر بچھا کر اس پر نفل پڑھنے لگی۔ ایسے وقت میں وہ بس خدا کو ہی پکار سکتی تھی۔ اس نے بہت تسلی سے دو نفل پڑھے تھے اور پھر پھوٹ پھوٹ کر خدا سے معافی مانگی۔ اس نے خدا سے کہا تھا کہ اب اس کی جان بھی چلی جاتی ہے تو وہ یہ کام نہیں کرے گی۔

''میں بھول گئی تھی کہ جان کی حفاظت کرنے والا ہے تو میرے اللہ...... تو ہے معاف کرنے والا، تو ہے بخشنے والا...... مجھے ''الا اللہ'' کہنا تھا۔ میں ''لا'' کہتی تو تھی لیکن مانتی نہیں تھی۔ میں ''نہیں'' بول کر بھی انسان نما خداؤں پر یقین رکھتی تھی کہ وہ میری حفاظت کریں گے۔ جبکہ مجھے ''الا اللہ'' پر یقین رکھنا تھا کہ حفاظت کرنے والا تو بس ایک ہی رب ہے۔''

وہ روتی جاتی تھی اور اس کی دعا بھٹکتی جاتی تھی۔ پولیس یقیناً قریب آ چکی تھی۔ ماڈل اس کی نظروں کے سامنے پڑا تھا۔

مقدس ماڈل...... آنسو پونچھتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اب اس کی کہانی ختم ہونے والی ہے۔ وہ مقدس پردوں میں سے عیاں ہونے والی ہے۔ لمبی جیل کا دکھ کسے تھا۔ اسے تو وہ بدنامی مار رہی تھی جو اس کے نام سے منسوب ہونے جا رہی تھی۔

''بابا مجھے معاف کر دیجیے گا۔ میران تم بھی مجھے معاف کر دینا......'' وہ سب سے معافی مانگنے لگی تھی۔ جیسے ہی اس کا آخری وقت ہو۔ یہ آخری پل تھے جو وہ آزادی سے گزار رہی تھی۔ وہ جانتی تھی۔

ہوٹل ے دروازے پر پولیس کی گاڑی رکی تھی۔ وہ آواز سن سکتی تھی۔ پھر بہت سے بھاری بوٹوں کی آواز بھی جو سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں اس کے گلے کا پھندا تھا۔ اس کی تقدیر کے لیے سیاہ روشنائی تھی۔ جس نے سب قبر میں اتار دینا تھا۔ اس کی خواہشات اور آرزوؤں کو بھی...... جس کی اسے چاہ تھی۔ جس کے لیے اس نے اتنے جوکھم اٹھائے تھے۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز اس کے کانوں کے پردے پھاڑنے لگی تھی۔ ہتھکڑیوں کی کھنکھناہٹ بھی اسے سنائی دے رہی تھی۔ دروازے پر بیل نہیں بجی تھی اور وہ ماڈل پکڑے دروازے کی طرف بڑھی تھی۔ اسے اب دروازہ کھولنا ہی تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ دروازہ نہ بھی کھولے تو پولیس اسے باآسانی توڑ دے گی۔ وہ احتجاج کرنے کے درجوں میں سے نکل چکی تھی۔ اس کے پاس کوئی راہ فرار نہیں تھی۔

باہر ہوا کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ فضائیں جھکڑوں سے جا ملی تھیں۔ ایسے میں اچانک سے ایک عجیب بات ہوئی...... ہوا کی دوش پر سوار ایک آواز اس تک پہنچی تھی اور اس نے نیند سے جاگ کر جھرجھری لی۔ اس کا سکتہ ٹوٹ گیا تھا۔ ایک دم ہی وہ غشی سے ہوش میں آئی تھی۔ وہ اس آواز کو بہت اچھے سے جانتی تھی۔ اس ماؤتھ آرگن کی آواز کو...... حائک کے ماؤتھ آرگن کی آواز...... جو کافی دنوں سے اپنی بہن دائنا کو تلاش کرتا ہوا دکھی دھنیں بجانے لگا تھا۔ یک لخت وہ پلٹی تھی۔ خدا کی مدد اس کے پاس پہنچ چکی تھی۔

اس نے کھڑکی کھولی اور نیچے دیکھا۔ حائک ماؤتھ آرگن بجاتا ہوا عین اس کے کمرے کی کھڑکی کے نیچے سے گزر رہا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی اپنی ہی مستی میں مست تھا۔ سبین نے گلدستہ پھینک کر اسے متوجہ کرنا چاہا تھا۔ ساتھ ساتھ اس کے دل میں ڈر تھا کہ کہیں حائل آج بھی پھولوں پر پاؤں رکھ کر نہ گزر جائے۔ لیکن آج ایسا نہیں ہوا تھا۔ حائک رکا تھا اور اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اوپر دیکھا تھا۔

سبین نے جلدی سے گلے والا اصل طغرہ حائل کی طرف اچھال دیا تھا۔ جسے حائک نے کمال مہارت سے کیچ کر لیا تھا۔ سب کچھ اچانک سے ہوا تھا۔ بنا کسی منصوبہ بندی کے...... حائک اب سوالیہ سبین کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''اسے لے کر نیچے سے جاؤ......'' وہ تیز آواز سے چلائی تھی۔ حائک یک ٹک اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ وہ گونگا تھا اور بہرہ بھی...... وہ کچھ سمجھ بھی نہیں سکتا تھا۔ سبین نے یکسے سوچ لیا کہ وہ اس کی زبان سمجھ سکتا ہے۔ صرف اس لیے کہ آج اسے خدا پر یقین آ گیا تھا کہ اگر وہ اسے بچانا چاہے تو ایک اپاہج کے ذریعے بھی اس کی مدد کر سکتا ہے۔

''یہاں سے جاؤ...... دور چلے جاؤ......'' وہ پھر سے چلائی تھی اور اس نے ہاتھ کے اشارے سے بھی اسے مخالف سمت میں بھاگ جانے کو کہا تھا۔ پولیس اوپر اس کے کمرے کی راہداری کے پاس آگئی تھی۔ وہ کھڑکی میں جھکی کھڑی تھی اور نیچے حائنک تھا کہ پٹر پٹر سبین کی طرف دیکھتا ہی جا رہا تھا۔

مہینہ پہلے اس طرح اس کی بہن بھی اسی طرح کی ایک کھڑکی میں کھڑی تھی۔ اس نے بھی اسے ایک اشارہ کیا تھا۔ اس نے اسے مدد کے لیے پکارا تھا لیکن وہ اپنی بہن کی مدد نہیں کر سکا تھا۔ اور اس کم ہمتی کے بدلے میں اس نے اپنی بہن کو کھو دیا تھا۔ نجانے وہ کہاں گم ہوگئی تھی۔

اب یہ لڑکی بھی اسے ایک اشارہ کر رہی تھی۔ وہ کیا چاہتی تھی۔ حائنک کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ اتنا کم ہمت کیوں تھا؟ اس کی کم ہمتی کی وجہ سے اس کی بہن اس سے ناراض ہو کر نجانے کہاں روپوش ہوئی تھی اور اب یہ لڑکی بھی یقیناً کسی مشکل میں تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے طغرے کی طرف دیکھا۔ جس کی لکھائی اس کی سمجھ میں آنے والی نہیں تھی۔ لیکن اس کا تقدس اس کے حرفوں سے عیاں تھا۔

''بھاگو...... تیز بھاگو......'' لڑکی اسے کہہ رہی تھی۔ وہ کچھ سمجھا اور کچھ نہیں سمجھا...... لیکن اس نے ویسا ہی کیا جیسا وہ چاہ رہی تھی۔ وہ ایک اور لڑکی کو گم ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ کلمے کا طغرا لے کر وہ بھاگ نکلا تھا اور اتنی تیزی سے بھاگا تھا کہ سبین کی نظروں سے لمحے بھر میں ہی اوجھل ہوگیا تھا۔ سبین یقین نہیں کر سکتی تھی کہ کوئی انسان اتنا تیز بھی بھاگ سکتا ہے۔ وہ کسی چھلاوے کی مانند ''چھو'' ہوگیا تھا۔

دروازے کے باہر پولیس آچکی تھی۔ اس کے کمرے کی ڈور بیل کو بجایا گیا تھا۔ سبین نے ایک گہری اور سکون بھری سانس لی تھی۔ خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ کھڑکی کے پردے برابر کیے تھے اور پھر آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا تھا۔

☆......☆......☆

''زندگی پچھل پائی ہے۔ اس کی ہر چال الٹی ہے۔ آپ پانسا پھینکنے میں جتنے مرضی ماہر ہوں...... آپ چالوں کو چاہے جس قدر مرضی مہارت سے چلا لیں...... یہ آپ کو ہر ہر موڑ پر حیران کرے گی۔ یہ کبھی آپ کی سہیلی نہیں بنتی...... سہیلی بن بھی جائے تو حکم کا ایک ہمیشہ اپنے پاس رکھتی ہے۔ آپکی آنکھوں پر پٹی باندھ کر یہ آپ کو تو خوب نچاتی ہے۔ لیکن خود اس کی باری کبھی نہیں آتی......

کم وقت میں ایک لمبی عمر گزار دینے کے بعد میں نے یہ ہی سیکھا ہے کہ ایسی ظالم سہیلی کے آگے ہاتھ جوڑنے سے کہیں بہتر ہے کہ وہ ہاتھ خدا کے آگے جوڑ دیے جائیں۔ کیونکہ خدا آپ کو وہاں سے بھی بچا لینے کی طاقت رکھتا ہے جہاں زندگی آپ پر بقا کے سارے دروازے بند کر چکی ہوتی ہے۔''

☆......☆......☆

موسم بدل رہا تھا۔خزاں آرہی تھی اور سردی کے شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔شام کی ہوا میں تیز کاٹ تھی جو سبین کے بدن میں اترتی جارہی تھی اور اس احساس کو اس کے اندر کے غصے کی شدت مار رہی تھی۔ پولیس اسٹیشن سے وہ سیدھی میران کے ہی گھر گئی تھی۔ایک کام کو ختم کر لینے کے بعد وہ دوسرے کو بھی جلد از جلد ختم کر لینا چاہتی تھی۔

"آنٹی! میران کہاں ہیں؟" اس نے ربیکا کو سلام بھی نہیں کیا تھا۔ربیکا اس کی شکل دیکھنے لگی تھی۔وہ اشتعال کا شکار تھی۔اس کے چہرے سے عیاں تھا۔

"میران گھر پر نہیں ہے میری جان......تم اندر آؤ......"

"نہیں میں جلدی میں ہوں۔"

"تم غصے میں ہو......" ربیکا نے کہا تھا۔سبین شرمندہ ہوگئی اور اندر چلی آئی۔

"کیا بات ہے سبین......؟ میران سے ناراض ہو......؟"

"نہیں......"

"تو پھر ان سے فون پر پوچھ لو کہ وہ کہاں ہے؟"

"وہ فون نہیں اٹھا رہا......"

"ایک منٹ......" ربیکا نے کہا تھا اور اپنے فون سے میران کو کال کی تھی۔

"میران کہاں ہو بیٹا......"

میران نے آگے سے جو بھی جواب دیا تھا اس سبین نہیں سن سکی تھی۔اسے یہ بات ہی سمجھ میں آئی تھی کہ میران اس کی کال اٹینڈ نہیں کر رہا اور اس نے ربیکا کی کر لی تھی۔اگر وہ ربیکا کی بھی نہ کرتا تو وہ یہ ہی سمجھتی رہتی کہ وہ مصروف ہے۔لیکن اب اسے سخت تذلیل محسوس ہوئی تھی۔بے عزتی کا احساس ہوا تھا۔خیر کوئی بات نہیں......وہ اب اس رشتے کو ختم ہی کرنے والی تھی۔وہ میران سے طلاق لینے والی تھی۔اس نے سبین سے شادی کرتے وقت کہا تھا کہ یہ شادی کے پیپرز مشکل میں تمہارے کام آئیں گے۔اور جب سبین پر یہ مشکل پڑی تو اس نے کہا کہ وہ اپنی مرضی سے مشکل میں ہے۔جب اس نے سبین کی کوئی مدد کرنی ہی نہیں تھی تو اس نے اس سے شادی کیوں کی......شادی کے پیپرز سے بچا جا سکتا تو وہ کسی سے بھی شادی کر سکتی تھی۔حتیٰ کہ گونگے حاتک سے بھی......

"وہ کہہ رہا ہے کہ وہ سکون کے لمحے گزار رہا ہے۔اسے تنگ نہ کیا جائے۔" ربیکا نے میران کے الفاظ ہی دہرا دیے تھے۔سبین جانتی تھی کہ وہ سکون کے لمحے کہاں گزار رہا ہوگا۔

"اگر میں تمہارا بتا دیتی تو وہ یقیناً جلدی گھر آجاتا۔" ربیکا نے اس کا بھرم رکھنا چاہا تھا۔

''ٹھیک ہے آنٹی...... پھر میں چلتی ہوں۔''

''سبین......؟'' وہ اٹھ کر جانا چاہتی تھی جب انہوں نے اسے پکارا تھا۔

''جی آنٹی......؟''

''پہلی بات تو یہ کہ تم مجھے آنٹی نہ کہا کرو......''

''تو پھر کیا کہوں......؟''

''اپنی ماں کو کیا کہتی تھیں؟'' ربیکا نے پوچھا۔

''اماں......؟'' سبین کی آواز بھرا گئی تھی۔

''تو پھر مجھے بھی اماں ہی کہہ لیا کرو......''

''آپ کو اماں نہیں کہہ سکتی...... اماں لفظ آپ پر سوٹ نہیں کرتا ربیکا آنٹی...... یہ لفظ صرف اس ہستی پر جچتا ہے جو 'چکی' چلاتی ہو...... جس نے دن رات محنت کر کے اپنے بچوں کا پیٹ پالا ہو...... چکی کے قطب کی وجہ سے جس کے ہتھیلی میں گڑھا پڑ چکا ہو۔ جس کے گھٹنوں میں درد ہو...... اور جس کی پیڑھی کے نیچے پہیے ہوں...... وہ سلامت ہوتے ہوئے بھی اپاہجوں کی سی زندگی گزارے...... یہ لفظ صرف ایسی ہی ہستی پر سوٹ کرتا ہے ربیکا آنٹی...... آپ پر نہیں۔'' وہ رو دینے کے قریب تھی۔

''سبین......'' اس نے سبین کو گلے سے لگا لیا تھا۔ ''میں جانتی ہوں کہ تم میران کو چاہتی ہو اور یہ بھی جانتی ہوں کہ تم دونوں میں آج کل جھگڑا چل رہا ہے۔''

''آج اسی جھگڑے کو ختم کرنا چاہتی ہوں میں ربیکا آنٹی......'' وہ اپنی آواز کی شدت نرم نہیں رکھ پائی تھی۔

''یہ بات یاد رکھنا کہ میران تمہیں تم سے بھی زیادہ چاہتا ہے۔''

''کیسی چاہت ہے اس کی جس نے سارے جذبات کا پتھر کا کر دیا ہے۔'' وہ دل میں سوچ کر رہ گئی تھی۔

''اس کی محبت پر کبھی شک مت کرنا سبین......''

وہ کرنا بھی کہاں چاہتی ہے لیکن پرسوں والے واقعے نے اس کا دل میران سے بدظن کر دیا تھا۔ ایسی محبت کا کیا فائدہ کہ جب اسے اس کی پرواہی نہیں تھی۔ اگر وہ اس وقت میں جیل میں ہوتی تو وہ کہاں سکون تلاش کرتا یا اسے تب ہی سکون نصیب ہونا تھا۔

دو دن اس نے پولیس کو تسلی کرنے میں گزار دیے تھے۔ ان کے سوالات ابھی تک اس کے اعصابوں پر سوار تھے۔ دو دن تک وہ ان کے درمیان بے بسی کا بت بنے بیٹھی رہی تھی۔ اور دل ہی دل میں خدا سے اپنی خلاصی کی دعا کرتی رہی تھی۔ اس دعا نے اس کا بہت سخت امتحان لیا تھا۔ خیر وہ صحیح سلامت باہر آ گئی تھی۔ گروپ نے اس کی مدد کی تھی یا نہیں...... وہ نہیں جانتی تھی اور نہ ہی

جاننا چاہتی تھی۔

ٹیکسی پکڑ کر وہ رش جھیل آ گئی تھی۔

ایک تو وہ قدرتی پارک بھی قدرت کی طرح وسیع تھا۔ اس کا جیسے کوئی انت تھا ہی نہیں...... میران کو تلاش کرنے میں اسے جتنی تھکن ہوئی تھی اس کا غصہ اس سے بھی زیادہ بڑھ گیا تھا۔ پھر کچھ یاد آنے پر اس نے رک کر خاموشی سے کان لگا کر چاروں طرف کی آوازوں کو سننا چاہا تھا۔ اس کا ایسا کرنا کارگر ثابت ہوا تھا۔ دور کہیں اسے گٹار بجتا ہوا محسوس ہوا تھا اور یہ کام صرف میران کا ہی تھا۔ وہ گٹار کی تاروں سے نکلتی اس دھن کو بھی پہچانتی تھی اور اس دھن میں چھپے شاعر کے خفیہ پیغام کو بھی...... اور اب نہیں پہچاننا چاہتی تھی تو اس کو جو یہ دھن بجا رہا تھا۔

پہلی بار میں اسے یہ منظر کس قدر سہانہ لگا تھا۔ دنیا کا خوب صورت ترین منظر...... ایک ایسا خواب جس کو دیکھنے کے لیے کم از کم ایک ہفتہ مسلسل سونا پڑتا تھا۔ دھن کے ساتھ ساتھ اسے تب ہزاروں کوئلیں بھی کوکتی ہوئی محسوس ہوئی تھیں۔ لیکن یہ خزاں کا موسم تھا۔ اس موسم میں کوئلیں نہیں کوکتی تھیں...... الو بولتے ہیں۔ سب یاد کرتے ہوئے اسے جیسے کاہیت محسوس ہو رہی تھی۔

میران ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا تھا۔ اس کی پشت سین کی جانب تھی۔ وہ پیچھے سے جا کر اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ دھن جوبن پر تھی اور عین عروج پر اس کا زور ٹوٹا تھا۔ میران، سین کو وہاں دیکھ کر حیران ہوا تھا۔ چند لمحے اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ سین سے کیا کہے۔ لیکن سین جانتی تھی کہ اس نے میران سے کیا مطالبہ کرنا ہے۔

''مجھے تم سے علیحدگی چاہیے۔'' اس نے چھوٹتے ہی کہا تھا۔ طلاق کا لفظ وہ چاہ کر بھی نہیں بول سکی تھی۔

''مطلب......؟'' میران اس غیر متوقع مطالبے پر ہکا بکا رہ گیا تھا۔

''مجھے طلاق چاہیے۔'' اب کی بار اس نے واضح لفظ بولا تھا۔ میران نے حیران سے سین کی طرف دیکھا تھا۔ جس کے چہرے پر آج کہیں بھی پرانی محبت نہیں تھی۔ مطالبہ واضح ہو گیا تھا۔ کسی بھی طرح کے ابہام سے نتھرا ہوا مطالبہ...... جو فضا کو پراگندہ کر گیا تھا۔

''مجھے طلاق چاہیے۔'' اس نے پھر سے دہرایا، کیونکہ وہ اپنی قبولیت کی ایسی تذلیل برداشت نہیں کر سکتی تھی اور میران سے یہ الفاظ بار بار سنے نہیں جا رہے تھے۔

''کیوں......؟'' وہ بس اتنا ہی پوچھ سکا۔ دھن او گٹار اسے یکسر بھول چکے تھے۔

''تمہیں اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے۔''

''میں نے یہ شادی کسی کے کہنے پر کی تھی۔ اب اس سے پوچھ کر ہی تمہیں چھوٹ سکتا ہوں۔''

''کس کے کہنے پر......؟'' وہ حیران ہوئی تھی۔

''مجھے ممی نے ایسا کرنے کو کہا تھا۔'' میران نے بتا دیا تھا۔ سیبن پر ایک ساتھ دو دھماکے ہوئے تھے۔ ایک تو یہ کہ ربیکا نے اسے ایسا کرنے کو کہا تھا اور دوسرا یہ کہ ربیکا سب جانتی ہے۔ میران نے شاید اس کی آنکھوں کے دونوں سوال ہی پڑھ لیے تھے۔

''جس جن تم گھر آئی تھیں ممی نے ہماری گفتگو سن لی تھی۔'' اس نے ایک سوال کا جواب دے دیا تھا اور دوسری بات کی وضاحت نہیں کی تھی۔ جس کی وضاحت اسے اس سے بھی زیادہ شدت سے چاہیے تھی۔ اس نے سیبن سے شادی ربیکا کے کہنے پر کی تھی۔ یہ اس کا اپنا ذاتی فعل نہیں تھا۔ سیبن کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ تم نے ان کے کہنے پر مجھ سے شادی کی اور اب میرے کہنے پر مجھے چھوڑ دو۔ میں اس نام کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔'' اس نے دو ٹوک کہا تھا۔

''ٹھیک ہے...... میں پیپرز بنواتا ہوں۔''

''پیپرز بعد میں بن جائیں گے۔ تم مجھے ابھی اپنے منہ سے طلاق دو۔''

''اتنی جلدی کس بات کی ہے؟''

''بس ہے جلدی......''

میران اس کی صورت دیکھنے لگا تھا۔ تو وہ اتنی پڑی بھی تھی۔ اسے محبت نے ایسا بنا دیا تھا یا نفرت نے...... یا اس کی تعلقی نے......

''مجھ سے کسی بات پر ناراض ہو؟''

''ناراض اپنوں سے ہوا جاتا ہے مسٹر میران! کس بھول میں ہو تم۔''

جھومتے جھومت درخت میران پر آگرے تھے۔

''جس دن تم نے کال کی میں واقعی بہت بزی تھا۔ فیکٹری بھی جانا۔'' اس نے اپنی طرف سے وضاحت دینی چاہی تھی۔

''مجھے یہ سب نہیں سننا مسٹر میران! فی الحال مجھے بس طلاق چاہیے۔'' وہ اپنے مطالبے پر ڈٹی ہوئی تھی اور میران کو توڑ رہی تھی۔

''کیوں؟ اب کیا نفرت کرنے لگی ہو مجھ سے؟''

''کیوں؟ نفرت کیا صرف تم ہی کر سکتے ہو۔ تمہیں ممی کے کہنے پر مجھ سے شادی نہیں کرنی چاہئے تھی۔ اور اگر تم نے ایسا کر بھی لیا تھا تو مجھے نہیں بتانا چاہیے تھا۔ ایک لڑکی اتنی تذلیل برداشت نہیں کر سکتی۔ میں محبت کے ساتھ تو رہ سکتی ہوں لیکن خود ترسی

کے ساتھ نہیں...... میں تمہارے بنا تو رہ سکتی ہوں لیکن اس طرح ساتھ نہیں کہ تم مجھ سے نفرت کرو...... اور کسی اور کے کہنے پر مجھے اپناؤ......'' وہ بولتی جارہی تھی اور وہ خاموشی سے اسے سن رہا تھا۔ وہ جیسے اس کے غصے سے ایک دم سے بے پرواہ ہو گیا تھا کیونکہ اس نے اس کے غصے کی وجہ جان لی تھی۔ لاتعلقی...... اس کی بے رخی نے اسے ایسا بنا دیا تھا۔ اب اسے ہی اس بے رخی کو ختم کرنا تھا۔ اور وہ جانتا تھا کہ کیسے...... وہ ایک جوان لڑکا تھا۔

''تم نے مجھ سے کچھ عہد لیے تھے جو میں نے خاموشی سے دے دیے تھے۔ اپنی محبت کے بدلے...... آج میں بھی تم سے وہ ہی عہد لینا چاہتی ہوں۔ اگر تمہیں مجھ سے ذرا سی بھی محبت تھی تو مجھے ابھی اسی وقت طلاق دے دو......'' وہ کہتی جارہی تھی اور اس پر جیسے کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا تھا۔

گٹار ایک طرف پھینک کر وہ اس کی طرف بڑھا تھا۔ سیبن کو غصہ آیا کہ وہ اس کی کسی بات کا جواب کیوں نہیں دے رہا ہے۔ کیا وہ اتنی ہی کم حیثیت ہو گئی تھی۔ وہ یک ٹک اس کو دیکھتا ہوا اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور اب اس کے بے حد قریب آ چکا تھا۔ اور وہ مسکرا کیوں رہا تھا۔ کیا وہ اس کا مذاق بنا رہا تھا۔ ایک بے بس لڑکی کا...... اب بھی کوئی کسر رہ گئی تھی جو وہ اپنے رویے سے اس کی تذلیل کر رہا تھا۔

''میران......'' اس نے چلاتے ہوئے کہا تھا۔ اس پہاڑی علاقے سے اس کی آواز کی گونج پلٹ پلٹ کر سنائی دی تھی۔

''طلاق چاہیے تمہیں......؟'' اب وہ اس کے بے حد قریب کھڑا اس سے پوچھ رہا تھا۔ سیبن پیچھے ہوتے ہوتے درخت کے موٹے تنے سے جا لگی تھی۔

''بولو......'' وہ اس کے اوپر جھک آیا تھا۔ اور اس کے چہرے کے ایک حصے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ سیبن کے اتنا قریب تھا کہ سیبن کو لگا اس نے آج تک میران کو اصل میں دیکھا ہی نہیں ہے، اور جو دیکھ رہی ہے وہ آج ہی دیکھ رہی ہے۔

''بولو...... علیحدگی چاہتی ہو مجھ سے......'' اس کی آنکھیں اس کے چہرے پر گڑی تھیں۔

''ہاں......'' اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نڈر انداز میں کہا تھا۔

''تو یہ لو......'' میران نے کہا اور......

درختوں میں اچانک سرسراہٹ ہوئی۔ تتلیاں، چرند پرند سب سرگوشیاں کرتے ہوئے پودوں کی اوڑھ میں ہو گئے تھے۔ سیبن مزید کچھ بھی بولنے کے قابل نہ رہی تھی۔ پہلے اس نے ہلکا سا احتجاج کیا تھا اور پھر خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ میران کے ہونٹ اس کی پیشانی پر تھے اور اس کا سارا غصہ کافور ہو چکا تھا۔

خزاں جس کی آمد آمد تھی اس نے ایک دم سے اپنے ارادے ملتوی کر لیے...... پر رونق بہار جیسے پھر سے لوٹ آئی......

دھرتی پر شام کی اوس اتر رہی تھی۔ سفید دودھیاں دھواں...... جس نے دونوں پر اپنی سفید چادر اوڑھا دی تھی۔ سبین نے ایسے آنکھیں بند کرلیں جیسے زندگی میں پہلی بار خواب دیکھنے جا رہی ہو۔ اگر یہ خواب تھا تو اسے کبھی نہ توڑنے کے لیے وہ ساری زندگی اس ایک خواب کے بدلے سونے کے لیے تیار تھی۔

گہری ہوتی رات میں سب کچھ چھپتا جا رہا تھا۔ لیکن سبین کی آنکھوں میں نجانے کون سی ناگ منی قید تھی کہ سب اسے دن کی روشنی کے مقابلے میں بھی زیادہ روشن دکھائی دے رہا تھا۔ سبین نے میران کے کشادہ ماتھے کو دیکھا۔ وہاں پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔ میران کے بالوں کی جڑیں بھی پسینے سے بھیگ چکی تھیں۔ جنہوں نے اس کے ہیئر اسٹائل کو خراب کر دیا تھا۔ اور یہ بے ترتیب سا میران، سبین کو اس قدر پیارا لگ رہا تھا کہ وہ اسے دیکھتی جا رہی تھی اور مسکراتی جا رہی تھی۔

''میں نے تمہارا بہت دل دکھایا ہے ناں میران......''

''یہ وقت ان باتوں کا نہیں......'' اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ بولا۔

''لیکن......'' سبین کے ہونٹ بند ہو گئے۔ میران نے اسے مزید بولنے ہی نہ دیا۔ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

بغیر کھاد ملی اصلی گھاس کی خوشبو اس قدر دلفریب تھی کہ سبین کے اعصاب کو وہ دنیا کی ساری خوشبوؤں پر حاوی لگی۔ یا شاید اسے ان لمحوں میں سب کچھ ہی بہت اچھا لگ رہا تھا۔ آسمان میں ٹنگا چاند بھیگے موسم میں اپنا نایاب خزانہ لٹا رہا تھا۔ قوسِ قمر...... سبین نے دیکھا تو وہ حیرت سے جامد سی ہو گئی۔

''میران...... مون بو......'' ایک دم سے ہی وہ چلا اٹھی تھی۔

میران نے بھی چاند کی طرف دیکھا تھا۔ دودھیا قوس، سیاہ آسمان پر اپنی تمام تر دلفریبی کے ساتھ موجود تھی۔ وہ قوس جو قسمت والوں کو ہی نظر آتی تھی۔ وہ دونوں نے دیکھ لی تھی اور ایک ساتھ دیکھی تھی۔

''یہ کس قدر حسین ہے ناں میران! قصے کہانیوں سے بھی زیادہ۔''

''دیکھو۔ آج میری وجہ سے تم نے اسے دیکھ ہی لیا۔''

''تمہاری وجہ سے؟''

''اور نہیں تو کیا۔ اگر میں تمہیں نہ روکتا تو......'' وہ شوخی سے کہہ رہا تھا۔

''آہستہ بولو...... کوئی ادھر آ گیا تو......''

''کوئی نہیں آئے گا۔ قدرت ہماری رکھوالی کر رہی ہے۔'' اس نے اس کی ٹھوڑی کو پکڑ کر پھر سے ایک شرارت کی تھی۔ سبین نے آنکھیں بند کرلی تھیں۔

دور کہیں چکی چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ آج اسے یہ آواز بہت بھلی لگ رہی تھی۔ ایسے جیسے اماں اسے خوشیوں بھرا کوئی گیت سنانا چاہتی ہوں۔

☆......☆......☆

دائنا کی خودکشی کا کیس کچھ ایسا بھی انوکھا نہیں تھا۔ پولیس اس کیس کی فائل کو کوئی بھی مناسب وجہ دے کر بند کر سکتی تھی۔ یہ ہی وجہ کافی تھی کہ اس کی بے حرمتی کی گئی تھی لیکن یہ کیس تب بہت اہمیت اختیار کر گیا تھا جب دائنا کی موت والی جگہ کا باریک بینی سے مشاہدہ کرنے پر پولیس کو وہاں تین جگہ سے ایڈم راہل کا نام لکھا ہوا مل گیا تھا۔

ایڈم راہل معاشرے کا ایک معتبر نام تھا۔ اس کے بے شمار فلاحی ادارے تھے جو تقریباً دنیا کے تمام ہی مذاہب کے لیے کام کر رہے تھے۔ غریبوں کے لیے اس کے "وش ہوم" الگ سے قائم تھے۔ وہ آیتیں سناتا تھا۔ شلوک پڑھتا تھا۔ سب لوگوں کی نظر میں اس کا تصور ایک فرشتے کا سا تھا۔ ایسے میں دائنا کی موت کی جگہ پر جگہ جگہ اس کا نام لکھا ہوا ملنا پولیس کو اصل کہانی جاننے کے لیے بے چین کر رہا تھا۔

"دو بری خبریں ہیں چیٹی......"

پیٹرسن کچھ نئی طرز کی پوست کے نمونے چیک کر کے انہیں پاس یا فیل کر رہا تھا جب جیفرسن نے اس کے پاس آ کر دھماکا کیا تھا۔

"تم کبھی اچھی خبر بھی لائے ہو جیفی...... خیر بولو" ناک سے پوست کی خوشبو سونگھتے اور ذائقہ چکھتے ہوئے پیٹرسن کی توجہ ہٹی تھی۔

"ایک تو یہ کہ دائنا کے ساتھ بدفعلی کی گئی تھی اور دوسری......"

"کیا......؟ یہ کب ہوا......؟" سبزی مائل سیاہ برادہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر ٹیبل پر بکھر گیا تھا۔

"اس کی موت والی رات......"

"کس نے کیا یہ سب......"

"میں نہیں جانتا......"

"تو کس کو جاننا چاہیے۔ کارزل کہاں ہے۔ برونو کہاں ہیں۔ کیوں خیال نہیں رکھ رہے وہ ان سب باتوں کا...... یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ایک لڑکی کی ذمہ داری ان سے ٹھیک سے نہیں نبھائی گئی۔"

"میں نے بتایا تو ہے چیٹی...... کہ جس وقت ہمارے آدمی وہاں پہنچے دائنا گھر پر نہیں تھی۔"

''تم نے آدمیوں کو اگلے روز کیوں بھیجا...... جب کہ میں نے اسی دن بھیجنے کا کہا تھا۔تم نے غفلت کیوں کی جیفی......''
''میں نے اپنی طرف سے بہتری کرنی کی کوشش کی تھی پیٹی...... مجھ پر غصہ مت کرو...... ڈائنا غصے میں تھی۔ایسے میں ہمارے آدمیوں کا وہاں جانا معاملے کو بگاڑ سکتا تھا۔خیر جو ہونا تھا ہو گیا۔دوسری بری خبر یہ ہے کہ...... جہاں وہ مری وہاں تین جگہ سے تمہارا نام لکھا ہوا مل گیا ہے۔''

''کیا بک رہے ہو تم......'' پیٹرسن غصے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔جیفرسن ایک قدم پیچھے ہٹا تھا۔

''تم نے تو کہا تھا کہ سب ''صاف'' کر دیا گیا ہے۔''

''لیکن وہ نام اس قدر باریک تھے کہ ہمارے آدمی انہیں نہیں دیکھ سکے......''

''اور پولیس نے انہیں دیکھ لیا۔''

جیفرسن نے سر جھکا دیا تھا۔

''کون کر رہا ہے یہ سب...... یہ تو واضح دشمنی ہے۔اور یہ کوئی بہت ہی شاطر دشمن ہے۔ڈائنا کا ریپ کر کے وہ الزام مجھ پر ڈال رہا ہے۔کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس طرح آسانی سے وہ میری شخصیت کا بت ٹوٹ گیا تو پیچھے ڈان کا بت بھی خود بخود ہی ٹوٹ جائے گا۔یہ تو کسی قریبی آدمی کا کام لگتا ہے۔''

''اس مسئلے کو بعد میں دیکھ لیں گے پیٹی...... فی الحال اہم بات یہ ہے کہ رپورٹ میں تمہارا نام آ چکا ہے۔پولیس یقیناً ہم تک پہنچنے والی ہے۔وہ یقیناً تم سے سختی سے پیش تو نہیں آئیں گے لیکن پریس والوں کو تو تم جانتے ہو...... سفید کو سیاہ کرنا انہیں خوب آتا ہے بتاؤ کیا کرنا ہے۔''

''پولیس پہنچنے والی ہے تو پریس والوں کو بھی بلا لو......

''کیوں...... پریس کیوں...... تم کیا کرنے جا رہے ہو پیٹی......؟''

''پیٹی کچھ نہیں کرے گا۔میرے دشمن نے ایڈم نام کو استعمال کیا ہے تو اب جو بھی کرے گا ایڈم ہی کرے گا۔میں تیار ہونے جا رہا ہوں۔'' پیٹرسن، ایڈم کا لباس پہننے کے لیے واش روم کی طرف بڑھا تھا۔

''اور ہاں......؟'' پیٹرسن جاتے جاتے پلٹا تھا۔''ایک لڑکے کو تیار کرو...... جو ڈائنا کے ساتھ ہوئی بدفعلی کا جرم قبول کرے۔بعد میں اسے نکلوا لیا جائے گا۔''

ساری بات سمجھ لینے کے باوجود بھی جیفرسن کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پیٹرسن کیا کرنے جا رہا ہے۔

پریس کانفرنس کا اہتمام ایک گھنٹے کے اندر اندر ہو چکا تھا۔تب تک پولیس کے کچھ چہیتے صحافی یہ خبر پا چکے تھے کہ ایک

لڑکی دائنا کی خودکشی کے پیچھے ایڈم راہل کا نام آچکا ہے۔

ہال میں پیٹرسن کی آمد کچھ ایسے ہوئی تھی کہ سب بے اختیار ہی اپنی اپنی سیٹوں سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ پیٹرسن نے سب سے پہلے سٹیج پر آکر ایک سجدہ کیا تھا۔ ہاتھ میں پکڑی تسبیح، گلے میں پہنی صلیب، بانی، اور ''اوم'' کے سائن والی انگوٹھی کو اب وہ اور زیادہ نمایاں کر کے پہننے لگا تھا۔ یہ سب آج دائنا والے واقعے سے ہی شروع نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس سب کا آغاز اس روز ہوا تھا جب اس کے ادارے سے شائع ہونے والی مذہبی کتاب کے ذریعے دوسرے ملک ہیروئن کی اسمگلنگ کی جا رہی تھی۔

''میرا پبلشنگ ہاؤس کتابیں چھاپ کر صرف اپنے تک محدود نہیں رکھتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ہم کتابوں کو ارزاں قیمت پر بیچتے ہیں۔ اب کوئی اس کتاب کو خرید کر اس کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ پر میں یہاں یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ ایسے لوگوں کو کچھ شرم آنی چاہیے۔ وہ جو اپنے برے کاموں میں مذہب کو گھسانے پر بھی نہیں ڈرتے...... یقیناً قیامت کے دن یہ لوگ اپنے گناہوں پر بہت پچھتائیں گے۔'' ایڈم نے ایک بھڑکتا ہوا بیان دیا تھا۔ اپنی خودساختہ تقریر کا اختتام کرتے ہوئے اس نے ایک آیت اور ایک اشلوک پڑھ کر سنائی تھی۔ جس کا متن کچھ یوں تھا کہ گناہ گاروں کو ان کے کیے کی سزا ہر حال میں مل کر رہے گی۔ سب خاموش ہو گئے تھے۔ وہ واقعی مذاہب کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔

وہ جانتا تھا کہ آج بھی اس نے سب کو کیسے خاموش کروانا ہے۔

''وہ پاکیزہ اور حیادار لڑکی دائنا...... اپنی موت سے ایک روز پہلے کاؤنسلنگ (مشورے) کے لیے میرے پاس آئی تھی۔ وہ پریشان تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ ایک لڑکا اس کی حرمت کے پیچھے ہے۔ وہ پولیس کے پاس بھی گئی تھی، لیکن صحیح سے نشاندہی نہ ہونے کی وجہ سے پولیس اب دائنا کو ہی ذہنی عارضہ کی مریضہ سمجھنے لگی تھی۔ اس نے مجھ سے مدد مانگی تھی۔ میں نے اسے اپنے ''وِش ہوم'' میں رکھنے کی حامی بھرلی تھی۔ دائنا اپنے گھر سے اپنا سامان لینے ہی گئی تھی جب وہ واقعہ ہو گیا۔ جو ہرگز نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ لڑکی تو میرے پاس آکر محفوظ ہونا چاہتی تھی۔ لیکن کون جانتا تھا کہ اس کے ساتھ اتنا سب کچھ ہو جائے گا۔

میں سمجھ سکتا ہوں کہ اس نے مرتے وقت جگہ جگہ میرا نام کیوں لکھا ہے۔ تاکہ میں اس کے قاتل کو پکڑوانے پر پولیس پر زور ڈالوں۔ ہاں...... یہ قتل ہی تھا۔ آپ حیران نہ ہوں۔ کسی کو خودکشی پر مجبور کر دینا بھی ایک طرح سے قتل ہی ہوتا ہے۔''

لمبی تمہید کے بعد اس نے بدھا کے اقوال پڑھے تھے۔ پھر تورات کی وہ سطریں پڑھنے لگا تھا جو ہال میں موجود کسی صحافی کو یقیناً نہیں آتی تھیں۔

ایڈم کی اس جذباتی تقریر کا سب صحافیوں پر ویسا ہی اثر ہوا تھا جیسا وہ چاہتا تھا۔ کچھ انٹرنی لڑکیاں تو ''تورات'' کی سطروں کا ترجمہ پوچھ کر رونے بھی لگی تھیں۔ دائنا میں انہیں اپنا آپ نظر آنے لگا تھا۔

اس پریس کانفرنس کے چند دن بعد ہی دائنا کا مجرم پکڑا گیا تھا۔ وہ جیڈن تھا۔ جو ہونٹوں پر لپ اسٹک لگاتا تھا اور پینٹ کی سائیڈ پر چین لٹکاتا تھا۔ اس نے بیان دیا تھا کہ وہ دائنا کو بچپن سے چاہتا تھا، لیکن مذہبی تبدیلی کی وجہ سے دائنا اس سے شادی کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ اپنی نفسانی خواہش کا گلا نہ گھونٹ سکنے کی بنا پر ایک دن اس نے دائنا کی بے حرمتی کی اور اسی دن دائنا نے......

سب کو اس بیان پر یقین آ گیا تھا۔ جیڈن سیاہ فام تھا۔ ویسے بھی سب کی چاہ تھی کہ اگر وہ قتل کا اعتراف نہیں بھی کرتا تو اس پر کسی نہ کسی طرح قتل ڈال دیا جائے۔

چند دنوں میں معاملہ ٹھنڈا ہو گیا تھا اور سرد خانے میں پڑی دائنا کی لاش کو بھی دفن کر دیا گیا تھا۔ اس کی لاش کا اکلوتا وارث مل گیا تھا۔ جو گونگا تھا اور بہرا بھی اور وہ جب دائنا کی تابوت میں بند سرد لاش سے لپٹ لپٹ کر رو رہا تھا تو اردگرد کھڑا اسارا ہاسپٹل اسٹاف بھی اس کے ساتھ رونے لگا تھا۔

''اتنی سی بات تھی جیفی! تم بہت جلدی پریشان ہو جاتے ہو۔'' پیٹرسن نے اپنا جام جیفرسن کے جام سے ٹکراتے ہوئے کہا تھا۔ جیفرسن نے کھوکھلی سی مسکراہٹ پیٹرسن کی طرف اچھالی تھی۔

''ٹھیک...... یہ معاملہ تو حل ہو گیا۔ لیکن تم اس حصے کو نظر انداز کر رہے ہو کہ معاملہ شروع کہاں سے ہوا تھا۔؟''

''تم بتاؤ...... تم کس مرض کی دوا ہو جیفی! اتنے سے عرصے میں تم نے مجھ سے کیا سیکھا ہے۔''

''میں تو بارہا ایڈورڈ کا نام لے چکا ہوں۔ تم ہی اسے نظر انداز کر رہے ہو۔ اسے معمولی سمجھ رہے ہو جبکہ وہ خود کو چند سالوں بعد پیٹرسن کی سیٹ پر دیکھ رہا ہے۔''

جواب میں پیٹرسن نے غصے سے جیفرسن کی طرف دیکھا تھا۔

''غصہ کرنے سے کچھ نہیں ہو گا پیٹی...... میں جان گیا ہوں اسے...... جوزف کی موت کا بدلہ وہ لے کر رہے گا۔''

''پہلے ہم نے برنامی کو ختم کروایا...... تم نے کہا کہ جوزف برنابی کا دوست تھا اس لیے مقدس کتابوں میں ہوتی اسمگلنگ کی مخبری جوزف نے کی ہے۔ ہم نے جوزف کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔ اب تم کہہ رہے ہو کہ ایڈورڈ، جوزف کا رشتے دار ہے اس لئے وہ اس کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے بے چین ہے۔ اس طرح تو رفتہ رفتہ ہم اپنی س اری ٹیم سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔''

''لیکن یہ سب حقیقت ہے۔ اتفاقات یہ ہی بتا رہے ہیں۔ اگر ہم ایڈورڈ کو بھی ٹھکانے لگا دیتے ہیں تو ہم باقی پانچ بچے گے۔ اور کسی بھی کامیاب گینگ کے لئے محض تین مضبوط ستون بھی بہت ہوتے ہیں۔''

''لیکن مجھے ایڈورڈ سے کبھی بھی تاثر نہیں ملا...... تمہارا اندازہ غلط بھی ہو سکتا ہے جیفرسن!''

''ہاں...... میں خود کو غلط مان لیتا...... اگر میں نے ایڈورڈ کی جاسوسی نہ کی ہوتی...... وہ ہر ہفتے میں ایک بار جوزف کی قبر پر

ضرور جاتا ہے۔ اور اپنی آمدنی کا ایک بڑا حصہ اس کی بیوہ کو دیتا ہے۔ اب تم بتاؤ...... کیا اب بھی میرا شک یقین میں نہ بدلے۔''

''ٹھیک ہے۔ اس ہفتے ایڈورڈ کو جوزف کی قبر نہ جانا پڑے...... اسے جوزف کے پاس ہی لٹا دو۔'' پیٹرسن نے نیا حکم جاری کیا تھا۔ جیفرسن مسکرانے لگا تھا۔ وہ ایسا ہی چاہتا تھا۔

جمعے کی رات کو ایڈورڈ اپنی فیملی کے ساتھ مال میں شاپنگ کر رہا تھا۔ جب ٹیٹو اس تک پہنچا تھا۔ ٹیٹو کا اصل نام نجانے کیا تھا، لیکن اس کی گردن پر بنا بھیڑیے کا ٹیٹو اس قدر بھیانک تھا کہ اس کی نسبت سے سب اسے ٹیٹو ہی پکارنے لگے تھے۔

''ڈان تمہیں یاد کر رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں ان کے پاس آتا ہوں۔''

''وہ نیچے پارکنگ میں ہیں۔''

''اوکے......'' ایڈورڈ نے اپنی بیوی کے کان میں کچھ کہا تھا۔ بدلے میں اس کی بیوی نے تیکھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا اور پھر بچوں کو لے کر آگے بڑھ گئی تھی۔ ایڈورڈ، ٹیٹو کے ساتھ نیچے پارکنگ ایریا میں آ گیا تھا۔

''ڈان کہاں ہیں۔'' اسے پیٹرسن کی مخصوص کار کہیں بھی دکھائی نہیں دی تھی۔

''وہ اس طرف ہیں۔ جیفرسن کی کار میں......'' ٹیٹو نے ایک سیاہ کار کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ایڈورڈ کار کے اندر داخل ہو گیا تھا۔ ٹیٹو باہر ہی کھڑا رہا تھا اور پھر اس نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ ایڈورڈ یہ ہی سمجھا کہ ڈان کو اس سے اکیلے میں کچھ خاص بات کرنی ہوگی۔ تب ہی ٹیٹو کار کے اندر نہیں آیا...... لیکن ڈان تو کار کے اندر تھے ہی نہیں...... بلکہ کار میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ایڈورڈ کو کسی خطرے کا احساس ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے کار میں سے اتر جانا چاہا تھا، لیکن کار کے دروازے لاک تھے۔ اس نے شیشے میں سے جھانک کر ٹیٹو کو دیکھا تھا۔ وہ ہاتھ ہلا تھا ہوا اسے ''بائے'' کر رہا تھا۔ ایڈورڈ اس ''بائے'' کا مطلب نہیں سمجھا تھا، لیکن پھر اگلے ہی پل اسے سب سمجھ میں آ گیا تھا۔ ٹیٹو اسے دنیا سے رخصت ہونے پر ''بائے، بائے'' کر رہا تھا۔

کار کی ڈگی میں سے کسی نے نکل کر ایڈورڈ کی گردن کو باریک دھاتی تار کی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ ایڈورڈ کی چیخ بھی نہیں نکل سکتی تھی۔ تار اس کی گردن پر رفتہ رفتہ سخت ہو رہی تھی۔ اس کی گردن سرخ ہو چکی تھی۔ چند ہی لمحوں کی گیم تھی۔ ایڈورڈ جان چکا تھا کہ وہ دفاع کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اسے بہت بے دردی سے قتل کیا جا رہا تھا۔ مرتے وقت اس کی آنکھوں میں بس ایک ہی دکھ تھا۔ ایک ہی سوال...... کہ کوئی اسے اتنا تو بتا دیتا کہ اس کا قصور کیا تھا۔

''کام ہو گیا ہے ڈان......'' ٹیٹو نے ایڈورڈ کے مردہ وجود کو دیکھتے ہوئے ڈان کو فون پر بتایا تھا۔ ڈان پیٹرسن کو نہیں بلکہ...... آنے والے وقت کے ایک نئے ڈان کو...... جو پیٹرسن کو بہت دھیرے دھیرے تباہ کر رہا تھا۔ پیٹرسن کو خبر ہوئے بنا...... جس

نے دائنا کی خودکشی والی جگہ پر بھرسے ایڈم راہل کا نام لکھوا دیا تھا، اور جس نے دائنا کا ریپ بھی کیا تھا۔

☆......☆......☆

منظر کسی تصویر کی مانند ساکت اور خاموش تھا۔ ماسوائے اس اوس کے جو دھیرے دھیرے اڑتے ہوئے بنا چاپ کیے فضا کے بادل بن رہی تھی۔ سیین کی آنکھ کھلی تو اس نے ایک ہدہد کو اپنے سر کے اوپر شاخ پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ جیسے چپکے چپکے ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ سیین مسکرائی تو وہ ہدہد پھر امار کر ایک دم سے اڑ گیا۔ اس کے پروں میں بھی اتنی ملائمیت تھی کہ سرسراہٹ کی آواز بھی نہیں آتی تھی۔ لیکن پھر اس کلاسک تصویر کے پس منظر میں پانی کے چھپاکے کی آواز پوری شدت سے گونجی تھی۔ سیین نے پانی کی اس عجیب وغریب سی آواز کو سنا تھا۔ یقیناً جھیل میں کوئی چیز گر گئی تھی۔ مگر کیا......؟ پانی کا ایسا شور تو جھیل میں کسی انسان کے گرنے کا ہی ہوسکتا تھا۔ درختوں کی اوڑ میں سے نکل کر اس نے صبح کے نقاب میں لپٹی رش جھیل کو دیکھا تھا۔ جہاں تیز بھنور پڑ چکے تھے اور ان بھنوروں کے درمیان حائک کا سر کبھی ابھرتا اور کبھی گم ہو جاتا تھا۔

''میران......'' سیین نے ایک چیخ ماری تھی۔ سویا ہوا میران ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔

''کیا ہوا......؟'' اور اگلے ہی پل وہ اس کے پاس تھا۔

''وہ...... وہ حائک...... دائنا کا بھائی...... وہ...... خودکشی......'' سیین نے جھیل کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میران کو ساری بات سمجھنے میں ایک منٹ بھی نہیں لگا تھا۔ اپنی شرٹ اتار کر اگلے ہی پل میران نے بھی جھیل میں چھلانگ لگا دی تھی۔ وہ تیرتا ہوا اس سمت کی طرف بڑھا تھا جہاں حائک ڈوب اور ابھر رہا تھا۔ وہ ایسا دنیا بے زار آدمی تھا کہ اسے ٹھیک سے خودکشی کرنی بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ یہ ہی نہیں جانتا تھا کہ پانی میں ڈوب کر خودکشی کرنی ہو تو بس جسم ڈھیلا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور وہ تھا کہ ڈوبنا بھی چاہ رہا تھا اور پانی سے مدافعت بھی کر رہا تھا۔

سیین کنارے پر ہی کھڑی جھیل کو دیکھ رہی تھی۔ دونوں کے سر پانی میں اب غائب ہو چکے تھے۔ سیین بے چینی سے باہر کھڑی دونوں کے نمودار ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ جھیل کا بھنور خاموش ہو رہا تھا۔ سیین کی بے قراری بڑھ رہی تھی۔ میران کو تو تیرنا آتا تھا وہ جانتی تھی لیکن حائک...... اگر میران ذرا سی دیر کرتا ہے تو وہ جانتی تھی کہ پھر وہ زندہ حائک کو اوپر نہیں لائے گا بلکہ اس کی لاش ہی لے کر آئے گا۔

''میران......'' وہ اونچے اونچے میران کا نام پکارنے لگی تھی۔ وہ مشکل وقت میں ایسی ہی بدحواس ہو جاتی تھی۔ جبکہ اچھی طرح سے جانتی بھی تھی کہ پانی میں گم میران اس کی آواز بھلا کہاں سن سکتا ہے۔ چند لمحوں بعد پانی کی سطح پر میران کا سر نمودار ہوا تھا۔ کب سے روکے سانس کو اس نے ہوا میں خارج کیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں حائک کا وجود تھا۔ جو خود کو چھڑواتا ہوا جھیل

میں ڈوب جانے کی سرتوڑ کوششیں کر رہا تھا۔ حائک رو رہا تھا۔ بری طرح سے...... سبین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ جانتی تھی کہ حائک نے ایسا کیوں کیا...... یقیناً اسے پتا چل گیا تھا کہ اس کی بہن مر چکی ہے۔ بے حرمتی کے بعد......اور خودکشی کے بعد...... جو بات زمانہ اسے کب سے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا اسے، وہ یقیناً سرد خانے میں پڑی ہوئی دانا کی لاش دیکھ کر ہی سمجھا تھا۔

جس طرح میران حائک کو باہر لایا تھا۔ وہ منظر کچھ ایسا تھا جیسے انسان شیر کے منہ سے نوالہ چھین رہا ہو...... حائک اپنی پوری طاقت سے اپنی موت کو گلے سے لگانے کے لئے بے چین تھا۔ میران تقریباً اسے گھسیٹتا ہوا باہر تک لا رہا تھا۔ کنارے پر آتے ہی سبین نے بھی میران کا ساتھ دیا تھا۔ کھینچ کر اس نے حائک کو باہر نکالا تھا۔ چار ہاتھوں کے آگے ہائک بے بس ہو گیا تھا۔ باہر نکل کر اس نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا تھا اور پھر اونچے اونچے رونا شروع کر دیا تھا۔ وہ گونگا تھا اور بہرا بھی...... اس کے رونے کی آواز اس قدر بھیانک تھی کہ خاموش فضا کو آری کی طرح چیر رہی تھی۔

''دانا کے مجرم کو ضرور سزا ملے گی حائک...... اس کا خون رائگاں نہیں جائے گا۔'' سبین نے اپنی طرف سے اشاروں میں بات کر کے حائک کو سمجھانا چاہا رہی تھی اور جواب میں حائک مزید اونچا اونچا رونے لگا تھا۔

''اسے اب پتا چلا ہے اپنی بہن کی موت کا......'' میران نے دکھ سے سبین سے کہا تھا۔

''پتا چل گیا تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا۔''

سبین حائک کے پاس بیٹھ کر اس کے آنسو پونچھنے لگی تھی۔ حائک کا رونا بند نہیں ہو رہا تھا۔ دونوں بے بس تھے۔ نہیں سمجھ پا رہے تھے کہ حائک کا دکھ کیسے کم کریں۔ تب سبین نے وہ ہی کام کیا تھا جو وہ دانا کے مردہ وجود کے ساتھ بھی کر چکی تھی۔ پاس ہی کھلے ہوئے ثعلب مصری کے تازہ پھول توڑ کر اس نے حائک کے ہاتھوں میں دے کر اس کی مٹھیاں بند کر دی تھیں۔

''جیسے زہر، زہر کو چوس لیتا ہے ایسے ہی تازہ ثعلب مصری غموں کو چوس لیتا ہے...... بس اسے چند لمحے ہاتھ کی مٹھی میں مضبوطی سے تھامے رکھنا پڑتا ہے اور پھر یہ اپنا معجزہ دکھا دیتا ہے۔ یہ سارے دکھوں کو کسی فوم کی طرح جسم میں سے چوس لیتا ہے۔ لیکن یہ سب اس کے مرجھا جانے سے پہلے ہو جانا چاہیے...... کیونکہ جیسے ہی یہ مرجھاتا ہے یہ اپنے سارے فعل باطل کر لیتا ہے۔ یہ اپنا ہی متضاد ہو جاتا ہے۔''

اسے بابا کی بتائی ہوئی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ اور وہ حائک کی مٹھیوں کو سختی سے بند کرتی جا رہی تھی۔ اپنی پوری جان سے...... وہ نہیں چاہتی تھی کہ ثعلب مصری مرجھا کر اپنے فعل باطل کر لے، اور حائک کے غم کے لیے بے اثر ثابت ہو۔

میران اور حائک دونوں نے اسے یہ عجیب و غریب حرکت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر نجانے کیا بات ہوئی تھی۔ یہ ثعلب مصری کا جادو تھا یا کچھ اور...... حائک اپنا رونا بھول کر سبین کو دیکھنے لگا تھا۔ وہ ایک دم سے چپ ہو گیا تھا۔ اس کے دل کو جیسے

واقعی میں قرار مل گیا تھا۔ سبین نے اپنے دوپٹے سے اس کے باقی ماندہ آنسو پونچھے تھے اور پھر اس کے پاس سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اب حائک دوبارہ خودکشی کی کوشش نہیں کرے گا۔

دونوں نے اداسی کی حالت میں گھر واپسی کا سفر طے کیا تھا۔ کرنے کو کوئی بات نہیں تھی۔

ثعلب مصری...... سبین کو پتا ہی نہیں چلا اور بابا نے اسے زندگی کے کتنے بڑے بڑے سبق سکھا دیے تھے۔

☆......☆......☆

پانچواں باب کافور ریزی......

''انسان اپنی پیدائش سے ہی ضیاریزی کا محتاج رہا ہے۔'' مجھے یاد ہے کہ بابا نے ایک بار بچپن میں بتایا تھا کہ صدیوں پہلے دھرتی پر آٹھ دنوں تک اندھیرا چھایا رہا تھا۔ ان آٹھ دنوں میں نہ تو سورج نے اپنی شکل دکھائی تھی اور نہ ہی چاند نے......اور اس اندھیرے کی وحشت سے نجانے کتنے لوگوں کی موت ہوگئی تھی۔ یعنی ضیاریزی کی بندش کافور ریزی کا باعث بن گئی۔ شاید تب ہی سے یہ دستور بن گیا ہے کہ کسی کے موت سے پہلے اس گھر میں کافور کی بو محسوس ہوتی ہے۔

میں سوچتی تھی کہ بابا کی باتیں لاکھ سچی سہی......لیکن آج کے دور میں انہیں کون مان سکتا ہے اس نفسا نفسی کے دور میں کافور ریزی کو محسوس کرنے والی حس کہاں سے آسکتی ہے۔ لوگوں کے پاس تو اتنا وقت نہیں کہ وہ خوشبوؤں کو سونگھ سکیں۔ مجھے وقت گزرنے کے ساتھ احساس ہوا کہ یہ حسیں کیسے خود بخود انسان میں جنم لے لیتی ہیں۔ کوئی بڑا دکھ دل کو مل جائے تو کیسے دل غم سے پھٹ جانا سکھ لیتا ہے۔ کوئی جدا ہو جائے تو کیسے انسان کو خود بخود ہی رونا آجاتا ہے۔ اور کسی نے مرنا ہو تو...... کیسے ناک گلاب کے پھولوں سے بھی کافور کی بو محسوس کر لیتی ہے۔

☆......☆......☆

وہ ان دنوں اس قدر خوش تھی کہ کوئی بھی دیکھ کر کہہ سکتا تھا کہ وہ محبت زدہ ہو چکی ہے یا محبت گزیدہ......ضرور اس کے دل میں کوئی بات ہے۔ وہ بھی اپنی خوشی کو چھپانے کی کوشش نہیں کر رہی تھی۔ اسے جیسے آج پتا چلا تھا کہ لڑکی کے لیے مرد کا ساتھ کیوں بنایا گیا ہے اور مرد کے بنا ایک عورت کس قدر نامکمل ہے۔

اس نے اپنے لباس کو دیکھا...... جو گندہ ہو چکا تھا اور جسے وہ کبھی بھی دھونے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ اس نے اپنے چہرے کو دیکھا۔ وہاں مسرت ہی مسرت تھی۔ جو بار بار چہرہ دھلنے سے بھی جانے والی نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی۔

گھر آتے ہی اس نے بابا کو کال کی تھی۔ وہ بلاوجہ ہی سب سے باتیں کرنا چاہتی تھی۔ سب کے ساتھ مل کر مسکرانا چاہتی تھی۔ اس نے زویا سے بات کی تھی۔ اسے بتایا تھا کہ اس کی زندگی میں جو لڑکا ہے وہ کیسا ہے، وہ کیسا دکھتا ہے، وہ کتنا خوب صورت ہے۔ کتنا حسین، کتنا باوقار، اور کس قدر محبت کرنے والا...... وہ، وہ سب بتاتی جا رہی تھی جو وہ ان دنوں میں محسوس کرنے لگی تھی، اور وہ سب بھی جو ایک لڑکی صرف خود ہی سوچ سکتی ہے۔ زویا سن کر مسکرا رہی تھی۔ وہ آگے سے کچھ کہہ نہیں رہی تھی، اس نے ابھی بھی بولنا شروع کیا تھا۔ لیکن اس کے پاس لفظوں کے چناؤ کی ابھی بھی کمی ہی تھی۔ اسے نہیں اندازہ تھا کہ ایسے موقعے پر کیا کہا جاتا ہے۔ لیکن سین جانتی تھی کہ وہ مسکرا رہی ہے۔ اس نے اسے قوس قمر کے بارے میں بھی بتایا تھا کہ جب سیاہ آسمان پر قوس قمر نمودار ہوتی ہے تو وہ منظر کس قدر دلکش ہوتا ہے۔ اور جیسے کہ وہ نور کی قیمت کوئی ادا نہیں کر سکتا...... ایسے ہی قیمت کے پیمانے پر اس منظر کی قیمت کی آخر حد کا تعین بھی کوئی نہیں کر سکتا۔

''میں نے اماں کی چکی چلنے کی آواز کو بھی سنا زویا...... وہ مجھے کوئی گیت سنا رہی تھیں۔ میں بہت خوش ہوں زویا...... میران بہت اچھا ہے۔'' وہ خوشی سے کہہ رہی تھی۔ آگے سے کھانسنے کی آواز آئی تھی۔ وہ یک دم سے چپ ہوئی تھی۔ یہ بابا کی آواز تھی۔

''سین......'' بابا نے نجانے کب چھوٹی کے ہاتھ سے موبائل لے لیا تھا اور اسے یہ ظاہر نہیں کروایا تھا کہ وہ اس کی آخری بات سن چکے ہیں۔

''جی بابا......؟''

''تم ٹھیک ہو......؟'' وہ ذومعنی پوچھ رہے تھے۔

''جی بابا......'' اس نے تاثر سے عاری لہجے میں کہنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ خوشی کی شدت کو اپنے لہجے سے الگ نہیں کر پائی تھی۔

''مجھے کب ملاؤ گی اس سے......؟''

''جلد ہی بابا......''

''تمہیں اپنی زندگی جینے کا پورا پورا اختیار ہے سین...... میں نے اور تمہاری ماں نے کوئی ایسا قابل قدر کام نہیں کیا کہ ہم تم دونوں کو کوئی آسائش دے سکتے...... لیکن اب میں چاہتا ہوں کہ تم ویسے زندگی گزارو جیسی تم چاہتی ہو۔''

''آپ کا شکریہ بابا......'' اور برسوں بعد اس نے تہہ دل سے اپنے بابا کا شکریہ ادا کیا تھا۔

☆......☆......☆

''بس میں نے کہہ دیا ہے کہ تم دونوں الگ گھر لو گے اور اس میں رہو گے۔'' ربیکا کی ایک ہی رٹ تھی۔

''لیکن ممی ہم تو آپ کے پاس رہنا چاہتے ہیں۔''

''میں تمہارے پاس ہی رہوں گی۔ زیادہ تر تمہارے پاس ہی رہا کروں گی۔ لیکن تم دونوں ایک الگ گھر میں رہو فی الحال...... عیسیٰ کے مذہب میں ایسا ہی تھا کہ نئے جوڑے کو الگ گھر میں رہنا چاہیے۔''

''اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے؟'' میران دل ہی دل میں کسی حد تک ربیکا کی بات سے متفق تھا۔

''وہ تم مجھ پر چھوڑ دو...... میں سب کرلوں گی۔ میرے پاس بہت زیور ہیں۔ عیسیٰ نے لے کر دیے تھے۔ لیکن اب......''

ربیکا پھر سے گم ہونے کی تیاری کرنے لگی تھی۔

''ٹھیک ہے ممی...... جیسا آپ کہیں۔''

''لیکن ہم آپ کو اکیلے نہیں رہنے دیں گے یا آپ کو ہمارے ساتھ نئے گھر میں رہنا ہوگا یا ہم بھی ادھر ہی رہیں گے۔'' سبین نے بھی مداخلت کی تھی۔

''وہ سب بعد میں دیکھا جائے گا۔ فی الحال تم اپنے لیے نیا گھر دیکھو اور اس گھر کو سجانے کے لیے سامان خریدو...... شادی کے بعد کے دن بہت حسین ہوتے ہیں۔ یہ سب چھوٹی چھوٹی چیزیں بہت اچھی لگتی ہیں اور یادوں کا سب سے بڑا سرمایہ ہوتی ہیں۔'' ربیکا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ مزید بات چیت کیا نتیجہ نکال سکتی تھی دونوں جانتے تھے۔ اس لیے دونوں نے خاموش ہو جانے میں ہی عافیت سمجھی تھی۔

اور انہوں نے ایسا ہی کیا تھا جیسا ربیکا نے کرنے کو ان پر دباؤ ڈالا تھا۔ دونوں نے اسی دن سے گھر دیکھنے شروع کر دیے تھے۔ سبین کا تو کام ہی یہ رہ گیا تھا کہ وہ سارا دن لیپ ٹاپ پر ڈاؤن پے منٹ پر قبضے والے گھر دیکھتی رہتی تھی۔ اور میران کا کام یہ تھا کہ وہ سبین کے پسند کیے ہوئے گھروں کے مالکوں سے جا کر ان سے ڈاؤن پے منٹ میں گنجائش کے بارے میں بات کیا کرتا تھا۔ دونوں نے نجانے کتنے گھر فائنل کیے تھے۔ لیکن ان گھروں کے مالک ان دونوں کو فائنل نہیں کر رہے تھے۔

ہر گزرتے دن میں محبت کی باس تھی۔ وہ دن ایسے تھے کہ ہر ہر دن کی ڈائری میں پھولوں کا پورا چمن لپیٹ کر رکھا جا رہا تھا۔ اور اس چمن کی باس کبھی ناگوار نہیں ہونے والی تھی۔ وہ پھول کبھی سیاہ نہیں ہونے والے تھے۔ ان کی پتیاں کبھی جھڑنے نہیں والی تھیں۔

''مجھے تو سوئمنگ پول والے گھر پسند ہیں میران...... لیکن اس کا قرض اتارتے اتارتے تو ہم بوڑھے ہو جائیں گے۔''

دونوں تفریح کی غرض سے قریبی پارک میں آئے تھے، لیکن سبین پر تو نئے گھر کا بھوت اس طرح سوار تھا کہ پارک میں بیٹھے بھی وہ موبائل پر سیل ہونے والے گھر ہی دیکھ رہی تھی۔

''پہلے کوئی سادہ سا گھر دیکھ لیتے ہیں میری جان...... پھر بعد میں جب پیسے آئیں گے تو کوئی بڑا گھر بھی دیکھ لیں

گے۔" اس نے اس کی ناک پر چٹکی کاٹی تھی۔

"میری ناک پر چٹکی مت کاٹو...... مجھے آئس کریم کی طلب ہونے لگتی ہے۔"

"کیا......؟" وہ کھلکھلا کر ہنسا تھا۔" یہ کیسی منطق ہے؟"

"جیسی بھی ہے اب اسے پوری کرو۔ چٹکی ناک پر کاٹی جائے تو میری زبان پر خارش ہونے لگتی ہے۔ جسے ٹھنڈی میٹھی چیز ہی ختم کر سکتی ہے۔ وہ سامنے آئس کریم والا ہے۔ اگر تم نے ابھی وہ نہ لا کر دی تو رات تک میری بھوک تمہیں دیوالیہ کر دے گی۔"

"آئس کریم کھانی تھی تو ویسے کہہ دیتیں۔ یہ ناک والا بہانہ بنانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔"

"اچھا...... اچھا لاتا ہوں۔" ہنستے ہوئے وہ اٹھا۔

"دو لانا......"

"دو ہی لاؤں گا۔"

"میں اپنے لیے دو کا کہہ رہی ہوں۔ تمہیں کھانی ہے تو تین لے لینا......"

"او کے مائی کیوٹ وائف۔" وہ ہنستے ہوئے چلا گیا تھا۔ وہ اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔

دن، شام میں گم ہونے کی تیاری کرنے لگا تھا اور جیسا کہ ہر شام کے آغاز پر ہوتا ہے، چند لمحوں کے لیے دن پہلے سے بھی زیادہ روشن نظر آنے لگتا ہے۔ لمحاتی وقت کے لیے اس کی روشنی بڑھ جاتی ہے۔ اس تیز روشنی میں تیز ہوا کے جھونکے بھی قید تھے۔ جنہوں نے سبین کے بال پہلے اڑائے تھے اور پھر انہیں بری طرح سے بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ بیگ سے پونی نکال کر اس نے تمام تر بالوں کو اس میں جکڑنا چاہا تھا۔ جب میران نے آئس کریم لاتے ہوئے دور سے ہی آواز لگائی تھی۔

"کھلے ہی رہنے دو ناں...... اچھے لگ رہے ہیں۔" اس نے شوخی سے کہا تھا۔ سبین نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ میران کی شوخی کے جواب میں اس کی مسکراہٹ بڑی دلفریب تھی۔ میران نے ایسی جان لیوا مسکراہٹ پر دل پر ہاتھ رکھ کر، پیچھے کرتے ہوئے مر جانے والی اداکاری کی تھی اور ایسا کرتے ہوئے آئس کریم اس کی شرٹ کو لگ گئی تھی۔ سبین بے اختیار ہی ہنسی تھی۔ اس کی ہنسی ایسی پچل تھی کہ گھونسلوں میں واپس آتے پرندے مڑ مڑ کر اس کو دیکھنے لگے تھے۔

"یہ لو...... ایک ساتھ دو کھاؤ گی کیا......؟"

"ایک میں کھاؤں گی۔ ایک تم مجھے اپنے ہاتھوں سے کھلاؤ گے۔"

"مطلب...... تو یعنی ابھی سے خدمت...... مشرقی انداز شروع......؟"

''ہاں......'' وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی تھی۔

''لیکن ابھی شادی تو ہوئی نہیں۔'' اس نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ سبین شرم سے سرخ ہوگئی تھی۔

''میرا مطلب رخصتی۔'' اب کے اس نے کڑی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

''میران......'' جب اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا تو وہ ایسے ہی تیز آواز سے اس کا نام پکارتی تھی۔

''اچھا بابا۔ غصہ مت کیا کرو...... میں ڈر جاتا ہوں تم سے۔ یہ آئس کریم کھاؤ۔'' اس نے آئس کریم اسے کھلانی چاہی تھی۔ اور جیسے ہی سبین نے آئس کریم کھانے کے لیے منہ کھولا تھا میران نے آئس کریم اس کی ناک پر لگادی تھی۔

''اللہ...... میران...... یہ کیا حرکت کی تم نے۔''

''میں دیکھ رہا ہوں کہ ناک پر چٹکی کاٹوں تو تمہیں آئس کریم کی طلب ہوتی ہے۔ آئس کریم کو ناک پر لگاؤ تو کس چیز کی طلب ہوتی ہوگی۔''

''ٹھہرو ابھی محسوس کر کے بتا دیتی ہوں۔ آج پہلی بار تجربہ ہو رہا ہے۔'' سانس روک کر اور آنکھیں بند کر کے وہ ''نئے تجربے'' کو محسوس کرنے لگی۔

''کچھ پتا چلا......؟''

''ہاں...... پتا چل گیا۔ مجھے ڈائمنڈ کی طلب ہو رہی ہے۔'' وہ چلائی۔ میران نے اسے خود سے لگالیا تھا۔

''میں نے ڈائمنڈ کہا ہے۔''

''تمہارا ڈائمنڈ میں ہی تو ہوں۔'' میران نے خوب بات بدلی تھی۔ دونوں ہنسنے لگے تھے۔

رات ابھی دور تھی۔ لیکن جگنو وقت سے پہلے ہی چمکنے لگے تھے۔

☆......☆......☆

کمرے میں ''کنگ آف ڈنمارک'' کے مہنگے سگاروں کا مہکتا ہوا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ ایک بھرپور کش لے کر فضا میں دھواں چھوڑتے ہوئے پیٹرسن نے مرغولے بنانے چاہے تھے لیکن پھر جیفرسن کی بات یاد آجانے پر اس نے اپنا ارادہ ترک کردیا ہے۔ اسے ایماء اور ولیم سے مماثلت رکھنے والی پرانی اور بری عادتوں کو واقعی میں ترک کردینے کی اشد ضرورت تھی۔

''بولو کارزل...... کیا رپورٹ ہے۔'' اس نے سگار کی راکھ، راکھ دان میں جھاڑتے ہوئے کارزل سے پوچھا۔ پیٹرسن کا موڈ خوشگوار تھا۔ یہ بات اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ لیکن اس کے باوجود کارزل کا اترا ہوا منہ ٹھیک نہ ہوسکا، آج اس کے پاس ڈان پیٹرسن کے لئے اچھی رپورٹ نہیں تھی۔ کارزل کے پاس پندرہ منٹ تھے۔ اسے پندرہ منٹ میں اپنی رپورٹ پیش کرنی تھی۔

اس کے بعد مارک کی باری تھی۔

اور کارزل کو آج یہ پندرہ منٹ کم...... بہت ہی کم محسوس ہو رہے تھے۔ جیسی خبریں اس کے پاس تھیں، ان کو سنانے کی تمہید کے لیے ہی کافی وقت درکار تھا۔ وہ اپنے وقت میں اپنی بہترین کارکردگی کا مظاہرہ کر دینا چاہتا تھا اور اس مظاہرے کے لیے اس کے پاس بس ایک ہی لفظ تھا۔ ''میرے عزیز ڈان پیٹرسن......'' وہ پیٹرسن کو اس ہی لاحقے کے ساتھ مخاطب کیا کرتا تھا۔ کارزل، پیٹرسن کی ایک کمزوری سے اچھی طرح واقف ہو چکا تھا کہ پیٹرسن کو یہ احساس خوب راحت دیتا ہے کہ وہ ''ڈان'' ہے۔ سب اس سے خوف کھاتے ہیں اور اس کی عزت کرنے پر مجبور ہیں۔ کارزل اسے یہ احساس کرواتے رہنا چاہتا تھا۔ اس کی پہلی کامیابی بھی اس کی اسی چالاکی کی مرہون منت تھی۔

اور اگر کارزل یہ سمجھتا تھا کہ اس کی اس چالاکی سے پیٹرسن بے خبر ہے تو یہ اس کی بے وقوفی تھی۔ پیٹرسن بہت سے معاملات پر صرف اس لیے لاعلمی یا نادانی کا مظاہرہ کر دیتا تھا کہ وہ اگلے کی حد دیکھنا چاہتا تھا۔

''ڈان...... یہ لڑکا...... اس کا تعلق بنگلہ دیش سے ہے۔ اس نے ہمارا گینگ چھوڑ دیا ہے۔'' کارزل نے ڈرتے ڈرتے پہلی خبر سنائی تھی۔ دیوہیکل بڑی ٹی وی اسکرین پر ایک بنگالی لڑکے کی فوٹیج چلنے لگی تھی۔ اس وقت وہ بنگالی لڑکا ایک بدنام زمانہ کلب میں اسٹریٹ گرلز کے ساتھ بیٹھا ہوا عیاشی کرنے میں مصروف تھا۔

''کیوں......؟'' پیٹرسن نے مختصر سوال پوچھا تھا۔ اس مختصر سوال میں تفصیلی غصہ تھا۔ کارزل جانتا تھا۔ باقی سب پیٹرسن اور کارزل دونوں سے لاتعلق تھے۔ ان سب کو اپنے اپنے کام کی رپورٹ بھی دینی تھی۔ وہ ذہن ہی ذہن میں اپنی اپنی تیاری کر رہے تھے۔

''اس نے دوسرا گینگ جوائن کر لیا ہے؟''

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تم نے کہا تھا کہ یہ لڑکا پلاسٹک سرجری کروانے پر بھی آمادہ ہو گیا تھا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تم نے اسے جانے دیا۔''

''میرے عزیز ڈان پیٹرسن...... بات دراصل یہ ہوئی تھی کہ اس لڑکے نے معاہدے سے ہٹ کر زیادہ پیسوں کا مطالبہ کیا۔ جبکہ اسے پہلے سے ہی ایک اچھی خاصی رقم دی جا رہی تھی۔ میں نے ''ٹیٹو'' سے کہا کہ وہ اسے سمجھائے۔ اس نے ذرا سخت ہاتھوں سے سمجھا دیا ہے۔ اور غصے میں اس لڑکے نے دوسرے گینگ کی پشت پناہی حاصل کر لی۔ ایک طرح سے اب وہ ان کی حفاظت میں ہے اور ان کے لیے کام کرے گا۔''

''اگر ہم سب تم جیسا کام کرتے رہے تو ہمارا گروپ امریکا کا نمبر ون گروپ تو کیا بنا سکے گا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ہم اپنی اب کی پوزیشن سے بھی نیچے آ جائیں گے۔'' پیٹرسن کی عادت تھی۔ وہ اپنے خاص ورکر کے سامنے ''میں'' کا لفظ بولنے کے بجائے

"ہم" کے لفظ کا استعمال کیا کرتا تھا۔ یہ اس کا خاص انداز تھا۔ اس سے دو فائدے حاصل ہو جاتے تھے۔ ایک تو یہ کہ سب خود کو گروپ کا اہم حصہ سمجھنا شروع کر دیتے تھے۔ دوسرا یہ کہ نام لیے بنا اگلا نصیحت بھی جلدی پکڑ لیتا تھا اور اپنی بے عزتی بھی محسوس نہیں کرتا تھا۔

کارزل نے دائیں بائیں دیکھا تھا۔ اگرچہ پیٹرسن کی بات پر کوئی ہنسا تو نہیں تھا لیکن کارزل کے لیے سب کی آنکھوں میں مذاق تھا۔ کارزل کو بے پناہ ہتک کا احساس ہوا تھا۔ کچھ یہ سوچ کر اور زیادہ اس بات سے کہ اگلی خبر بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ کارزل کے چہرے پر پریشانی کے باعث لکیریں سی بن گئی تھیں۔

"ڈان...... اس لڑکی نے بھی کام کرنے سے انکار کر دیا ہے۔" کارزل نے ریموٹ کا بٹن دبا کر اگلی فوٹیج چلا دی تھی۔ اب کے بڑی اسکرین پر سبین کی تصویر ابھری تھی۔ یہ فوٹیج اس وقت بنائی گئی تھی جب سبین اور میران پارک میں موجود تھے اور میران، سبین کے لیے آئس کریم لینے گیا تھا۔

فوٹیج میں سبین کے بال ہوا سے بکھر رہے تھے۔ سبین بال سمیٹنے کی کوشش کرتی ہے لیکن پھر کسی کے کچھ کہنے پر بھرپور انداز میں مسکراتی ہے اور بال کھلے ہی رہنے دیتی ہے۔ پھر کچھ ہوتا ہے اور اب کی بار سبین کھلکھلا کر ہنستی ہے۔ سبین کی مسکراہٹ اور ہنسی ایسی تھی کہ سب اپنی رپورٹس بھول کر بڑی اسکرین کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

"کون ہے یہ لڑکی......" پیٹرسن سیٹ پر آگے کو ہوا تھا۔ اس کی آواز کئی لحافوں میں لپٹی ہوئی برآمد ہوئی تھی۔ کارزل کو اس سوال کی توقع نہیں تھی، اور اس انداز کی تو ہرگز توقع......

"پاکستان سے ہے میرے عزیز ڈان پیٹرسن! سبین نام ہے اس کا...... تین بار پہلے بھی ہمارے لیے کام کر چکی ہے۔ یہ پاکستان سے لائم (چونے) سے بنے ڈیکوریشن پیس کے ذریعے حشیش لاتی تھی۔ لیکن اب اس نے کام کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ کہتی ہے کہ اب میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ میں یہ کام نہیں کروں گی۔ گینگ کو مجھے جان سے مارنا ہے تو بے شک مار دے۔"

"کسی اور کے لیے کام کرنے لگی ہے؟"

"نہیں...... کہتی ہے کہ وہ اللہ سے توبہ کر چکی ہے۔"

فوٹیج ایک بار چل کر پھر سے دوبارہ چل رہی تھی۔ سبین کے کھلے بال ایڈم کے اردگرد بکھر رہے تھے۔ اس کی مسکراہٹ سے اسے جیسے گدگدی ہونے لگی تھی۔ اس کی ہنسی کی آواز سے سارا کمرہ بھر چکا تھا۔

"اس کی اسمگلنگ کا طریقہ کار بہت شفاف تھا۔ پچھلے دنوں اس نے کیمیکل لیبارٹری کی رپورٹ کو بھی جھوٹا کر دیا ہے۔ انوسٹی گیشن ٹیم اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی کہ ایسا کیسے ممکن ہو گیا۔ ڈیکوریشن کا جو پیس ان کے پاس تھا اس میں سے حشیش برآمد ہو گئی

اور جو اس لڑکی کے پاس تھا اس کا ذرہ ذرہ چیک کر لینے پر بھی رہاں سے کچھ نہیں ملا...... اسی لیے میں چاہتا تھا کہ کسی بھی طرح سے اس لڑکی کو واپس بلا لیا جائے۔ میں نے زیادہ پیسوں کا لالچ بھی دیا لیکن ہر کوشش ناکام ہوگئی۔"

کارزل بولتا جا رہا تھا اور پیٹرسن خاموش تھا۔ اس نے ایک لفظ پر تبصرہ بھی نہیں کیا تھا۔ وہ بس اسکرین پر مسکراتی اور پھر کھلکھلا کر ہنستی سیبن کو دیکھتا جا رہا تھا۔ کارزل کو لگا پیٹرسن شاید اس لڑکی پر کوئی تبصرہ کرنا ہی نہیں چاہتا۔ اس کے لیے یہ اتنی اہم ثابت نہیں ہوئی تھی جتنی خود کارزل کے لیے تھی۔ اس لیے اس نے فوٹیج کو بدل دیا۔

"اور ڈان...... یہ بوڑھا آدمی......"

"واپس اس لڑکی کو فوٹیج پر لگاؤ......" پیٹرسن نے تیز آواز سے کہا تھا۔ کارزل نے فوراً حکم کی تعمیل کی تھی۔

ہوا، بال، مسکراہٹ، ہنسی...... یہ سب ایک ایسا بھنور بن گیا تھا جو ہر گزرتے لمحے پیٹرسن کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ بے حد مضبوط اعصاب ہوتے ہوئے بھی وہ ان کم حیثیت چیزوں کی دلدل میں دھنسنے لگا تھا۔

"اس لڑکی کے بارے میں کیا حکم ہے میرے عزیز ڈان پیٹرسن......"

"ابھی سب جاؤ...... مجھے آرام کرنا ہے۔ آج کی ساری میٹنگ کینسل کر دو......"

سب نے ایک دوسرے کی طرف حیرت سے دیکھا تھا اور پھر کمرہ اگلے ہی لمحے خالی ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

ان کی محنت کے ثمر کے طور پر انہیں ایک گھر مل گیا تھا۔ جو کہ شہر سے ذرا فاصلے پر سبزے سے گھرے علاقے میں تھا۔ قیمت بھی مناسب تھی اور ڈاؤن پے منٹ کے بعد باقی کی پے منٹ کا شیڈول بھی ان کے لیے موزوں تھا۔ اس لیے سیبن اور میران نے اسے خریدنے میں دیر نہیں کی تھی۔ جتنے پیسے ان کے اور ربیکا کے پاس تھے اتنے میں انہوں نے اپنے لیے ایک چھوٹی سی جنت خرید لی تھی۔

اور وہ کہاں جانتے تھے کہ پیسوں سے جنت نہیں خریدی جا سکتی......

دونوں بہت خوش تھے۔ گھر کو انہوں نے ایک ویب سائٹ پر دیکھا تھا۔ پھر جب انہوں نے اسے خریدنے کا ارادہ کر لیا تو وہ اس کی جگہ پر گئے تھے۔ وہ گھر اس سے کہیں زیادہ پر فضا مقام پر تھا جتنا تصویروں میں نظر آیا تھا۔ جبکہ عموماً ایسا ہی ہوتا ہے کہ تصویریں ہی زیادہ اچھی ہوتی ہیں۔ دو تین دفعہ گھر دیکھنے کے بعد اور ساری کاغذی کارروائی ہو چکنے کے بعد آج مالک مکان نے انہیں اس گھر کی چابی پکڑا دی تھی۔ ایڈوانس وہ دے چکے تھے۔ باقی رقم آہستہ آہستہ تین سالوں میں ادا ہوئی تھی۔

پتا نہیں چابی میں اسپرنگ لگے ہوئے تھے یا سیبن میں...... وہ اچھلتی پھر رہی تھی۔ دروازہ کھول کر وہ اندر آ گئی تھی اور خالی گھر میں ایسے گھوم رہی تھی جیسے کوئی تتلی بھول بھلیوں میں گم ہو گئی ہو...... اس نے گھر کی ساری کھڑکیاں، دروازے کھول دیے تھے

اور تازہ ہوا کو اندر آنے دے رہی تھی۔ میران اسے دیکھ رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

''اس کی دیواروں پر کون سا پینٹ اچھا لگے گا میران......؟''

''یہ سب تو تم کرو گی۔ میں تمہارے کام میں نہیں بولوں گا۔ جو جو تمہارا دل کرے کرنا......'' وہ پیار سے بولا تھا۔

''ہم جلد ہی اس گھر کا باقی کا قرض بھی اتار دیں گے۔ تین سالوں سے پہلے ہی......'' سبین خالی گھر کو دیکھتے ہوئے بولی تھی۔ سامان نہ ہونے کی وجہ سے گھر میں اس کی آواز گونجی تھی۔ میران اسے دیکھ رہا تھا کہ وہ کس قدر خوش ہے۔

''میں اس کو سجاؤں گی۔ ہم اس کے لیے آج ہی شاپنگ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہمارے پاس جتنی بھی سیونگ ہے وہ خرچ کر لیتے ہیں۔ اونر کو کہہ دیں گے کہ ہم اگلے ماہ سے باقی کی پے منٹ کا شیڈول فالو کریں گے۔ وہ بہت اچھا ہے۔ یقیناً اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

وہ ایک ایک کمرے کو دیکھتے ہوئے وہاں تصور ہی تصور میں سامان سجانے لگی تھی۔

''وہ سامنے والا روم ممی کا ہوگا اور یہ ہمارا بیڈ روم ہوگا۔'' اب وہ ایک خالی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ ''میں اسے بہت اچھی طرح سجاؤں گی۔''

''ہاں......ہم خوب محنت کریں گے اور...... بہت سی محبت......'' میران نے کھینچ کر اسے خود سے لگا لیا تھا۔

☆......☆......☆

''پیٹی...... کچھ بتا کر گیا ہے کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟'' جیفرسن نے ملازم سے پوچھا تھا۔ وہ بہت جلدی میں اور عجلت میں پیٹرسن کی طرف آیا تھا۔ اس وقت اس کا چہرہ متوحش ہو رہا تھا۔

''وہ کہیں نہیں گئے۔ وہ تو اپنے کمرے میں ہیں۔'' ملازم نے جواب دیا۔

''کمرے میں......'' اس نے حیرت سے ملازم کو دیکھا۔ ''پھر مجھے کیوں کال پر بتایا گیا تھا کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔''

''انہوں نے سب سے یہ ہی کہنے کو کہا تھا۔''

ڈینی سر ہلا کر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا پیٹرسن کے کمرے میں آیا تھا۔ وہ بہت پریشان تھا اور الجھن کا شکار بھی...... پیٹرسن آج صبح سے اس کی کال ریسیو نہیں کر رہا تھا اور اس کے کسی میسج کا جواب بھی نہیں دے رہا تھا۔ ملازم یہ ہی کہہ رہے تھے کہ وہ کمرے میں نہیں ہے۔ جب اس نے ملازم کو پیغام دیا کہ وہ جا کر اسے کمرے میں کہے کہ وہ جیفی کی کال ریسیو کرے تو ملازم نے اسے کہا تھا کہ وہ کسی کو بتائے بنا گھر سے باہر جا چکے ہیں۔ اب وہ ہی ملازم کہہ رہا تھا کہ وہ کمرے میں ہیں۔ جیفرسن کو خطرے کی بو آئی تھی۔ اسی لیے وہ تقریباً بھاگتا ہوا پیٹرسن کے کمرے میں آیا تھا۔

راستے سے یہاں تک کے سفر میں بھی لاکھوں ہی اندیشے تھے جو جیفرسن کو پریشان کرتے رہے تھے۔ اسے ایک دم سے سخت پریشانی ہوئی تھی۔ پیٹرسن نے پہلے کبھی اس طرح کا رویہ نہیں اپنایا تھا۔ وہ تو بیماری میں بھی ہشاش بشاش رہنے والا آدمی تھا۔ وہ بے انتہا مصروف ہی کیوں نہ ہوتا جیفرسن کی کال ضرور پک کیا کرتا تھا۔ نجانے کیا بات ہوئی تھی۔ اس جوانی میں پیٹرسن کی طبیعت تو نہیں بگڑ سکتی...... پھر کون سی پریشانی ہے جو اس نے خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا ہے اور جیفرسن تک سے بات کرنے سے ملازم کو منع کیا ہوا ہے۔ یہ تک جاننے کی کوشش نہیں کی کہ اسے کتنی اہم بات بھی کرنی ہو سکتی ہے۔

پیٹرسن کے کمرے کی ساری لائٹس بند تھیں۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ صرف ٹی وی اسکرین روشن تھی۔ جس پر کوئی منظر چل رہا تھا۔ جیفرسن کو اندھیرے میں کہیں بھی پیٹرسن نظر نہیں آیا...... تو وہ کمرے میں بھی نہیں تھا اور ٹی وی بھی چل رہا تھا۔ اسے کسی گڑبڑ کی بو آئی تھی۔

''پیٹرسن ایسی غلطیاں کرتا تو نہیں۔ ٹی وی چل رہا ہے۔ دروازہ کھلا ہے اور وہ کمرے میں نہیں۔'' سوچتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکلنے والا تھا جب اسے محسوس ہوا کہ ٹی وی پر ایک ہی منظر بار بار دہرایا جا رہا ہے۔

منظر میں ایک لڑکی کے بال ہوا میں بکھر رہے تھے۔ وہ لڑکی بال سمیٹنے کی کوشش کرتی ہے لیکن پھر کسی کے کچھ کہنے پر بھرپور انداز میں مسکراتی ہے اور بال کھلے ہی رہنے دیتی ہے۔ پھر کچھ ہوتا ہے اور اب کی بار لڑکی ہنستی ہے۔ اس کی مسکراہٹ اور اس کی ہنسی دیکھ لینے کے بعد یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ دونوں میں سے کون سی چیز زیادہ دلکش ہے، زیادہ دلفریب، زیادہ قیامت خیز، زیادہ تباہ کن......

غور سے دیکھ لینے کے بعد جیفرسن خود چند لمحوں تک اس منظر سے اپنی نظریں نہیں ہٹا پایا تھا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر لائٹس آن کر دی تھیں۔ اس کا شک صحیح تھا۔

پیٹرسن خاموشی سے...... بے حد خاموشی سے گداز صوفے پر اس طرح بیٹھا تھا کہ اندھیرے میں نظر ہی نہیں آ سکتا تھا۔ اس کے بیٹھنے کے انداز سے زیادہ اس کے ٹی وی کو دیکھنے کا انداز جیفرسن کو ڈرانے لگا تھا۔

''پیٹی......'' جیفرسن نے اسے پیار سے پکارا تھا۔ پیٹرسن ساکت بیٹھا رہا جیسے اس کے جسم سے روح نکل چکی ہو۔ اگر وہ اس وقت زندہ تھا بھی تو اس کا روم روم اس قدر ڈھیلا ہو چکا تھا کہ اس پر مردے کا گمان ہوتا تھا۔

''پیٹی......'' اسے پھر سے پیٹرسن کا پکارنا پڑا تھا۔ وہ حقیقتاً پریشان ہو گیا تھا۔ پیٹرسن نے تب بھی کچھ نہیں کہا تھا۔ البتہ ٹی وی اسکرین کو اس نے آف کر دیا تھا۔ پھر آہستگی سے اٹھ کر وہ کنسول کی طرف بڑھا تھا۔ وہاں پڑی ''لائن شیک'' کی سیاہ بوتل میں سے گہرا سرخ آب کھنکتے ہوئے جام میں انڈیلا تھا۔ آئس بالٹی سے تین کیوبز بھی اس میں ڈالے تھے اور پھر اس کا ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرا تھا۔ یہ تمام کارروائی انتہائی آہستگی سی ہوئی تھی اور اس تمام میں وہ کنسول پر نصب آئینے میں اپنا ہی عکس دیکھتا رہا تھا۔

''پیٹی...... کچھ ہوا ہے کیا؟''

''مجھے یہ لڑکی چاہیے جیفی!'' اپنے عکس پر نظریں جمائے ہوئے بالآخر پیٹرسن نے لب کھولے تھے۔ جیفرسن نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ کہاں تو وہ دانا کے لیے بھی نہیں مان رہا تھا اور کہاں اب اس شدت سے اس لڑکی کا طالب بن گیا تھا۔

یہ پہلا واقعہ تھا کہ پیٹرسن نے کسی لڑکی کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

''ہر قیمت پر......'' اب کی بار پیٹرسن نے زور دے کر کہا تھا۔

''جو حکم میرے پیارے ڈان! میرے پیارے بھائی۔'' جیفرسن نے خوش ہو کر پیٹرسن کے گال پر پیار سے ہاتھ رکھتے ہوئے اسے مکمل یقین دہانی کروائی تھی۔ پیٹرسن کے لہجے کی شدت کو جیفرسن محسوس کر چکا تھا۔ اسے پتا تھا کہ اب اسے یہ لڑکی واقعی میں ہر قیمت پر چاہیے۔ جیفرسن مسکرا رہا تھا۔

''بالآخر...... آخر کار......'' کمرے سے باہر نکلتے ہوئے جیفرسن نجانے کیا کیا سوچنے لگا تھا۔ اسے پھر سے ایک موقع مل گیا تھا اور اب کی بار وہ اس موقعے کو کسی صورت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔



ناول **شام رنگ سیاہ** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **20** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 11

وہ دونوں ان دنوں بہت خوش تھے اور ایک ایک چیز کو خوب انجوائے کر رہے تھے۔ دونوں ان جگہوں پر پھر سے گئے تھے جہاں وہ پہلے بھی کئی بار جا چکے تھے اور سبین کو ان جگہوں پر پہلے سے بھی زیادہ مزا آیا تھا۔ پہلی بار سے بھی زیادہ مزا...... محبت کے رتھ کی ڈوریں ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ وہ دونوں اسے جہاں چاہے گھما رہے تھے۔ نیویارک میں رہتے ہوئے جیسے وہ دونوں کوہ قاف کی سیر کر رہے تھے۔ الف لیلیٰ کا رومان تھا جو ان دنوں دونوں پر مسلط تھا۔

وہ مختلف پارکس میں گئے تھے۔ پلے لینڈ، فن لینڈ...... انہوں نے لمبی لمبی اور خوفناک رائڈز لی تھیں۔ سبین کو جھولوں سے بہت ڈر لگتا تھا۔ جھولا دیکھ کر ہی اس کی جان نکل جاتی تھی۔ خاص کر ایسے جھولے جو انسان کو الٹا سیدھا چاروں طرف سے اچھی طرح گھما کر، ٹھونک بجا کر چیک کرتے ہیں کہ ان پر سفر کرنے والا انسان ہی ہے تو وہ اسے اس حالت میں نیچے اتارتے ہیں کہ اس انسان کو دوسرے لوگوں سے پوچھنا پڑتا ہے کہ ''میں دنیا میں ہوں؟ میں دنیا کا ہی آدمی ہوں؟''

کچھ جھولے تو اتنے ڈھیٹ ہوتے ہیں کہ وہ انسان کی چیخ و پکار پر یقین نہیں کرتے...... انہیں الٹیاں درکار ہوتی ہیں، جو ہوتی تو یقیناً صبح کے کھانے کی ہی ہیں، لیکن جسے آدمی خون کی الٹیاں سمجھ کر کرتا ہے۔

اور میران کی جان ایسے ہی جھولے تھے۔ باقی معمولی جھولوں کو تو وہ پینگ سمجھتا تھا، اور سبین تو لڑکی ہونے کے باوجود بھی پینگ سے اتنی نابلد تھی کہ بچپن میں جب کہیں ان کے گھر کے پاس عید وغیرہ کا میلہ لگتا تھا اور اس کی سہیلیاں اسے تھوڑا تیز جھولا دے دیا کرتی تھیں تو وہ باقی کی ساری عید اپنے حواس بحال کرنے میں لگا دیتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس کا سانس اس سے روٹھ گیا ہے۔ اس کے دل کی دھڑکنیں اس کے قابو میں نہیں رہیں۔ اور وہ بس اللہ میاں کے پاس واپس جانے ہی والی ہے۔

''آؤ سبین......! اس جھولے میں بیٹھتے ہیں۔'' میران نے ایک ایسے جھولے کی طرف اشارہ کیا تھا جو زمین سے اتنی اونچائی پر نصب تھا کہ دیکھ کر لگتا یہ بنا ملک الموت کے ہی اللہ کے پاس پہنچا دیتا ہوگا۔

''میں عالم ارواح واپس جانے کے لیے تیار ہوں میران......! حتیٰ کہ عالم برزخ میں بھی...... لیکن اس جھولے پر میں نہیں بیٹھ سکتی......'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ میران اگر اس کی اس بات سے اسے ڈرپوک سمجھتا ہے تو بھلے سمجھے...... اس کو خطروں سے کھیلنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ میران قہقہہ مار کر ہنسا۔

"اتنا ڈرتی ہو......؟"

"اِتنا اُتنا میں نہیں جانتی...... میرے اندر جتنا بھی ڈر ہے وہ جھولوں کو دیکھ کر باہر نکل آتا ہے۔"

"تو کیا میں اکیلا ہی بیٹھوں......؟"

"وہ سامنے "اُونچ نیچ" لے لیتے ہیں۔اس میں مَیں تمھارے ساتھ بیٹھ جاتی ہوں۔"

"وہ......؟" اب کے وہ اور زور سے ہنسا۔

"وہ "اونچ نیچ" اس میں تو میں اسکول میں بھی نہیں بیٹھتا تھا۔"

"جو بھی ہو جائے...... اس جھولے میں تمھارے ساتھ ہرگز نہیں بیٹھ سکتی......"

"او کے...... میں اکیلا چلا جاتا ہوں۔لیکن سوچ لو...... مجھے کوئی مل بھی سکتی ہے۔"

"کیا مطلب......؟"

"کوئی ڈر کر میرے ساتھ چپک گئی تو......؟" وہ آنکھ دبا کر بولا۔

"پھر مجھ سے شکایت نہ کرنا......"

"میران......!تم مجھے جذباتی بلیک میل نہیں کر سکتے......"

"جذباتی چھوڑو...... تم تو نفسیاتی بلیک میل بھی نہیں ہو رہیں...... سوچ لو...... جھولے کو کچھ ہو گیا تو میں اکیلا ہی اوپر سے "اوپر" چلا جاؤں گا۔" اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔سبین نے جلدی سے اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھا۔

"پھر سے ایسا مت کہنا...... ہم دونوں ایک ساتھ مریں گے۔"

"چلو پھر آج ٹرائی کر لو...... مر گئے تو دونوں ایک ساتھ اوپر...... بچ گئے تو ایک ساتھ پھر سے جھولا لیا کریں گے۔"

اس نے ناں میں سر ہلایا۔وہ ابھی بھی نہیں مان رہی تھی۔

"میرے کہنے پر بھی نہیں......؟" اب کی بار اس نے اس انداز سے کہا کہ سبین کو لگا کہ اب تو وہ انکار کر ہی نہیں سکتی...... وہ عالم ارواح میں واپس جا سکتی ہے۔عالم برزخ میں بھی...... حتیٰ کہ جہنم میں بھی...... لیکن میران کو انکار نہیں کر سکتی۔

سبین اس کے ساتھ اس آسمانی...... نہیں خلائی جھولے پر بیٹھ گئی تھی اور اس نے میران کا بازو اتنی شدت سے تھام رکھا تھا کہ جھولے سے اترنے کے بعد سبین اپنا دل اور میران اپنا بازو نارمل کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

"لگتا ہے تمھاری جھجک ختم ہو گئی ہے۔تمھارا ڈر نکل گیا ہے۔"

"ہاں...... کسی حد تک......"

"لیکن میرے بازو کا دورانِ خون کیوں رواں نہیں ہو رہا......" وہ جان بوجھ کر اور زور زور سے اپنا بازو سہلانے لگا تھا۔

"اب زیادہ مت بنو......رات میں تو کہتے ہو سرہانہ ایک ہی رکھو......تم میرے بازو پر سوؤ......پھر اب کیا ہوا ہے؟"

میران موضوع سے بچتے ہوئے دائیں بائیں دیکھنے لگا تھا۔

"اچھا بولو......اب کہاں چلیں......؟" سبین نے پوچھا۔

"رش جھیل چلتے ہیں۔"

"نہیں......وہاں نہیں......دائنا کی خودکشی اور پھر حانک کی خودکشی کی کوشش کے بعد میرا وہاں جانے کو دل نہیں کرتا میران......"

"چلو......جیسے تمھاری مرضی......لیکن وہاں......کچھ اور بھی تو ہوا تھا۔" اب کے وہ مسکرایا۔

سبین خجالت سے بچنے کے لیے آئس کریم لینے کا بہانہ کر کے آگے بڑھ گئی۔

☆......☆......☆

پاکستان میں اس کے قریبی رشتے داروں میں اس کا بس ایک بوڑھا باپ ہے اور ایک چھوٹی بہن......جو ذہنی بیمار تھی لیکن اب بہتر ہے۔ اسمگلنگ کا کام اس نے مجبوری میں کیا تھا۔ گھر کی غربت سے تنگ آکر اس نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ پھر اسے شادی سے ایک روز پہلے ہی طلاق ہوگئی تھی۔ اس کا نکاح اس کے تایا کے بیٹے سے ہوا تھا، لیکن جب شادی کا دن قریب آیا تو اس نے سبین کو طلاق دے دی۔ مسلمانوں میں اکثر اس طرح بھی ہو جاتا ہے وہ نکاح پہلے کر لیتے ہیں اور شادی......"

سبین کے ماضی کے متعلق ساری معلومات اکٹھی کرنے کا کام جیفرسن نے کارزل وغیرہ کو سونپنے کی بجائے خود ہی سر انجام دیا تھا۔ وہ کہیں بھی کوئی بھی غلطی نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ سب بے حد طریقے سے کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت پیٹرسن کے ساتھ شطرنج کھیلتے ہوئے وہ پیٹرسن کو سبین کے بارے میں اکٹھے کیے گئے سارے جز سے آگاہ کر رہا تھا جب نکاح کی بات پر پیٹرسن نے اسے درمیان میں ٹوکا تھا۔

"میں سب جانتا ہوں جیفی......کیا تم نہیں جانتے کہ تمھارے بھائی کو دنیا کے سارے مذاہب کے بارے میں ان مذاہب کے عالموں سے بھی زیادہ علم ہے۔"

"اوہ......ہاں......میں بھول گیا تھا۔" جیفرسن واقعی ہی یہ بات بھول گیا تھا۔ جیسا کہ وہ اکثر کرتا آیا تھا۔

"آگے بولو......"

کرسٹل کے "وزیر" کو ہاتھ میں پکڑے پیٹرسن اگلی چال کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا اور جیفرسن کی بات بھی سن رہا

تھا۔ شطرنج کی بساط پچھلے تین گھنٹے سے بچھی ہوئی تھی۔ مقابلہ کانٹے کا تھا۔ جیفرسن جو آج تک اس سے نہیں جیتا تھا، آج واضح طور پر جیتتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ متوقع جیت کی خوشی جیفرسن کے پورے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔ لیکن وہ ہمیشہ کی طرح یہ بھی بھولا ہوا تھا کہ پیٹرسن نے ہارنا نہیں سیکھا...... وہ آخری چال میں بھی بازی اپنی طرف کر لینے کا استاد تھا۔

''تو یہ کام اس نے اپنی مرضی سے نہیں اپنی مجبوری سے کیا تھا۔'' جیفرسن کو آج پہلی بار پیٹرسن کی ہار نے نہال کیا ہوا تھا۔

''مجھے اس سب سے کوئی سروکار نہیں ہے جیفی...... کہ اس نے یہ کام مجبوری میں کیا یا خوشی سے...... تم اصل بات کی طرف آؤ۔'' چال سے اکتا کر پیٹرسن نے سگار کا لمبا کش لینے کے بعد دھواں فضا میں چھوڑا تھا۔ کنگ آف ڈنمارک کی بہکی ہوئی مہک کمرے میں چاروں طرف پھیلنے لگی تھی۔ جیفرسن چند لمحے خاموش رہا تھا۔ پیٹرسن اس سے جو پوچھ رہا تھا اس کا مطلب وہ بخوبی جانتا تھا۔

''بولو جیفی......! یا تم اس کے بارے میں ساری معلومات اکٹھی کرنے میں ناکام رہے ہو؟''

جیفرسن نے تھوک نگلا تھا۔ جھوٹ بولنا مشکل تر ثابت ہو رہا تھا۔

''نہ تو پاکستان میں اس کا کوئی بوائے فرینڈ تھا اور نہ ہی امریکا میں ہے۔'' جیفرسن نے ایسے کہا جیسے کوئی بہت ہی مشکل بات کہہ رہا ہو...... جیسے یہ بات اس کے لیے زہر مار کرنے کے مترادف تھی۔ پیٹرسن نے کش کو درمیان میں ہی ادھورا چھوڑ دیا تھا۔

''آر یو شیور......؟''

''ہنڈرڈ پرسنٹ......''

''آج کل کہاں ہے وہ......؟''

''وہ کرائے پر ایک گھر لے کر وہاں تنہا رہ رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے...... بلواؤ اسے یہاں...... اسے کہو ڈان پیٹرسن نے اسے بلوایا ہے۔'' پیٹرسن کا ''وزیر'' بھی پٹ چکا تھا۔ کھیل اب سارے کا سارا جیفرسن کے حق میں ہو چکا تھا۔

''یہ کام میں تمہارے کہنے سے پہلے ہی کر چکا ہوں پیٹی...... میں نے پیغام بھجوایا تھا کہ ڈان تمھیں یاد کر رہے ہیں، لیکن اس نے کہا ہے کہ وہ ڈان کے منہ پر تھوکتی ہے۔ وہ کسی صورت اب یہ کام نہیں کرے گی۔ وہ اپنے اللہ کے ساتھ وعدہ کر چکی ہے کہ اب یہ کام پھر سے نہیں کرے گی اور اسے اپنے اللہ سے کیے ہوئے وعدے کے خلاف نہیں جانا......''

جیفرسن کی بات سن کر پیٹرسن خاموش ہو گیا تھا۔ اس کا سگار ختم ہو چکا تھا۔ گیم ہارے جانے کے قریب تھا۔ سونے کے سگار کیس میں سے پیٹرسن نے ایک دوسرا سگار نکال لیا تھا۔ پھر اس نے BERLUT کے لائٹر سے سگار سلگایا تھا۔ وہ ایک وقت

میں ایک ہی سگار پینے کا عادی تھا لیکن جیفرسن دیکھ رہا تھا کہ پچھلے چند دنوں سے اس کی عادت واطوار میں کافی بدلاؤ آ رہے تھے۔

''پھر کیا کرنا ہے پیٹی......؟''

''وہی......جو گرینڈ فادر نے ایمنڈا کے ساتھ کیا تھا۔'' پیٹرسن نے ایک جملے میں ساری بات ختم کر دی تھی۔ پھر پیادے کی چال چلی تھی جس نے ساری گیم کی کایا پلٹ دی تھی۔

☆......☆......☆

نئے گھر کا نام انہوں نے ''ڈریم لینڈ'' رکھا تھا۔ خوابوں کی سرزمین......ان دونوں کے خوابوں کی، جو انہوں نے سوتے سے زیادہ جاگتے میں دیکھے تھے۔ نئے گھر کے لیے دونوں نے بہت سی خریداری کی تھی۔ حقیقتاً اپنی ساری سیونگ لٹا دی تھی۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں تھیں، جن کا ان کے نئے گھر میں انبار لگتا جا رہا تھا۔ ربیکا نے بھی اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی بہت سی چیزیں نئے گھر کے لیے ان کو دی تھیں۔ کچھ میز پوش، گلدان، پردے، فوٹو فریم اور بیڈ کورز وغیرہ......اس نے اپنے سارے زیور بھی سین کو دے دیے تھے۔

''مشرق میں یہ ہی رواج ہے ناں کہ ساس اپنی بہو کو اپنے سارے زیور دے دیتی ہے۔ اس لیے یہ بھی اب تمھارے ہوئے۔''

نجانے ربیکا کس مشرق کی بات کر رہی تھی۔ سین کی ہونے والی ساس نے تو اسے اپنے بیٹے کے منہ سے رخصتی سے ٹھیک ایک دن پہلے طلاق ہی دلوائی تھی۔ سین تاسف سے اس منظر کو سوچ کر رہ گئی تھی۔

بند کارٹنز کا ڈھیر تھا جو نئے گھر میں اکٹھا ہوتا جا رہا تھا، اور جسے پینٹ کے بعد ہی کھلنا تھا۔ میران نے اسے کہا تھا کہ وہ پینٹ کے لیے کوئی ورکر بلا لیتے ہیں، اتنی کنجوسی کرنا بھی ٹھیک نہیں ہوتا......لیکن سین نے اسے منع کر دیا تھا۔ ایک تو بچت کرنے کی غرض سے......دوسرا اس وجہ سے کہ تھوڑا بہت پینٹ کرنا تو اسے بھی آتا تھا۔

''میں پینٹ کرنے میں ماہر ہوں......فکر نہ کرو......کسی ورکر سے زیادہ اچھا کروں گی۔'' پینٹ کا نیا ڈبا کھولتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ پھر سرخ پینٹ میں رولر ڈبو کر اس نے جوں ہی سفید دیوار پر رگڑا اسے بچپن کا وہ دن یاد آ گیا جب اس نے زویا کے ساتھ مل کر باہر کے دروازے پر پیلے رنگ کا پینٹ کیا تھا۔ پھر رنگ کم ہونے کی وجہ سے ایک دروازہ بنا رنگے ہی رہنے دیا تھا۔ وہ ایک ایسا دن تھا جسے یاد کر کے وہ بیک وقت خوش بھی ہوئی تھی اور اداس بھی......

''کیا ہوا......؟ کیا سوچنے لگی ہو......؟''

''بچپن کے دن کتنے عجیب ہوتے ہیں ناں میران......! وہ اداس کر دیتے ہیں اور پھر بھی انسان ایسے ہی دنوں کو یاد کیے جاتا ہے۔''

''کیونکہ شاید ان میں محرومیاں ہوتی ہیں۔ وہ محرومیاں انسان کو تنگ کر رہی ہوتی ہیں۔ انسان چاہتا ہے کہ وہ ماضی میں جا کر ان سب محرومیوں کو ٹھیک کر لے۔''

''اور بعض اوقات انسان ان محرومیوں کو'' حال'' میں پورا کرنے کی کوشش میں ہلکان ہوتا رہتا ہے۔

''تم بتاؤ کہ تم سوچنے کیا لگی تھیں؟''

''میں وہ دن سوچ رہی تھی جب میں نے زویا کے ساتھ مل کر اپنے گھر کا دروازہ پینٹ کیا تھا۔'' اس نے گہری سانس لی...... میران کو ساری بات بتا دینے کے باوجود بھی وہ اپنے احساسات اسے نہیں بتا سکتی تھی، وہ جانتی تھی۔

''دروازے سے گھر تک کا سفر بہت لمبا رہا میران...... بہت لمبا...... اور تھکا دینے والا بھی......''

''ان باتوں کو مت یاد کرو سبین...... اب کی سوچو...... میں تمھارے ساتھ ہوں۔ رنگ ضائع کرتی رہو، میں تمھیں اور لا کر دیتا رہوں گا۔'' جواباً وہ اپنی زندگی کی ساری تلخی چھپاتے ہوئے ہنسی تھی۔

اگلے ہفتے وہ دونوں باقاعدہ اپنے نئے گھر میں شفٹ ہو گئے تھے۔ بڑے اور چکنے پتوں والے پام کے درختوں سے گھرے علاقے میں...... اپنی چھوٹی سی جنت میں...... سارا سامان کھول کر سجا لیا گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں نے اتنی رونق پیدا کر دی تھی کہ سارا گھر جگمگ جگمگ کرنے لگا تھا۔ آسمان کے سارے ستارے جیسے اس گھر میں اتر آئے تھے۔

سبین خوش تھی۔ وہ کہاں جانتی تھی کہ اس نئے گھر میں ہوا سرخ پینٹ اس کی کیسی سیاہ تقدیر لکھنے والا ہے۔

☆......☆......☆

ربیکا ایک دو دن ان کے ساتھ رہی تھی۔ پھر ایک دن ناشتے کی ٹیبل پر میران سے الیگزینڈر کے چیری کے باغات جانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

''میں کچھ دن اپنے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔''

ربیکا کا مطالبہ سن کر سبین اور میران دونوں ہی خاموش ہو گئے تھے۔ دونوں جانتے تھے کہ وہ کچھ دن اپنے ساتھ نہیں بلکہ تنہائی میں عیسیٰ کے ساتھ گزارنا چاہتی ہے۔ عیسیٰ...... عیسیٰ...... عیسیٰ...... ایک شخص مر کر بھی آخر اس بری طرح سے کیسے زندہ تھا۔ کیا اس کی روح ایسی ہی دنیا پسند تھی کہ مر کر بھی اس دنیا سے رخصت نہیں ہو سکی تھی۔

''تم ممی کو جانے دو میران......! وہ ہماری نئی زندگی سے اپنے ماضی کو یاد کرتے ہوئے مزید اداس ہو رہی ہیں۔'' سبین نے صلاح دی تھی۔ غیر متوقع طور پر میران نے سبین کی یہ بات مان لی تھی۔ اس نے ربیکا کو الیگزینڈر کے چیری کے باغات جانے کی بخوشی اجازت دے دی تھی۔ ربیکا نجانے کتنی شدت سے الیگزینڈر کے چیری کے باغات میں جانا چاہتی تھی کہ اس نے اسی دن

اپنی ساری پیکنگ بھی کر لی تھی اور شام میں وہ دونوں کو وقتی طور پر تنہا چھوڑ کر الیگزینڈر کے چیری کے باغات میں چلی گئی تھی۔

آنے والے دنوں میں موسم کی شدت میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ پہاڑوں پر برف باری کا آغاز ہو چکا تھا۔ چند ہی دنوں میں میدانی علاقے بھی برف کی سفیدی سے ڈھکنے والے تھے۔ لوگ سیر تفریح کے لیے گرم ممالک کے پلان بنانے لگے تھے۔ میران اور سبین کہیں جانے کی منصوبہ بندی نہ کر سکے، کیونکہ ابھی ان کے پاس پیسوں کی کمی تھی۔ دوسرا سبین کو اپنا نیا گھر ہی کسی جنت سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ اگرچہ ربیکا کے جانے کے بعد گھر خالی خالی ہو گیا تھا۔ میران صبح سے گیا شام کو گھر واپس آتا تھا۔ وہ پچھلی روٹین کی ہی طرح دو دو جابز کر رہا تھا، کیونکہ ابھی دونوں نے نئے گھر کا بہت سا قرض بھی اتارنا تھا۔ سبین نے میران کو مشورہ دیا تھا کہ ایسے حالات میں اسے بھی کوئی جاب کر لینی چاہیے۔ میران کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ سبین اسی دن سے اپنے لیے بھی کوئی جاب تلاش کرنے کے لیے سرگرداں ہو گئی تھی۔ اسے یہ سوچ ہی بہت خوش کن لگ رہی تھی کہ گھر کو چلانے کے لیے وہ میران کا ساتھ دے گی۔

یہ چھٹی کا دن تھا۔ باہر دھند اور برف دونوں ایک ساتھ اتر رہی تھیں۔ سردی کی شدید لہر شروع ہو چکی تھی۔ میران، سبین کے کہنے پر نیوز پیپر میں سے اس کے لیے کوئی مناسب جاب تلاش کر رہا تھا۔ جب سبین اس کے پاس آئی تھی۔ میران نے اسے کافی بنانے کو کہا تھا جسے اس نے اپنے نئے کچن میں بڑے شوق سے بنایا تھا۔ نئی چیزوں کو شوق ایک ماہ ہو جانے کے بعد بھی ابھی تک برقرار تھا۔

''اپنی نہیں بنائی......؟''

''اپنی بھی ہے......''

''کہاں......؟ یہ تو ایک کپ ہے......؟''

''یہ ایک مگ ہے مگ میں دو کپ کافی آتی ہے۔'' وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئی تھی۔

''ایک گھونٹ تم پیو اور ایک مجھے پلاؤ......'' میران نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''اتنی محبت مت کرو مجھ سے......میں کہیں کا نہیں رہوں گا۔ کام پر جانے کو دل نہیں کیا کرے گا میرا......اور میں کام پر نہ گیا تو کھائیں گے کہاں سے......ایک گھونٹ کافی سے تو پیٹ بھرنے سے رہا۔''

''تمھاری محبت میں مَیں ایک گھونٹ کافی پی کر بھی خوشی سے ساری زندگی بھوکی رہ سکتی ہوں۔ اور کوئی شکوہ بھی نہیں کروں گی۔'' اس نے بھرے ہوئے کپ میں سے ایک کپ کافی کا گھونٹ بھرا تھا۔

''تمھیں پتا ہے کہ اخبار میں کیا خبر آئی ہے۔ دانا کا ریپ کرنے پر جیڈن کو سزا ہو گئی ہے۔''

"ہاں......میں نے پڑھ لی ہے۔اس میں اتنا حیران ہونے والی کیا بات ہے؟"

"حیران ہونے والی بات ہے۔ میں جیڈن کو جانتا ہوں۔ ممی کی وجہ سے میں اسی کے پاس جاتا رہا ہوں۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا......"

"کیوں نہیں کر سکتا......؟" سبین کچھ نہ سمجھی۔

"کیونکہ......اسے لڑکیوں میں دلچسپی نہیں ہے......اسے تو......"

"اسے تو کیا......؟"

"کچھ نہیں......تم نہیں سمجھو گی......"

"تم بلاوجہ غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہو......ظاہری بات ہے کہ تمام کاروائی کے بعد ہی تو اسے سزا دی گئی ہے۔"

"پھر بھی میرا دل کہہ رہا ہے کہ ضرور اس میں کچھ گڑ بڑ ہے۔"

"نہیں......مجھے نہیں لگتا......میں تو خوش ہوں کہ دائنا کے مجرم کو سزا مل گئی۔"

ابھی وہ دونوں باتیں کر ہی رہے تھے جب سبین کے سیل فون کی بیل بج اٹھی تھی۔

"یہ کون ہے؟ رہنے دو، بجنے دو۔" میران نے اسے اٹھنے نہ دیا۔

"نہیں......دیکھنے دو......پاکستان سے بابا کی کال نہ ہو۔"

اس نے اٹھ کر دور پڑا سیل فون پکڑا تھا۔ پاکستان سے ہی کال تھی، لیکن بابا کی نہیں......ڈینی کی......

"یہ اب کیوں کال کر رہا ہے؟" اس نے خود کلامی کی تھی۔ اسکرین پر ڈینی کا نمبر دیکھ کر اس کا دل خود بخود ہی کوئی خطرے کا الارم دینے لگا تھا۔

"بولو ڈینی......؟"

"سبین! کہاں ہو تم اس وقت......؟" ڈینی کی آواز ایسی گھبراہٹ لیے ہوئے تھی جیسے کوئی کند چھری سے اسے ذبح کرنے جا رہا ہو۔

"کیوں......؟"

"جہاں بھی ہو......وہاں سے بھاگ نکلو......" ڈینی نے کہا۔ سبین کو یہ سادہ سی بات بھی سمجھ نہ آسکی۔

"کیا......؟" وہ سمجھی ڈینی نے شاید کسی اور کو کال کرنی تھی، غلطی سے اسے کر لی ہے۔

"اپنی اور میران کی زندگی چاہتی ہو تو جلد سے جلد اس گھر سے بھاگ جاؤ سبین......اب کی بار تو تمہارے پاس پانچ

منٹ کا وقت بھی نہیں ہے۔'' ڈینی چلایا تھا۔موبائل سین کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرا تھا۔وہ وہیں بت بن گئی تھی۔گینگ کی خاموشی کس طوفان کی صورت ظاہر ہونے جا رہی تھی۔اسے اندازہ ہی کہاں تھا۔

☆......☆......☆

اپنی چندھی چندھی آنکھوں کو مسلتا ہوا دن بیدار ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔رات کے سیاہ رنگ فنا ہوتے ہوتے جیسے بقا سے جا ملے تھے۔سفیدے کے درختوں پر سورج کی کرنیں بڑی آہستہ روی سے اتر رہی تھیں۔وہ لمبے، سیدھے درخت جو اندھیرے میں سرپٹ بھاگتے ہوئے جنوں کے مشابہہ لگ رہے تھے، اب صبح کی روشنی میں جب واضح ہوئے تو سبین کو لگا تھا جیسے کوہ قاف سے نکال کر واپس دنیا میں بھیج دی گئی ہو...... نجانے کتنے ''جنات'' کو وہ پیچھے چھوڑ آئی تھی۔آگے کیا تھا وہ نہیں جانتی تھی۔

وہ سفر تھا کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔سبین کو ایسے لگ رہا تھا جیسے وہ بچپن سے لے کر اب تک مسلسل سفر ہی سفر کیے جا رہی ہے۔اس نے زندگی بھر کہیں پڑاؤ ڈالا ہی نہیں ہے اور نہ ہی اسے ابھی تک منزل ملی ہے۔کوچ آرام دہ تھی، لیکن یہ اندر کی بے چینی تھی جس نے سبین کو بے چین کیا ہوا تھا۔کھڑکی سے سر ٹکائے وہ پتھر کی مورت بنی بیٹھی تھی۔باہر کے پرفضا مناظر اس کے اندر کی فضا کو پراگندہ کر رہے تھے۔اس کی سانس گھٹ رہی تھی۔

یک لخت کوچ نے بریک ماری...... سبین ہڑبڑا کر ایسے چونکی جیسے اس نے گولی چلنے کی آواز سن لی ہو۔

''کیا ہوا......؟'' پاس بیٹھے میران نے پیار سے پوچھا تھا۔جبکہ وہ جانتا تھا کہ سبین کو کیا ہوا ہے۔سبین ہونق بنی دائیں بائیں دیکھنے لگی تھی۔

''بس نے اسٹے کیا ہے۔کیا تم نیچے اترو گی؟'' جواباً اس نے ناں میں سر ہلایا تھا۔

''میں پانی کی بوتل بھر کر لاتا ہوں......'' میران کہہ کر باقی مسافروں کے ساتھ نیچے اتر گیا تھا۔سبین نے پھر سے بند کھڑکی کے شیشے پر سر ٹکا دیا تھا۔

پچھلے دو دنوں سے وہ دونوں مسلسل سفر کر رہے تھے۔ڈینی کی کال کے اگلے ہی منٹ وہ دونوں گھر سے باہر تھے۔میران نے گھر میں موجود ساری رقم پکڑ لی تھی اور سبین کے ہاتھ میں جتنے بھی کپڑے وغیرہ آئے تھے وہ اس نے ایک بیگ میں ڈال لیے تھے۔اب یہ تھوڑا سامان لے کر وہ نیو یارک سے میلوں دور جا رہے تھے۔اپنے نئے گھر سے میلوں دور...... اپنی زندگیوں کی حفاظت کے لیے...... دنیا سے الگ تھلگ...... ایک سنسان گوشے میں...... جہاں کوئی ڈان پیٹرن نہیں تھا۔کوئی گینگ نہیں تھا، کوئی ''ٹیم'' نہیں تھی۔اور نہ ہی کوئی فکر...... ڈینی نے اس کی مدد کی تھی۔اس نے اسے گیبریل کا پتا دیا تھا۔

''گیبریل میرا جاننے والا ہے۔تم دونوں وہاں محفوظ رہو گے۔''

سیین کو ڈینی پر اتنا ہی اعتبار تھا جتنا وہ اپنے بابا پر کر سکتی تھی۔ ڈینی نے ہر مشکل میں اس کا ساتھ دیا تھا۔ اسی لیے وہ سوچے بنا کہ ڈینی بھی اسی گینگ کا حصہ ہے، اس کے بتائے پتے پر جانے کے لیے تیار ہوگئی تھی۔ نجانے حالات اب کب ان کے لیے سازگار ہونے والے تھے۔ یہ مشکل کب ان کے سر سے ٹلنے والی تھی۔ سوچ سوچ کر وہ پاگل ہو رہی تھی۔ اس نے تو اپنے نئے گھر میں، اپنی ایک الگ جنت بسا بھی لی تھی، پھر یہ کن گناہوں کی سزا تھی کہ وہ جہنم میں دھکیلی جا رہی تھی۔

''اب یہ سب کیسے ٹھیک ہوگا میران......؟'' اس نے پاس بیٹھے میران سے پوچھا تھا، لیکن میران وہاں نہیں تھا۔ سیین نے گھبرا کر ساری بس میں نظریں دوڑائیں...... میران وہاں کہیں بھی نہیں تھا۔ پریشانی میں وہ بھی بس سے نیچے اتری تھی۔ میران اسے سامنے سے آتا ہوا نظر آیا تھا۔

''تم کہاں چلے گئے تھے میران......؟'' وہ اس کے گلے لگ کر رونے لگی تھی۔

''پانی لینے...... تمھیں بتایا تو تھا۔''

''نہیں...... تم نے تو مجھے نہیں بتایا۔''

میران حیران ہوتا اگر یہ پہلا واقعہ ہوتا...... پچھلے دو دنوں سے وہ عجیب و غریب ہو چکی تھی۔ سوتے میں اٹھ کر رونے لگتی تھی۔ میران کو اپنے پاس سے اٹھنے نہ دیتی تھی۔ اگر وہ کہیں دائیں بائیں ہوتا تو وہ کھڑے کھڑے ہی غش میں جانے لگتی تھی۔ دو دن سے وہ لوگ سفر میں تھے۔ یہ سفر رقبہ کا کم اور ذہنی آزمائش کا زیادہ تھا۔ جوں جوں سیین اپنے گھر سے دور جا رہی تھی اس کی عقل بجھ اس کا ساتھ چھوڑتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے سارے حواس جیسے اپنے گھر میں چھوڑ کر ہی باہر نکلی تھی۔

بوڑھے گیبریل کا گھر ''رباب'' کے کھیتوں میں واقع تھا۔ ارغوانی اور گہرے سبز رنگ کی ''رباب'' سے بھرے کھیتوں کے عین درمیان میں...... جہاں پہنچ کر سیین نے کھل کر سانس لیا تھا اور خود میں ایک عرصے کے بعد توانائی محسوس کی تھی۔ تین دن کے تھکا دینے والے، چوروں جیسے سفر کے بعد وہ لوگ وہاں پہنچے تھے۔ پچھلے تین دنوں سے وہ سانس بھی ڈر ڈر کر لے رہی تھی۔ جیسے اس کے تیز سانس لینے کی خبر بھی گروپ کو ہو جائے گی اور وہ اسے اور میران کو جان سے مار دیں گے۔ اسے اپنی کہاں پروا تھی۔ پروا تھی اپنی جان کی جان کی...... میران کی......

گیبریل نے انھیں ایسے پناہ دی تھی جیسے مرغی اپنے نوزائیدہ چوزوں کو اپنے پروں میں چھپا لیتی ہے۔ وہاں ویسے بھی دور دور تک آبادی کا نام و نشان نہیں تھا۔ بڑی سڑک سے کوئی گاڑی اس کے گھر تک آتی بھی تو پندرہ منٹ پہلے ہی نظر آ جاتی تھی اور ایسے میں گھبرانے والی کوئی بات نہیں تھی۔ پھر اس جگہ پر اتنی خاموشی تھی کہ گاڑی کا شور بھی دور سے ہی سنائی دے جاتا تھا۔

''رباب'' کے لیے موزوں ترین جگہ ان کے لیے بھی مفید ثابت ہوئی تھی۔ دن اور رات کے ہر ہر پہر میں وہ سب خرگوش کی طرح چونکتے رہتے تھے۔

گیبریل نے دونوں کو ایک الگ اور گھر کا خوب صورت ترین کمرہ دیا تھا۔

"یہ کمرہ میرا اور میری بیوی کا تھا۔ میری بیوی نے اسے بہت چاہت سے سجایا تھا۔ اب تم اسے استعمال کرو گے تو اس کی روح کو سکون ملے گا۔"

بوڑھے گیبریل کی اس نوازش کے بدلے میں دونوں کے پاس پھیکی مسکراہٹ کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ وہ دونوں اپنے گھر سے اپنا کسی بھی طرح کا اثاثہ لے کر باہر نہیں نکلے تھے۔ دونوں گیبریل اور اس کی بیوی کے کمرے میں رہنے لگے تھے۔ جہاں سین گیبریل کی مرحوم بیوی کی روح کو محسوس کرتے ہوئے ہر وقت ڈری سہمی رہتی تھی۔ میران اسے خود سے لپٹائے رکھتا تھا پھر بھی وہ ساری ساری رات خوف سے کانپتی رہتی تھی۔ میران بیک وقت دو دو چیزوں سے نبرد آزما تھا...... بے روزگاری سے اور سین کی نفسیاتی کیفیت سے......

"سین...... ! کیا ہو گیا ہے تمھیں......؟ کچھ نہیں ہو گا ہمیں...... خدا پر یقین رکھو......" میران کی باتوں اور دلاسوں کا اثر ہونے میں بڑے دن بیت گئے تھے۔ سین رفتہ رفتہ پھر سے سکون اور محبت محسوس کرنے لگی تھی جب ایک دن عجیب بات ہوئی تھی۔

"تم دونوں نیچے تہ خانے میں چلے جاؤ...... اور جب تک میں نہ کہوں باہر نہ آنا......" بوڑھے گیبریل نے بڑی سڑک پر تین سیاہ گاڑیوں کی اڑتی دھول کو دیکھتے ہوئے دونوں کو تہ خانے میں دھکیلا تھا۔

بڑے تختوں سے ڈھکے چوبی تہ خانے میں اتنی خاموشی تھی کہ باہر نیوکلیر بم بھی پھٹ جاتا تو شاید اندر آواز نہ آتی۔ سین نے میران کا ہاتھ اتنی مضبوطی سے تھام رکھا تھا کہ میران کے بازوؤں میں اس کے ناخن پیوست ہو گئے تھے۔ میران اس کے بالوں میں ہاتھ پھیر رہا تھا۔

"کچھ نہیں ہو گا سین...... میں تمھارے ساتھ ہوں اور خدا ہمارے ساتھ ہے۔"

اور وہ کیا کہتی کہ وہ بھی اس کے ساتھ ہے لیکن اس کے ساتھ بدقسمتی ہے۔

نجانے کتنے پہر گزر چکے تھے۔ بوڑھے گیبریل نے انھیں واپس اوپر آنے کے لیے نہ تو آواز دی تھی اور نہ ہی تختے ہٹائے تھے۔ تقریباً آٹھ گھنٹوں کے سخت اذیت ناک انتظار کے بعد میران نے ہمت کر کے تھوڑا سا تختہ ہٹایا تھا، اور پھر وہیں گرتے گرتے بچا تھا۔

بوڑھا گیبریل چوبی فرش پر اوندھا پڑا تھا اور اس کے سر سے خون نکل کر پورے فرش پر پھیل چکا تھا۔

بوڑھے گیبریل کو قتل کر دیا گیا تھا۔

☆......☆......☆

زندگی ایک ایسی سرنگ بن گئی تھی جس کا بس ایک ہی سرا تھا۔دوسری طرف سے سرنگ بند تھی۔آگے اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور پیچھے کے راستے وہ دونوں کھو چکے تھے۔تین ماہ ان دونوں نے کس طرح گزارے تھے یہ کچھ وہ ہی جانتے تھے۔ربیکا کو بہت مشکل سے خط لکھ دیا گیا تھا کہ وہ چیری کے باغات میں ہی رہے۔گھر جانے کی کوشش نہ کرے۔وہ اسے بھی نقصان پہنچا سکتے تھے۔وہاں سے عجیب خبر آئی تھی کہ ربیکا نام کی کوئی بھی عورت وہاں نہ تو رہ رہی ہے اور نہ وہاں آئی ہے۔ایسے مشکل حالات میں ربیکا کی طرف سے ملنے والی اس خبر نے دونوں کو مزید پریشان کر دیا تھا،لیکن اندر ہی اندر دونوں یہ بھی جانتے تھے کہ ربیکا جہاں بھی ہے اپنی مرضی سے ہے،اور اب جب بھی واپس آئے گی اپنی مرضی سے آئے گی۔

ان تین ماہ میں وہ تین مختلف لوگوں کے گھر رہے تھے۔ان تین لوگوں کے پاس سین کو ڈینی نے ہی بھیجا تھا،لیکن وہ ان دنوں اتنی بدقسمت واقع ہو رہی تھی کہ اپنے ساتھ ساتھ اس نے ان تین لوگوں کی زندگی بھی تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔

الزبتھ ایک ورکنگ لیڈی تھی۔اس کی بیٹی پریسٹن یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہی تھی اور وہاں ہی ہوسٹل میں رہتی تھی۔ بہت پہلے الزبتھ نے ''ٹیم'' کے لیے کام کیا تھا لیکن اب ایک عزت دار زندگی گزار رہی تھی۔اس نے سین اور میران کو بخوشی اپنے گھر میں رہنے کو جگہ دی تھی اور وہ ان دنوں کا ایسے خیال رکھ رہی تھی جیسے اپنی بیٹی اور اس کے شوہر کا رکھ رہی ہو......لیکن پھر ایک دن الزبتھ کو کال آئی کہ اس کی بیٹی کو پریسٹن یونیورسٹی سے اغوا کر لیا گیا ہے اور تاوان کی صورت میں الزبتھ کو میران اور سین کو ان تک پہنچانا ہوگا۔الزبتھ ایسی خود غرض تو نہیں تھی،لیکن قدرتی طور پر اسے اپنی بیٹی سے زیادہ سین سے پیار نہیں ہو سکتا تھا۔اس نے بہت چالاکی اور تھوڑی مکاری سے سین اور میران کو ایک کمرے میں بند کر کے دروازہ باہر سے لاک کر دیا تھا،اور ٹیم کو اطلاع کر دی تھی کہ وہ آ کر اپنا ''تاوان'' لے جائیں۔

سین اور میران کو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ سکتا تھا اگر ایک بار پھر سے بروقت ڈینی کی کال نہ آ جاتی۔

بند کمرے سے وہ دونوں کھڑکی توڑ کر باہر بھاگے تھے۔سین کو الزبتھ کی حرکت پر دکھ نہیں ہوا تھا۔اس کی جگہ وہ ہوتی تو وہ بھی یقیناً ایسا ہی کرتی......یا شاید اس سے بھی برا......

اس کے بعد وہ ایڈن کے پاس گئے تھے اور پھر کیلون کے پاس......گیبریل اور الزبتھ کی طرح ان دونوں نے بھی ''ٹیم'' کے لیے کام کیا تھا۔ڈینی انہیں جانتا تھا،وہ اپنے جاننے والوں کی منت سماجت کرتے ہوئے سین اور میران کو بچاتا پھر رہا تھا۔نجانے ڈینی کو سین سے کیا انسیت ہو چکی تھی کہ وہ خود کو اس کا گارجین سمجھے ہوئے تھا۔سین اس قدر تنگ حالات میں بھی ڈینی کی کوششوں کو سراہنا نہیں بھولی تھی۔لیکن ساری کوششیں رائیگاں گئی تھیں۔ایڈن اور کیلون کے گھروں میں بھی کم و بیش ایسے ہی واقعات ہوئے تھے،جو گیبریل اور الزبتھ کے گھروں میں ہو چکے تھے۔عین وقت پر وہ دونوں اپنے مددگاروں کی جانوں کو عذاب

میں ڈال کر خود وہاں سے فرار ہو جاتے تھے۔

سیبن سمجھ رہی تھی کہ وہ اپنی عقل اور ڈینی کی مدد کی وجہ سے گروپ سے بچ رہی ہے، ڈینی بھی یہ ہی سمجھ رہا تھا کہ وہ سیبن کی مدد کر رہا ہے۔ اپنی طرف سے اسے بچا رہا ہے۔ اسی کی وجہ سے سیبن ابھی تک موت سے محفوظ ہے لیکن دونوں ہی نہیں جانتے تھے کہ دونوں ہی ایک ''تیسرے ہاتھ'' میں کٹ پتلی بنے ہوئے تھے۔ وہ تیسرا ہاتھ دونوں کو بہت طریقے سے چلا رہا تھا۔ اسی نے ڈینی کو باری باری گیبریل، الزبتھ، ایڈن اور پھر کیلون کا نام بتایا تھا۔ پھر اسی نے چاروں کو باری باری مروا بھی دیا تھا۔ سیبن کو کوئی گزند پہنچائے بنا بھاگنے دینا بھی اسی کی پلاننگ کا حصہ تھا۔ وہ خود کو ظاہر کیے بنا بہت اچھے سے دونوں کے ساتھ کھیل کھیل رہا تھا۔ اور اس کی دونوں کو ہی خبر نہیں تھی، نہ سیبن کو اور نہ ہی ڈینی کو......

☆......☆......☆

''پسندیدہ خواب آنکھوں کے ہوں تو یہ سلاتے بہت ہیں اور زندگی کے ہوں تو یہ رلاتے بہت ہیں۔ انھیں موت جیسی نیند اور ماتم جیسی آہوں سے بہت پیار ہوتا ہے۔ نیند والے خواب، گھر کے آنگن میں کھلے ہوئے پھول کی مانند ہوتے ہیں، ان کی خوشبو اور ان کا وجود آپ کی دسترس میں ہوتا ہے اور زندگی والے خواب، ندی کے راج ہنس کی طرح ہوتے ہیں۔ جو خوش نما تو ہے، جسے تھامنے کو دل بھی کرتا ہے، لگتا ایسا ہی ہے کہ اس کا وجود اور اس کی پرواز آپ کی دسترس میں ہے، لیکن قریب جانے پر اس کے نوکیلے پنجے ہاتھوں میں چبھ جاتے ہیں۔ جو نیند والے خوابوں کے پھول کے کانٹوں سے زیادہ زہریلے اور خطرناک ہوتے ہیں۔

راج ہنس جتنا مرضی بھلا مانس ہو، بھگت ہو، درویش پرندہ گردانا جاتا ہو، لیکن آسانی سے قابو میں نہیں آتا...... خواب سادہ ہوں، نیک ہوں، مجرمانہ ہوں، ان کی تکمیل پرواز اتنی جلدی مکمل نہیں ہوتی...... اور پھر میرے خواب تو رہے بھی اس قدر عجیب و غریب ہیں کہ مجھے لگتا ہے کہ میں نے ان کی تعبیر کو پورا کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ شیر سے پنجا آزمائی کی ہے۔''

☆......☆......☆

سیبن بھاگتے بھاگتے اس قدر تھک چکی تھی کہ اب اس میں اتنی ہمت بھی نہیں رہی تھی کہ وہ اپنے پاؤں کے چھالوں پر مرہم ہی رکھ سکتی...... دونوں کے پاس جتنے پیسے تھے سب ختم ہو چکے تھے، جتنے کپڑے تھے وہ پہن پہن کر اپنی اصلیت کھو چکے تھے۔ میران سیبن کو تو کچھ نہیں کہہ رہا تھا لیکن اس کی ذہنی حالت کیا تھی وہ اس کی ظاہری حالت سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ اس کا ہیئر کٹ خراب ہو چکا تھا۔ کافی دنوں سے اس نے اسے ترشوایا نہیں تھا۔ اس کی شیو بھی بے ترتیبی سے بڑھی ہوئی تھی۔ جتنے مشکل دن وہ کاٹ رہے تھے ایسے میں ان چیزوں کی طرف دھیان جاتا بھی تھا تو ٹال دیا جاتا تھا۔

سیبن گھٹ گھٹ کر رو رہی تھی۔ کیا خدا نے اس کی توبہ قبول نہیں کی تھی جو وہ اس مشکل میں گرفتار ہو گئی تھی؟ اسے اماں کی

وہ ساری دعائیں یاد آ رہی تھیں جو اماں نے سوتے جاگتے میں اس کی حفاظت اور خوشیوں کے لیے کی تھیں۔ کیا خدا نے کسی ایک دعا کو بھی قبول نہیں کیا تھا؟ بابا ہر جمعے کو عبادت سے واپسی پر سبین کے چہرے پر پھونکیں مارا کرتے تھے، کیا وہ جمعے کی برکت سے خالی تھیں یا وہ پھونکیں زہریلی تھیں۔ رو رو کر وہ ادھ موئی ہو چکی تھی۔ میران اسے چپ کروا کروا کر تھک چکا تھا۔ وہ اسے سنبھالتے سنبھالتے اس قدر تھک چکا تھا کہ اب بیزار ہونے لگا تھا اور سبین خود کو میران کی مشکلات کا مجرم سمجھتے ہوئے اب دیوانی ہونے لگی تھی۔

''سبین! میں نے تم سے کہا تھا کہ اپنے دس چکر پورے کر لو، لیکن تم نے میری بات مانی ہی نہیں......'' ڈینی الگ اسے موردِ الزام دے رہا تھا۔ سبین کے پاس جواب دینے کو کوئی لفظ نہیں تھا۔ وہ اسے کیسے بتاتی کہ وہ خدا کے قرب کی متلاشی ہو چکی ہے۔ اب اسے کسی معاہدے کا پاس نہیں رہا تھا۔

''ہم ایک چھوٹے سے ہٹ میں رہ رہے ہیں ڈینی...... ! یہاں نہ کوئی بستر ہے اور نہ ایسا کہ جس کے بل بوتے پر میں کہہ سکوں کہ یہاں گھر جیسا ماحول ہے اور میں سکون میں ہوں۔ در حقیقت...... ہم بے حد بے سکونی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ہم دونوں ہی گھر کو ترس چکے ہیں۔'' سبین تقریباً ڈینی کے آگے رو دی تھی۔

''ایسے میں تمھارے پاس بس ایک ہی راستہ باقی بچتا ہے سبین......''

''میں وہ کام پھر سے نہیں کروں گی ڈینی......''

''میں وہ بات نہیں کر رہا......''

''پھر......؟''

''امریکا میں ایک ہی شخص ہے جو تمھیں ڈان اور گروپ سے بچا سکتا ہے۔ وہ ہی اب تمھیں اپنی پناہ میں لے کر تمھاری زندگی کو محفوظ بنا سکتا ہے۔ تم اس کے پاس چلی جاؤ۔''

''کون ہے وہ......؟''

''ایڈم...... ایڈم راہل......''

اور ڈینی کہاں جانتا تھا کہ اس کا سبین کے سامنے ایڈم راہل کا نام لینا بھی ''تیسرے ہاتھ'' کی پلاننگ کا حصہ تھا۔ ڈینی کو یہ نام اسی لیے تو بتایا گیا تھا کہ اس سے پہلے کہ ''ڈان پیٹرسن'' سبین کو حاصل کرے، سبین خود ہی ''ایڈم راہل'' تک پہنچ جائے۔

ڈان پیٹرسن اور ایڈم راہل کو تباہ کرنے کی شطرنج کے خانوں میں ''پیادے'' اب کی بار بڑے آرام آرام سے آگے بڑھ رہے تھے۔

☆......☆......☆

''کچھ پتا چلا اس لڑکی کا......؟''

پیٹرسن نے جیفرسن سے پوچھا تھا۔ جیفرسن خاموش کھڑا رہا تھا۔ پچھلے کئی ماہ سے اس سوال کے جواب پر اس کے پاس بس ایک ہی چیز تھی...... ''خاموشی......''

''بولو جیفی......! تم نے تو کہا تھا کہ آج ہر صورت وہ یہاں ہوگی......''

''پیٹی......! وہ...... نجانے کس نے اسے پناہ دی ہوئی ہے۔ ہمارے آدمی تو اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے ہیں۔ جہاں جہاں سے اطلاع ملی ہمارے آدمی وہاں گئے۔ پہلے گیبریل کے پاس، پھر الزبتھ، ایڈن اور پھر کیلون کے پاس...... لیکن اس لڑکی کا کچھ پتا نہیں چل سکا۔ ہمارے آدمیوں کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی وہ وہاں سے بھاگ نکلتی تھی۔ ایسے جیسے اسے خود سے الہام ہو جاتا تھا کہ ہم اس تک پہنچنے والے ہیں۔''

''یہ الہام نہیں ہے۔ ضرور کوئی ملا ہوا ہے۔ ضرور کوئی اس کی مدد کر رہا ہے۔''

''کوئی مدد نہیں کر رہا پیٹی...... تم اتنا منفی مت سوچو...... ''جیفرسن نے جلدی سے کہا تھا۔

''پھر وہ لڑکی کیسے اچانک سے غائب ہو جاتی ہے۔ ہمارے گینگ کے دس ہزار آدمیوں کو وہ ایک اکیلی لڑکی جل دے رہی ہے۔ اس کے ساتھ کوئی ہوتا تو میں تمھاری بات مانتا بھی...... لیکن...... اکیلے انسان کی اتنی ہمت...... یہ ناممکن ہے۔''

''موت کے خوف نے اس میں یہ ہمت پیدا کی ہے پیٹی......''

''اسے مارنا چاہتا ہی کون ہے؟'' اس نے بے اختیار ہی مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

''یہ بات تو اسے تب ہی سمجھائی جا سکتی ہے ناں...... جب وہ ملے......''

''تو اس سے ملو...... ڈھونڈ و اسے...... میں مزید انتظار نہیں کر سکتا...... اور اگر نہیں ہو پا رہا تم سے یہ کام تو بتاؤ مجھے...... میرے خیال سے مارک اس کام کو بہت اچھے سے ہینڈل کر لے گا۔'' پیٹرسن نے براہ راست جیفرسن کی بے عزتی کی تھی۔ اس کے سامنے مارک کا نام لیا تھا۔ جبکہ وہ جانتا بھی تھا کہ جیفرسن، مارک سے چڑتا ہے۔

''مجھے بس دو دن اور دو پیٹی......''

پیٹرسن نے ہلکے سے سر ہلا کر سگار کو سلگایا تھا۔

''ایسا کیا ہے اس لڑکی میں...... جو تم اس کے لیے اس قدر بے چین ہو گئے ہو......'' جیفرسن اس کی بے چینی کی حد کو ماپنا چاہ رہا تھا۔ اس کی بے قراری کو پرکھنا چاہتا تھا۔ پیٹرسن نے سگار کے لمبے لمبے کش لیے تھے۔

''گرینڈ فادر نے ایک بار کہا تھا کہ جو چیز تمھیں کمزور کرے اسے اپنی طاقت بنا لینا چاہیے۔ میں جانتا ہوں کہ بین کی وجہ

سے میں پچھلے کئی ہفتوں سے کام پر توجہ نہیں دے پا رہا...... اسی لیے میرے مطالبے کی شدت بڑھتی جا رہی ہے۔ میں اپنی کمزوری کو اپنی طاقت بنانا چاہتا ہوں۔"

"سر! آفس سے فون آیا ہے۔ جان کہہ رہا ہے کہ ایک لڑکی فوری طور پر آپ سے ملنا چاہتی ہے۔" ایڈم کے خاص ملازم جیمز نے کمرے میں آ کر کہا تھا۔

"میں اس وقت کسی سے ملنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔" پیٹرسن نے دو ٹوک انکار کر دیا تھا۔

"سر......! جان نے بھی پہلے اسے منع ہی کیا تھا۔ لیکن بقول اس کے وہ لڑکی بہت رو رہی ہے اور کہہ رہی ہے کہ اس کا ایڈم راحل سے ملنا بے حد ضروری ہے۔"

نجانے اس پیغام میں ایسا کیا تھا کہ پیٹرسن سمیت جیفرسن کے بھی کان کھڑے ہوئے تھے۔

"کیا نام بتایا اس نے اپنا......؟" پیٹرسن کی بجائے جیفرسن نے پوچھا تھا۔

"سبین......" جیمز نے بتایا تھا اور پیٹرسن کا کش درمیان میں ہی رک گیا تھا۔ وہ لڑکی جو پچھلے تین مہینوں سے ڈان پیٹرسن سے چھپتی پھر رہی تھی، خود بخود ایڈم راحل کی گود میں آ گری تھی۔

"تمھیں گرینڈ فادر کی کہانی پر نہیں چلنا پیٹی...... تمھیں اپنی کہانی خود بنانی پڑے گی۔ وہ لڑکی ڈان پیٹرسن سے نہیں، ایڈم راحل سے ملنے آئی ہے۔" جیفرسن نے خوش ہو کر کہا تھا۔

"ہاں...... میں سمجھ گیا۔"

"اس نئی کہانی میں، مَیں تمھارا پورا پورا ساتھ دوں گا پیٹی...... پورا پورا......" جیفرسن نے خلاؤں میں دیکھتے ہوئے خود سے کہا تھا۔

☆......☆......☆

چار ماہ کی سخت اذیت کے بعد وہ ایک بار پھر سے اپنے ڈریم لینڈ میں واپس آ گئے تھے۔ اتنا لمبا عرصہ در بدر کی خاک چھاننے کے بعد واپس گھر آنا ایسے ہی تھا جیسے بنجر زمین پر پھولوں کا اُگ جانا......

سبین کو تو لگنے لگا تھا کہ اب وہ دوبارہ اپنے اس گھر کی شکل دیکھ ہی نہیں سکے گی جسے اس نے اپنے ہاتھوں سے سجایا تھا، لیکن شکر خدا کا کہ ایڈم راحل کی وجہ سے یہ ممکن ہو گیا تھا۔ ایڈم راحل نے سبین کی حفاظت کے لیے اپنے دو آدمی بھی دیے تھے۔ جو ہر دم ان کے گھر کے باہر کھڑے رہتے تھے۔ سبین اب قدرے سکون محسوس کر رہی تھی۔

"قریب سے دیکھنے میں کیسے ہیں سر ایڈم......؟" واش روم سے نکلتے ہوئے میران نے پوچھا تھا۔ ایک عرصے بعد وہ

بھی اپنی جون میں واپس آیا تھا۔

”فرشتے کا انسانی روپ......“ وہ اسے یاد کرتے ہوئے بولی تھی۔

”وہ اس قدر حسین ہیں میران کہ ان کے سامنے باقی سب بدصورت لگنے لگتے ہیں۔ وہ ایسے پاکیزہ ہیں کہ اس کے مقابلے میں سب کا وجود ناپاک لگنے لگتا ہے۔ مجھے ہمیشہ سے کسی ولی کو دیکھنے کی آرزو رہی ہے، اور سر ایڈم کو دیکھنے کے بعد وہ آرزو اب تشنہ نہیں ہے۔ کیا کوئی اس قدر صاف دل بھی ہو سکتا ہے، مجھے تو وہ، وہ درویش لگے جو سماع سے نکل کر بھی اپنی ذات کے سماع سے نہیں نکل سکتے...... میں نے وہاں آفس میں ایک بہت بڑے سائز کی تصویر دیکھی تھی جس میں ایڈم راہل درویش چکر میں حال کر رہے تھے۔ یقین کرو، وہ ان سب سے الگ تھے۔ ان کے دل کا تقدس ان کی ذات پر چھایا ہوا تھا۔ ان کی سادہ مزاجی، ان کی شریف النفسی ان کے وجود میں ایسے رچی ہوئی تھی کہ دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ یہ مجسمہ مائیکل اینجلو کے مرنے کے بعد اس کی روح نے بنایا ہو...... تمھیں پتا ہے میران...... وہ میرے آنسو ایسے صاف کر رہے تھے جیسے یہ ان کے دل پر گر رہے ہوں...... انھوں نے مجھے خود سے لگا کر چپ کروایا...... اور مجھے مکمل یقین دہانی کروائی کہ اب ان کا ہاتھ میرے سر پر ہے۔ اب گینگ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔“

”تمھیں لگتا ہے کہ اب ہماری پریشانیاں ختم ہو گئی ہیں بین......؟“

”ہاں...... انھوں نے خدا کی قسم کھا کر کہا کہ وہ مجھے کوئی گزند نہیں پہنچنے دیں گے۔ مجھ سے پہلے گینگ کو ان پر ہاتھ ڈالنا پڑے گا۔“

”یہ تو ان کی مہربانی ہے۔ ہم تو ان کے قرض دار ہو چکے ہیں۔“

”ہاں میران...... یہ ہماری کوئی نیکی تھی جو اللہ نے ہمیں ایڈم راہل سے ملوا دیا...... ورنہ...... ورنہ...... نجانے ہمارا کیا بنتا......“

”اوہ خدایا...... تیرا شکر......“

”مجھے یقین نہیں آرہا کہ ہم آزاد ہو گئے ہیں میران...... یہ خوف کی زندگی...... اُف...... یہ تو جیل کی زندگی سے بھی بری تھی۔“

”بہت برے دن تھے لیکن ابھی ایک پریشانی قائم ہے بین...... ممی کی گمشدگی......“

”ممی نے خود کو چھپا لیا ہے میران...... وہ جب عیسیٰ کے نام کی تسبیح کرتے کرتے تھک جائیں گی تو خود ہی آجائیں گی۔ تم پریشان مت ہو...... اب میں سب سمجھ گئی ہوں...... انھیں ہماری شادی کی بھی اسی لیے جلدی تھی تاکہ وہ تمھاری ذمہ داری کسی اور کو سونپ جائیں...... وہ جلد ہی واپس آجائیں گی اور اس بار مکمل صحت یاب ہو کر آئیں گی۔“

”خدا کرے......!“

دونوں باتیں کر رہے تھے جب دروازے کی گھنٹی بجی تھی۔

"تم بیٹھو میں جاتی ہوں......" وہ باہر آئی تھی، دروازے کی خوردبین سے اس نے دیکھا تو اسے باہر پھول نظر آئے تھے۔ گہرے سرخ پھول...... بے انتہا خوبصورت اور تازہ...... دروازہ کھول کر انھیں ریسیو کرنے کی بجائے وہ بھاگتی ہوئی پھر سے اندر آئی تھی۔

"میران...... اتم نے میرے لیے پھول کوریئر کروائے ہیں؟" وہ چلائی تھی۔

"نہیں تو......" وہ اس سارے معاملے سے یکسر انجان تھا۔

"جھوٹ مت بولو...... باہر ایک پھول والا لڑکا کھڑا ہے۔"

"ارے میری جان...... دروازہ تو کھولو...... شاید وہ غلط پتے پر آ گیا ہو......"

"ہائے اللہ...... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں......" اس کا منہ اتر گیا۔

"ویسے تم کروا دیتے تو مجھے خوشی ہوتی......"

بیل پھر سے بجی تھی۔

"دروازہ کھولو...... کہیں پھول مرجھا نہ جائیں...... اور وہ اپنے اصل مالک کے بھی کام کے نہ رہیں......"

وہ پھر سے باہر آئی تھی اور اس نے دروازہ کھول دیا تھا۔

"مس سبین......؟" استفسار سے پوچھا گیا تھا۔

ہائے اللہ...... اسی کے لیے تھے اور وہ کوئی کوریئر والا نہیں تھا، سیاہ کار سے اترتا، سیاہ سوٹ میں ملبوس وہ تو کوئی جینٹل مین تھا۔

"ہاں...... ہاں...... لاؤ۔" اس نے بڑی جلدی کی تھی پھولوں کو پکڑنے میں...... اور تب ہی پھولوں میں چھپا ہوا ایک کانٹا اسے چبھ گیا تھا۔ چبھن سے اس کے منہ سے ایک آہ نکلی تھی اور کانٹے کی تیز نوک سے اس کی انگلی سے تیزی سے خون جاری ہو گیا تھا۔

"اوہ...... سوری مس سبین......! پھولوں کے کانٹے اتار کر انھیں پیک کیا جاتا ہے۔ یہ کانٹا نجانے کیسے رہ گیا۔ میں بے حد معذرت خواہ ہوں۔"

وہ اپنی انگلی کو دیکھ رہی تھی جہاں سے خون ایسے جاری تھا جیسے کوئی چھوٹا سا نل کھل گیا ہو...... یہ اچھا شگون نہیں تھا۔ اس کی ساری خوشی رخصت ہو گئی تھی۔ اب وہ بدحواسی سے جینٹل مین کو دیکھ رہی تھی۔ خون فرش پر گرتا جا رہا تھا...... ٹپ...... ٹپ...... ٹپ...... اور ایک دھار بناتا جا رہا تھا۔

''یہ کس نے بھیجے ہیں؟''اس نے پوچھا۔

اس کی آواز میں لرزش تھی۔ان پھولوں سے اسے کافور کی بو آئی تھی۔یہ برے شگون سے بھی بڑھ کر قبیح اندیشہ تھا۔

''پھولوں کے ساتھ کارڈ ہے آپ پڑھ لیجیے اور پارٹی کا انویٹیشن بھی ہے۔''

''لیکن انھیں بھیجنے والا کون ہے؟''

''سر ایڈم راحل......''

سین نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''کیا آپ انھیں نہیں جانتی ہیں......؟''

''جانتی ہوں......کل شام ہی میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی ہے لیکن......میں ان پھولوں کی وجہ نہیں جان پا رہی......''

''یہ ان کا اسٹائل ہے۔ایڈم ایک سماجی شخصیت ہیں۔آپ کو ان سے مل کر یقیناً اچھا لگا ہوگا۔وہ اپنے قریبی لوگوں کو ایسے ہی خوش کرتے رہتے ہیں۔اس پارٹی میں آپ کو خاص طور پر شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔''

''او کے......میں انفارم کر دوں گی کہ مجھے پارٹی میں آنا ہے کہ نہیں......''

پھول......کارڈ......اور زخمی انگلی لے کر وہ اندر آئی تھی۔

''کون تھا......؟''

''ٹھہرو میں پہلے ذرا اس پر بینڈ یج لگا لوں......''پھول ایک طرف رکھ کر وہ دراز کھولنے لگی تھی۔

''اوہ......کیا ہوا مائی ڈیئر......؟''میران اس کے قریب آیا تھا۔سین نے دراز میں سے بینڈ یج نکال لی تھی جسے میران نے اس کی انگلی پر لپیٹ دیا تھا۔

''اب ٹھیک ہے......؟''

''ہاں......''وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرائی تھی۔

''اب بتاؤ یہ پھول کس نے بھیجے ہیں؟''وہ غصے سے پوچھنے لگا۔عارضی غصے سے......جیسے اسے سین پر شک ہو......

''زیادہ فلمی ہونے کی ضرورت نہیں ہے......ایڈم راحل نے بھیجے ہیں۔''اس نے ساری بات بتا دی۔

''میرا وہاں جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے میران......!میں اعصابی طور پر بہت تھکی ہوئی ہوں۔ایڈم راحل کی اس مہربانی پر میں ان سے فون پر معذرت کر لوں گی۔''

''لیکن یہ ٹھیک نہیں ہے سین......ایڈم راحل ہمارے لیے بہت مددگار ثابت ہوئے ہیں۔تمھیں تو وہاں ضرور جانا چاہیے۔''

''لیکن میں تمھارے بنا کہیں نہیں جا سکتی میران......''

سین، میران کے ساتھ بھی پارٹی میں نہیں جا سکتی تھی کیونکہ اس نے میران کو اس سارے معاملے سے دور رکھا ہوا تھا۔ ڈینی نے ہی اسے ایسا کرنے کو کہا تھا کہ اگر اسے میران کی اتنی ہی پرواہ ہے تو اب وہ سب خود ہینڈل کرے۔ کسی کے سامنے میران کا نام بھی مت لے۔ سب کو ایسے ہی ظاہر کروائے جیسے وہ امریکا میں اکیلی رہ رہی ہے۔ جب تک مکمل تسلی نہیں ہو جاتی...... اسی لیے سین نے ایڈم راہل کے سامنے بھی میران کا نام نہیں لیا تھا۔

''اب میں تم تک کوئی مشکل نہیں آنے دوں گی میران...... سب کچھ خود فیس کروں گی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن تم پارٹی میں تو جاؤ...... ایڈم راہل کی اتنی مدد کے بعد تمھاری ایسی بے رخی مناسب عمل نہیں ہوگا۔ اب چلی جاؤ...... پھر نہ جانا...... اور تمھیں کون سا ملک سے باہر جانا ہے...... یہ مقامی ہوٹل ہی تو ہے۔''

''ٹھیک ہے میں فون کر کے کہہ دوں گی کہ میں آجاؤں گی۔''

تھوڑی دیر بعد ہی اس نے فون کر کے کہہ دیا تھا۔

''آپ کو لینے ایڈم کی پرسنل گاڑی آئے گی۔'' آگے سے کہا گیا تھا۔ سین اتنی عزت افزائی پر حیران رہ گئی تھی۔

☆......☆......☆

سرمئی رنگوں والی رات دھرتی پر چھا رہی تھی۔ اس رات کے انگ انگ میں شوخیاں ہی شوخیاں تھیں جیسے کوئی اندھیرے سے بھرا دن طلوع ہو گیا ہو...... یا جیسے سورج نے ضیا ریزی سے اکتا کر سیاہ ریزی شروع کر دی ہو......

میران کے کہنے پر اس نے ایک جامنی رنگ کا فراک زیب تن کیا تھا۔ جو دامن سے تو کافی گہرے رنگ کا تھا، لیکن کمر سے ہوتا ہوا اوپر سینے اور بازوؤں سے ہلکے رنگوں میں ڈھل جاتا تھا۔ پاؤں میں اس نے قدرے اونچی ہیل کے جوتے پہنے تھے اور ہلکا سا میک اپ اپنے چہرے پر اس طرح اپلائی کیا تھا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ بہت زیادہ تیار اور پارٹی کے لیے پرجوش نظر آنے لگی تھی۔

آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے اسے جیسے برسوں کے بعد اپنا آپ پیارا لگا تھا۔ اس میں وہ معصومیت پھر سے لوٹ آئی تھی۔ جس سے وہ بنی تھی۔ میران کی محبت نے اسے پھر سے پاک وصاف کر دیا تھا۔ سالوں کی تھکن اس کے چہرے سے رخصت ہو چکی تھی۔

میران نے اسے اس ڈریس سے میل کھاتے جامنی گل لالہ کے تازہ پھولوں کا گلدستہ لا دیا تھا، جو نایاب تھا اور مہنگا بھی کہ وہ اتنے بڑے آدمی سے ملنے جا رہی ہے، جوان کا مددگار بھی رہا تھا، اس لیے وہ خالی ہاتھ نہ جائے۔ سین نے اس کی بات مان لی تھی۔ اب وہی پھول لیے وہ ہال کے گیٹ پر کھڑی تھی اور سوچ رہی تھی کہ اندر کیسے جائے۔ کیونکہ ہال کے باہر سے ہی اس کے

اندر کی شان وشوکت عیاں تھی۔ اسے اندر جانے میں گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ پھر ہمیشہ کی طرح قسمت ہی اس پر مہربان ہوئی تھی۔ انتظامیہ سے ایک آدمی اس کی طرف بڑھا تھا۔

''مس سبین......؟'' اس نے تصدیق چاہی تھی۔

''جی......!''

''اندر آجایئے......''

پھول پکڑے وہ اس کی تقلید میں اندر داخل ہوئی تھی۔

یہ ایک سماجی قسم کی پارٹی تھی جسے امریکا میں رہنے والے غیر ملکیوں کے تحفظ کے لیے آرگنائز کیا گیا تھا۔ ایڈم راہل کچھ لوگوں کے ساتھ بات چیت کر رہا تھا۔ لوگ جو اس کی دل سے عزت کرتے تھے وہ اس عزت افزائی پر ان کے آگے عجز سے بچھا جا رہا تھا۔ ہالی وڈ فلموں کا ہیرو...... جو اتنا کم گو لگتا تھا کہ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے اس نے زندگی بھر ضروری گفتگو بھی نہیں کی ہے۔ اس کی جلد کا روم روم خاموش اور خوب صورت تھا، اور یہ ہی اس کی خاصیت تھی۔ ڈان کے روپ میں وہ جس قدر غصیلا لگتا تھا، ایڈم کا بہروپ بھرتے ہی وہ لباس کے ساتھ ساتھ اپنے انداز واطوار بھی بدل لیا کرتا تھا

بات چیت کے دوران ایڈم کی نظریں ہال کے مرکزی دروازے پر ہی لگی ہوئی تھیں۔ اسے جس کی آمد کا انتظار تھا ان پلوں نے اس کے دل کی دھڑکنوں کو پہلے سے ہی بہت بڑھا رکھا تھا۔ اسے بتا دیا گیا تھا کہ وہ آرہی ہے۔ کب آرہی ہے یہ نہیں بتایا گیا تھا۔ کس سیکنڈ میں اس کی آمد ہال کے اندر ہوگی وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا۔ بظاہر شانت لیکن اندر کہیں ایک طوفان کو دبائے وہ ایک ایک کی باتوں کو دلچسپی سے سنتا ہوا صرف اپنے دل کی پکار کو سن رہا تھا۔ جو سبین کہہ رہی تھی۔ اس سے پہلی ملاقات بھی کافی دلچسپ رہی تھی۔ روتے ہوئے وہ اسے اپنی ساری مجبوریاں بتا رہی تھی اور ایڈم کے سامنے پیٹرسن کے خلاف بول رہی تھی۔ ایڈم سے اپنی مسکراہٹ پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ جیسے اس کے ایک کندھے پر سر رکھے دوسرے کندھے کی برائیاں کر رہی تھی۔ وہ روتی ہوئی ایسی دلکش تھی تو دلکشی میں کیا غضب ڈھاتی ہوگی، یہ ہی دیکھنے کے لیے ایڈم نے اگلے ہی دن اس پارٹی کو آرگنائز کروایا تھا۔

ایڈم اپنی زندگی کے پچیس سال متزلزل نہیں ہوا تھا۔ اس نے کمال مہارت سے ایڈم اور پیٹرسن کا کھیل کھیلا تھا لیکن اب اس سے محبت اور عجز، جان کاری اور غفلت کا کھیل نہیں کھیلا جا رہا تھا۔ وہ بار بار ڈگمگا رہا تھا۔

''ہم کہہ رہے تھے کہ اگر ہم ایشیاء کے غریب ممالک میں صرف پینے کے صاف پانی کا مسئلہ......''

''ایک منٹ......'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے بات کرنے والے کو روکا تھا۔

بار بار ہال کے مرکزی دروازے پر اٹھتی اس کی نظر ایک جھٹکے سے جامد ہوئی تھی۔ سرخ کارپٹ کے فرش پر احتیاط سے وہ

اپنی سیاہ اونچی ہیل ٹکاتی آگے بڑھ رہی تھی۔ باہر کے سرد موسم کی کپکپی اس کے جسم میں ہی قید تھی۔ اس سمیت اس کا جامنی فراک بھی کپکپا رہا تھا۔ اس کے فراک کے دامن کی کترنوں سے اس کی گوری پنڈلیاں جھلک رہی تھیں۔ ایک جامنی سمندر کو اس نے اپنے اردگرد پھیلا کر جیسے کمر سے کس کر باندھ رکھا تھا۔ نیچے سے فراک جتنی کھلی تھی اوپر سے اتنی ہی چست تھی۔ کندھوں سے ذرا سا آگے اس کے بازو عریاں تھے۔ اس نے بالوں کو گردن سے اٹھا کر سر کے اوپر کھلے ہوئے پھول کی طرز پر بنے جوڑے کی شکل دے رکھی تھی۔ جس سے اس کی صراحی دار گردن اور بھی نمایاں ہو چکی تھی۔ کانوں میں لٹکتے آویزے جھول رہے تھے۔ سر کے اطراف سے نکلتی دو باریک لٹیں ان آویزوں کو بار بار چھونے کی کوشش کر رہی تھیں۔ چونکہ وہ تھوڑی متذبذب اور پریشان تھی، اس جگہ سے غیر مانوس بھی...... اس لیے اس کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے جسے دیکھ کر ایڈم کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی تھی۔ وہ اس ہونٹ کاٹنے کا مطلب بخوبی سمجھتا تھا۔ اسے قیافہ شناسی میں مہارت تھی۔

''خوش آمدید...... پیاری سبین......'' اطراف سے نکل کر وہ اس کے سامنے آیا تھا۔ تبھی سبین چونکی تھی۔

''شکریہ......!'' سنبھل کر اس نے کہا تھا۔ پھر جامنی گل لالہ کے نایاب پھولوں کا گلدستہ ایڈم راحل کی طرف بڑھایا تھا۔

''یہ آپ کے لیے...... سر ایڈم......!''

''شکریہ...... لیکن صرف ایڈم...... سر نہیں......'' اس نے سرگوشی کرنے کے سے انداز میں کہا تھا۔ سبین مسکرائی تھی۔

ایڈم نے کریمی رنگ کا پینٹ کوٹ پہن رکھا تھا۔ سفید شرٹ پر گولڈن کف لنک، اور گولڈ کے ہی بٹن...... وہ سنہری ڈبیا میں جگمگ کرتا ہوا ہیرا لگ رہا تھا۔ سبین بے اختیار ہی اسے چند لمحے بنا پلکیں جھپکے دیکھتی رہی تھی۔ اسے قریب سے دیکھنے کا تجربہ بہت خوشگوار تھا۔ اس کی خوبصورتی میں جو چیز سب سے بڑھ کر تھی وہ اس کی سفید جلد پر سونے کی تاروں جیسی پلکیں اور بھنویں تھیں۔ سبین ان سے متاثر ہوئی تھی۔ اگر لڑکیاں اس سے شادی کے خواب دیکھتی تھیں تو یہ کچھ ایسا بھی انوکھا نہیں تھا۔ یہ شخص بچپن، جوانی، بڑھاپے، کسی بھی عمر میں تباہ کن سے کم نہیں لگے گا۔ اسے دیکھتے ہوئے وہ سوچنے لگی تھی۔

''میں اتنی عزت افزائی پر آپ کی شکر گزار ہوں۔''

''میں تمھاری آمد پر تمھارا......'' اس نے خمار آلود لہجے میں کہا۔ بہت آسانی سے وہ آپ سے تم پر آ گیا تھا۔ پھر اس نے پاس سے گزرتے ایک ویٹر کو روک لیا، اس کے تھال میں سے بیئر کے دو گلاس اٹھائے اور ویٹر کو کان میں کچھ ہدایات بھی دیں۔ جس کو سبین نہیں سن سکی تھی، لیکن چند لمحوں بعد بخوبی سمجھ گئی تھی۔

ویٹر حکم کی تعمیل میں سر ہلاتا چلا گیا تھا۔ ایڈم نے ایک گلاس سبین کی طرف بڑھایا تھا۔ سبین نے وہ تھام لیا تھا۔ پھر ایڈم نے اس کے گلاس سے اپنا گلاس ٹکرایا تھا۔

''یہ تمھاری آمد کے نام......'' اور دونوں نے ایک ایک گھونٹ بھرا تھا۔

''یہ تمھارے خوب صورت سراپے کے نام......'' اس نے پھر سے اپنے گلاس کو سبین کے گلاس سے ٹکرایا تھا۔ سبین مسکرائی تھی۔

''اور یہ تمھارے ہونٹوں کے نام......'' اس بار سبین کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ ایڈم کی حس مزاح نے اسے متاثر کیا تھا۔ بہت کم دورانیہ میں ہی وہ اس کے ساتھ بے تکلف ہو گیا تھا اور اس نے اسے بھی نارمل کر دیا تھا۔ وہ جو سہمی سہمی سی گھبراہٹ کا شکار تھی اب پوری طرح سے نارمل ہو چکی تھی۔ پھر سبین نے اپنے گلاس کو اس کے گلاس سے ٹکرا کر ایڈم کو چونکایا تھا۔ ایڈم اس کے ہونٹوں سے اپنی نظریں نہیں ہٹا پا رہا تھا۔

''اور یہ اس خوب صورت شام کے نام......'' کہتے ہوئے سبین مزید کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ گلاس سے بیئر کا ننھا گھونٹ بھرتے ہوئے ایڈم کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے تھے۔ یہ بھڑکتے ہوئے جذبات کو قابو کرنے کا نتیجہ تھا۔

سبین کی ہنسی کی آواز اتنی بلند ہو گئی تھی کہ ہال میں موجود سارے لوگوں نے پلٹ پلٹ کر دونوں کو دیکھا تھا۔ خاموش ہال جیسے جاگ اٹھا تھا۔ مردہ مجمع میں ایک دم سے جان پڑ گئی تھی۔ اگلا کھیل مزید پر جوش تھا۔ ہال کی تمام لائٹس ایک دم سے بند کر دی گئی تھیں۔ سارے ہال میں اندھیرا چھا گیا تھا۔ چند لمحوں کی تاریکی کے بعد روشنیاں پھر سے کھولی گئی تھیں۔ ہال جو اس سے پہلے پیلی روشنی میں مزین تھا، تاریکی کے بعد سارے کا سارا جامنی رنگ میں نہا گیا تھا۔ ویٹرز جلدی جلدی میں میزوں پر پڑے سرخ گلابوں کے پھولوں کے گلدستے ہٹا کر وہاں جامنی گل لالہ کے پھول رکھ رہے تھے۔ سفید موم بتیاں بھی ہٹائی جا رہی تھیں۔ اب وہاں جامنی موم بتیاں رکھی جا رہی تھیں جس کے کناروں پر اور اندر جامنی نقش و نگاری کی گئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا ہال بدل گیا تھا۔ لمحوں کی گیم میں...... کسی کو ان تبدیلیوں کی خبر نہیں ہوئی تھی سوائے سبین کے کیونکہ وہ اپنے ڈریس کے رنگ کو بخوبی جانتی تھی۔ اتنی عزت افزائی تو سبین کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔

''یہ سب کیا ہے؟'' وہ خوش گوار حیرت سے سب دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''ایک غیر ملکی کو خوش آمدید کہنے کا طریقہ......'' ایڈم مسکرایا۔ سبین بھی ہنسی...... پھر سے ہنسی...... اور ایڈم سانس لینا بھول گیا۔

''میں بے حد متاثر ہوئی ہوں۔'' وہ شوخی سے بولی تھی۔

''میں بھی......'' وہ مدہم اور مدہوش کن آواز میں بولا۔

پھر تقریب کا باقاعدہ آغاز ہوا تھا۔ سب لوگوں نے اپنے اپنے تاثرات کا اظہار کیا تھا کہ یہاں وہ اپنے اپنے ملک کے لوگوں کے لیے کیا کام کر رہے ہیں۔ یہ سب بور کر دینے والا ہرگز نہیں تھا۔ سبین کی طرف سے ایڈم نے گفتگو کی تھی۔

''ہمارے ملک کی پولیس نے ایک پاکستانی لڑکی کی بے عزتی کی ہے۔ اس پر ایک گھٹیا الزام لگایا ہے جس کے لیے ہم

سب اس سے معذرت خواہ ہیں۔"

سب نے تالیاں بجائی تھیں۔

کھانے کی میز پر وہ ان سب مردوں میں واحد لڑکی تھی۔ وہ سب کسی نہ کسی ادارے کے مالک تھے، اور یہاں اپنے اپنے ملک کے لوگوں کے تحفظ کے لیے کام کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو کی نوعیت کاروباری اور سیاسی تھی اور بور کر دینے والی بھی...... کھانے کی میز پر وہ بھولے رہے کہ ان کے درمیان ایک لڑکی بیٹھی ہے۔

"آپ میری خاص مہمان کو بور کر رہے ہیں۔" ایڈم نے نیپکن کو اتارتے ہوئے کہا تھا۔

"آپ کی مہمان سیاسی گفتگو میں دلچسپی نہیں رکھتیں...... بہتر ہے کہ آپ ان کے لیے ڈانس شروع کروا دیں۔"

"ٹھیک ہے پھر آغاز ہم سے ہوگا۔" وہ اٹھا اور گھوم کر سبین کی کرسی کے پاس آیا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ سبین کے آگے کیا تھا۔ سبین نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔ ایڈم نے اس کے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ بس ہاتھ آگے کیے ہوئے تھا۔

"مجھے ڈانس نہیں آتا ایڈم......!"

"مجھے کون سا آتا ہے۔"

سبین تب بھی نہیں اٹھ سکی تھی۔ ہال کی لائٹس ایک بار پھر بند کر دی گئی تھیں۔ ایک سنگل لائٹ کی لہر تھی جو دونوں پر پڑ رہی تھی۔ سارا ہال دونوں کو دلچسپی سے دیکھنے لگا تھا۔

"اٹھ جاؤ...... سب اب ہمیں دیکھ رہے ہیں۔"

"میں نے ڈانس کیا تو یہ سب ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جائیں گے۔"

"تو پھر آج انہیں ہنس ہی لینے دو......"

چار و ناچار وہ اٹھ گئی تھی۔ ایڈم اسے تھام کر ہال کے وسط میں بنے ڈانس فلور پر لے گیا تھا۔ مدھم میوزک پر اس نے مدھم مدھم اسٹیپس لگانے شروع کیے تھے۔ سبین کے لیے یہ سب پہلا تجربہ تھا۔ لیکن ایڈم نے اسے اتنی اچھی طرح تھام رکھا تھا اور اسے ایسے موو کر رہا تھا کہ سبین کو خود بھی اپنے آپ پر یقین نہ آیا کہ وہ پہلی بار میں اتنے کمال کا رقص کر رہی ہے۔ سب انہیں رشک سے دیکھ رہے تھے۔

"سنا ہے تم چونے سے جادوگری کرتی ہو سبین......" ایک بازو سبین کی کمر کے گرد حمائل کیے اور دوسرے سے اسے تھامے ہوئے اس نے سبین کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"جادوگری میرے بابا کرتے ہیں۔ مجھ سے تو سیکھا ہوا کام بھی ٹھیک سے نہیں ہو پاتا۔"

"میرا مجسمہ بناؤ گی؟" ایڈم نے اچانک سے ہی کہہ دیا تھا۔ کوئی مناسب جواب تراشنے میں سبین کو لمحے لگ گئے تھے۔

"میں انسانی اشکال بنانے میں ماہر نہیں ہوں ایڈم......!"

"تم جیسا بھی بناؤ گی مجھے منظور ہوگا۔"

"لیکن......" سبین نے تھوک نگلا۔ ایڈم جیسی شخصیت کو انکار کرنا اس کے لیے بہت مشکل ثابت ہو رہا تھا۔

"نہیں بنانا چاہتیں تو......کوئی بات نہیں......"

"نہیں......ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں آپ کی بات کیسے ٹال سکتی ہوں۔"

"پھر...... مجھے تمہارا انتظار رہے گا۔"

"کیوں نہیں...... میں پہلی ہی فرصت میں آپ کے مجسمے پر کام شروع کرتی ہوں۔" سبین نے مسکرا کر رضامندی دے دی تھی۔ ایڈم خوش ہو کر پھر سے اسے گھمانے لگا تھا۔

نجانے وہ میوزک کی کون سی دھن تھی، جس پر ایڈم اس پر جھکتا ہی چلا آیا تھا اور اس نے چند لمحوں کے لیے اپنے ہونٹ سبین کی گردن پر رکھ دیے تھے۔ پھر مسکرا کر سبین کو دیکھا تھا۔ سبین بھی چار و ناچار مسکرائی تھی۔

اپنی گردن پر ایڈم کے ہونٹوں کا لمس محسوس کرتے ہوئے اسے ایسا ہی لگا تھا جیسے بابا نے اسے ماتھے پر بوسہ دیا ہو...... جیسے اماں نے پیار سے اس کا ہاتھ دبایا ہو...... وہ تو ایڈم کو ایک بڑے کی حیثیت دے رہی تھی۔ ایک معزز شخص کی، باوقار آدمی کی...... یہ غلط فہمی جلد ہی دور ہونے والی تھی۔

☆......☆......☆

"ہیلو مس سبین......!" وہ ہال سے باہر نکلی تھی اور ہوٹل کے مین ڈور تک جا رہی تھی جب ایک آدمی نے اسے روکا تھا۔

"جی بولیے......!"

"میرا نام رافے ہے۔ لوگ مجھے مسٹر رافے کہتے ہیں۔ میرا تعلق نیویارک پولیس سے ہے۔ یہ میرا کارڈ ہے۔ آپ تسلی کر سکتی ہیں۔" اس نے اپنا کارڈ سبین کے سامنے کیا تھا۔ سبین نے اسے ایک نظر دیکھا تھا۔ وہ واقعی میں نیویارک پولیس میں آفیسر تھا۔ سبین کانپ کر رہ گئی تھی۔

"تو......؟ آپ یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟" اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"کچھ نہیں...... بس ویسے ہی...... یہ میرے ماتھے پر کٹ کا نشان دیکھ رہی ہیں آپ......؟" اس نے اپنے ماتھے کے بال پیچھے کر کے وہاں پر پڑے کٹ پر انگلی رکھ کر سبین کو دکھایا تھا۔

''جی......'' وہ منمنائی۔

''اسے یاد رکھیے گا۔ لوگ مجھے جلد بھول جاتے ہیں کیونکہ میری شکل عامیانہ ہے۔ میں ایڈم راہل کی طرح انسانی دیوتا نہیں ہوں، لیکن یہ کٹ انھیں یاد رہ جاتا ہے۔ یقیناً آپ کو بھی یاد رہے گا۔ امید ہے آپ سے دوبارہ بھی ملاقات ہوگی۔ میری چھٹی حس مجھے کہہ رہی ہے کہ آپ سے آگے بہت سی باتیں اور ملاقاتیں متوقع ہیں۔''

''میں کچھ بھی نہیں سمجھ رہی ہوں مسٹر رافے......''

''ابھی آپ کو سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے مس سبین......! جب وقت آئے گا میں خود ہی آپ سے رابطہ کرلوں گا۔'' اس نے سبین کے ساتھ ہاتھ ملایا تھا اور چلا گیا تھا۔ سبین شش و پنج کے عالم میں وہیں کھڑی رہی تھی۔

☆......☆......☆

''کیسی تھی تقریب......؟''

''ہمم......بہت شاندار......'' بال کھول لینے کے بعد اب وہ جوتی کے اسٹریپس کھول رہی تھی۔ نجانے اس کے چہرے پر ایسا کیا لکھا تھا جو میران نے تاڑ لیا تھا۔

''تم پریشان لگ رہی ہو......؟''

''ہاں......''

''کیوں......؟''

سبین نے گہرا سانس لیتے ہوئے میران کو مسٹر رافے سے ملاقات کا سارا احوال بتا دیا تھا۔

''مجھے لگتا ہے کہ ڈان پیٹرسن سے پیچھا چھٹا ہے تو اب پولیس ہمارے پیچھے لگ گئی ہے۔'' وہ سخت پریشانی کے عالم میں بولی تھی۔

''لیکن وہ وقت گزر چکا سبین......! اب تمھارے بارے میں ان کے پاس کچھ نہیں ہے۔ اب تم نے کوئی ایسا کام کرنا ہی نہیں تو پھر پولیس تمھاری طرف کیوں دیکھے گی۔ ایڈم نے یقین دہانی کروائی تو ہے کہ وہ تمھیں نہ صرف پولیس سے معافی نامہ دلوائے گا بلکہ کلین چٹ بھی دلوا دے گا۔''

''لیکن میرا دل بہت گھبرا رہا ہے میران......''

''کیا وہ شخص تقریب کے اندر بھی تھا؟ کیا اندر بھی وہ تم پر نظر رکھے ہوئے تھا؟''

''نہیں......وہ مجھے ہال کے باہر ملا تھا۔ وہ پارٹی میں شریک نہیں تھا اور وہ ہوٹل انتظامیہ کا ورکر بھی نہیں تھا۔ اس کے

باوجود اس نے ہوٹل مینجر کا روپ دھار رکھا تھا۔ ایک پولیس آفیسر ہوتے ہوئے وہ کیوں کسی سے چھپ رہا تھا۔''

''کچھ اور بات ہوگی سین...... جس سے ہمارا تعلق نہیں ہوگا۔''

''میران......! کیا خدا نے مجھے معاف کر دیا ہے؟''

''ہاں...... تب ہی تو اب ہم ہر طرح کی فکر و غم سے آزاد ہیں۔''

''کیا اب وہ ہمیں کسی مشکل میں تو نہیں ڈالے گا ناں......؟ مجھے تم سے جدا تو نہیں کرے گا ناں......؟''

''کبھی بھی نہیں......'' میران نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر کہا، پھر اس کے قریب ہوا۔ سین مسکرائی۔

میران نے اسے تو تسلی دے دی تھی، لیکن درحقیقت اس کا دل سین سے بھی زیادہ ڈر گیا تھا۔ ساری رات اس نے پریشانی میں گزار دی تھی۔

برف باری میں شدت آتی جا رہی تھی۔ سارا شہر سفید ہو چکا تھا۔ کرسمس بھی قریب تھی۔ اس کی تیاری بھی عروج پر تھی۔ لوگ اپنے گھروں کو سجانے میں لگے ہوئے تھے اور کمروں کو بھی...... ہر طرف آنے والی کرسمس کی خوشیاں پھیلی ہوئی تھیں جب میران نے ایک صبح سین کو اداس کر دیا تھا۔

''اٹھ جاؤ...... مائی کیوٹ وائف......'' میران نے اسے اٹھایا تھا۔

''آج میں نے خود تمھارے لیے چائے بنائی ہے۔''

''ہاں...... اٹھ چکی ہوں......''

''یہ دیکھو......'' میران نے ایک لفافہ اس کے سامنے لہرایا تھا۔

''یہ کیا ہے؟''

''کھول کر دیکھ لو......'' وہ مسکرا رہا تھا۔ سین نے لفافہ چاک کر کے اندر سے کاغذ باہر نکال لیا تھا۔ اس کاغذ پر جو لکھا تھا اسے پڑھ کر بھی وہ جیسے نہیں سمجھی۔

''کیا ہے یہ......؟''

''میرا پروموشن لیٹر......''

''واقعی......؟''

''ہاں...... دیکھو...... میری پے میں بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ کمپنی شکاگو میں فیکٹری لگا رہی ہے۔ وہ مجھے وہاں کا انچارج بنا کر بھیج رہی ہے۔''

میران نے بتایا تھا۔ سبین کا کھلا ہوا منہ اتر گیا تھا۔

''شکاگو......؟''

''ہاں......''

''اتنی دور......'' دور کا لفظ لمبا ادا کرتے ہوئے وہ اداس ہو رہی تھی۔

''کس زمانے میں رہ رہی ہو سبین......آج کے دور میں لوگ کمانے کے لیے ایک براعظم سے دوسرے براعظم میں چلے جاتے ہیں اور تم شکاگو کو دور کہہ رہی ہو......دو گھنٹے کی تو فلائٹ ہے بس......''

''لیکن پھر بھی میران......یہاں کیوں نہیں......؟''

''ظاہری بات ہے کہ یہاں آبادی بہت زیادہ ہے، کمانے والے بھی زیادہ ہیں اور مقابلہ بھی بہت ہے۔ وہاں لوگ کم ہیں، جو وہاں جائے گا اسے زیادہ پے ملے گی۔''

''ہم کم پے میں گزارا کر لیں گے میران......'' وہ اس کے اتنی دور جانے کے خیال پر ہی افسردہ ہو رہی تھی۔

''میری پیاری بیوی......! ابھی ہمیں گھر کا قرض بھی اتارنا ہے۔ گھر کی آرائش بھی کرنی ہے اور بھی بہت سے کام ہیں۔ دو دن کی چھٹی میں مَیں تمہارے پاس واپس آجایا کروں گا۔''

''ممی کا بھی کچھ پتا نہیں چل رہا اور ایسے میں تم بھی جا رہے ہو......''

''تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ ممی کے حوالے سے ہمیں پریشان نہیں ہونا چاہیے اور ان کو تلاش کر کے انھیں بھی پریشان نہیں کرنا چاہیے۔''

''ٹھیک ہے......پھر......جیسے تم مناسب سمجھو......'' نیم دلی سے اس نے رضامندی دے دی تھی۔

بس اسٹینڈ پر اسے الوداع کہتے ہوئے سبین کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے تھے۔ اس کا دل گھبرا رہا تھا۔ نجانے کیوں......

''میں ہمیشہ کے لیے نہیں جا رہا سبین......'' میران نے اس کے گال پر پیار کرتے ہوئے کہا۔

ایسے موقعے پر اس کی ایسی بات نے سبین کو اور بھی زیادہ پریشان کر دیا تھا۔ کانپتے دل کے ساتھ کپکپاتے ہاتھ ہلا کر اس نے میران کو بائے بائے کیا۔

دونوں اسے وقتی جدائی سمجھ رہے تھے۔ کہاں جانتے تھے کہ یہ جدائی کتنی طویل ثابت ہونے والی تھی۔

☆......☆......☆

''بابا......! انسانی اشکال کیسے بنائی جاتی ہیں؟''

ایڈم کا مجسمہ بنانے کا اصرار بڑھ رہا تھا، اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ یہ اس کے لیے پہلا تجربہ تھا اور وہ اپنے پہلے تجربے میں اپنا بہترین کام دینا چاہتی تھی۔ اب اگر ایڈم نے اس سے ایک فرمائش کر ہی دی تھی تو وہ اسے مایوس نہیں کرنا چاہتی تھی۔ یہ ایک طرح سے اس کے خیال میں ایڈم کے احسان کا بدلہ بھی تھا۔ اس کی مدد کا شکریہ بھی...... کچھ اور سمجھ میں نہیں آیا تو اس نے بابا کو فون کر لیا۔

"تمھیں کس کا مجسمہ بنانا ہے میری جان......"

سبین نے گہرا سانس لیا۔ بابا جو سمجھ رہے تھے بات وہ نہیں تھی۔

"بابا! ایک آڈر ملا ہے۔ ایک بہت معزز آدمی کا مجسمہ بنانا ہے مجھے......"

"اچھا......!" بابا اب اصل بات سمجھے تھے۔

"تمھیں مشکل کہاں پیش آ رہی ہے؟"

"وجود میں بنالوں گی۔ مجھے چہرے کے خدوخال میں مسئلہ ہو رہا ہے۔"

"تمھیں یاد ہے کہ سبین ایک بار تم نے گھوڑے کا ماڈل بنایا تھا۔ سانچے میں سے جب تم نے گھوڑے کا ماڈل باہر نکالا تھا تو اس کا چہرہ ٹوٹ گیا تھا۔ وہ تم سے ٹھیک سے نہیں بن سکا تھا۔ لیکن تم نے عجیب کام کیا تھا۔ میرے بنائے ہوئے گھوڑے کے چہرے پر ہاتھ پھیر پھیر کر تم نے اپنی انگلیوں کو اس کے خدوخال ازبر کروا دیے تھے۔ پھر جیسے ہی تم نے چونے کو چھوا تھا چونے نے تمھاری انگلیوں کی تحریر پڑھ لی تھی اور تم نے گھوڑے کا ادھورا سا چہرہ بنالیا تھا۔ میں تمھارے اس طریقے پر حیران رہ گیا تھا۔ یہ بلاشبہ کمال کا خیال تھا۔ اب بھی تم ایسا ہی کرو...... تم یہ بہت اچھی طرح کر لو گی، کیونکہ بچپن کی سیکھی ہوئی چیزیں پتھر پر ضرب ہوتی ہیں۔ ایک بار پھر سے ویسا ہی کرنا تمھارے لیے فائدہ مند ثابت ہوگا۔"

بابا نے اسے مسئلے کا حل بتا دیا تھا۔ جسے اب وہ دور کھڑے ایڈم کو دیکھتے ہوئے پھر سے یاد کر رہی تھی۔ چہرے پر ہاتھ پھیر کر وہ اپنی انگلیوں کو ایڈم کے خدوخال کیسے ازبر کرواتی......؟ ایڈم کی شخصیت کا تو رعب ہی اتنا تھا کہ وہ اس کے پاس جاتے ہوئے گھبرا رہی تھی۔

ایڈم کا کمرہ اس کی شخصیت کی طرح شاہانہ تھا۔ یہ کمرہ کسی چھوٹے سے محل سے کسی صورت کم نہیں تھا۔ وہاں کی آرائش میں نفاست اور وقار جھلکتا تھا۔ ویسا ہی جیسا ایڈم کی شخصیت سے جھلکتا تھا۔ قد آدم کھڑکیوں سے باہر کا منظر اتنا دلفریب تھا جیسے قدرت کی ساری فیاضی اسی کھڑکی کے پاس سے دکھائی دیتی ہو...... ایڈم ایک امیر شخص تھا، وہ یہ سب افورڈ کر سکتا تھا۔ سبین کو جس عزت سے وہاں بلایا جاتا تھا اس کے تحت وہ ایڈم کی مزید احسان مند ہوتی جا رہی تھی۔ چائے اور کافی کے علاوہ سبین نے ایک دوبار لنچ بھی ایڈم کے ساتھ ہی کیا تھا۔ ایک دن ایڈم نے اسے اپنا سارا گھر دکھایا تھا۔ مصوری کے وہ شاہکار جو اس نے دنیا کے کونے

کونے سے اکٹھے کیے تھے۔ نجانے کتنے تو اسے تحفے میں ہی ملے تھے۔ قرآن مجید کے نایاب نسخے، خانہ کعبہ کے غلاف پر بنی ایک مسجد کا شاہکار خاکہ اصلی گوہر نایاب کی تسبیحات...... ایڈم کے پاس ایسی چیزوں کا ذخیرہ تھا۔ مجسمے کا کام جو وہ جلد از جلد کر لینا چاہتی تھی التواء کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔ دونوں میں وہ تعلق پنپتا جا رہا تھا جس کا کوئی مناسب نام ابھی سبین کے ذہن میں نہیں ابھر رہا تھا۔ اس نے ایڈم کو اتنا اونچا درجہ دے رکھا تھا کہ وہ اسے دوست کے درجے پر لا ہی نہیں پا رہی تھی۔

گیلے چونے میں ہاتھ ڈبو کر اس نے مجسمے کے ادھورے چہرے کے اوپر رکھے اور ایک بار پھر سے اپنا کام شروع کرنا چاہا، جو کسی طور مکمل نہیں ہو پا رہا تھا۔ دور کھڑے ایڈم نے سفید توپ پہن رکھی تھی۔

سر پر سرخ کیفیہ باندھ رکھا تھا اور دائیں طرف دیکھتا ہوا وہ غضب ڈھا رہا تھا۔ اس حالت میں وہ کسی بھی لڑکی کے دل پر بجلی بن کر گر سکتا تھا۔

مجسمے کو بنتے ہوئے پورے دو ہفتے گزر چکے تھے۔ ابھی نجانے کتنا کام باقی تھا۔ سبین جتنا چاہ رہی تھی کہ یہ کام جلدی ہو جائے، اتنی ہی دیر ہوتی جا رہی تھی۔ ایک شکل بنانا اس کے لیے مشکل تر ثابت ہو رہا تھا۔ وہ بنیادی خاکہ بنا چکی تھی، لیکن اسے چہرہ بنانے میں مشکل پیش آ رہی تھی۔

شاید وہ چہرہ بھی ہو بہو بنا لیتی، لیکن اسے ڈر تھا کہ وہ اپنے مجسمے میں ایڈم کی خالص روح نہیں ڈال سکے گی۔ اس نے ایڈم سے کہہ رکھا تھا کہ وہ مجسمہ مکمل ہونے سے پہلے نہیں دیکھے گا۔ ایڈم نے بھی ہنستے ہوئے رضامندی دے دی تھی۔ اب سبین اسے اپنا بہتر کام کر کے دکھانا چاہتی تھی۔ اس نے آج تک مجسمہ سازی نہیں کی تھی، لیکن اب جب وہ کر رہی تھی تو اس کام میں اس کا بھی دل لگ گیا تھا اور وہ اس کام کو کاملیت سے بھی کرنا چاہتی تھی، مکمل جانفشانی سے......

"کیا ہوا سبین...... رک کیوں گئی ہو......؟"

ایڈم سبین کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا، پھر بھی اس نے جج کر لیا تھا کہ سبین کام نہیں کر رہی بلکہ رک کر کچھ سوچ رہی ہے۔ ایڈم کی ایسی باتیں سبین کو حیران کرتی تھیں۔ بہت سی باتیں وہ ایسی کر دیتا تھا کہ جیسے وہ غیب کا علم جانتا ہو...... جس دن میران شکاگو گیا تھا، اس دن سبین اداس تھی اور ایڈم نے اس کا چہرہ دیکھتے ہی اس کی اداسی کو نوٹ کر لیا تھا۔

"ہاں...... مجھے میرے بابا اور چھوٹی بہن یاد آ رہے ہیں۔" اس نے ایڈم سے ایک بے نام تعلق بن جانے کے باوجود بھی میران کا ذکر نہیں کیا تھا۔ میران کے حوالے سے وہ کوئی کوتاہی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

"کیا آج تم تھک گئی ہو؟"

"نہیں...... مجھے...... مجھے آپ کے ماتھے کا سائز لینا ہے۔" جھجکتے ہوئے اس نے بالآخر کہہ دیا تھا۔ ایڈم نے مسکرا کر

اثبات میں سر ہلایا تو سبین کی ہمت بڑھی۔

ایڈم کا ماتھا وسیع تھا، شفاف اور روشن...... سبین نے وہاں اپنی چاروں انگلیوں کو جوڑ کر رکھا تھا اور جامنی گل لالہ سے مہکتا پورا باغ اس کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔ ایک کرنٹ ایڈم کے وجود میں اترا تھا۔ سبین اس کے اوپر جھکی ہوئی تھی اور وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔ یہ لمحہ اتنا طویل تھا کہ ختم ہو کر بھی فنا نہیں ہو رہا تھا۔ سبین کی انگلیوں کا لمس ایسا تھا جیسے کسی نے موہ قلم کو پارے میں ڈبو کر اس کے ماتھے پر رکھ دیا ہو...... تپش سے اس کی آنکھیں اندھی ہو چکی تھیں۔ اسے سوائے محبت کے کمرے میں اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

نجانے اس بدیسی چونے میں کچھ انوکھا تھا، ایڈم کی شخصیت لمحوں میں رنگ بدل رہی تھی یا سبین سے ہی کام ٹھیک سے نہیں ہو پا رہا تھا کہ سبین کو بار بار ایڈم کے پاس جا کر اس کے چہرے کے خدوخال کو محسوس کرنا پڑتا تھا۔ وہ ایڈم کے ماتھے پر ہاتھ پھیرتی تھی، اس کے گالوں پر، ناک پر...... اور...... ہونٹوں پر بھی...... اور پھر وہی سب کچھ چونے پر اتارنے کی کوششیں کرتی تھی۔ ایڈم کے لیے یہ سب اتنا حسین تھا کہ وہ چاہتا تھا کہ وہ سالوں اسی طرح کھڑا رہے اور سبین اس کے چہرے کو چھو چھو کر محسوس کرتی رہے۔ یہ مجسمہ کبھی مکمل ہو ہی نہ پائے۔

یہ سبین کے کام کا کوئی بیسواں روز تھا۔ چونے کے ٹیلے پر مشق کرتے کرتے سبین ایک بار پھر سے آنکھیں بند کیے ایڈم کے گالوں پر ہاتھ پھیر کر اسے محسوس کر رہی تھی۔ جب ایڈم نے چونے کے آمیزے سے لتھڑے اس کے ہاتھ تھام لیے تھے۔

''سبین......!''

''جی......؟'' بند آنکھوں سے ایڈم کو چھو کر ''نوٹ'' کرتی سبین چونکی تھی۔ ہڑبڑا کر اس نے اپنی آنکھیں کھولی تھیں۔

''کیا مطلب ہے تمھارے نام کا......؟''

''صبح کی ٹھنڈی ہوا......'' اس نے مسکرا کر اپنے نام کا مطلب بتایا تھا۔ چند لمحے خاموشی میں گزر گئے تھے جو بڑے طویل ثابت ہوئے تھے۔ ایڈم نے اس کے ہاتھ نہ چھوڑے تھے، اور خود وہ چھڑوا نہ سکی تھی۔

''میں اس ٹھنڈی ہوا کو ہمیشہ محسوس کرنا چاہتا ہوں سبین......'' ایڈم نے وہ بات کہہ دی تھی جس کا فیصلہ وہ کل رات کر چکا تھا۔ جیفرسن نے بھی اس کے فیصلے کی تائید کی تھی۔

''سبین ہر لحاظ سے تمھاری بیوی بننے کے لیے موزوں ہے بیٹی...... تم بالکل بھی دیر مت کرو...... گرینڈ فادر سے آگے بڑھ کر سوچو...... زبردستی حاصل کی گئی چیز ملکیت تو ہو سکتی ہے لیکن محبت ہرگز نہیں...... تم اس سے شادی کر لو...... شادی کیے بنا ویسے بھی تم اپنی ''خواہش'' پوری نہیں کر سکتے......'' پہلے سمجھاتے ہوئے اور آخر میں جیفرسن نے شوخی سے کہا تھا۔

''اگر اسے چاہتے ہو تو فوراً پرپوز کردو۔''

اور آج ایڈم نے ایسا ہی کیا تھا۔ سین کو پرپوز کردیا تھا۔ جسے سن کر سین شاکڈ سی ایڈم کو دیکھنے لگی تھی۔

''کیا مطلب......؟'' بے اختیار ہی سین نے اپنے ہاتھ ایڈم کے ہاتھوں کی گرفت سے آزاد کروائے تھے۔

''مجھ سے شادی کروگی سین......؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔ سین کے پیروں تلے سے سارا محل نما گھر نکل گیا تھا۔ یہ کیا بات کہہ دی تھی ایڈم نے......وہ تو ایڈم کو ایک جوان درویش سمجھے ہوئے تھی۔ ایک معزز آدمی......ایک ناگوار سا تاثر سین کے چہرے پر آکر گزرا تھا۔

''کیا تمھیں میری بات بری لگی......؟'' اب کے وہ معصومیت سے پوچھنے لگا۔

سین کا سارا منفی اثر زائل ہوگیا۔

''ناں'' میں سر ہلاتے ہوئے وہ دھیرے سے مسکرائی تھی۔

مغربی معاشرے میں یہ سوال کچھ ایسا عجیب نہیں تھا۔ اسے اتنا حیران نہیں ہونا چاہیے تھا۔ پھر اس کی اور میران کی شادی تو ابھی سب سے چھپی ہی ہوئی تھی۔ اگر ایڈم نے اس کے لیے ایسے جذبات بنا لیے تھے تو وہ اتنا قصوروار نہیں تھا۔ وہ جس قدر چاہے عاجز انسان تھا، لیکن وہ ایک مرد تھا۔ دنیا کے باقی مردوں کی طرح اسے بھی گھر بسانے کا پورا پورا حق تھا۔

''سر ایڈم......!'' وہ وضاحت آمیز جواب دینا چاہتی تھی جب ایڈم نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''کتنی بار کہوں......مجھے سر مت کہا کرو......'' اب کی بار سین نے بڑی مشکل سے ایڈم کی اس حرکت کو برداشت کیا تھا۔

''ایڈم......! میں تم سے شادی نہیں کرسکتی۔''

''کیوں......؟'' ایڈم کی آنکھوں میں وہ رنگ آیا جس سے سین ایک لمحے کے لیے ڈر گئی تھی۔ اسے اپنے انکار پر ایڈم کا کچھ اور ہی روپ دیکھنے کو ملا تھا۔

''میرا مطلب ہے اس کی کوئی وجہ......کیا کوئی اور ہے؟'' اب کے وہ پیار سے پوچھ رہا تھا۔

''میں شادی شدہ ہوں......'' سین نے مسکرا کر بڑے آرام سے ایڈم کے پاس دھماکا کیا تھا اور یہ دھماکا ہیروشیما، ناگاساکی سے بھی زیادہ بڑا تھا۔

''کیا......؟ لیکن......'' وہ حیران کیسے نہ ہوتا۔

''لیکن یہ کہ یہ شادی چھپی ہوئی تھی۔ کسی کے علم میں نہیں تھی، لیکن اب نہیں...... کیونکہ اب ویسے بھی ہم دو سے تین ہونے جارہے ہیں۔'' اس نے جان بوجھ کر اس بات کا اضافہ کیا تھا۔ وہ بات جو وہ سب سے پہلے میران کو بتانا چاہتی تھی، مجبوری میں اسے ایڈم کو بتانی پڑ رہی تھی۔

کھڑکی سے باہر قدرت کی بھرپور فیاضی والے مناظر جلنے لگے تھے۔ سبز رنگ کاہی میں بدلنے لگا تھا۔ چونے کا وہ بت جو ابھی ادھورا تھا جیسے ایک ہلکی سی ٹھوکر سے ہی گر کر پاش پاش ہو گیا تھا۔ سفید بادل اٹھا تھا جس نے ایڈم کی آنکھوں کو سرخ کر دیا تھا۔

''اوہ......پھر تو مبارک ہو......'' یہ ایڈم ہی جانتا تھا کہ اس کے منہ سے یہ الفاظ کیسے نکلے تھے۔ سبین نے ہاتھ صاف کیے تھے اور پھر مسکراتی ہوئی باہر چلی گئی تھی۔ ایڈم نے سبین کے جانے کے فوراً بعد غصے سے بیل بجائی تھی۔ جیمز کمرے میں کسی جن کی طرح حاضر ہوا تھا۔

''جی سر......؟''

''جیفرسن کو بلاؤ......جلدی......'' پیٹرسن غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔

''سر جیفرسن! جلدی گھر آئیں......سر پیٹرسن نے آپ کو فوراً بلایا ہے۔'' جیمز نے فون پر جیفرسن سے کہا تھا۔ پیغام سن کر جیفرسن ہنسا تھا اور پھر ہنستا ہی چلا گیا تھا۔



ناول **شام رنگ سیاہ** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **20** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 12

پیٹرسن اپنا سنہری بالوں والا سر تھامے بیٹھا تھا۔ دو ہاتھوں کی دس خوب صورت انگلیوں نے اس کے بالوں کو بے ترتیب کر دیا تھا، لیکن اس کا یہ ہی وصف دلنشین تھا کہ ہر بے ترتیبی اسے پہلے سے زیادہ دلکش بنا دیتی تھی۔

جو خبر اسے چند سیکنڈز پہلے ملی تھی ایسے میں نارمل رہنے کی تمام تر کوششیں بیکار ثابت ہو رہی تھیں۔ سیین کمرے سے جا چکی تھی، لیکن وہ اپنے پچھلے بہت سے دنوں کے لمس کو یہاں ہی چھوڑ گئی تھی۔ وہ لمس جو اس کی انگلیوں کا تھا اور جو پیٹرسن کے چہرے پر ثبت ہو چکا تھا۔ اس کے ماتھے پر، اس کے گالوں پر، اس کی گردن پر اور...... اس کے ہونٹوں پر...... اس کی خوشبو کمرے کی در و دیوار سے لپٹی ہوئی تھی۔ وہ سب بھسم تو کر سکتی تھی لیکن خود فنا نہیں ہو سکتی تھی۔ ابھی تو پیٹرسن کا مجسمہ مکمل بھی نہیں ہوا تھا، پھر مکمل ہونے سے پہلے وہ کیوں ٹوٹ گیا تھا۔ کیسے ٹوٹ گیا تھا۔ گرینڈ فادر کے بعد اس نے زندگی میں پہلی بار کسی کی خواہش اپنے دل میں پالی تھی۔ اسے خواہشوں اور محبت کی ضرورت ہی کب رہی تھی۔ وہ ان چیزوں سے یکسر انجان تھا۔ لیکن پھر اس نے وہ غلطی کر لی جو اسے ہرگز نہیں کرنی چاہیے تھی۔ گرینڈ فادر کی نصیحتوں کے باوجود اس نے محبت کر لی...... سیین سے...... جس کی مسکراہٹ نے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا، اسے گدگدایا تھا، اسے جامد کیا تھا، اس کی سانسوں میں خلل ڈالا تھا اور پھر...... یہ سب کرنے کے بعد وہ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے ہاتھوں سے ایسے نکل گئی تھی جیسے پانی کی مچھلی ہو۔

گرینڈ فادر نے اسے سختی سے اس کافرانہ جذبے...... محبت سے دور رہنے کا کہا تھا۔

"ڈان کی زندگی میں نہ تو کہیں رحم ہوتا ہے اور نہ ہی محبت......"

خود وہ بھی ایک بار اس جذبے کا شکار ہوئے تھے۔ ایمنڈا...... وہ عورت تھی جس نے گرینڈ فادر کی سدھ بدھ چند روز کے لیے ختم کر دی تھی۔ پھر بدلے میں گرینڈ فادر نے اگلے پانچ سالوں تک اسے اپنے کمرے کے تہ خانے میں قید کیے رکھا تھا۔ کیا اسے بھی یہ ہی کرنا چاہیے تھا؟ اس نے سیین کے معاملے میں رعایت برت کر اپنے ساتھ غلطی کر لی تھی کیا؟ جیفرسن نے ہی کہا تھا کہ زبردستی سے حاصل کی گئی چیز ملکیت تو ہو سکتی ہے لیکن محبت ہرگز نہیں...... اس لیے تم اس سے شادی کر لو۔

اور اس نے جیفرسن کی بات مان لی تھی۔ سیین کو قید کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ وہ تو اس کے ساتھ ساتھ اپنے ساتھ بھی نیکی کرنے جا رہا تھا۔ اس کے بچپن کا وہ لیگو باکس جس سے وہ ادھوری تصویریں بناتا چلا آ رہا تھا، سیین کو دیکھ کر اس نے پہلی بار کسی

شبیہہ کو مکمل کیا تھا۔ جیسے جیسے سبین اس کا مجسمہ بنا رہی تھی ویسے ویسے اس نے لیگو باکس سے اس کی شبیہہ اپنے دل میں مکمل کی تھی۔

وہ جس طرح کے مرضی ماحول میں پلا بڑھا تھا، لیکن اس کی رگوں میں ولیم کا خون تھا۔ وہ ایک شریف انسان تھا...... یہ شادی کی خواہش شاید ولیم کے جینز کی صورت میں اس کے دل اور وجود میں اتری تھی۔ ورنہ اس کی قبیل میں شادی ایک بے وقوفانہ طرز عمل کے علاوہ اور کچھ نہیں تھی، اور جب وہ یہ بے وقوفانہ عمل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا تو......

غصے، بے بسی، دکھ، دھوکا، غلط بیانی...... ان سب چیزوں کو سوچتے سوچتے پیٹرسن کا دماغ پھٹنے پر آ گیا تھا۔ اس کی ایسی حالت تب نہیں ہوئی تھی جب اس کے ادارے کی کتابوں کے ذریعے ہوتی افیون کی اسمگلنگ کو بارڈر پر پکڑ لیا گیا تھا۔ جب دائنا کی موت والی جگہ پر اس کا نام لکھا ہوا ملا تھا۔ جب دائنا کے پوسٹ مارٹم سے پیٹرسن کے خون کے نشان ملے تھے۔ لیکن اب جیسے سب برداشت سے باہر ہو چکا تھا۔

''میں شادی شدہ ہوں...... لیکن یہ شادی چھپی ہوئی تھی، کسی کے علم میں نہیں تھی، لیکن اب نہیں...... کیونکہ اب ویسے بھی ہم دو سے تین ہونے جا رہے ہیں۔'' سبین کا فقرہ کمرے میں گونج گونج کر تھک چکا تھا اور اب مردار کھانے والے گدھ کی طرح پیٹرسن کے اعصاب پر سوار تھا۔ روشنیاں اندھیروں سے جا ملی تھیں۔ وحشت اتنی بڑھ گئی تھی کہ دیوانہ کرنے لگی تھی۔

پھر اسی پریشانی میں ایک عجیب بات ہوئی، ایما عین اس کے سامنے آ بیٹھی...... اونچی پنسل ہیل پر تنگ جینز اور اوپر کھلی ڈلی شرٹ پہنے ایما کا وجود سامنے صوفے پر جیسے دھر دیا گیا تھا۔ ایما کے ہاتھ کی باریک انگلیوں میں ایک باریک سا سگریٹ بھی دبا ہوا تھا، جسے وہ بڑی ادا سے اپنے ہونٹوں میں دبائے کش کر کے دھواں چھوڑ رہی تھی۔ یہ انداز خاص ولیم کو چڑانے کے لیے ہوتا تھا اور آج یہ پیٹرسن کو سلگا رہا تھا۔

ایما نے اب بڑے اطمینان سے ایک گہرا کش لے کر دھواں اس انداز سے چھوڑا تھا کہ دھوئیں کے بہت سے چھوٹے بڑے کھو کھلے دائرے ایک کے اوپر ایک اس کے منہ سے نکلتے چلے گئے تھے اور وہ ساری کاریگری انسانی نہیں بلکہ مکینکلی لگتی تھی۔ بڑی محنت کے بعد تو وہ اس کرتب کو کرنے میں کامیاب ہو پائی تھی۔ سراسر بازاری اور بے معنی کرتب میں...... جو سڑکوں پر پھرنے والے آوارہ ہپیوں کی سستی شعبدہ بازی سمجھا جاتا تھا۔ پھر وہ اس کرتب کو بار بار کر کے مشاق کیوں نہ ہوتی......

پیٹرسن ساکت و جامد اپنے تصور کے اس غیر حقیقی وجود کو دیکھنے لگا تھا۔ ایما یہاں کیا کر رہی تھی، اس نے اسے تو یاد نہیں کیا تھا۔ وہ تو جیفرسن کی آمد کا منتظر تھا۔ یہ ایما کیوں چلی آئی تھی۔

''تمہاری آنکھوں میں میرے لیے اس وقت مجھے اتنی ہی نفرت نظر آ رہی ہے جتنی تمہارا باپ مرنے سے پہلے تک مجھ سے کرنے لگا تھا۔ جب کہ تم دونوں کے دلوں میں نفرت پیدا کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ولیم مجھے زندگی کی آسائشیں دینے

سے قاصر تھا اور مجھے وہ اس طرح کی زندگی جینے نہیں دے رہا تھا جیسی میں چاہتی تھی اور تم...... تم بھی مجھ سے صرف اس لیے نفرت کرنے لگے کہ میں کال گرل تھی۔ تمھارے باپ کے ساتھ فریب کرتی تھی جبکہ وہ فریب میری مجبوری تھا۔"

"مجبوری......؟" پیٹرسن نے نفرت سے کہا تھا۔

"ہاں...... مجبوری...... اب تو تم مجبوری کو سمجھ ہی گئے ہو گے کہ یہ کس بلا کا نام ہے۔ جیسے اب تم مجبور ہو...... اپنے دل کے ہاتھوں...... ہر صورت سبین کو پانا چاہتے ہو...... ویسے ہی میں آسائشوں کو پانا چاہتی تھی۔ جیسے تم اسے حاصل کرنے کے لیے گناہ ثواب بھول گئے ہو...... ویسے ہی میں سہولیات کے لیے وفا، بے وفائی بھول گئی تھی۔"

ایما نے توقف کیا تھا۔ پھر سے دھواں کش کرتے ہوئے چھلّے چھوڑے...... پیٹرسن کو اس سے شدید نفرت محسوس ہوئی۔

"لیکن تم اعتراف کرلو کہ یہ سب میرے لیے کر رہے ہو...... میری محبت کو بھولنے کے لیے...... مجھ سے نفرت کو دبانے کے لیے...... نہ تمھیں وائنا سے کوئی غرض تھی اور نہ اب سبین سے ہے۔"

"ہاں...... یہ سچ ہے۔" پیٹرسن نے اعتراف کرلیا۔

"لیکن تم سے محبت کو بھولنے کے لیے نہیں...... بلکہ اپنی نفرت کی شدت کو مزید بڑھانے کے لیے...... نفرت ہے مجھے تم سے...... اور ولیم سے بھی...... جو مجھے اس دنیا میں لائے...... بنا چاہت کے، بنا وجہ کے......"

پیٹرسن نے پاس ہی پڑا ایک وزنی گلدان ایما کے وجود پر اچھالا تھا۔ گلدان صوفے سے ٹکرا کر فرش پر گرا تھا اور پھر پاش پاش ہو گیا تھا۔ کمرے میں دو چیزوں کا شور گونجا تھا۔ گلدان کے ٹوٹنے کا اور ایما کے اونچا اونچا ہنسنے کا...... وہ حقیقت میں حاضر ہوتی تو چوٹ کھاتی...... گھائل پیٹرسن نے قریب پڑی ایک دو اور چیزیں بھی ایما کے غیر حقیقی وجود پر دے ماری تھیں۔

"نفرت ہے مجھے...... تم دونوں سے شدید نفرت ہے۔" وہ چیزیں اس پر اچھالتا جا رہا تھا۔ یہ غصہ اس دبے ہوئے احساس کا تھا کہ گرینڈ فادر نے اسے عام سے اتنا خاص کیوں بنا دیا؟ وہ ایڈم اور پیٹرسن کی ایک ساتھ اداکاری کرتے کرتے تھک چکا تھا۔ یہ غصہ شاید اسی تھکن کا تھا۔

اور ایما تھی کہ وہاں سے جا ہی نہیں رہی تھی۔ وہ بڑی ڈھٹائی سے ہنستی جا رہی تھی۔ قہقہے لگاتی جا رہی تھی اور پیٹرسن اس پر کمرے کی چیزیں پھینکتا جا رہا تھا۔

تب ہی جیفرسن کمرے میں داخل ہوا تھا۔ اس نے پیٹرسن کو اس دیوانگی کی حالت میں دیکھا تھا اور سرشاری کے جذبے سے مسکرا اٹھا تھا۔ یہ منظر تخیل سے زیادہ مسحور کن تھا۔ پیٹرسن سے اس کے بہت سے بدلے ادھار تھے۔ جنہیں وہ آہستہ آہستہ چکا رہا تھا۔ ان بدلوں کی فہرست کی شروعات دونوں کے بچپن سے ہی ہو گئی تھی۔ یہ بات جیفرسن کے لیے کیا کم سوہانِ روح رہی تھی کہ اس

کے سگے ماں باپ اس سے زیادہ پیٹرسن پر توجہ دیا کرتے تھے۔ پیٹرسن ذہین ہی بہت تھا۔ وہ سب کو اپنا گرویدہ کر لیتا تھا۔ خوب صورت بھی بلا کا تھا۔ سب بے اختیار ہو کر اسے ہی چاہتے تھے لیکن اب جیفرسن نے اس کی ساری ذہانت، اس کی ساری خوبصورتی سمیت اس کے وقار کو بھی برباد کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

اپنی مسکراہٹ پر قابو پاتے ہوئے وہ پیٹرسن کے پاس آیا تھا۔

''کیا ہوا پیٹرسن...... کیا ہو گیا ہے تمھیں......؟'' اس نے پیٹرسن کو بازوؤں سے تھاما تھا۔

''تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا جیفی؟''

''کیا......؟'' وہ انجان بنتے ہوئے بولا۔

''کیوں چھپایا مجھ سے سب کچھ......؟''

''کس کی بات کر رہے ہو......؟''

''وہ لڑکی شادی شدہ ہے۔'' پیٹرسن نے اپنی طرف سے ایک ایسا دھماکا کیا تھا جو جیفی پہلے سے ہی جانتا تھا۔ پھر اس نے جیفی کو ساری بات بتا دی تھی جو بہت دیر سے اس کے علم میں تھی۔

''تم نے یہ سب باتیں مجھے کیوں نہیں بتائیں جیفی......؟''

''میں قسم کھاتا ہوں پیٹی...... مجھے تو اندازہ بھی نہیں کہ یہ سب کیسے ہوا...... وہ لڑکی شادی شدہ ہے یہ بات تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔''

''تم نے اس کی اچھی طرح سے جان کاری کیوں نہیں حاصل کی......'' پیٹرسن تیز آواز میں بولا تھا۔

''اس قدر باریک بینی سے مشاہدہ کروایا گیا ہے کہ میں بتا نہیں سکتا...... پھر تم خود ہی تو کہہ رہے ہو کہ اس نے اس شادی کو چھپا کر رکھا ہوا تھا، تو اسی لیے ہم سے بھی بھول ہو گئی۔ کسی کو پتا ہی نہیں چل سکا کہ وہ شادی شدہ ہے۔''

''لیکن میں نے اس سے تب محبت کی ہے جب وہ شادی شدہ نہیں تھی۔ میں نے اسے تب چاہا جب وہ تنہا تھی۔ جب اس کا اس دنیا میں کوئی مددگار نہیں تھا۔ جب وہ میرے کندھے سے لگے ہوئے آنسو بہا رہی تھی۔ جب وہ مجھے چھو کر محسوس کرتی میرا مجسمہ بناتی رہی تھی۔''

''لگتا ہے اس نے تمھارا مجسمہ بناتے بناتے تمھیں کمزور کر دیا ہے پیٹی......!'' جیفرسن نے کہا تھا۔ پیٹرسن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''ایسے مت دیکھو...... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں...... تم ڈان ہو...... ڈان پیٹرسن...... جس کے گروپ میں کارکنوں کی تعداد

کسی ملک کی آرمی سے کم نہیں ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ تم خود کو اتنا بے بس اور لاچار کیوں محسوس کر رہے ہو...... تمھارے ہاتھ میں سب کچھ ہے۔ تم جو چاہے کر سکتے ہو...... ایک ادنیٰ سی لڑکی تمھیں پریشان کرے...... میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔"

جیفرسن اٹھا، اس نے پیٹرسن کی پسندیدہ شراب کا ایک گلاس تیار کیا تھا۔ وہ اس وقت وہ ساقی بنا ہوا تھا جو جام پلانے کے ساتھ ساتھ ذہن ماؤف کرنے کا بھی ماہر ہوتا ہے۔

"یہ لو...... یہ پیو...... یہ تمھیں ریلیکس کرے گی۔"

پیٹرسن نے چاروناچار گلاس تھام لیا تھا۔

جیفرسن نے اسی پر بس نہیں کی تھی۔ وہ آج شاطر پنے کی ساری مشقیں سیکھ کر آیا تھا۔ اس نے کمرے میں لگی پکاسو کی ایک تصویر کی مہنگی نقل کو دیوار پر سے سرکایا تھا، تصویر کے پیچھے دیوار میں ایک جگہ خفیہ بٹن لگا ہوا تھا۔ جیفرسن نے وہاں انگوٹھا رکھ دیا تھا۔ پھر تصویر کے چوکھٹے جتنا ہی ایک دروازہ کھلا تھا۔ یہ ایک خفیہ خانہ تھا۔ خفیہ تجوری...... جس میں کسی قسم کی کوئی رقم تو نہیں تھی لیکن پیٹرسن کی ذات سے جڑا سب کچھ اس کے اندر موجود تھا۔ اس کی "گرینڈ فادر" کے ساتھ تصویریں، اس کا اصلی برتھ سرٹیفکیٹ، گرینڈ فادر کی پیٹرسن کے لیے لکھی ڈائریاں...... اور بھی بہت کچھ...... پیٹرسن کو ان سب چیزوں سے بے حد پیار تھا۔ اپنے نامکمل ماضی سے...... اپنے گرینڈ فادر سے...... دنیا میں واحد وہ ہی ہستی تھی جن سے اسے پیار ملا تھا۔ ورنہ باقی سب نے تو اس کا فائدہ ہی اٹھایا تھا۔ اب وہ ان سے پیار نہ کرتا تو اور کن سے کرتا...... اس لیے اس نے ان کی ذات اور اپنی ذات سے منسلک تمام چیزوں کو اس خفیہ خانے میں چھپا رکھا تھا۔

اس خانے کو صرف دو لوگ ہی کھول سکتے تھے۔ ایک پیٹرسن خود اور ایک جیفرسن...... اگر کوئی اور اس باکس کو کھولنے کی کوشش کرتا تو باکس میں خودکار طریقے سے آگ لگ سکتی تھی جس سے تمام مواد جل کر راکھ ہو جانا تھا۔ پھر دوسرا یہ مواد گھر سے باہر بھی کسی صورت نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے ایک ایک صفحے پر سنسر چپ لگی ہوئی تھی۔ کمرے کی دہلیز پار کرتے ہی پورے گھر میں الارموں کا شور گونج اٹھتا تھا۔ انتظام اس قدر اعلیٰ تھا کہ اس باکس تک فرشتے بھی نہیں پہنچ سکتے تھے اور اس کے اندر کے مواد کو باہر اسمگل کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

جیفرسن نے اسی باکس میں سے گرینڈ فادر کی ایک تصویر کو نکالا تھا۔ پھر وہ تصویر پیٹرسن کے آگے کی تھی۔

"ایسے وقت میں تمھیں یہ ہی ریلیکس کرے گی۔ یہ ہی تمھیں بتائے گی کہ تمھیں کیا کرنا ہے۔ مجھے شک ہو رہا ہے کہ تم مذہب کا روپ بھرتے بھرتے تھوڑے مذہبی ہو رہے ہو......"

پیٹرسن نے چونک کر جیفرسن کو دیکھا تھا۔

''یہ بات تمھارے لیے کیا...... ہم میں سے کسی کے لیے بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔تم شریف ہوتے جارہے ہو پیٹی...... شریفوں کی یہ دنیا تمھیں تباہ کردے گی۔'' جیفرسن کہتا جارہا تھا۔ پیٹی کو پہلی بار جیفرسن خود سے اوپر نظر آیا۔ ورنہ اسے جیفی کے ہر ہر نظریے میں جھول ہی ملا تھا۔

''سوچو گرینڈ فادر یہاں ہوتے تو کیا کرتے...... کیا وہ تمھاری طرح بے بس نظر آتے...... ہر گز نہیں...... جتنا میں انہیں ملے بغیر ہی جان سکا ہوں اسی کے باعث کہتا ہوں کہ وہ ایسے وقت میں وہ ہی کرتے جو اس وقت میرے ذہن میں ہے۔ تمھیں ایک بار پھر سے ان کا بیٹا بننے کی ضرورت ہے۔ یہ لو...... ان کی ڈائری پڑھو...... جو انھوں نے تمھارے لیے لکھی تھی۔ تمھیں آج اس کی ضرورت ہے کیونکہ تم بھولتے جارہے ہو کہ وہ تمھیں کہاں اور کیسا دیکھنا چاہتے تھے۔ مجھے تو تب ہی شک پڑ گیا تھا جب تم نے دائنا کی موت پر ایسے ری ایکٹ کیا تھا جیسے وہ تمھاری محبوبہ ہو یا بہن...... اگر گرینڈ فادر تمھاری جگہ ہوتے تو انہوں نے دائنا کی موت پر پتا ہے کیا کرنا تھا۔ ایک لمحے کو اپنی تاش کی بازی سے نظر ہٹانی تھی اور پھر اگلے ہی وار پر ساری بازی چت کر جانی تھی۔ لیکن تم...... پیٹی...... تم تو حساس ہوتے جارہے ہو...... یہ ایک ڈان کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ تم اس ڈائری کو پڑھو اور خدا کے لیے پھر سے گرینڈ فادر والے ڈان بننے کی کوشش کرو...... ورنہ تم عنقریب کوئی عالم بن جاؤ گے اور اصل ڈان کا قتل ہو جائے گا۔''

پیٹرسن کے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحتیں وقتی طور پر مفقود ہو چکی تھیں۔ اس لیے جیفرسن جو کرنے کو اسے کہتا گیا پیٹرسن اس پر اپنی رضامندی دیتا چلا گیا۔

☆......☆......☆

سبین بار بار میران کو کال کر رہی تھی لیکن میران نجانے کہاں گم تھا کہ اس کی کال پک ہی نہیں کر پا رہا تھا۔ جو بات وہ اسے بتانے کے لیے بے چین تھی وہ اس کے علاوہ بھلا اور کسے بتا سکتی تھی۔ ربیکا تو ویسے ہی منظر سے روپوش تھی، بابا کو وہ بتا نہیں سکتی تھی۔ ایسے میں بس ایک چھوٹی ہی بچتی تھی۔ اس نے فوراً سے زویا کو کال کرلی۔

''زویا...... میں...... ایکسپیکٹ کر رہی ہوں۔'' اس نے پرجوش انداز میں کہا۔ آگے سے زویا کو شاید کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ سبین نے اسے کتنی بڑی خوشی کی خبر سنائی ہے۔ وہ کچھ نہیں بولی۔

''زویا! تم خالہ بننے والی ہو......'' اب کے سبین نے سادہ سے الفاظ میں زویا کو بتایا۔ پھر اس کے آگے وہ بولتی رہی اور بس بولتی ہی رہی...... زویا کو اپنی اور میران کی باتیں بتاتی رہی...... یہ بھی کہ میران یہاں سے جا کر بھی نہیں گیا...... وہ ہر وقت اس کے ہونے والے بچے سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ یہ باتیں ختم ہوئیں تو وہ زویا کو اپنے نئے گھر کی باتیں بتانے لگی...... اس کی ڈیکوریشن، اس کے کمرے، کھڑکیاں، پردے، صوفے، کچن، کراکری...... ہر چیز کہاں سے لی، کتنے کی ملی، اس کا رنگ،

پائیداری...... وہ ہر ہر بات کو اتنی تفصیل سے بتا رہی تھی کہ سات سمندر پار بیٹھی زویا آسانی سے اس کے نئے گھر کا ہو بہو نقشہ بنا سکتی تھی۔اور جب بولتے بولتے سبین تھک گئی اور گھر کی بتائی جانے والی چیزوں کی فہرست بھی ختم ہوگئی تو اسے محسوس ہوا کہ زویا اس کی باتیں تو سن رہی ہے، لیکن ضرورت سے زیادہ خاموش ہے۔ وہ ہوں، ہاں بھی نہیں کر رہی تھی۔ اپنی ہی رو میں بہتے ہوئے سبین کو اس بات کا احساس بہت دیر سے ہوا تھا۔

''ہیلو......!'' دوسری طرف زویا کی موجودگی کا یقین کرنے کے لیے اس نے ہیلو کہا۔

''جی...... میں سب سن رہی تھی۔'' زویا نرم لہجے میں بولی۔

''کیا کوئی بات ہوئی ہے زویا......؟''

''جی......'' زویا نے سادگی سے کہا تھا۔

''کیا......؟'' اس نے چھوٹی سی چیخ ماری......

زویا کی اس چھوٹی سی جی نے اس کا جی ہلکا کر دیا۔

''بابا کا ایک ہلکا سا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ ان کی طبیعت پہلے سے ہی بہت خراب تھی۔ ایکسیڈنٹ نے انہیں مزید نڈھال کر دیا ہے۔'' زویا نے اپنے مدھم لہجے میں سبین کے اعصابوں پر دھما کا کر دیا۔ وہ بولنا تو سیکھ گئی تھی لیکن ابھی اسے اتنا احساس حاصل نہیں ہو سکا تھا کہ ایسی ہولناک باتوں کو کیسے بتاتے ہیں۔ نرم لہجے سے، غصے سے، عجلت سے، فکر سے یا پریشانی سے......

وہ میران کے نیو یارک آنے کا دن تھا۔ جب سبین نے پاکستان جانے کے لیے ٹکٹ کٹوا لیا تھا۔ جب سے میران شکاگو گیا تھا، اس دن کے بعد سے وہ پہلی بار نیو یارک آ رہا تھا۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے ملنے کے لیے بے چین تھے لیکن اس نئی خبر نے سارا پلان خراب کر دیا تھا۔

''میں پاکستان جا رہی ہوں میران...... بابا کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔'' پیکنگ کرتے ہوئے اس نے عجلت میں میران کو کال کی۔

''کیا......؟ کب......؟ کیسے......؟'' وہ بھی سبین کی طرح ہی پریشان ہوا تھا۔

''زیادہ نہیں ہوا...... زویا نے کہا ہے کہ پریشان ہونے والی کوئی بات نہیں...... لیکن میرا دل بہت گھبرا رہا ہے میران...... اس لیے میں جا رہی ہوں۔''

''ٹھیک ہے...... جلد ملاقات ہوتی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔''

''سیین......!''فون بند ہونے سے پہلے میران پھر سے بول اٹھا۔

''ہاں......بولو میران......''

''ممی کا کچھ پتا چلا......؟''اس نے کسی آس میں پوچھا تھا۔جلدی جلدی سامان پیک کرتی سیین کے ہاتھ رک گئے تھے۔ اس کے پاس میران کے لیے ربیکا کے حوالے سے کوئی بھی اچھی یا بری خبر نہیں تھی۔

''نہیں میران......''اس نے مایوسی سے کہا تھا۔اور اس ساری افراتفری میں وہ اہم بات کرنا بھول گئی کہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ربیکا کی فکر میں گھلتے ہوئے میران کو شاید یہ ہی بات تھوڑا آسرا دے سکتی تھی۔

ربیکا کہاں تھی،کس حال میں تھی،کوئی نہیں جانتا تھا۔

☆......☆......☆

ربیکا،الیگزینڈر کے چیری کے باغات میں نہیں تھی۔وہ تو وہاں گئی ہی نہیں تھی اور نہ ہی وہاں جانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ سیین اور میران سے اس نے وہاں جانے کا جھوٹ بولا تھا۔کیونکہ جہاں وہ جانا چاہتی تھی وہاں کے بارے میں پتا چلنے پر میران نے اسے وہاں جانے کی ہرگز اجازت نہیں دینی تھی۔

اسے پتا چلا تھا کہ پاکستان سے ایک بہت مشہور عالم صاحب اپنی جماعت کے ساتھ امریکا آرہے ہیں۔چند روز یہاں قیام کر کے وہ چھوٹے چھوٹے دوسرے ممالک کا بھی دورہ کرنے والے تھے۔ان کی جماعت اپنے مذہب کی تبلیغ کے لیے یہ ٹور کر رہی تھی۔

نجانے ربیکا تک ان عالم صاحب کی شہرت کس انداز میں پہنچی تھی کہ وہ انہیں کوئی بہت ہی پہنچا ہوا بزرگ سمجھے ہوئے تھی۔وہ مانے ہوئے تھی کہ ان کے پاس چلّے کاٹنے کے ایسے ایسے طریقے ہیں جو کسی اور کے پاس نہیں ہیں۔ربیکا نے ایک میگزین میں ان کی آمد کی خبر پڑھی تھی۔اس کا دستور تھا کہ وہ،ہر وہ میگزین اور اخبار خرید لاتی تھی جس میں پاکستان سے متعلق خبریں ہوا کرتی تھیں۔وہ ہر چینل دیکھا کرتی تھی جو پاکستان کا تھا یا جس میں پاکستان کے پروگرام لگا کرتے تھے۔اسکرین پر نظر آتے چہروں میں وہ عیسیٰ کو تلاش کیا کرتی تھی۔خاص کر روڈ شو تو وہ کسی صورت نہیں چھوڑا کرتی تھی۔ہجوم کو دیکھتے ہوئے وہ عیسیٰ کا چہرہ مل جانے کی دعا کیا کرتی تھی۔

اخبار و میگزین میں بھی وہ بس چہرے ہی دیکھا کرتی تھی کہ شاید کہیں عیسیٰ فریادی بن کر اسے تلاش کر رہا ہو......

اب جن عالم صاحب کے پاس وہ آئی تھی اس کا بھی اس نے اسی میگزین میں پڑھا تھا۔متوجہ ہونے کی وجہ صرف یہ تھی کہ یہ عالم صاحب ہو بہو اس فقیر جیسے تھے جو ربیکا کو ایک بار سرگودھے میں ملا تھا اور اس نے ربیکا کو وہاں سے بھاگ جانے کی تنبیہ کی تھی،میران کی زندگی کی حفاظت کا اشارہ دیا تھا اور پھر ربیکا کے اصرار پر واپس گھر جا کر عیسیٰ کا انتظار کرنے کا کہا تھا۔اسی باعث

ربیکا نے ان عالم صاحب پر تحقیق کا آغاز کیا تھا۔ وہ شکلوں کی مماثلت کو اپنی تلاش کی منزل سے نسبت دے رہی تھی۔ جیسے جیسے وہ عالم صاحب کو کھوجتی جا رہی تھی حیران ہوتی جا رہی تھی۔ وہ صرف عالم دین، تفسیر القرآن ہی نہیں بلکہ ایک بہت پہنچے ہوئے بزرگ تھے اور بعض لوگ تو ان کے بارے میں یہاں تک کہتے تھے کہ وہ غیب کا علم بھی جانتے ہیں۔ ربیکا نے اسی دن فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ان کے پاس ضرور جائے گی۔

لیکن درحقیقت عالم صاحب کسی غیب کا علم نہیں جانتے تھے۔ ہاں یہ تھا کہ وہ بہت سے دوسرے علوم جانتے تھے۔ روحانی، نوری، علمی، عملی...... ان کے ساتھ ایک ہجوم بھی آیا تھا جو چھوٹی چھوٹی مساجد میں جا کر اپنے مذہب کی تبلیغ کر رہا تھا۔ یہاں ان کا قیام چند دن کا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے دوسرے بہت سے کم و بیش دس ممالک کا ٹور کرنا تھا اور یہ ٹور کا سلسلہ چھ ماہ بعد جا کر ختم ہونا تھا۔

جس وقت ربیکا ان کے پاس پہنچی...... وہ ایک چھوٹی سی مسجد کے فرش پر چٹائی بچھائے اپنی جماعت کے لوگوں کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ ربیکا کی وہاں آمد پر سب نے اسے دیکھا تھا۔ عورتوں کا حصہ دوسری طرف تھا۔ وہ مردانہ حصے میں ہی چلی آئی تھی۔ عالم صاحب کا نوالہ بھی ان کے منہ میں نہیں جا سکا تھا۔ پتا نہیں کیا دیکھا انہوں نے ربیکا کے چہرے میں جو وہ رک سے گئے۔

''عورتوں والا حصہ اوپر ہے۔''

''مجھے اس حصے میں نہیں جانا...... کیونکہ ویسے بھی میں مسلمان نہیں ہوں۔ مجھے بس آپ سے ملنا ہے۔''

عالم صاحب اسی وقت کھانا چھوڑ کر ہاتھ دھو کر اس کے پاس چلے آئے۔

''ہاں...... بولو......''

''میں آپ کی جماعت میں شامل ہونا چاہتی ہوں۔'' اس نے التجاء آمیز لہجے میں کہا۔ وہ جانتی تھی کہ اصل کام سے پہلے اسے بہت سے نقل کام کرنے پڑیں گے۔

''لیکن تم نے تو کہا کہ تم مسلمان نہیں ہو......''

''آپ کا کام دیکھ کر شاید ہو جاؤں۔''

''لیکن ہماری جماعت تو صرف مردوں پر مبنی ہے۔ یہاں ایک بھی عورت نہیں ہے۔''

''میں مرد اور عورت کی تفریق سے نکل چکی ہوں۔ عمر سے بہت پہلے ہی میری زینت خیر آباد ہو چکی ہے۔ آپ کا اعتراض بے بنیاد ہے۔'' اس نے کمال کا جواب دیا تھا۔

بابا جی نے اسے مسکرا کر دیکھا تھا۔ پھر انہوں نے بخوشی ربیکا کو اپنی جماعت میں شمولیت کی اجازت دے دی تھی۔ ربیکا

اسی دن سے ان کے ساتھ رہنے لگی۔

وہ لوگ مختلف جگہوں پر جاتے...... مختلف چھوٹے بڑے قصبوں میں، دیہاتوں میں، چرچوں، مساجد، مندروں میں...... وہاں جا کر وہ اپنے مذہب کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ چھوٹے بڑے بہت سے سیمینار تھے جو ان کی آمد پر پہلے سے ہی مرتب تھے۔ ایک بڑی شیڈول تھا، جس میں نہ کھانے کا ہوش تھا اور نہ پینے کا...... بابا جی کی خوراک تو ویسے بھی بہت کم تھی، یہ ہی حال ان کی جماعت کے باقی لوگوں کا بھی تھا۔ وہ سب پیٹ بھرنے کے لیے کھاتے تھے، رغبت کے لیے نہیں......

ربیکا بھی ان کے ساتھ ہر جگہ پر جا رہی تھی، لیکن وہ ان کے کسی کام کی نہیں تھی۔ بدقسمتی سے مذہب کو لے کر اس کی معلومات ایک عام آدمی سے زیادہ کی نہیں تھیں۔ نہ اسے عیسیٰ کے مذہب کے بارے میں زیادہ کچھ پتا تھا اور نہ ہی اپنے مذہب کے بارے میں...... ایسے میں وہ ان کے لیے کیسے مددگار ثابت ہو سکتی تھی۔ محض کھانا پرونسے اور کپڑے دھونے کا کام وہ خود بھی کر سکتے تھے۔ عالم صاحب تحمل سے اسے دیکھتے رہے تھے۔ وہ شاید جانتے تھے کہ وہ تبلیغ کی غرض سے ان کے پاس نہیں آئی ہے بلکہ اس کے مقاصد کچھ اور ہیں۔ جو وہ جلد یا بدیر بتا دینے والی تھی۔

"تمھاری آنکھوں میں ایک دکھ ہمہ وقت تیرتا رہتا ہے ربیکا......!"

"آپ نے اس دکھ کو دیکھنے میں دیر نہیں کر دی......!"

"مجھے بتاؤ...... کس بات کا غم ہے تمھیں......؟"

"مجھے اپنے شوہر کے جھوٹے وعدے کا غم ہے جبکہ وہ تو جھوٹ بھی نہیں بولا کرتا تھا۔ کہاں جھوٹا وعدہ کرنا......"

"کیا جھوٹا وعدہ کیا تھا اس نے تم سے......؟"

"اس نے کہا تھا کہ وہ میرے پاس واپس آئے گا، لیکن وہ نہیں آیا...... وہ نہیں آیا...... میں نے پچیس سال انتظار کیا اس کا...... پچیس سال...... لیکن اس کا وعدہ ایفا نہیں ہوا...... وہ نہیں آیا......" اور روتے روتے ربیکا نے ان کو ساری کہانی سنا دی تھی۔ اس فقیر کے بارے میں بھی جس نے عیسیٰ کے آنے کی تصدیق کی تھی۔

"کیوں تلاش نہیں کرنے دیا انہوں نے مجھے عیسیٰ کو...... کیوں واپس بھیج دیا مجھے...... مجھے بھی وہاں ہی اس کے ساتھ ہی مر جانے دیا ہوتا...... مجھے اپنی جان عیسیٰ کی جان سے عزیز تو نہیں تھی۔"

"انہوں نے تمھیں میران پر قانع ہو جانے کا بھی تو کہا تھا۔"

"ہاں لیکن میں نہیں ہو سکی...... اور نہ ہی ہو سکتی ہوں۔"

"شاید وہ تمھاری زندگی چاہتے ہوں۔"

"کس لیے...... نہیں...... وہ ایک فراڈ تھے اور کچھ نہیں...... ان ہی کی وجہ سے اب میرا کسی عالم دین، کسی فقیر، درویش پر اعتبار نہیں رہا...... سب محض وقت کو ٹالتے ہیں۔ جھوٹے دلاسے دیتے ہیں۔ خدا بھی ان کے ساتھ مل جاتا ہے ورنہ میں نے خدا کو راضی کرنے کے لیے کیا کیا نہیں کیا...... دن رات عبادت گاہوں میں گزارا...... صبح چرچ کھلنے سے بہت پہلے ہی وہاں موجود ہوتی اور پھر رات گئے نکلتی...... میں نے عیسیٰ کے بدلے خدا کو عیسیٰ کے واسطے دیے، محمد کا واسطہ دیا، دو نبیوں کے واسطے دے کر میں نے ایک انسان کو پانا چاہا۔

خدا کو ہر طرح کے لالچ دیے...... عبادت کا لالچ، ریاضت کا لالچ، اسے خوش کرنے کا لالچ...... میں عالموں کے پاس گئی، بزرگوں سے دعا کے لیے کہا، بچوں کو کہا کہ وہ اس کے لیے دعا کریں کہ عیسیٰ آجائے...... میں بلا امتیاز ہر مذہب کے ماننے والوں کو ملتی رہی کہ نجانے کس کا خدا سچا ہو۔ کہیں اس سے دعا مانگنے میں کسی خاص خدا کا نام لینے میں کوتاہی نہ رہ جائے۔ عیسیٰ کے معاملے میں میں کوئی غلطی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میں نے میری کا نووینا کیا، نو بدھ میں پیدل چرچ جا کر نو نو گھنٹے لگاتار دعائیں مانگتی رہی تھی۔ میں نے درباروں پر چادریں چڑھائیں، ذوالجناح کے جلوس کی راکھ اپنے سر میں ڈالی، بدھ دانت تجوری دیکھنے کے لیے میں نے دھکے سہے۔ چرچوں کے آگے موم بتیاں جلا جلا کر میں نے اپنی ساری دولت خدا کو خوش کرنے کے لیے لٹا دی، لیکن خدا خوش نہیں ہوا تھا۔"

"اب تک اسے آجانا چاہیے تھا۔ یا اسے تم تک پہنچ جانا چاہیے تھا یا قرار کو...... لیکن تم تک دونوں ہی نہیں پہنچے...... نہ قرار نہ وہ......" عالم صاحب نے دکھ سے کہا۔

آنے والے دنوں میں ربیکا مزید تن دہی سے ان کا کام کرنے لگی تھی۔ جو کہ کسی بچے کے کام سے زیادہ کا نہیں ہوتا تھا۔ عالم صاحب حیران تھے کہ جب وہ خدا سے اس قدر ناراض ہے تو وہ خدا کے کاموں میں اتنی تن دہی سے کیوں شامل ہو رہی ہے۔ مذہب کا کام کر کے اسے کون سا سکون ملتا ہے۔ جب کہ ہر کام میں اس کا انتشار بھی واضح تھا۔ جسمانی نقل و حرکت کا بھی اور ذہنی بے چارگی کا بھی...... اس سب کے باوجود ربیکا عالم صاحب کا دل جیتنے میں کوئی کوتاہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اور اگر ربیکا یہ سمجھتی تھی کہ عالم صاحب اس بات کے حوالے سے لاعلم ہیں تو یہ اس کی غلط فہمی تھی۔

پھر ایک ایک کر کے سارے ممالک کے ٹور مکمل ہو گئے۔ جماعت سمیت عالم صاحب کے واپس جانے کا بھی وقت نزدیک آگیا۔ ربیکا نے ابھی تک اپنا مدعا بیان نہیں کیا تھا۔ جس کا عالم صاحب کو پہلے دن سے انتظار تھا۔

"ہم کل واپس جا رہے ہیں ربیکا......!"

"جانتی ہوں۔"

"پھر وہ بات کر گزرو جس کے لیے تم پچھلے چھ ماہ سے ہمارے ساتھ ہو......"

ربیکا نے چونک کر ان کی طرف دیکھا تھا۔تو وہ آج تک کوئی بھی کردار اچھے سے نبھا ہی نہیں سکی تھی۔ سوائے عیسیٰ کی بیوی کے۔

"میں جانتا ہوں کہ نہ تو تمھیں تبلیغ سے کوئی سروکار ہے اور نہ ہی جماعت کی خدمت سے...... یہ سب تم کسی اور چیز کے لیے کر رہی ہو......اب اپنا مدعا بیان کر گزرو......"

"جی...... مجھے آپ سے ایک کام ہے۔ انتہائی ضروری......"

"کیا......؟"

"مجھے غیب کا علم جاننا ہے......"

عالم صاحب نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی خواہش انہیں بچگانہ لگی تھی۔

"میں تو غیب کا علم نہیں جانتا......"

"پھر یہ بتا دیں کہ یہ علم کہاں سے سیکھا جاتا ہے۔"

"یہ سیکھا نہیں جاتا...... یہ وارد ہوتا ہے۔"

"اس کی واردات کہاں سے ہوتی ہے......؟"

بابا جی بے بس ہو گئے۔ ربیکا کے پاس ہر جواب کے بدلے میں ایک نیا سوال تھا۔

"آپ کے پاس اعداد کا علم ہے۔ میں جانتی ہوں۔ آپ کے شاگرد اس بارے میں چرچا کر رہے تھے۔ میں سن چکی ہوں ان کی باتیں...... ساتھ وہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ آپ اس علم کا استعمال انتہائی ضرورت کے وقت ہی کیا کرتے ہیں۔ میں نے آپ کو اپنی ساری کہانی سنا دی ہے۔ بتائیں کیا میں ضرورت مند نہیں ہوں۔"

عالم صاحب ربیکا کی طرف دیکھنے لگے تھے۔ انہیں سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ اس کا کیا جواب دیں۔ ہاں وہ اعداد کا علم جانتے تھے لیکن اس کے ذریعے وہ کسی کے زندہ یا مردہ ہونے کا کیسے پتا چلا سکتے تھے۔

"ٹھیک ہے...... میں تمھارے لیے اعداد کا حساب لگاؤں گا، لیکن اس کے لیے میری ایک شرط ہے۔"

"مجھے ہر شرط منظور ہے۔"

"نتیجہ جو بھی نکلا تمھیں اس پر قانع ہونا ہوگا۔ مطمئن ہونا ہوگا۔"

"میں وعدہ کرتی ہوں کہ ایسا ہی ہوگا۔ اگر آپ نے بتایا کہ وہ مر چکا ہے تو میں دوبارہ کبھی یہ نہیں کہوں گی کہ وہ زندہ ہے اور واپس آئے گا۔"

''پھر ٹھیک ہے۔کل جانے سے پہلے میں تمھیں اپنے علم سے جتنا جان سکا تمھیں بتادوں گا۔'' عالم صاحب نے وعدہ کر لیا تھا۔

وہ رات ربیکا اور عالم صاحب دونوں پر ہی بہت بھاری گزری تھی۔ عالم صاحب اور ربیکا دونوں اس سوچ میں غرق تھے کہ حساب کے بعد نجانے کیا صورت حال نکل کر سامنے آتی ہے۔ غیر متوقع طور پر ربیکا قدرے مطمئن تھی۔ وہ واقعی دل سے اب بابا جی کے بتائے حساب پر قانع ہو جانے والی تھی۔

اگلے دن واپس پاکستان کے لیے جاتے ہوئے بابا جی نے ائیر پورٹ پر ایک بند لفافہ ربیکا کو تھمایا تھا۔

''اس میں میرے کل حساب، میرے کل علم کی تحریر ہے۔اسے میرے جانے کے بعد کھولنا......'' بابا جی نے ہدایت دی تھی۔

ربیکا نے ان کی ہدایت پر سختی سے عمل کیا تھا۔ جہاز کے رن وے پر پرواز کرنے کے اگلے پل اس نے بند لفافہ کھول لیا تھا۔اور پھر اندر کی تحریر پڑھ کر وہیں بے ہوش ہو کر گر گئی تھی۔

☆......☆......☆

بابا کا ایکسیڈنٹ زیادہ تو نہیں ہوا تھا۔ سائیکل پر کہیں جاتے ہوئے کسی ٹھوکر سے گر گئے تھے۔ معمولی خراشیں آئی تھیں جو ڈاکٹر کے بقول کچھ دنوں میں چلی جانے والی تھیں لیکن بابا کچھ زیادہ ہی لاغر دکھائی دے رہے تھے۔ سیلن کو پہلے لمحے میں تو یقین ہی نہیں آیا کہ یہ وہی بابا ہیں جنہیں وہ پانچ ماہ پہلے چھوڑ کر گئی تھی کہ اب وہ اپنا کام ختم کر کے ہی آئے گی۔ اس کا کام ختم ہو گیا تھا۔ وہ تو جلدی ہی آگئی تھی ورنہ اس کا خیال تھا کہ وہ بابا اور زویا سے کم از کم ایک سال تو ضرور ہی جدا رہے گی۔ خدا نے اپنے بندے حائک کے ذریعے اس پر مہربانی کی تھی۔ وہ جلد ہی واپس آگئی تھی۔ لیکن بابا...... وہ ایسے کیوں دکھ رہے ہیں جیسے برسوں کی مسافت کاٹ چکے ہوں، اور اب اپنی اصل منزل پر جانے کے لیے بالکل تیار ہوں۔

''مجھے معاف کر دیں بابا...... میں ہی ہوں آپ کی نالائق اولاد...... آپ کو اس نہج تک پہنچانے والی......'' بابا کے سینے کے ساتھ لگ کر وہ رونے لگی تھی۔ اس نے بابا کو خوش کرنے اور اپنا بوجھ اتارنے کے لیے اپنے ساتھ نیویارک میں اس بار بیتنے والی ساری آپ بیتی سنا دی تھی۔ کلیے کا طغرا، رپورٹ کی خرابی، حائک کی شکل میں خدا کی مدد...... گروپ کا اس سے انتقام لینا...... چار ماہ کی اذیت اور ایک بار پھر سے ایڈم کی شکل میں خدا کی رحمت......

بابا خاموشی سے اس کی ساری باتوں کو سنتے رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

''اب سب ٹھیک ہو گیا ہے۔ اب میں نے وہ کام چھوڑ دیا ہے۔ اب مجھے کسی کا ڈر نہیں......''

بابا تب بھی خاموش رہے تھے۔

''کیا آپ نے مجھے معاف نہیں کیا بابا......؟''

''میں نے تمھیں معاف کر دیا ہے بین...... جب خدا نے تمھیں معاف کر دیا ہے تو میرے پاس ناراض رہنے کا تو کوئی جواز ہی نہیں رہتا......بس خود کو معاف نہیں کر پا رہا...... مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ میری بیٹی اکیلی اتنی تکلیفیں جھیلتی رہی ہے۔''

''میری تکلیف ان تکلیفوں کے آگے کچھ بھی نہیں جو میں نے آپ کو دی ہیں۔'' وہ بابا کے سینے کے ساتھ لگی پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی تھی۔

''تم نے مجھے اس کے بارے میں نہیں بتایا...... وہ کیسا ہے۔'' بابا نے پیار سے میران کے متعلق پوچھا تھا۔

''وہ بالکل آپ پر گیا ہے بابا...... میری ہر غلطی کے باوجود مجھ سے محبت کرنے والا......''

اب کی بار اس نے بابا کو اپنی اور میران کی ہنگامی شادی اور پھر ہونے والے بچے کی خوشخبری سنائی تھی۔ اس کی سوچ بس اتنی ہی تھی کہ اگر بابا اس کی فکر لے کر بستر پر بیمار پڑے تھے تو اب وہ اس فکر سے آزاد ہو جائیں...... کیونکہ ان کی بیٹی اب خوش تھی۔ خدا نے اسے ہر پریشانی سے باہر نکال لیا تھا۔

''چلو میں اب سکون سے مر سکوں گا کہ میرے بعد ایک شخص ہے جو میری بیٹی کا مجھ جتنا ہی خیال رکھے گا۔'' بابا نے کہا تھا۔ بین تڑپ کر رہ گئی تھی۔

''ایسی باتیں نہ کریں بابا...... خدا کے لیے......'' ایک عرصے بعد تو وہ ہوش میں آئی تھی اور بابا ایسی باتیں کر کے اسے پھر سے دنیا سے غافل کرنا چاہتے تھے۔

''ٹھیک ہے...... میں ایسی باتیں نہیں کرتا...... لیکن تم اس کی باتیں کرو بس...... مجھے بتاؤ کہ وہ کیسا ہے، کیسا دکھتا ہے۔ کیا کرتا ہے۔ تمھارا خیال تو رکھتا ہے ناں......؟''

بابا نے فرمائش کی تو وہ خوش ہو کر بابا کو میران کے بارے میں بتانے لگی، جسے بابا بڑی چاہ سے سنتے رہے۔

''آہ...... میں نے خدا سے اسی کی دعا کی تھی۔ تمھاری خوشیوں کی...... تمھاری راحت کی...... لگتا ہے خدا نے میری دعا سن لی ہے۔'' بابا نے اسے خود میں بھینچ لیا تھا۔ وہ واقعی مطمئن ہو چکے تھے۔

''میرے بعد تم وہاں چلی جانا...... یہاں نہ رہنا...... زویا کو بھی اپنے ساتھ لے جانا......'' ایک رات بابا نے اسے نصیحت کی تھی۔ وہ لفظ ''میرے بعد'' پر جھرجھری لے کر رہ گئی تھی۔

''آپ بار بار ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں بابا...... کیوں مجھے غم میں دھکیلتے ہیں۔''

''ایک نہ ایک دن تو یہ ہونا ہی ہے نا بیٹا...... کوئی باپ اپنی اولاد کی آخری سانسیں نہیں دیکھنا چاہتا...... اس لیے وہ موت کو

خوشی سے قبول کر لیتا ہے۔''

سیین رونے لگی تھی۔ بابا کی بات سچی تھی لیکن دردناک بھی...... ہائے یہ دنیا کی اٹل حقیقتیں...... ان سے کوئی کیسے نظریں پھیر سکتا ہے۔

☆......☆......☆

''کیا واقعی......؟'' میران کو جیسے سیین کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

''ہاں......'' وہ مسکرائی تھی۔ بابا کی صحت کی پریشانی میں سے چند لمحے نکال کر اس نے میران کو اس کے باپ بننے کی نوید سنائی تھی۔

''کاش اس وقت تم میرے پاس ہوتی......'' اس نے آگے بھی ایک فقرہ کہا تھا جس نے سیین کے گال سرخ کر دیئے تھے۔

''تم واپس کب آ رہی ہو سیین......؟''

''بابا کی طبیعت نہیں سنبھل رہی میران......''

''میں سمجھ سکتا ہوں۔ تم تسلی سے وہاں رہو...... جب تک بابا کی طبیعت نہیں سنبھل جاتی......''

''بابا ٹھیک ہو جائیں گے تو میں تم سے ان کی بات کرواؤں گی۔ وہ بہت بے تاب ہیں تم سے بات کرنے کے لیے......''

''مجھے بھی ان سے بات کر کے خوشی ہو گی۔''

''اچھا اب میں فون بند کرتی ہوں۔ مجھے بابا کے پاس جانا ہے۔'' سیین نے فون بند کر دیا تھا۔

میران خوش تھا۔ سیین نے اسے اتنی بڑی خوشی کی خبر سنائی تھی کہ اس کی سخت بھوک ہی اڑ گئی تھی۔ وہ باپ بننے والا تھا۔ موبائل سائیڈ پر پھینک کر وہ مسرت سے اچھل کر بیڈ پر گرنے کے سے انداز میں دراز ہو کر تصور ہی تصور میں اپنے ہونے والے بچے کی غیر واضح شکل بنانے لگا تھا۔ یہ تصور، یہ تخیل اتنا اچھوتا تھا کہ وہ پہروں اس میں گم رہ سکتا تھا۔ وہ، سیین، ان کا بچہ اور ایک خوشحال گھرانہ...... یہ تو جنت سے بھی بڑھ کر کچھ تھا۔

اسی غیر متوقع خوشی میں میران، سیین سے وہ پریشان کن بات کرنا تو بھول ہی گیا تھا جس نے پچھلے کافی دنوں نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔

یہ پچھلے ایک ہفتے سے ہو رہا تھا کہ وہ اپنے اردگرد کچھ مشکوک لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ یہ مشکوک لوگ صرف اس کی جاب کی جگہ شکاگو میں ہی ہوتے تو شاید وہ اس سب کو اپنا وہم سمجھ کر ٹال جاتا...... لیکن یہ ہی لوگ وہ نیویارک میں بھی اپنے گھر کے اردگرد دیکھ رہا تھا۔ وہ تین سرد مہر سے چہرے جب متواتر اسے نظر آنے لگے تو وہ پریشان ہو گیا تھا۔ آنے والے دنوں میں وہ اس سلسلے میں

پولیس کی مدد لینے کا سوچ ہی رہا تھا کہ وہ مشکوک چہرے اچانک سے نظر آنا بند ہو گئے۔

☆......☆......☆

آنے والے دنوں میں بابا کی صحت روز بروز گرتی ہی رہی...... سبین ان کو دیکھ دیکھ کر فکر مند ہوتی جا رہی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ ان کی طبیعت اس قدر خراب ہو جائے گی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ اب وہ آ چکی ہے تو سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن بابا شاید اپنی زندگی سے اکتا چکے تھے۔ ان کے اندر کوئی امنگ باقی نہیں بچی تھی۔ ہر اگلی سانس انہیں زیاں محسوس ہو رہی تھی۔ تب ہی وہ ہر وقت موت کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ سبین کے اعصاب ان دنوں بری طرح سے جھنجھنائے ہوئے تھے۔ اسے ایک طرف سے خوشی ملتی تھی تو نجانے کیوں دوسری طرف سے دوگنا دکھ اس کا منتظر ہوتا تھا۔ نجانے اس کی قسمت سیاہ اور سفید کی اس قدر رسیا کیوں تھی کہ وہ دونوں کو ساتھ لے کر بنا ڈولے چل رہی تھی۔

سبین کو اپنے اردگرد اندھیرے بڑھتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ وہ بابا کو لے کر شہر کے سب سے بڑے اور مہنگے ہسپتال میں گئی تھی۔ وہاں ہی اسے پتا چلا تھا کہ جن لوگوں کو ہم نہیں بچا سکتے انہیں پیسے کے بل بوتے پر بھی نہیں بچا سکتے...... اماں جب مر رہی تھی تب اس کے پاس اتنے ہی پیسے ہوتے جتنے اس وقت تھے تو تب وہ اماں کو بھی نہیں بچا سکتی تھی، کیونکہ ان کی تقدیر میں یہ ہی لکھا تھا۔ ''موت......'' جو شاید اب بابا کی تقدیر میں بھی لکھی جانے والی تھی۔

موت رفتہ رفتہ ان کے قریب آ رہی تھی۔ وہ باعلم تھے اور کہیں اندر ہی اندر یہ بات سبین بھی جانتی تھی۔

''کتنی عمر ہو سکتی ہے میری بیٹا...... سو سال بھی ہو جائے تو تب بھی ''اخیر'' یہ ہی ہوتا ہے کہ واپس جانا ہوتا ہے۔''

بابا کس قدر مطمئن انداز میں ایسی باتیں کرتے تھے اور سبین رونے لگی تھی۔ زویا بھی ان دنوں بہت خاموش خاموش تھی۔ سبین کو ڈر تھا کہ کہیں وہ پھر چپ نہ ہو جائے۔ وہ میران کو کال کرتی تھی۔ بابا کی طبیعت کے بارے میں بتاتی تھی۔ وہ دور تھا، سوائے اس کی سننے کے اور اسے دلاسا دینے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ بابا کو خوش کرنے کے لیے اس نے اسکائپ پر بابا کی اور میران کی بات کروائی تھی۔ میران کی تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ بابا سے کیا بات کرے۔ وہ بات کرنے سے زیادہ شرمارہا تھا۔ بابا بیماری میں اسے دیکھ کر مشکل سے مسکرا رہے تھے۔

''میری بیٹی کوہ نور سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ تمہیں ساری زندگی اس کوہِ نور کی حفاظت کرنی ہو گی میرے بیٹے......'' بابا کی آواز میں دکھ تھا۔ شاید ہر باپ کو مرتے وقت یہ ہی فکریں ہوتی ہیں۔ اسے آگے کی دنیا، جنت، دوزخ کی تو پروا ہی نہیں ہوتی...... اسے تو اس جنت کی پروا ہوتی ہے جو اس کے گھر میں موجود ہوتی ہے۔

''میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں بابا کہ اس کوہِ نور سے پہلے ہر مشکل، غم کو خود برداشت کروں گا۔''

میران نے کہا تھا۔ جسے بابا سمیت سبین کو بھی نہال کر دیا تھا۔ ایسی پریشانی میں وہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں ہی تو تلاش کر رہی تھی۔ یہ چھوٹے چھوٹے آسرے، دلاسے ہی تو اسے یک جان رکھے ہوئے تھے، ورنہ تو وہ آنے والے لمحوں کو سوچ کر ہی رو رو کر پاگل ہونے والی تھی۔

ہسپتال میں بابا کے ساتھ کسی دن زویار ہتی تھی اور کسی دن وہ خود...... ایک رات بابا نے اسے خود کہا تھا کہ وہ ان کے پاس رہے۔ اس نے زویا کو گھر جانے کا کہہ دیا تھا۔ رات میں بابا نے اسے جگایا تھا۔

''سبین......!''

بابا کی آواز پر سبین کا دل کانپ کر رہ گیا تھا۔ اسے اماں کی آخری رات یاد آ گئی تھی، تب اماں نے بھی اسے اسی طرح پکارا تھا اور اب بابا بھی......

''جی بابا......؟'' اپنی آواز کو حد درجہ نارمل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

''میرے پاس آؤ......''

وہ کانپتے وجود اور دھڑکتے دل کے ساتھ بابا کے پاس گئی تھی۔

''میں نے تمھارے لیے ایک چیز بنائی ہے۔''

''کیا......؟'' وہ اشتیاق سے پوچھنے لگی۔

''میرے بیڈ کے نیچے پڑا صندوق کھولو گی تو وہ تمھیں نظر آ جائے گی۔ مگر...... مگر اسے میرے مرنے کے بعد کھولنا...... وہ میرا سب کچھ ہے۔ میں تمھیں وہ تو نہیں دے سکا جو ایک باپ ہونے کے ناطے مجھے دینا چاہیے تھا لیکن جو میرے بس میں ہے وہ دے رہا ہوں تمھیں...... مجھے پتا ہے تمھیں چونے سے نفرت ہے لیکن تم یہ بھی تو جانتی ہو کہ چونا ہی تمھارے باپ کا واحد اثاثہ ہے۔ وہ اس کے علاوہ تمھیں اور دے بھی کیا سکتا ہے۔ میں ایک بدقسمت باپ ہوں۔ میں نے ساری زندگی گھر کے ایک کونے میں بیٹھ کر گزار دی۔ باہر کی دنیا کی مشکلات کو جھیلنے کے لیے اپنی نازک بیٹی کو آگے کر دیا۔ میں اس کی چھوٹی چھوٹی خواہشات بھی پوری نہیں کر سکا۔''

''پلیز بابا......! ایسی باتیں مت کریں۔'' وہ دکھی ہو رہی تھی۔ اور دکھی سے بھی زیادہ شرمندہ......

''میں نے ساری زندگی کیا ہی کیا ہے۔ اپنی گزری زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو سوائے ایک خبطی اور سنکی آدمی کے مجھے اور کچھ نظر نہیں آتا...... میری بیٹی دنیا کا مردانہ وار مقابلہ کرتی رہی...... جو ذمہ داریاں میری تھیں ان کو وہ نبھاتی رہی اور میں کھڑا منہ دیکھتا رہا...... میں نے اسے کانٹوں پر چلنے کے لیے ننگے پاؤں چھوڑ دیا۔ اسے گود میں اٹھانا تو دور...... میں اسے مضبوط جوتے بھی نہ لے

کر دے سکا......"

"مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہے بابا......"

"جب جب تمھیں اپنی گزری زندگی پر پچھتاوا ہو تو تم مجھے بد دعا دے دیا کرنا سیبن......اس سے تمھارا پچھتاوا کم ہو جائے گا۔ مجھے برا نہیں لگے گا، بلکہ میری روح کو سکون ملے گا۔"

"ابھی آپ سکون سے سو جائیں بابا......"

"گھر کو بیچ دینا......"

"جی اچھا......"

"میران کے پاس چلی جانا......"

"جی......"

"زویا کو بھی ساتھ لے جانا......"

"جی ٹھیک......"

وہ چاہتی تھی کہ کسی بھی طرح بابا مطمئن ہو کر سو جائیں......

پھر ایسا ہی ہوا تھا۔ بابا مطمئن ہو کر سو گئے تھے۔ ہمیشہ کے لیے......

☆......☆......☆

"خوشی کے ساتھ غم ہے۔ رزق کے ساتھ بھوک ہے اور زندگی کے ساتھ موت......نجانے ہر چیز جوڑے کی شکل میں ہی کیوں ہے۔ اور پھر یہ بھی قباحت ہے کہ یہ چیزیں جوڑوں کی حالت میں ہی انسانوں پر اترتی ہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک انسان تمام عمر بس خوشی کو ہی محسوس کرتا رہے اور غم اس کے پاس نہ آئے......اس کے پاس رزق کی فراوانی ہو اور بھوک کا اسے اندازہ تک نہ ہو......یا وہ قیامت تک جیتا ہی جائے اور موت کا اسے کوئی خوف نہ ہو......"

میں نے ایک دن بابا سے کہا تھا اور بابا نے مسکرا کر میری طرف دیکھا تھا۔

"اندھیرا نہ ہو تو تارے بھی کسی کام کے نہیں ہوتے سیبن......تاروں کی روشنی دیکھنے کے لیے اندھیرے کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اسی طرح خوشی کو محسوس کرنے کے لیے غم کا وجود بھی ضروری ہے۔ رزق کے ساتھ بھوک ہے، صحت کے ساتھ بیماری ہے۔ اور زندگی کی اہمیت جاننے کے لیے موت کا خوف بھی انسان کے ساتھ اسی لیے منسلک کیا گیا ہے۔" بابا نے جواب دیتے ہوئے میری تسلی کرنا چاہی تھی، لیکن شاید بابا نہیں جانتے تھے کہ وہ اس وقت بوڑھے ہو چکے تھے اور میں جوان تھی۔ جوان لوگوں

کے انتشار کو یہ باتیں تب تک بوڑھی لگتی رہتی ہیں جب تک وہ خود بوڑھے نہ ہو جائیں۔

☆......☆......☆

بابا کی تدفین کے بعد اسے سنبھلتے سنبھلتے بہت وقت لگ گیا تھا۔ حالانکہ بابا کی موت کا غم ان کی زندگی میں ہی ان کی باتوں نے کم کر دیا تھا اور بابا کافی عرصے سے ہسپتال میں بھی رہے تھے۔ پھر بھی وہ گھر کے خالی پن میں ان کی کمی کو شدت سے محسوس کر رہی تھی۔ پہلے وہ کونا خالی ہوا تھا جہاں پر اماں چکی چلایا کرتی تھیں۔ اب وہ کونا بھی خالی ہو چکا تھا جہاں پر بابا بیٹھے چونے کا کام کیا کرتے تھے۔ کونے کیا ختم ہوئے تھے اس کی زندگی ہی بے رنگ بن گئی تھی۔ جن دو کاموں سے اسے سخت نفرت تھی وہ ختم ہو چکے تھے۔ اپنے مالکوں سمیت...... پھر بھی وہ خوش نہیں تھی۔ جو وہ چاہتی تھی وہ ہو گیا تھا۔ پھر بھی اس کا دل کرتا تھا کہ یہ دونوں کام پھر سے زندہ ہو جائیں۔ اماں کی چکی کی گھوں گھوں پورے گھر میں گونجے...... اور بابا کی ٹھک ٹھک اور ریگ مال مارنے کی کھرچ کھرچ کی آواز اس کے کانوں میں درد پیدا کرے۔ وہ ان دنوں آوازوں کو ترس گئی تھی اور ان دنوں بے حد حساس ہو رہی تھی۔ وحشت جیسے اس کے دل میں بھر دی گئی تھی۔ اسے کسی پل چین نہیں مل رہا تھا۔

''میں پاکستان آ رہا ہوں۔ مجھے لگ رہا ہے کہ تمہیں اس وقت میری ضرورت ہے۔'' ایک دن میران نے اس سے کہا تھا۔ سبین کی باتوں سے اس نے سبین کی موجودہ حساس حالت کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ سبین کو اس وقت کسی جذباتی سہارے کی اشد ضرورت ہے۔ لیکن سبین نے میران کو پاکستان آنے سے منع کر دیا تھا۔

''نہیں...... اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے میران...... جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ اب میں جلد ہی ہمیشہ کے لیے امریکہ آنے والی ہوں۔ بس زویا کے پیپرز بن جائیں۔''

''اپنا خیال رکھنا...... اور جلد آنے کی کوشش کرو......'' میران نے تاکید کی تھی۔

وہ اکیلی پاکستان میں تھی۔ دکھ کے ساتھ ساتھ تنہائی اور اذیت بھی جھیل رہی تھی۔ یہ بات میران کو پریشان کر رہی تھی۔ اس کا تقریباً روز ہی فون آنے لگا تھا۔ وہ کبھی اس سے معمول کی باتیں کرتی تھی۔ کبھی رونے بیٹھ جاتی تھی۔ بابا کے کمرے میں وہ اکثر بابا کو یاد کرنے بیٹھ جاتی تھی۔ کیلی پر لٹکے ہوئے ان کی کپڑے دیکھتی، ان کے چونے کے اوزار، سانچے...... بابا کے ہاتھوں کے بنے ہوئے ماڈل...... ایک ایک میں بابا کی بو رچی ہوئی تھی اور یہ سب تھا کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

پہلے اسے چونے سے نفرت تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ اور اب وہ چونے سے ڈرنے لگی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ بابا کو دیا گیا کوئی دکھ چونا اس سے لے لے گا...... بابا کی اذیتوں کا بدلہ چونا اس سے لے گا۔ چونے کی بوریاں اس نے چچا کریم کی دکان سے لڑکے بلوا کر انہیں مفت میں اٹھوا دی تھیں۔ ان بوریوں کے ڈھیرے سے اسے اتنا ڈر لگنے لگا تھا کہ وہ

رات کو سوتے میں اٹھ کر بیٹھ جایا کرتی تھی، اور پتھرائی جامد بوریوں کو گھورتی رہا کرتی تھی۔ اسے وہم ہو گیا تھا کہ یہ ڈھیر اسے اپنے اندر دفن کر لے گا۔ اس کے زندہ جسم کے اوپر قبر کا ڈھیر بنا کر ہی دم لے گا۔

کام کرنے کو تو اس کا دل پہلے بھی مائل نہیں ہوتا تھا، اب تو بالکل کرنے کی کوئی وجہ ہی نہیں رہی تھی۔ کیونکہ نہ تو پیسوں کی کمی تھی اور نہ ہی ضرورت...... پھر بھی اس کا دل نہیں کر رہا تھا کہ وہ بابا کے سارے سامان کو بیچ دے یا پھینک دے...... چھوٹی چھینیاں، تانبے، تسلے، ڈوئی، استعمال اور غیر استعمال شدہ رنگ مال...... بے معنی چیزیں اس کے لیے سارے معنی بن گئی تھیں۔ بے ضرر او زار اسے ضرر پہنچا رہے تھے۔ خاموش آوازیں اس کے اعصابوں پر سوار تھیں۔

ایسے ہی ایک دن اسے صندوق کا خیال آیا تھا جس کے بارے میں بابا نے کہا تھا کہ وہ اس کے مرنے کے بعد اسے کھولے...... بابا کے کمرے میں جا کر اس نے زویا کی مدد سے ان کی چارپائی کے نیچے سے ان کا پرانا اور قدیم صندوق نکال لیا تھا۔

صندوق کے اوپر تو بابا کے پرانے کپڑے تھے اور نیچے نئے کپڑوں تلے ایک ''طغرا'' تھا جو کہ اخبار میں لپٹا ہوا تھا۔ اخبار کے اوپر ہی ایک کاغذ بھی تھا جس پر ''سبین اور زویا کے نام...... '' لکھا ہوا تھا۔ یہ خط بابا نے ان دونوں کے لیے لکھا تھا۔

اس نے اخبار ہٹایا، طغرا دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی تھی۔ وہ طغرے کو دیکھتے اگلے پل ہی جیسے خود بھی کوئی طغرا بن گئی تھی۔ چونے کا پکا اور مضبوط طغرا...... کبھی نہ ٹوٹنے والا......

وہ طغرا ایک ''لوح'' پر مشتمل تھا۔ قرآن کی ''بنیادوں'' کے الفاظ پر مبنی ''لوح''...... بارہ بائے بارہ کا وہ طغرا اس قدر عالیشان تھا کہ وہ حیران رہ گئی تھی کہ کیا یہ واقعی بابا نے بنایا ہے؟ کیونکہ وہ طغرا انسانی ہاتھوں سے بنا ہوا تو لگتا ہی نہیں تھا۔ گولڈن کا کام ایسا کیا گیا تھا جیسے واقعی میں چونے پر سونے کے ورق چڑھے ہوں۔ ایسی نفیس لکھائی جیسے کوئی ماہر خطاط سالوں میں صرف ایک اسی طغرے کو لکھ پایا ہو۔ حیرانی سے زیادہ وہ شاکڈ رہ گئی تھی۔ افشاں کا کام، نچل نگینوں کا کام...... اور مور پنکھ لگے ہوئے...... دنیا کے بازار میں اس طغرے کی کوئی قیمت ہوتی تو سات دریاؤں سے بھی زیادہ ہوتی......

لیکن وہ طغرا کسی غیر مرئی مخلوق نے نہیں بلکہ بابا نے ہی بنایا تھا کیونکہ اس میں سے بابا کے ہاتھوں کی خوشبو آ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ بابا کو افشاں، گولڈن پتی وغیرہ سے کتنی چڑ تھی۔ افشاں ان کی سانسیں بے ترتیب کر دیتی تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے اس کے لیے یہ سب کام کیا تھا۔ اس طغرے کو شاندار بنانے کے لیے...... اور اپنا ''شاہکار'' بنانے کے لیے......

''یہ خط بھی ہے آپی......'' زویا نے خط کھولا نہیں تھا بلکہ اسے پکڑا دیا تھا۔ سبین نے وہ خط پکڑ کر اونچی آواز میں پڑھنا شروع کر دیا۔

''پیاری بیٹی...... سبین اور زویا......!

میں وہ بدقسمت باپ ہوں جسے اپنے آخری وقت میں وصیت لکھنی چاہیے، لیکن میں ایک خط لکھ رہا ہوں۔ وصیت اس لیے نہیں لکھ سکا کہ میرے پاس ایسا کچھ ہے ہی نہیں جس کی میں وصیت کروں۔ ایک فن تھا، وہ میں تمھاری خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ اسے میں نے اتنی محنت سے بنایا ہے کہ جتنی محنت سے میں نے اپنی پوری زندگی میں کام کیا ہے۔ یہ ہی وہ شاہکار ہے جو میں بنانا چاہتا تھا۔ اسے تم اپنے نئے گھر میں لگانا...... یہ ''قرآنی لوح'' ہے۔ کہتے ہیں جس گھر میں لگے اس میں سے برکت نہیں جاتی...... اپنے نئے گھر میں اسے لگاؤ گی تو مجھے ایسا لگے گا کہ میں بھی تمھارے ساتھ ہوں۔ تم جب چاہو مجھے محسوس کر سکو گی اور میں بھی تمھیں......

سبین...... میرے مرنے کے بعد جلد از جلد زویا کو اپنے ساتھ لے کر امریکا چلی جانا......

فقط تمھارا تہی داماں باپ......''

خط پڑھ کر اور لوح سینے کے ساتھ لگا کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی اور پھر نجانے کتنی ہی دیر روتی رہی تھی۔

☆......☆......☆

گھر سبین نے بیچ دیا تھا۔ یہ کام جلدی ہی ہو گیا تھا۔ تایا نے گھر کو خریدنے میں دلچسپی لی تھی کسی اور پارٹی کے ذریعے...... لیکن اس نے گھر تایا کو نہیں بیچا تھا۔ تائی بھی بابا کے مرنے پر آئی تھیں۔ وہ سبین کو گلے سے لگانا چاہتی تھیں لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ سبین نے انہیں دور سے ہی پرے رہنے کا اشارہ کر دیا تھا۔

''اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے تائی......'' میت پر ہی اس نے بلا جھجک کہہ دیا تھا۔

وہ نرم دل تھی۔ معاف کرنا جانتی تھی، لیکن کچھ لوگوں کو آپ معاف بھی کر دیں تو دل میں ان کی جگہ نہیں بنا سکتے...... تائی بھی انہی میں سے ایک تھیں۔ اسے اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ رشید کی شادی شدہ زندگی کیسی جا رہی ہے یا اسے کن کن مشکلات کا سامنا ہے کیونکہ رشید کا معاملہ اس نے اللہ پر چھوڑ دیا تھا، اور جب کوئی معاملہ اللہ پر چھوڑ دیا جاتا ہے تو پھر درمیان میں خود نہیں رہا جاتا...... یہ دیکھنے کے لیے بھی نہیں کہ اللہ اس بندے کے ساتھ کیا کر رہا ہے۔

ہاں اتنا ضرور ہوا تھا کہ جب اسے پتا چلا تھا کہ رشید کی ڈاکٹر بیوی پہلی ڈلیوری پر ہی اپنی جان نہیں بچا سکی تو اسے خدا کے انصاف پسند ہونے پر پورا یقین ہو گیا تھا۔ ایک ڈاکٹر نے اپنے ساتھ کیا بے احتیاطی کر لی تھی کہ وہ ڈلیوری کے وقت جانبر نہ ہو سکی تھی۔ خیر یہ اللہ کے کام ہیں۔ انسان انصاف کرنے جوگا ہوتا تو دنیا یقیناً بہت پہلے ہی تباہ ہو چکی ہوتی......

ایک ہفتے میں ہی گھر بک گیا تھا۔ چچا کریم نے ہی اسے پھر سے خرید لیا تھا۔ وہ اس گھر کو دوبارہ خرید رہے تھے اور گھر کی ہر چیز سمیت خرید رہے تھے۔ اسے یہ جان کر خوشی ہوئی تھی کہ چچا کریم اس گھر میں کارخانہ لگانے کا سوچ رہے تھے اور بابا کے سارے اوزار اب نئے کارخانے میں استعمال ہونے والے تھے۔ اس نے چچا کریم سے اتنا وقت لے لیا تھا کہ وہ ان کے امریکا

شفٹ ہو جانے سے پہلے انہیں وہاں رہنے کی اجازت دے دیں۔ اسے یہ اجازت بخوشی مل گئی تھی۔

''اگر میرا دل کیا تو کیا میں اس گھر کو دیکھنے آسکتی ہوں...... کبھی کبھی......''

''کیوں نہیں میری جان...... قطب فوت ہوا ہے۔ تمھارا چچا ابھی زندہ ہے۔'' چچا کریم نے اسے سینے سے لگا کر کہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ اس کے اردگرد اچھے لوگ تھے۔

بابا کے بہت سے طغرے جو پڑے ہوئے تھے اس نے وہ بیچے نہیں تھے۔ کچھ گورکن کو دیے تھے۔ کچھ کوڑا چننے والے لڑکے کو...... جو ایک دورہ گئے تھے وہ ان کے لیے بنا آنکھوں اور بنا زبان والے فقیر بابا کا انتظار کرنے لگی تھی۔ عرصہ ہوا فقیر بابا نے اس کی گلی کا رخ نہیں کیا تھا۔ پھر ایک دن وہ جیسے اس کے دل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے آگئے تھے۔

''میں جا رہی ہوں بابا...... ہمیشہ ہمیشہ کے لیے...... شاید اب ہماری کبھی ملاقات نہ ہو سکے...... یہ گھر کارخانہ بن جائے گا۔ ہوسکتا ہے یہاں آپ کو اب کوئی کھانا کھلانے والا نہ رہے۔''

باباجی نے حسب عادت ہاتھ آسمان کی طرف اٹھایا تھا جیسے کہہ رہے ہوں کہ اللہ مالک ہے اور پھر اس کے سر پر پیار دیا تھا۔

''میرے لیے دعا کیجیے گا باباجی...... میرا باپ مر چکا ہے۔ ماں بھی...... اب میرے پیچھے دعا کرنے والا کوئی نہیں رہا......''

وہ ان دنوں اتنی جذباتی ہو رہی تھی کہ بات بات پر رونے لگتی تھی۔ اسے خود سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایسا کیوں ہے۔ وہ پہلے کبھی ایسی نہیں تھی، اور اب تو اسے بالکل ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ وہ ویسے ہی زندگی گزارنے والی تھی جس کا کوئی بھی لڑکی خواب دیکھتی ہے۔ اپنی حالت کو پہلے تو بابا کی موت سے جوڑتی رہی...... پھر گھر کے بک جانے سے...... اور پھر پاکستان سے تقریباً ہمیشہ کے لیے جدا ہو جانے سے...... لیکن پھر رات کے کسی پہر اسے احساس ہوا کہ اس کی بے کلی کی وجہ کچھ اور ہے۔ کیا ہے؟ وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ آنسو اس کی آنے والی زندگی کے آنسو ہیں۔ اس کی آنکھوں نے اس پر ترس کھایا ہے جو ابھی سے رونا شروع کر دیا ہے۔ اس کا دل اس کا خیر خواہ ہے جو ابھی سے بے کل ہے۔ یہ سب آنے والے دنوں کی مشق تھی۔ ورنہ جو وقت اس پر آنے والا تھا، عین ممکن تھا کہ وہ مشق کی عادی نہ ہوتی تو مر جاتی...... خدا کے کام بھی بڑی نفاست سے پایہ تکمیل تک پہنچتے ہیں۔ ساری زندگی موت سے ڈرنے والے کو جب موت آتی ہے تو وہ بے حد پرسکون نظر آتا ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ اسے اپنے بندوں کو کس آوے میں کتنا پکانا ہے۔

انہی دنوں اسے نجانے کیوں بابا کی کہی ہوئی ایک بات یاد آئی تھی جس میں انہوں نے بتایا تھا کہ صدیوں پہلے دھرتی پر

آٹھ دنوں تک اندھیرا چھایا رہا تھا۔ ان آٹھ دنوں میں نہ تو سورج نے اپنی شکل دکھائی تھی اور نہ ہی چاند نے...... اور اس اندھیرے کی وحشت سے نجانے کتنے لوگوں کی موت ہوگئی تھی۔ ضیا ریزی کی بندش کی وجہ سے چار سو کافور ریزی پھیل چکی تھی۔

پتا نہیں کون سی منحوس گھڑی تھی جب اسے یہ بات یاد آئی تھی اور اسے یہ بات کیسے نہ یاد آتی......

دو دن ہو چکے تھے سورج نے اپنی شکل نہیں دکھائی تھی۔ اگر چہ یہ ویسا اندھیرا تو نہیں تھا جیسا صدیوں پہلے ہوا ہوگا، لیکن سورج کی یہ ہلکی سی گمشدگی بھی سبین کو ایسی لگی تھی جیسے اس نے زندگی بھر سورج دیکھا ہی نہیں...... وہ سورج کی شکل ہی بھولنے لگی تھی۔

دیوانوں کی طرح روز صبح اٹھ کر وہ آسمان میں سورج کو ڈھونڈا کرتی تھی۔ سورج کی روشنی تو نظر آتی تھی لیکن سورج نہیں...... رات میں بھی اماوس کا راج چل رہا تھا۔ اور سب سے بھیانک چیز...... کافور کی بو......

یہ بو کہاں سے آرہی تھی وہ نہیں جانتی تھی۔ پہلے پہل وہ یہ ہی سمجھی تھی کہ ساتھ کے میو ہسپتال کے مردہ خانے سے یہ بو آرہی ہے لیکن پھر اسے اپنے اس خیال کی خود ہی تردید کرنی پڑی...... جس بو کو وہ اپنے بچپن سے محسوس کرتی آرہی تھی وہ ایک دم سے کیسے اتنی تیز ہوگئی کہ اس کے اعصاب پر ہی سوار ہوگئی۔ پھر اس نے سمجھا کہ بابا کی موت کی وجہ سے یہ سب محسوس کر رہی ہے۔ لیکن گھر کی ایک ایک چیز کو اچھی طرح رگڑ رگڑ کر دھلوا لینے کے باوجود بھی جب بات نہ بنی تو اس پر انکشاف ہوا کہ اس بو کا ماخذ تو اس کا اپنا وجود تھا۔ یہ پر انتقال خوشبو اس کے اپنے جسم سے آرہی تھی...... کافور کی بو...... کافور کا بیج اس کے اپنے اندر کہیں لگ چکا تھا۔ اور بھیانک بات یہ تھی کہ اس کی آبیاری کون کر رہا تھا......؟

”کیا ہوا آپی......؟ آپ مجھے ان دنوں کچھ عجیب عجیب لگ رہی ہیں۔“ زویا جو ساری زندگی خود عجیب رہی تھی سبین سے پوچھ رہی تھی۔ اس کا مطلب سبین تو پھر پاگل پن والی حرکات کر رہی تھی۔ سخت گھبراہٹ لیے ہوئے وہ بس دو ہی کام کیے جا رہی تھی۔ ایک روئے جا رہی تھی اور دوسرا اس گھر سے جلد از جلد بھاگ جانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھی۔

گھر بکنے کے بعد ایک مہینہ تک اسے رجسٹری اور انتقال کا انتظار کرنا پڑا...... پھر زویا کے ویزے کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔

میران کو اس نے کہہ دیا تھا کہ جیسے ہی ٹکٹ کنفرم ہوگا وہ اسے بتا دے گی۔ میران خوش تھا...... زویا بھی بہت خوش تھی......

وہ جو کبھی گھر سے باہر نہیں نکلی تھی اب امریکا جا رہی تھی۔ گھر میں سامان کم ہی تھا۔ وہ سارا سامان تو اپنے ساتھ لے کر نہیں جا سکتی تھی۔ اس لیے اس نے کچھ سامان لے لیا تھا اور باقی اڑوس پڑوس کی لڑکیوں میں بانٹ دیا تھا۔

ڈلیوری میں دو ماہ باقی رہ گئے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ ڈلیوری امریکا میں ہی ہو جائے...... اگر زویا کے ویزے میں دیر ہو جاتی تو پھر کافی زیادہ دیر ہو جانی تھی۔ اسے ڈلیوری تک اور پھر بعد میں بھی کچھ عرصہ کے لیے یہاں ہی رکنا پڑنا تھا، لیکن خوش قسمتی تھی کہ زویا کے ویزے کا مسئلہ حل ہو گیا۔

خوش قسمتی سے......؟؟؟یا بد قسمتی سے......؟؟؟وہ اپنی باقی کی ساری زندگی اس بات کا فیصلہ نہ کر سکی......

اور وہ تھا سورج کی بندش کا ٹھیک آٹھواں روز......

☆......☆......☆

اس نے میران کو اپنی فلائٹ کی ٹائمنگ کا بتا دیا تھا۔میران نے کہا تھا کہ وہ اسے لینے آجائے گا۔دبئی سے نیویارک کے لیے روانہ ہونے سے پہلے اس نے پھر سے میران کو کال کر دی تھی کہ وہ پورے وقت پر ائیر پورٹ آجائے۔ایک تو وہ تھکی ہوئی تھی، دوسرا جلد از جلد اپنے گھر پہنچنا چاہتی تھی اور تیسرا ڈاکٹر نے اسے اس حالت میں آرام کا مشورہ دیا تھا۔وہ ڈاکٹر کی ہدایت کے خلاف جاتے ہوئے اتنا لمبا سفر کر رہی تھی۔

''اوکے میں ٹائم پر پہنچ جاؤں گا۔اگر کہو تو ابھی پہنچ جاتا ہوں۔وہاں تمہارا انتظار کر لوں گا۔'' میران نے محبت سے کہا۔ساتھ ہی آہ کے ساتھ ایک سسکاری بھری تھی۔

''کیا ہوا......؟''

''دیوار پر کیل لگا رہا تھا۔ہتھوڑی ہاتھ میں لگ گئی ہے۔''

''تم دیوار میں کیل لگا ہی کیوں رہے ہو......؟''

''بس تھا کوئی کام......'' وہ شرارت سے بولا......لیکن اس نے وجہ نہ بتائی۔

''میرے گھر کی نئی دیواروں کو تم خراب مت کرو میران......ورنہ میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں......'' اس نے اس طرح کہا تھا کہ تمام مسافروں نے پلٹ پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔سبین جھینپ گئی تھی۔

''تمام گھڑیاں، فوٹو فریم لگے تو ہوئے ہیں گھر میں......پھر تم کیل ٹھونک کر کیا تعمیر کرنا چاہ رہے ہو......؟''

''ہاں سب کچھ لگا ہوا ہے گھر میں......بس ایک بچے کی فوٹو نہیں ہے۔وہ لگا رہا تھا۔'' اس نے شوخی سے کہا۔سبین جھینپ کر مسکرائی......ساتھ بیٹھی زویا تو پہلے سے ہی دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔

''اچھا رکھتی ہوں......''

''اوکے......'' میران نے کہہ کر فون بند کر دیا تھا اور پھر سے دیوار میں کیل ٹھونکتے ہوئے وہاں بچے کی تصویر لگانے لگا تھا۔ایک لمبے عرصے کے بعد سبین کی آمد کی وجہ سے میران نے گھر کو بہت زیادہ سجا رکھا تھا۔دیواروں پر وشنگ کارڈز لگائے تھے اور کمرے میں جا بجا پھول اور پھولوں کی پتیاں بکھری رکھی تھیں۔سبین نے اگر اسے باپ بننے کی خوشی دی تھی تو اب وہ بھی اس کا شاندار استقبال کرنا چاہتا تھا۔

ڈور بیل بجنے پر وہ اسٹول سے نیچے اتر آیا تھا۔ پھر دروازے تک گیا تھا۔ خوردبین سے اس نے دیکھا تھا کہ باہر ایک سیاہ فام لڑکا ہاتھ میں چھوٹا سا کاغذ لیے کھڑا تھا۔ میران نے فوراً پہچان لیا تھا۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے جب میران بچے کے فوٹو فریم والی تصویر لے کر گھر کی طرف آرہا تھا تو اسی سیاہ فام نے ایک کاغذ اسے دکھاتے ہوئے اس پر لکھے پتے کی بابت پوچھا تھا۔ میران نے اسے اچھی طرح سے پتا سمجھا دیا تھا، جو کہ کافی مشکل اور پیچیدہ کام تھا کیونکہ کاغذ پر لکھی لکھائی بے حد باریک تھی اور جگہوں کے نام بھی غلط لکھے گئے تھے۔ وہ سیاہ فام بے چارہ نجانے کب سے اس پتے کی تلاش میں خوار ہوا پھر رہا تھا۔ میران نے اسے ہاتھ کے اشاروں سے بھی سارا نقشہ واضح کر کے بتا دیا تھا۔

اب وہ ہی سیاہ فام پھر سے گھر کے دروازے کے باہر کھڑا تھا۔ شاید اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا جو اس نے میران کو دوبارہ تنگ کیا تھا۔

''جی......؟'' میران نے دروازہ کھول کر استفسار سے پوچھا تھا۔

''مجھے یہاں سے سمجھ نہیں آرہا...... کیا آپ ایک بار پھر سے میری مدد کر سکتے ہیں؟'' وہ بیچارگی سے بولا۔

میران نے اسے سمجھانے کی غرض سے ایک بار پھر سے اس باریک لکھائی والے ایڈریس کو غور سے پڑھنے کی کوشش میں سر جھکایا تھا۔ اور عین اسی لمحے لوہے کا سخت راڈ میران کے جھکے ہوئے سر کے اوپر پوری طاقت سے کھینچ کر مارا گیا تھا۔

ضرب لگنے کے اگلے ہی پل خون کا ایک فوارہ میران کے سر کی پشت سے جاری ہوا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا تھا۔

☆......☆......☆

بنفشی رنگ کی وہ آسمانی دھار سبین کے دیکھتے ہی دیکھتے سرخ ہو گئی تھی۔ گہری اور چمکتی ہوئی سرخ...... وہ رنگ اتنا مسلط کن تھا کہ باقی سارے رنگوں کو کھانے لگا تھا۔ افق کی لالیوں کو جیسے آگ لگی ہوئی تھی۔ سورج ڈوبنے کی تیاری کر رہا تھا اور آج سورج کے تیور ایسے تھے جیسے وہ اپنے ساتھ ساتھ پوری دنیا کو بھی لے کر ڈوبنے کی تیاری کر رہا ہو......

جہاز کے اندر بیٹھی سبین باہر قدرت کا ایسا ہولناک منظر دیکھ رہی تھی۔ یہ سفر نجانے کیوں ختم نہیں ہو رہا تھا۔ ایک بے کلی، ایک بے نام سی بے چینی اس کے اندر اترتی جا رہی تھی۔ خدا خدا کر کے جہاز نے نیویارک ائیرپورٹ پر لینڈ کیا تھا۔ جہاز سے اتری تو سامان کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ کنوئیر پر وہ نجانے کب سے زویا کے ساتھ اپنے سامان کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن اس کا سامان آ ہی نہیں رہا تھا۔ تب ہی اس کے سیل فون پر میران کی کال آئی تھی۔ سبین کال ریسیو کرنے ہی والی تھی کہ دو لمبے چوڑے سے آفیسر اس کے پاس آئے تھے۔

''ہمارے ساتھ چلیے......'' ان میں سے ایک نے رعب سے کہا تھا۔ سبین اس کی شکل دیکھنے لگی تھی۔ بھلا آج کیا تھا اس

کے پاس...... وہ بالکل بھی نہیں گھبرائی۔ اب تو وہ یہ کام ہی چھوڑ چکی تھی۔ پھر وہ کیوں گھبراتی......

''لیکن کیوں......؟''

''جتنا کہا ہے اتنا کیجیے میم...... اپنے اور ہمارے لیے مشکلات پیدا مت کریں۔ ہمارے ساتھ چلیے......'' رعب نے غصے میں تبدیل ہونے میں وقت نہیں لیا تھا۔

اسی دوران وہ میران کی کال ریسیو نہیں کر سکی...... شاید وہ باہر کھڑا اس کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے آفیسر کو آگے چلنے کا اشارہ کیا...... آفیسر اسے سختی سے بازو سے تھام کر راہداریاں عبور کرتا ہوا ایک کمرے میں لے آیا تھا۔ جہاں اس کا سارا سامان پہلے سے ہی موجود تھا۔ زویا کو باہر ہی بٹھا دیا گیا تھا۔ وہ اکیلی اندر لائی گئی تھی۔ زویا پریشان ہوئی تھی لیکن سبین نے اسے تسلی دی تھی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ آفیسرز تسلی کر کے ابھی واپس آجائے گی۔ یہ چیکنگ معمول کا حصہ ہوتی ہے۔

جس کمرے میں وہ لائی گئی تھی وہاں وہ پہلے بھی بہت بار آچکی تھی، لیکن پہلے کی بات اور تھی۔ اب وہ مطمئن تھی۔ وہ یہ کام چھوڑ چکی تھی۔ اب اسے کا جوپت کے تیل کو لے کر، ''امن'' تنظیم کی ''رکن'' ہونے کو لے کر یا کسی بھی چیز کو لے کر کوئی جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب اس کے پاس ایسا ویسا کچھ تھا ہی نہیں...... کیمیکل ٹیسٹ کیا...... یہ لوگ جس طرح کا مرضی ٹیسٹ کروا لیتے اب اس کے پاس سے کچھ بھی برآمد ہونے والا نہیں تھا۔

میران کی کال آرہی تھی۔ اس نے کال کاٹ کر اسے میسج لکھ دیا کہ ''ویٹ''...... لیکن کال بند ہو کر پھر آنے لگی۔

کمرے میں خاموشی تھی۔ کسی چیز کا انتظار کیا جارہا تھا۔ پھر کمرے میں دو تین آفیسرز ایک دم سے داخل ہوئے تھے۔ ان کے چہرے سرد تھے۔ وہاں موت کی سی مردنی طاری تھی۔ ان کے ساتھ کتے بھی تھے۔ وحشی اور سدھائے ہوئے کتے...... سبین نجانے کیوں گھبرا گئی۔

''اپنا فون بند کرو......'' آتے ہی اسے ہدایت دی گئی۔ کال ریسیو کرتے کرتے اس نے کال کاٹ دی، لیکن لمحے بھر بعد میران کی کال پھر سے آنے لگی۔ اس نے ٹیون والی جگہ پر ہاتھ رکھ کر آواز کو مدھم کر لیا تا کہ وہ سن نہ سکے۔

اسکے سامنے اس کا سوٹ کیس کھول دیا گیا تھا اور اب اسے تیز دھار چاقو کی مدد سے چاروں طرف سے بری طرح سے ادھیڑا جانے لگا تھا۔ وہ چلانا چاہتی تھی کہ یہ سب کیا کیا جارہا ہے، لیکن اس نے اس سب کو نظر انداز کر دیا...... کوئی بات نہیں...... جب انہیں کچھ نہیں ملے گا تو وہ اس سے معذرت کر لیں گے۔ ایک سوٹ کیس کی قیمت ہی آخر کیا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ احتیاط کرے۔ زیادہ پریشان نہ ہوا کرے۔ میران بھی اسے یہ ہی سب کہتا تھا۔ اب اگر وہ اس کی بات نہ مانتی تو کس کی مانتی......

''یہ کیا ہے......؟'' آفیسر اس ''لوح'' کے بارے میں پوچھ رہا تھا جو بابا نے بنائی تھی۔ جو بابا کا ''شاہکار'' تھی۔ وہ جواب کیا دیتی کہ میران کی کال ایک بار پھر سے آنے لگی تھی۔

''یہ کیا ہے......؟'' اب کی بار غصے سے پوچھا گیا تھا۔

''یہ قرآنی لوح ہے۔''

''یقیناً تمھارے ''استادِ محترم'' نے بنائی ہوگی اور تم کل اسے کسی ''میوزیم'' یا ''چرچ'' میں دینے والی ہوگی۔'' طنز سے کہا گیا تھا۔ سب آفیسرز ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے مسکرائے تھے۔ وہ ان کی شکل دیکھنے لگی تھی۔

''یہ میرے بابا نے بنائی ہے اور یہ مجھے کسی میوزیم میں نہیں دینی......'' وہ بولی، لیکن ان لوگوں نے جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں یا سنی تو اس پر یقین کرنا گوارا نہیں کیا۔

''اب کس میوزیم میں دینا ہے تم نے اسے...... ''امن'' تنظیم کی کارکن......'' آفیسر طنز سے کہتے ہوئے آپس میں ذومعنی اشارے کرتے ہوئے پھر سے ہنسے تھے۔

اسے کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ میران کی کال متواتر آ رہی تھی۔ جھنجھلاتے ہوئے اس نے کال پک کر لی یہ کہنے کے لیے کہ وہ اسے تھوڑی دیر بعد کال کرتی ہے۔

''میران ایک منٹ...... میں بعد میں کال کرتی ہوں۔'' کہہ کر وہ فون بند ہی کرنے والی تھی جب ایک دم سے رک گئی تھی۔

''سبین......!'' میران نے اس کا نام پکارا تھا۔ اور ایسے پکارا تھا کہ سبین کی جان نکل کر اس کے حلق میں آ گئی تھی۔ اس نام کی پھونک اتنی وحشت انگیز تھی کہ سبین کا روم روم کانپ اٹھا تھا۔ یہ بس بھری پھونک زمین کی تہ سے ایک لمحے میں سو شیش ناگ نکال کر لائی تھی جو بس چند ہی لمحوں میں سبین کو ڈسنے والے تھے۔

''میران تم ٹھیک ہو......؟'' وہ چلائی تھی۔ اسے ایک دم لگا تھا جیسے دنیا اجڑنے والی ہو۔ اسے ٹھیک لگ رہا تھا۔

''فون بند کرو......'' اسے حکم دیا گیا تھا لیکن اسے پھانسی پر ہی کیوں نہ لٹکا دیا جاتا وہ کال بند کرنے والی نہیں تھی۔ آنسو جو بہت دنوں سے اس کی آنکھوں کا رستہ دیکھ چکے تھے ایک بار پھر سے کسی آبشار کی طرح پھوٹ پڑے......

''میران......'' وہ چلا اٹھی۔

آفیسرز نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس کا یہ چلانا انہیں اس کا معمول کا ڈرامہ لگا تھا۔

''کال بند کرو...... سنا نہیں تم نے لڑکی......'' اسے پھر سے کہا گیا تھا، اور بے حد سختی سے کہا گیا تھا۔ لیکن اس کے چہرے کے کچھ ایسے تاثرات تھے کہ وہ فون اس کے ہاتھ سے کھینچ کر بند نہیں کر رہے تھے۔

"کیا ہے اس کے اندر......" وہ پوچھ رہے تھے اور نجانے کتنی بار پوچھ رہے تھے۔ ان کے ساتھ کتے بھی تھے جو آج بھونک نہیں رہے تھے۔ وہ خاموش تھے لیکن اس کا بر انصیب آج جاگ اٹھا تھا۔ اندر ہی اندر کہیں وہ اس بات کو جان گئی تھی۔

"میران تم ٹھیک ہو......" وہ پوچھ رہی تھی جبکہ وہ جانتی تھی کہ اب کچھ بھی ٹھیک نہیں رہے گا۔

"میں نے تم سے بہت محبت کی ہے سبین...... بہت زیادہ...... اس سے کم جتنی خدا اپنے بندوں سے کرتا ہے لیکن اس سے زیادہ جتنا ایک باپ اپنی اولاد کو چاہتا ہے۔" وہ اٹک اٹک کر جیسے آہوں میں کہہ رہا تھا۔ تصدیق ہو گئی تھی کہ کچھ ہونے والا ہے یا ہو چکا ہے۔

"میں بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں میران......" وہ رونے لگی تھی۔

"اس کے اندر کیا ہے...... بولو لڑکی...... اب کی بار کیا لائی ہو......؟" پوچھا جا رہا تھا۔

"میری محبت کو کبھی مت بھولنا سبین......" وہ کہہ رہا تھا۔ سبین اور زور زور سے رونے لگی تھی۔

"کیا ہوا میران...... میں تو بس آ رہی ہوں۔ پھر میرے سامنے بیٹھ کر کرنا یہ باتیں......"

جواب میں میران نے ایک گہری سانس چھوڑی تھی۔

"کچھ نہیں مری پیاری......"

اگر کچھ نہیں ہوا تھا تو اس کی آواز کیوں ایسی آ رہی تھی جیسے زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہو۔

"حشیش کے کتنے کیپسول ہیں اس کے اندر...... اور کہاں ہیں......؟" پھر سے غصے سے پوچھا گیا تھا۔

"میرے ان بوسوں کو یاد رکھنا جو میں نے تمھارے لبوں پر دیے......"

بس...... بس ایک جملہ میں جیسے اب سب واضح ہو گیا تھا۔

"بولو...... اب کی بار کتنی حشیش لائی ہو......"

"میران...... میں مر جاؤں گی۔" وہ چلائی تھی۔

"مجھے ایک بوسہ دو سبین...... مجھے پھر سے ایک بوسہ دو......"

"میران...... مجھے مت مارو......"

"پلیز سبین...... مجھے ایک بوسہ دو......"

"کال بند کرو......" حکم ہوا...... "بند کرو اپنا ہر بار والا ڈرامہ......"

اس کا ڈرامہ آج ہی تو حقیقت تھا۔ وہ دار پر بھی لٹکا دی جاتی تو یہ بات نہ سنتی اور نہ مانتی......

"میران......" وہ اونچا اونچا رونے لگی۔

''مجھے ایک بوسہ دو سبین......''

اس نے ایسا ہی کیا تھا۔ اسے ایک بوسہ دیا تھا۔ بوسہ اتنا طویل تھا کہ اسے لگا کہ اس کی روح اس کے ہونٹوں کے ذریعے پرواز کر گئی ہو......

''آہ......'' میران نے ایک سانس لی تھی۔ جیسے آخری سانس لی جاتی ہے۔ اور پھر اسے بھی ایک بوسہ دیا تھا۔

''سبین......میری پیاری......''

آفیسر نے لوح کو اوپر لے جا کر پوری طاقت سے ماربل کے ٹیبل کی سطح پر دے مارا تھا۔ لوح ٹیبل پر گرتے ہی چکنا چور ہو گئی تھی۔ چونے کا ایک سفید بادل اٹھا تھا۔ ہر چیز تاریک ہونے لگی تھی۔ وہ میران کے بوسے کو محسوس کرتے ہوئے فق آنکھوں سے ٹوٹی ہوئی لوح کے برادہ برادہ ہوئے بادل کو دیکھ رہی تھی۔ الماس برادہ...... جو اسے کوئلہ کر گیا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس کس بات کا ماتم کرے......

ایک آفیسر نے فون اس کے ہاتھ سے چھین کر بند کر کے پرے پھینک دیا تھا۔ اور اگلے ہی پل وہ بے ہوش ہو کر دھڑام سے پکے سنگی فرش پر گری تھی۔

یہ ''شام'' کا وقت تھا۔ ایک لمحے میں اس کی زندگی سے تین چیزوں کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا تھا۔

بابا کے ہاتھوں کی بنی لوح ٹوٹ گئی تھی۔ سبین کے پیٹ میں میران کا اور اس کا بچہ فوت ہو چکا تھا...... اور...... گھر میں میران نے آخری سانس لی تھی۔



ناول **شام رنگ سیاہ** ابھی جاری ہے۔ اگلی اقساط آپ ہر ماہ کی **20** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

قسط نمبر 13

مجھے یاد ہے بچپن میں بابا مجھے پیار سے ''گڑیا'' کہا کرتے تھے۔تب مجھے یہ نام بہت اچھا لگتا تھا،لیکن بڑے ہونے کے ساتھ ساتھ جوں جوں میرے اندر کا انتشار بڑھتا گیا اور میرے برج کا ستارہ عقرب میرے اندر اپنے زہریلے ڈنگ اتارنے لگا تو مجھے بابا کی ایک ایک چیز کے ساتھ ساتھ اس نام سے بھی چڑ ہوگئی۔بابا جب جب مجھے ''گڑیا'' کہتے تب تب میں غصے سے پاگل ہو جاتی۔بابا کے طغرے توڑ دیتی،ان کے چونے کے آمیزے میں پانی ڈال دیتی،سانچوں کو توڑ مروڑ دیتی۔۔۔بابا ہنستے جاتے اور مجھے مزید طیش آتا جاتا۔۔۔میں مزید کام خراب کیے جاتی۔۔۔

سالوں بعد میں پھر سے اسی موڑ پر آ کھڑی ہوئی ہوں۔زندگی اب مجھے ''قاتلہ'' کا نام دے رہی ہے۔میران کی قاتلہ کا۔۔۔اس کے ہونے والے بچے کی قاتلہ کا۔۔۔وہ مجھے ''قاتلہ'' کہہ کر چڑا رہی ہے اور میں چپ چاپ کھڑی زندگی کی اس چھیڑ کو برداشت کر رہی ہوں۔اب میں زندگی کے طغرے نہیں توڑ سکتی،اس کا گلا نہیں دبا سکتی،اسے بددعا نہیں دے سکتی۔۔۔

سنیے۔۔۔آپ بھی سنیے۔۔۔زندگی کا یہ ہنسنا مجھے بابا کے ہنسنے سے بھی زیادہ طیش دلا رہا ہے۔لیکن۔۔۔میں بے بس ہوں۔

ناگ منی کے پیچھے بھاگتی بھاگتی میں وہ ناگن ثابت ہوئی جو اپنے ہی بچے کھا جاتی ہے۔



اور یہ تیسری بار تھا۔

اس کے خدوخال دیکھتے ہوئے وہ کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں چلی گئی تھی۔ایک بار پھر سے۔۔۔ہاں۔۔۔ایک بار پھر سے اس کے چہرے کا لاابالی پن بھرپور مردانہ وجاہت میں ڈھل چکا تھا۔وہ باپ جو بننے والا تھا۔آنکھیں اس خوشی کے باعث بند ہوتے ہوئے بھی مسکرا رہی تھیں۔اس کی آنکھوں پر ایک باریک سی سیاہ پٹی باندھ دی گئی تھی۔وہ مرنے سے پہلے اپنی آنکھیں عطیہ کرنے کی وصیت کر چکا تھا۔سبین نے سنٹر والوں کو اس کام سے نہیں روکا تھا۔اس کی زندگی تو اس نے اپنی بدقسمتی سے جہنم بنا ہی دی تھی،اب وہ کیا اسے آگے بھی جنت میں نہ رہنے دیتی۔۔۔اس کے بال جدید کٹ کے تھے اور اس پر بہت جچ رہے تھے۔اس کے ہونٹ سرخ تھے۔۔۔گل مہر کے پھولوں کی طرح دہکتے ہوئے اور نمی والے سرخ۔۔۔جیسے وہ کوئی گاڑھا مشروب پی کر ہونٹ صاف کرنا بھول گیا ہو۔آج اپنا خون بہا کر اس نے یہ مشروب پیا تھا۔اس کے نمی والے ہونٹ سبین کو اندر تک بنجر کر رہے تھے۔

وہ بھرپور جوان اور خوبصورت مرد تھا۔ موت کی مردنی نے اس پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ تابوت میں لیٹا ہوا وہ ایسے ہی لگ رہا تھا جیسے میٹھی نیند لے رہا ہے، جیسے اس نے موت کو زندگی کی طرح گلے سے لگا رکھا ہو۔۔۔ اور ابھی جاگ کر سبین کو اپنی بانہوں میں بھر لے گا۔ لیکن یہ میٹھی نیند ابدی تھی۔ کبھی نہ ختم ہونے والی۔۔۔ وہ اُٹھ کر سبین کو گلے سے نہیں لگا سکتا تھا اور سبین اس کے ساتھ جا نہیں سکتی تھی۔ ایسی بے بسی پر سبین کا دل پھٹنے پر آ گیا۔

یہ دیدار تھا کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ یہ ٹرانس تھا کہ ٹوٹنے میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ پتھر کا بت بنی ٹکٹکی باندھے بس دیکھے جا رہی تھی۔ نہ رو رہی تھی اور نہ آہیں بھر رہی تھی۔ آنسوؤں کی دو موٹی لکیریں اس کی دونوں آنکھوں سے اس کے گالوں تک ثبت تھیں۔ وہ بہت رو چکی تھی، اسے سمجھ میں آیا تھا کہ اس کی آنکھوں نے بہت پہلے ہی رونا کیوں شروع کر دیا تھا۔ اس کے دل نے بے کل رہنا کیوں شروع کر دیا تھا۔ کیوں اس کی ناک ہر وقت کافور کو سونگھتی رہتی تھی۔ یہ سب اہتمام کس لیے تھا۔ یہ کس مرحلے کی تیاری تھی۔ میران کی موت کی۔۔۔؟ اگر ایسا ہی تھا تو اس ساری مشق کا کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے اعصاب بہت دھیرے دھیرے سے نارمل سے پاگل پن کی طرف جا رہے تھے۔

میران کے دوست اس کے تابوت کے پاس پھول رکھ رہے تھے۔ طرح طرح کے پھولوں کا ڈھیر اکٹھا ہو چکا تھا اور ان سب پھولوں سے قبر کے پودے کی مہک آ رہی تھی۔ نیاز بو کی۔۔۔ پھر تابوت کو بند کر دیا گیا۔ دیدار کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ سبین نے چلا کر انہیں ایسا کرنے سے روکنا چاہا تھا۔ لیکن اس کی آواز اس کے حلق کی قید سے باہر ہی نہیں نکل سکی تھی۔ وہ قوت رکھنے کے باوجود بھی جیسے صرف چلانے کی صلاحیت سے محروم کر دی گئی تھی۔

''میران عیسیٰ۔۔۔'' عالم صاحب نے اونچی آواز میں میران کا پورا نام لے کر اس کے لیے کی جانے والی آخری دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے تھے۔ سبین اپنے ہاتھ بلند نہیں کر سکی تھی۔ اسے اتنا بھی اندازہ نہیں رہ گیا تھا کہ اس کے وجود کے ساتھ ہاتھ منسلک ہیں یا نہیں۔۔۔

''میران۔۔۔'' آواز کے ساتھ ساتھ اس کا وجود بھی دفن ہونے کے قریب تھا۔

''میران۔۔۔'' اس نام کی قبر اس کے دل میں بن چکی تھی۔ محبت کے دیوتا کا خوش الحال بت اس کے من کے مکروہ مندر میں سج گیا تھا۔

اب میت کو قبر میں رکھا جا چکا تھا۔ پھر سب سبین کی طرف دیکھنے لگے۔ قبر پر پہلی مٹی ڈالنے کا حق اس کا تھا، لیکن وہ بے حس و حرکت اپنی جگہ پر کھڑی رہی۔۔۔ کسی نے سبین کے ہاتھ پکڑ کر جیسے زبردستی قبر پر پہلی مٹی ڈلوائی تھی۔ پھر سب لوگ قبر پر مٹی ڈالنے لگے تھے۔ میران کا گم ہوتا وجود اس کے دل کو تابوت کر رہا تھا۔ وہ مٹی اس پر ڈال رہی تھی، لمحہ بہ لمحہ خود دھنس رہی تھی۔

سانس اس کی گھٹ رہی تھی، دھڑکن اس کی تھم رہی تھی۔ ہوش اس کے گم ہو رہے تھے۔

"میران۔۔۔" بھولی لڑکی۔۔۔ کیا قسمت پائی تھی اس نے۔۔۔

قبر مٹی سے اب دہانے تک بھر چکی تھی۔ گویا واپسی کے تمام رستے بند ہو چکے تھے۔ اور یہ باور کرتے ہی سبین ایک بار پھر سے غش کھا کر گری تھی۔

☆......☆......☆

اس کا دل کسی پتھر کا ہو چکا تھا۔ جس پر اب کسی چیز کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک ایسا پتھر جو ٹھوکروں کی زد میں ہو۔۔۔ نہ کوئی نشیب اسے قبول کرنے پر آمادہ ہو اور نہ کوئی بلندی۔۔۔ دُکھ کی ایک پوری ندی تھی جس میں وہ ڈوب چکی تھی۔ یہ ندی رش جھیل سے زیادہ گہری تھی۔ اس ندی کا پانی بھی رش جھیل کی طرح صاف نتھرا ہوا نہیں تھا، بلکہ گدلا تھا۔ بدبودار۔۔۔ اور اس پر کوئی سہانا منظر منعکس نہیں ہو سکتا تھا۔

میران کی تدفین کے اگلے روز ہوش میں آنے کے بعد وہ اپنے گھر آئی تھی۔ اپنے ڈریم لینڈ۔۔۔ (خوابوں کا نگر) جس نے اس کی زندگی کے خوابوں کو صرف بھیانک تعبیر ہی نہیں دی تھی، بلکہ اس کی آنکھوں کو اس بری طرح سے نوچا تھا کہ اب وہ اس قابل نہیں رہی تھیں کہ زندگی بھر مزید کوئی خواب دیکھ سکتیں۔ زندگی کے خواب والے راج ہنس کے نوکیلے پنجے اس کے ہاتھوں کے علاوہ اس کی روح میں بھی اتر چکے تھے۔ وہ زہریلی ہو چکی تھی۔

میران کی موت کے بعد سے اس گھر کو بند رکھا گیا تھا۔ تفتیش کی کارروائی مکمل ہونے تک۔۔۔ لیکن یہ ایڈم راہل کی مہربانی سے ممکن ہو سکا تھا کہ وہ اس گھر میں داخل ہونے کی اجازت لے سکی تھی۔ آفیسر نے مین ڈور میں چابی گھما کر گھر کا مقفل دروازہ کھول دیا تھا اور ایک بار پھر سے ان ہدایات کو دہرانا شروع کیا جو وہ پہلے بھی دے چکا تھا اور جو سبین نے سنی ہی نہیں تھیں۔

دروازہ کھلتے ہی اس کے کانوں میں ایک نامانوس سی بو داخل ہوئی تھی۔ ایک بار پھر سے۔۔۔ کافور کی بو۔۔۔ وہی بو جس نے اس کا پچھلے کئی دنوں سے پیچھا شروع کیے رکھا تھا اور وہ ٹلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ جبکہ اس بو کو اب نابود ہو جانا چاہیے تھا۔ ان پھولوں تلے جو میران نے سبین کا شاہانہ استقبال کرنے کے لیے گھر کے شروعات سے کمرے تک پھیلا رکھے تھے۔

پھول کسی حد تک سوکھ چکے تھے، اور فرش کے وہ حصے جو پہلے ان کی پنکھڑیوں تلے چھپے تھے اب انہیں واضح کرنے لگے تھے۔ انہی مسلے ہوئے پھولوں کے درمیان ایک خون کی دھار بھی تھی جو پھسلتی ہوئی پھولوں کی روش کے ساتھ ساتھ ہی آگے بڑھ رہی تھی۔ تصور کی آنکھ سے وہ سارا منظر تخلیق کر سکتی تھی۔ میران کا پھٹا ہوا سر۔۔۔ اس کے سر سے بہتا خون۔۔۔ اور پھر رینگتے ہوئے میران کا اپنے کمرے تک جانا۔۔۔ تا کہ وہ آخری بار سبین سے فون پر بات کر سکے۔۔۔ اس کو بوسہ دے سکے۔۔۔ سبین نے

سختی سے آنکھیں بھینچ لیں۔۔۔وہ اپنی تخلیقی قوت کو دفن کر دینا چاہتی تھی، لیکن وہ جتنا خود پر جبر کر رہی تھی تصور اتنی ہی ضد باندھ کر اس کے رگ وپے میں اُترتا جا رہا تھا۔

آنسو جو رکے ہوئے تھے ایک بار پھر سے باہر نکل آئے تھے۔اس کا دل پھٹنے پر آ گیا تھا۔اور یہ دل آخر پھٹ کیوں نہیں جاتا تھا۔ان پھولوں میں کانٹے نہیں تھے پھر بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کانچ پر چل رہی ہو۔۔۔نوکیلے تیز کاٹنے والے کانچوں پر۔۔۔

جن سے بے تحاشا محبت ہو ان کی موت اور بے وفائی پر تو صبر آ سکتا ہے لیکن ان کے قتل پر نہیں۔۔۔ہرگز نہیں۔۔۔

دیواروں پر میران نے چھوٹے چھوٹے کارڈ نصب کر رکھے تھے جس پر اس نے اپنے اور سیبین کے خوشگوار لمحات کی تصویریں بھی لگا رکھی تھیں۔

''مائی لو اینڈ مائی لائف۔۔۔'' ایک کارڈ پر لکھا ہوا تھا۔اس نے آنسو ضبط کیے۔۔۔وہ اس کا ایسا ''لو'' ثابت ہوئی تھی جس نے اس کی ''لائف'' نگل لی تھی۔

''تمھارے بنا میری زندگی ادھوری ہے سیبین۔۔۔!'' کارڈز پڑھتے ہوئے، روتے ہوئے وہ آگے آگے بڑھ رہی تھی۔پھولوں سینچتی کہ وہاں اس کے پاؤں نہ آ جائیں۔ایسا ہوتا تو میران کے خون پر اس کا پاؤں آ جاتا۔وہ دونوں کی قاتلہ تھی۔پھولوں کے مرجھا جانے کی بھی اور میران کے خون کے رسنے کی بھی۔۔۔

''تم نے میری زندگی میں آ کر مجھے دو مزید زندگیاں دی ہیں۔ایک اپنی اور ایک ہمارے ہونے والے بچے کی۔۔۔''

بالآخر وہ کمرے میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔کمرہ پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔وشنگ کارڈ، کینڈلز اور بھی بہت طرح سے سجاوٹ کی گئی تھی اور یہ ساری سجاوٹ بہت نفیس تھی۔میران کے ذوق کے عین مطابق۔۔۔

وہیں کہیں پر ایک بچے کی تصویر بھی گری ہوئی تھی۔وہ تصویر دیوار پر نہیں لگ سکی تھی۔بدشگونیاں پہلے سے ہی شروع ہو چکی تھیں۔اس کا ابارشن تو اسی کمرے میں ہو گیا تھا۔اس کی بیوگی کے ساتھ ہی سب شروع ہو گیا تھا۔

''اگر بیٹی پیدا ہوئی تو اس کا نام میں رکھوں گا اور اگر بیٹا پیدا ہوا تو پھر یہ اختیار تمھیں ہوگا۔''

وہ سوچ سکتی تھی کہ میران یہ سب تحریریں لکھتے وقت کس طرح مسکرا رہا ہوگا۔

چلتے چلتے وہ اس جگہ پر آ گئی تھی جہاں میران نے اسے فون کیا تھا اور اپنی زندگی کی آخری سانسیں لی تھیں۔اس جگہ بے تحاشا خون جما ہوا تھا۔

''مجھے ایک بوسہ دو سیبین۔۔۔!'' میران کے الفاظ اس کمرے میں گونج رہے تھے۔

''پلیز سیبین۔۔۔مجھے ایک بوسہ دو۔۔۔'' اس کی التجا آہ کی صورت نکلی تھی۔اور یہ آواز، یہ الفاظ، یہ آہ، یہ التجا کمرے میں

غار سے نکلی چمگادڑوں کی طرح چکر لگانے لگی تھی اور پھر تھوڑی دیر بعد ان تتلیوں کی طرح مردہ ہو کر زمین پر گر گئی تھی جو کسی وبا یا موسم کی سخت تبدیلی کی وجہ سے اچانک مرجاتی ہیں۔

فرش پر بیٹھ کر وہ ان مردہ تتلیوں اور میران کے غیر حاضر وجود کو حاضر مان کر ایک بار پھر سے ماتم کرنے لگی۔ اس کے ماتم نے بہت جلد ہی چیخ و پکار کا روپ دھار لیا تھا۔

پولیس آفیسر اندر آئے تھے۔ انہوں نے ہی اسے تھاما تھا۔ وہ وہاں سے جانا نہیں چاہتی تھی اور وہ اسے زبردستی لے کر جا رہے تھے۔ وہ اسی جگہ کو گھورے جا رہی تھی جہاں میران نے آخری سانس لی تھی۔

کمرے سے باہر جاتے جاتے سبین کی نظر خون سے لکھے اس ایک لفظ پر پڑی تھی جو کمرے کے سفید چوبی فرش پر لکھا گیا تھا۔ وہ یقیناً میران نے ہی لکھا تھا۔ وہ ایک لفظ بہت سادہ تھا۔ انگریزی کا لفظ۔۔۔ ”P“

☆......☆......☆

پیٹرسن نے گلاس میں سے ننھا سا گھونٹ بھرتے ہوئے اس ایک لفظ کو پھر سے دہرایا۔ ”P“ جس سے آگے اس کے نام کا آغاز ہوتا تھا۔ پاس کھڑا جیفرسن اب کے بالکل نہ گھبرایا، نہ اسے اس بات کا خوف تھا کہ اگلے ہی پل پیٹرسن غصے سے گلاس زمین پر دے مارے گا یا اس کا گلا دبوچ لے گا۔ وہ اس سب کے لیے پہلے سے سوچ بیٹھا تھا کہ اسے کیا کہنا ہے۔

”ٹیٹو کے بقول اس نے میران کو جان سے مار دیا تھا۔ اس نے اس کی نبض بھی چیک کی اور سانس بھی۔۔۔ جیسا کہ اس کا طریقہ قتل ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ وہ مرنے والے کے ٹھنڈا ہونے تک وہاں ہی موجود رہتا ہے تا کہ کسی طرح کا بھی شک باقی نہ رہ جائے۔“

”پھر اب کی بار وہ کیوں نہیں رُکا۔۔۔؟“

”اس نے پولیس کی گاڑی کے سائرن کی آواز سن لی تھی۔ یقیناً اس لڑکے کے کسی پڑوسی نے پولیس کو کال کر دی تھی۔ اس لیے ٹیٹو کو جلدی وہاں سے نکلنا پڑا۔۔۔“

”لیکن اسے ضرورت کیا تھی میران کو یہ بتانے کی کہ یہ قتل کس کے کہنے پر ہو رہا ہے۔“

”وہی۔۔۔ عادت سے مجبور۔۔۔ تمھاری دہشت بٹھانے کے لیے۔۔۔ تم جانتے تو ہو کہ وہ تمھارے سامنے اپنے نمبر بڑھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔۔۔“

”ہاں۔۔۔ لیکن یہ موقع ہمارے لیے خطرناک ہو سکتا تھا۔ اگر وہ لڑکا مرنے سے قبل میرا پورا نام لکھ جاتا تو پھر تمھیں ساری زندگی احتیاط کرنی پڑتی تھی کہ تم سبین کے سامنے مجھے اس نام سے نہ پکارو۔۔۔“

''ہاں۔۔۔'' جیفرسن نے مدھم سی آواز میں کہا۔ پیٹرسن کو جس بات کی خوشی تھی جیفرسن کو اسی کا دکھ تھا۔ جبکہ اس نے ٹیٹو کو تاکید کی بھی تھی کہ وہ اس طرح قتل کرے کہ میران پیٹرسن کا نام پوری طرح سے لکھ سکے۔۔۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا ہو نہیں سکا تھا۔

اس کے باوجود گیم ابھی جیفرسن کے ہاتھ سے نکلی نہیں تھی۔ اس کے پاس ابھی بہت سے مہرے تھے۔

''ٹیٹو کہاں ہے؟''

''اسے فی الحال روپوش کر دیا گیا ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ پھر کسی ایسے لڑکے کا بندوبست کرو۔۔۔ جس کا نام ''P'' سے شروع ہوتا ہو۔۔۔''

''وہ ہو گیا ہے۔۔۔''

''گڈ۔۔۔ مزید کوئی بات۔۔۔''

''ہاں۔۔۔ میرے پاس ایک خیال ہے۔''

''کیسا خیال۔۔۔؟''

''وہ یہ کہ اب ہمیں کسی اور ملک یا شہر میں شفٹ ہو جانا چاہیے۔ نیویارک ہمارے لیے تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ ہمیں کسی نئی جگہ پر جانا چاہیے۔''

''تمھارے ذہن میں کون سی نئی جگہ ہے؟''

''ٹیکساس۔۔۔ وہاں میڈیا اور پولیس کا اتنا دباؤ نہیں ہے۔ میرے خیال سے وہ جگہ ہمارے لیے بہترین ہے۔ پھر وہاں غربت اور معیشت کی ایسی صورت حال ہے کہ لوگ ہماری ٹیم میں خود بخود شامل ہونا چاہیں گے۔ نیویارک کی نسبت وہاں ہمارا کام تین گنا تیزی سے پھیلے گا۔ ہمارے کارندے بھی بڑھ جائیں گے۔''

''لگتا ہے تم پہلے ہی بہت سی ریسرچ کر چکے ہو جیفی۔۔۔''

''ہاں۔۔۔ تمھیں کوئی بھی خیال مکمل تفصیل کے ساتھ جو پسند ہے بھائی۔۔۔'' جیفرسن نے کہا، پیٹرسن اندر ہی اندر چونکا۔ جیفرسن خاص خاص موقع پر ہی اسے بھائی کہتا تھا۔ کوئی بھی ایسا مطالبہ جس میں اس کی مرضی ہو۔۔۔ پسند ہو۔۔۔ یا ضد ہو۔۔۔ اسے پیٹرسن سے منوانے کے لیے وہ ایسے ہی معصومانہ سے حربے آزمایا کرتا تھا۔

''ٹھیک ہے۔ جیسے تم چاہو چھوٹے بھائی۔۔۔'' پیٹرسن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آمادگی دے دی تھی۔ جیفرسن کبھی کبھار ہی ضد کیا کرتا تھا۔

☆......☆......☆

اپنی بندشوں کی معیاد پوری کر لینے کے بعد سورج جیسے آج اپنی پوری آب وتاب سے نکلا تھا۔
اس کی چال میں غازی کی شان تھی۔ اس کا نقب بالکل درست جگہ پر لگا تھا۔ اس کا وار خالی نہیں گیا تھا۔ اس نے اپنے ماضی کی تاریخ کو دہرا لیا تھا۔ ضیاریزی کی بندش نے بالآخر ایک بار پھر سے کا فور ریزی کو جنم دے ہی دیا تھا۔
سبین نے آنسو بھری اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ سورج سے نظریں چار کرنا بے سود تھا۔ وہ ادنیٰ تھی اور جانتی تھی کہ اس وقت ساری قدرت اس کی دشمن بنی بیٹھی ہے۔
ایک ہفتہ ہسپتال میں رہنے کے بعد، اور پھر ہوش میں آنے کے بعد وہ آج پہلی بار میران کی قبر پر آئی تھی۔ لیکن قبر پر آ کر اسے صرف مٹی ملی تھی۔ جبکہ وہ یہاں آنے کے لیے ایسے بے چین تھی جیسے وہاں میران بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ جیسے وہ رش جھیل میں کیا کرتا تھا۔ تب وہ اپنے ساتھ کھانے پینے کی چیزیں بھی لایا کرتا تھا۔ اب سبین دنوں سے بھوکی تھی اور اس کے منہ میں نوالا ڈالنے والا کوئی نہیں تھا۔ اسے یاد آ رہا تھا۔ سب یاد آ رہا تھا۔ اس کا شرارت سے دیکھنا، خود کو دیکھتا پا کر سبین کی چوری پکڑنا، مسکرانا، گٹار پر دھن بجانا، اس کی دل لگی، اس کی وارفتگی، اس کے بوسے۔۔۔ اللہ۔۔۔ اسے کچھ بھی تو نہیں بھول پا رہا تھا۔
"کیا میرا مجسمہ بناؤ گی؟"
اسے یاد آیا، میران نے نیویارک میں پہلی ملاقات پر سبین سے پوچھا تھا۔ تب سبین نے فوراً سختی سے انکار کر دیا تھا۔
"نہیں۔۔۔"
"کیوں۔۔۔؟"
"میں مجسمہ سازی میں زیادہ ماہر نہیں ہوں۔ تمھاری شکل خراب کر دوں گی۔"
"چلے گا۔"
"لیکن میرے لیے نہیں چلے گا۔ تمھاری اس صورت کو میں تصور میں بھی نہیں بگاڑ سکتی۔"
"چلو جب میں دنیا سے چلا جاؤں گا تم تب بنا دینا۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ یاد کرتے ہوئے سبین رونے لگی تھی۔
تب اس نے دل ہی دل میں خدا سے میران کے حصے کی معافی بھی مانگی تھی۔ نادانی میں اس کے منہ سے بولے جانے والے برے لفظوں کی توبہ کی تھی، لیکن وہ پتا نہیں کیسی منحوس گھڑی تھی جس میں میران نے سبین سے پہلے اس دنیا سے جانے کی پیشن گوئی کر دی تھی اور اب وہ اس کا بت کیسے بنا سکتی تھی۔ اس کا بت تو بننے سے پہلے ہی اس نے توڑ دیا تھا۔ اس کے گناہوں نے۔۔۔
"میرے گناہ مجھ سمیت تمھیں بھی کھا گئے ہیں میران! یہ میرے گناہ تھے جس کی سزا تمھیں ملی ہے۔ اس کی سزا مجھے ملنی چاہیے تھی۔ یہ میرے حصے کی سزا تھی جو تمھیں ملی۔۔۔ نہیں یہ تمھارا حق نہیں تھا۔ تمھیں میرے پاس ہی نہیں آنا چاہیے تھا، تم نے عہد

توڑ کے غلطی کی۔۔۔ تمھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے چھوڑ دیتے۔۔۔ پھر کبھی میرے پاس نہ آتے۔ میری بھلائی کے لیے مجھ سے شادی کر کے تم نے اپنا نقصان کروالیا۔ میں تمھاری یادوں کے سہارے ہی زندگی گزار دیتی لیکن اس طرح نہیں گزار سکتی۔۔۔ تم میری زندگی میں اتنی تھوڑی دیر کے لیے ہی آئے تھے کیا؟ تم مجھے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے کر گئے؟ میران۔۔۔! تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا۔۔۔ تم تو کہتے تھے کہ اب تم مجھے کبھی نہیں چھوڑو گے۔

پھر اب یہ کیسا ظلم کیا ہے تم نے مجھ پر کہ درد بھی نہیں ہے اور میں تڑپ رہی ہوں، کہیں چوٹ بھی نہیں پھر بھی لہولہان ہوں۔"

روتے روتے کب شام ہوئی وہ نہیں جانتی تھی۔ اسے واپس کہیں جانے کی جلدی بھی تو نہیں تھی۔ اب میران کی قبر کو ہی وہ اپنا گھر مان چکی تھی۔

دن اپنے پینڈے سے لگنے لگا تھا۔ غازی سورج کا سفر کنارے تک پہنچ چکا تھا۔ اگلے روز پھر اپنی روز کی آن بان شان سے نکلنے کی غرض سے سورج نے شام کی طرف بڑھتے ہوئے انگڑائی لی تھی۔ جس نے دن کا رنگ گہنا کر لمحے میں بدل دیا تھا۔

یک لخت قبرستان کی خاموش فضا میں ایک کار کی آواز نے خلل ڈالا۔ قبرستان کے گیٹ پر پہنچ کر وہ سیاہ کار رُک گئی تھی۔ سبین جانتی تھی کہ اس کے اندر کون ہوگا۔ اس کا اندازہ درست تھا۔ ایڈم نے پہلے کار کا شیشہ نیچے کر کے اسے میران کی قبر پر کبھی نہ ختم ہونے والا آسن جمائے دیکھا تھا اور پھر سر جھٹکتا ہوا کار میں سے اُتر کر اس کے پاس چلا آیا تھا۔

سبین، ایڈم کے ایک ڈرائیور کے ساتھ ہی میران کی قبر پر آئی تھی۔ اب جب سبین کو روتے روتے اور ڈرائیور کو کھڑے کھڑے رات ہونے والی تھی تو اس نے فون کر کے ایڈم کو ساری صورتحال سے آگاہ کر دیا اور وہ سبین کو لینے خود چلا آیا تھا۔

"سبین۔۔۔!" ایڈم نے اس کے پاس آ کر پیار سے اس کا نام پکارا۔ سبین نے سر اُٹھا کر ایڈم کو دیکھا تھا۔ شام کا سورج ایڈم کی پشت پر غروب ہو رہا تھا۔ اُفق کی دھاریوں کا بنفشی رنگ سیاہی میں بدلنے کے قریب تھا۔

"چلو سبین! رات ہونے والی ہے۔"

سبین پھر بھی نہیں اٹھی تو چار و ناچار ایڈم کو ہی میران کی قبر پر سبین کے پاس بیٹھنا پڑا۔

"گھر نہیں چلو گی کیا۔۔۔؟"

"مجھے یہاں ہی رہنے دو ایڈم! میں نے ڈرائیور سے کہا بھی تھا کہ وہ گھر چلا جائے، لیکن اس نے میری بات ہی نہیں سنی۔"

"تمھیں میں یہاں کیسے رہنے دے سکتا ہوں۔ یہ کوئی گھر تھوڑی ہے۔"

"مجھے اب گھر کی ضرورت بھی نہیں رہی۔"

"تمھاری صحت دن بدن گر رہی ہے سبین۔۔۔ تمھیں اپنا خیال رکھنا پڑے گا۔ ایسا کیسے چلے گا سب۔۔۔"

سبین خاموش رہی۔ وہ ایڈم کو کیا بتاتی کہ موت کی خواہش کرنے والے صحت مندی کے بارے میں نہیں سوچا کرتے۔

''اپنا نہیں تو زویا کے بارے میں تو سوچو، اسے تمھاری ضرورت ہے۔ تمھیں اس کے لیے جینا ہے۔ وہ تمھاری وجہ سے بہت پریشان بھی ہے۔ مجھ سے تو کوئی خاص بات نہیں کرپاتی لیکن میں سمجھ سکتا ہوں کہ اسے تمھاری کتنی فکر ہے۔''

''ایک وعدہ کرو گے مجھ سے ایڈم۔۔۔''

''ہاں۔۔۔بولو۔۔۔''

''میرے بعد زویا کا خیال رکھو گے۔'' سبین نے اچانک سے ہی غیر متوقع بات کہہ دی۔ ایڈم کے دل پر جیسے کسی نے خنجر سے وار کیا تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھنے لگا۔ جس کو پانے کے لیے اس نے اس کے شوہر کو مروا دیا تھا اسے وہ کیسے مرنے دے سکتا تھا۔ وہ تو اسے مرنے کی بات بھی نہیں کرنے دے سکتا تھا۔ ابھی تو اس نے اسے اپنی زندگی میں شامل کرنا تھا۔

''ایسے مت کہو سبین! میں تمھیں کچھ نہیں ہونے دوں گا۔'' اس نے سبین کو خود سے لگا لیا۔

''میں موت کو اپنی طرف بڑھتا محسوس کر رہی ہوں ایڈم!''

''یہ صرف میران کی موت کی وجہ سے ہے۔ اس احساس میں حقیقت نہیں ہے۔''

''مجھے اس احساس کو حقیقت بنانے تک چین نہیں آئے گا۔''

''جب میران کا قاتل مل جائے گا تو تم بہتر محسوس کرو گی۔''

''میران کا قاتل تمھارے سامنے بیٹھا ہے ایڈم! میں ہوں اس کی قاتلہ۔۔۔''

''خود کو قصوروار کیوں سمجھ رہی ہو سبین۔۔۔؟''

''کیونکہ میران کو میرے گناہوں کی سزا ملی ہے ایڈم!'' وہ ایک بار پھر سے رونے لگی۔

''یہ سب میران کے ساتھ کیوں ہوا۔۔۔ اس کا تو کوئی قصور بھی نہیں تھا۔ غلطیاں تو سب میری تھیں۔ کوتاہیاں تو میں نے کی تھیں۔ گناہ میرے تھے۔ پھر وہ کیوں مر گیا اور اب مجھے بھی روز موت کی دعا کے باوجود موت نہیں آ رہی۔۔۔ خدا نے نجانے مجھے زندہ کیوں رکھا ہوا ہے۔''

''یقیناً خدا نے تم سے کوئی کام لینا ہوگا سبین!'' ایڈم نے اپنی ہی روانی میں کہا۔ سبین نے روتے روتے چونک کر اسے دیکھا۔

''ہاں سبین! خدا نے یقیناً تم سے کوئی کام لینا ہوگا۔''

سبین بٹر بٹر ایڈم کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ لمحے میں اس کے آنسو آنا بند ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں خشک ہوئی تھیں۔ ایک سازشی سا جھونکا قبرستان کی خاموشی میں ابابیل کی طرح چک پھیریاں لینے لگا۔ سبین کو ایک دم سے ہی مہینوں پہلے کا

وہ دن یاد آ گیا جب رشید نے اسے طلاق دی تھی، اور اس نے اگلے دن چونے کو الماس برادے میں بدلنے کا فیصلہ کر لیا، تب بھی ایسے ہی ہوا کے کسی جھونکے نے اس کے کانوں میں سیسہ انڈیلا تھا لیکن تب میں اور اب میں بہت فرق تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس بار والا جھونکا اس کے کانوں میں سیسہ نہیں بلکہ رس گھول رہا ہو۔۔۔ کسی نے جیسے اسے کوئی تنبیہ کی تھی۔ کوئی راز کی بات بتانے کی کوشش میں سکون کی حیات عیاں کی تھی۔

کان میں سرگوشی کرتے ہوئے آنے والی زندگی کا لائحہ عمل بتایا تھا۔ یہ جیسے کوئی الہام تھا۔ کوئی وحی تھی جو ایڈم کے لبوں سے اس تک پہنچی تھی۔ ایک لمحے میں ہی اس کا دل پر سکون ہو گیا تھا۔ جیسے واقعی میں اب وہ خدا کا کوئی کام کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گئی تھی۔

ایڈم نے اُٹھ کر سبین کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ سبین، ایڈم کا ہاتھ تھام کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ سبین کو خود سے لگائے لگائے ہی ایڈم قبرستان سے باہر جانے والی روش پر چل پڑا۔

☆......☆......☆

سیاح پہاڑوں میں گھوم پھر کر اب اپنے اپنے گھروں کو واپس جا چکے تھے۔ نیچے سوئمنگ پول خالی تھا۔ اطراف میں بھی کوئی رش نہیں تھا۔ ماسوائے چند ایک ورکرز کے، وہ سات منزلہ ہوٹل بری طرح سے سنسان ہوا پڑا تھا۔ یا شاید ایڈم کے اپنے اندر کی تنہائی تھی جو اسے ہر چیز ادھوری نظر آنے لگی تھی۔ وہ آخر کب تک گرینڈ فادر کی مردہ محبت کو یاد کر کے زندگی گزار سکتا تھا۔ زندگی پر کچھ حق اس کا بھی تھا۔ اس نے سبین کو پانے کے لیے وہ سب کچھ کیا تھا جیسا جیفرسن نے اسے کرنے کو کہا تھا۔ اس کے باوجود سبین اسے اپنی دسترس سے دور نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔۔ وہ اس کے پاس ہوتے ہوئے بھی جیسے میران کے پاس پہنچی ہوئی تھی۔ اب آخر اسے مزید کتنا انتظار کرنا پڑنا تھا۔

''تم میرے گھر منتقل ہو سکتی ہو سبین! ہوٹل میں تمہارا رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ میران کے گھر کی تفتیش ختم ہونے تک تم میرے گھر رہ سکتی ہو۔'' ایڈم نے ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے سبین سے کہا۔

زویا تھوڑی دیر پہلے ہی کسی غیر ضروری کام کا بہانہ کر کے کمرے سے نکل گئی تھی۔

''نہیں میں اپنی جگہ پر ٹھیک ہوں ایڈم! تمہارا شکریہ۔۔۔'' اس نے رکھائی سے کہا تھا۔ ایسا کہنے میں اس کا کوئی اپنا عمل دخل شامل نہیں تھا۔ آج کل وہ سب سے ایسے ہی بات کر رہی تھی۔ ایڈم نے گہرا سانس لیا۔

''تم ٹھیک نہیں ہو۔۔۔ ویل جہاں تمہیں سکون ملتا ہے تم وہاں ہی رہو۔ میں تمہارے ساتھ زبردستی نہیں کروں گا۔ لیکن کسی بھی طرح کی مدد کی ضرورت ہو تو مجھے ضرور بتانا۔۔۔ مجھے تمہاری مدد کر کے خوشی ہوگی۔''

''تم نے میرے لیے بہت کیا ہے ایڈم! اب فی الحال کسی بھی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ بدستور ویسا ہی تھا۔ ایڈم نے کھڑکی کا بلائنڈر نیچے گرادیا۔ پھر وہ سبین کے پاس آ کر اس کے سامنے، اس کے بے حد قریب بیٹھ گیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔

''تم مجھے اپنا کیا سمجھتی ہو سبین۔۔۔؟'' ایڈم نے اچانک سے غیر متوقع سوال کیا۔ سبین نے چونک کر استفہامیہ ایڈم کو دیکھا۔

''رشتوں میں تم مجھے کس رشتے میں رکھتی ہو سبین! درجوں میں کس درجے پر رکھتی ہو؟'' ایڈم پوچھ رہا تھا۔ اس سوال کا کوئی بھی جواب سبین کے پاس نہیں تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ایڈم یہ کیوں پوچھ رہا تھا۔ وہ یقیناً سبین کی بے رخی سے ہرٹ ہوا تھا۔ سبین نے لمحوں میں ان بیت جانے والے دنوں کو یاد کیا تھا جن میں ایڈم اس کے لیے کس قدر مددگار ثابت ہوا تھا۔ اگر ان دنوں میں ایڈم اس کے ساتھ نہ ہوتا تو اس کا کیا بنتا۔۔۔ اس کی حالت تو ایسی تھی کہ اماں، بابا بھی ہوتے تو اسے سنبھال نہیں سکتے تھے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ایڈم کس قدر مصروف شخصیت ہے۔ جتنی دیر وہ سبین کے پاس ہوتا تھا ہر وقت اس کا فون بجتا رہتا تھا۔ جن میں سے بیشتر کال وہ پک کر لیتا تھا اور کبھی موبائل ہی آف کر دیا کرتا تھا۔ وہ ایک ایسی سماجی شخصیت تھا جس سے لوگ منت منت کی ملاقات کرنے کے لیے مہینوں پہلے وقت لیا کرتے تھے اور وہ بنا کسی اپائمنٹمنٹ کے ہر وقت سبین کے لیے دستیاب رہا کرتا تھا۔ اس کا وقت جو بے حد قیمتی تھا اسے وہ بنا کسی غرض کے سبین پر لٹا رہا تھا۔ اور سبین اس سے رکھائی سے ایسے پیش آ رہی تھی جیسے وہ اس کا قرض دار ہو۔

''بولو سبین! میں تمھاری زندگی میں کس درجے پر ہوں؟''

''تم میری زندگی میں اتنے اونچے درجے پر ہو ایڈم کہ وہاں تک کوئی رشتہ جاتا ہی نہیں ہے۔ وہاں سارے درجے ختم ہو جاتے ہیں۔ وہاں سارے نمبر چھوٹے لگنے لگتے ہیں۔''

''مجھے اتنا اونچا لے جانے کی کیا ضرورت تھی سبین! مجھے بس اپنا دوست مان لیتیں۔''

سبین خاموش ہوگئی۔ چند لمحے خاموشی میں ہی گزر گئے تھے۔ پھر ایڈم نے اپنا ہاتھ سبین کے آگے کیا تھا۔

''دوست۔۔۔؟''

سبین مدھم سا، بے رنگ سا مسکرائی پھر اس نے ایڈم کے گورے سفید ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

اسی دن وہ اور زویا، ایڈم کے گھر منتقل ہوگئی تھیں۔

وہ اتنا اچھا نہیں تھا جتنا وہ سوچتی تھی، بلکہ وہ اس سے کہیں زیادہ اچھا تھا جتنا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اپنے گھر کا انتہائی شاندار کمرہ اس نے سبین اور زویا کو دیا تھا۔ گھر کی ہر سہولت دونوں کے لیے ہر وقت میسر تھی۔ اس محل نما گھر کو سبین تو ویسے بھی پہلے دیکھ چکی تھی، لیکن چند لمحوں کے لیے تو زویا بھی دیکھ کر ششدر رہ گئی تھی۔ اس گھر کا تو باغ ہی اس قدر وسیع تھا کہ سارا گھومنے کے لیے

دو دن درکار تھے۔ گھوڑے، زیبرے، مور، راج ہنس اور مرغیوں کی خاص قسم۔۔۔ گولڈن لیف۔۔۔

زویا کو وہ سارا گھر جنت کا کوئی چھوٹا سا ٹکڑا لگا تھا۔ سیین نے بھی وہاں آ کر خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا۔ میران کی موت کے غم کا بھاری پتھر جو اس کے دل پر دھرا تھا تھوڑی دیر کے لیے اس کا بار کم ہو گیا تھا۔ ابھی اسے اس بات کا علم نہیں تھا کہ جسے وہ مہربان سمجھ رہی ہے وہ ہی اس کی خوشیوں پر نامہربان ہوا ہے۔ اسے معلوم ہو جاتا تو اس کے دل کے پتھر نے چٹان کا روپ دھار لینا تھا۔ اسے اندازہ ہی کہاں تھا کہ جسے وہ ہمدرد سمجھ رہی ہے وہ ہی رقیب ہے۔ ایڈم نے ہی میران کو قتل کروایا ہے۔ اسی نے اس کا قافلہ لوٹا ہے۔

"میران کا قاتل ملا۔۔۔؟"

"نہیں۔۔۔ ابھی تک تو کوئی کامیابی نہیں ہو سکی۔" وہ اسے ہر بار ایسا ہی جواب دیتا تھا۔

"مجھے میران کے قاتل کو قتل کرنا ہے ایڈم!" ایک دن اس نے ضبط سے کہا۔

"تم اتنی شدت سے مت سوچو۔۔۔ پولیس کو اس کا کام کرنے دو۔"

"پھر میں میران کے قاتل کے مل جانے تک چین سے نہیں بیٹھ سکتی۔۔۔ میری مدد کرو ایڈم!" ایک دم سے ہی وہ ایڈم کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگی۔

ایڈم کا تنفس تیز ہو گیا۔

وہ اسے چپ کروانے لگا، لیکن جیسے جیسے وہ اسے چپ کروا رہا تھا سیین کا رونا اتنا ہی بڑھتا جا رہا تھا۔

آنے والے دنوں میں، گھر کے باغ میں ٹہلتے ہوئے، کھانے کی ٹیبل پر کھانا کھاتے ہوئے، لائبریری میں ایڈم کے پاس بیٹھتے ہوئے وہ اسے روتے روتے اپنی اور میران کی باتیں بتانے لگتی تھی۔ پہلی ملاقات، دوسری۔۔۔ پھر ملاقاتوں کا سلسلہ۔۔۔ اور پھر شادی۔۔۔ یہ جیسے اب دونوں کا ہی پسندیدہ مشغلہ بن گیا تھا۔ میران کی باتیں کرنا۔۔۔ پھر ایک دن سیین بتاتے بتاتے میران کی موت والے دن تک پہنچتے پر ٹوٹ کر ایڈم کے وجود پر ڈھے گئی اور ایڈم کو جیسے اسی لمحے کا انتظار تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس ٹوٹے ہوئے وجود کو اس نے کیسے اپنی بانہوں میں سمیٹنا ہے۔

ایڈم نے موم ہو چکی سیین کو اپنی آغوش میں بھر لیا۔

☆......☆......☆

میران کا قاتل مل گیا تھا۔ سب جانتے تھے کہ یہ صرف ایڈم کی وجہ سے ہی ممکن ہوا ہے۔ اس نے میڈیا اور پولیس پر اس قدر دباؤ ڈال دیا تھا کہ انہیں سب کام چھوڑ کر میران کے قاتل کو ڈھونڈنا پڑا تھا۔ ان دنوں میران کے قتل کے کیس کا ویسے بھی بہت چرچا تھا۔

سبین اس لڑکے سے ملنے گئی تھی جس کا نام ''پیٹر'' تھا اور جو ابھی بمشکل اپنی ٹین ایج کی حدود سے باہر نکلا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے چند لمحے تو سبین یقین نہیں کر سکی کہ یہ معصوم صورت لڑکا کسی کو قتل بھی کر سکتا ہے۔

''تم نے اسے کیوں قتل کیا؟'' لہجہ کو حد درجہ نارمل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے اس پیٹر نامی لڑکے سے پوچھا تھا۔

''بولو۔۔۔ کیوں قتل کیا تم نے اسے۔۔۔ وہ تو اتنا معصوم تھا کہ اس نے آج تک کوئی پھول بھی نہیں توڑا تھا، اور تم نے اسے قتل کر دیا؟'' وہ پوچھتی رہی تھی، لیکن پیٹر جیسے کچھ نہ کہنے کی قسم کھا چکا تھا۔ سبین کے پہلے چلا کر اور پھر منت سے پوچھنے پر اس نے وہی بات کی تھی جو وہ پولیس کو بھی بتا چکا تھا کہ وہ میران سے گھر کا ایڈریس پوچھنے کے بہانے اسے لوٹنے گیا تھا، میران نے دست درازی کی تو اس نے اسے قتل کر دیا۔ یہ صرف ایک وقتی اشتعال تھا۔ ایک بے سوچا سمجھا فعل۔۔۔ ورنہ وہ اسے ہرگز قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''صرف اتنی سی بات کے لیے تم نے اسے قتل کر دیا۔ جان سے مار دیا۔۔۔ اس سمیت مجھے بھی مار دیا۔ اس کے پیدا ہونے والے بچے کو بھی ختم کر دیا۔۔۔ تم ایک نہیں تین جانوں کے قاتل ہو۔۔۔'' وہ اس پر چیخنے لگی۔ تب پولیس اسے اٹھا کر باہر لے گئی۔

☆......☆......☆

''میران کا قاتل مل گیا ہے۔ اسے سزا بھی ہونے والی ہے۔ اب کیا چاہتی ہو؟'' ایڈم نے ایک دن اس سے پوچھا تھا۔

''خودکشی کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ کسی ٹرانس کی کیفیت میں تھی۔ ان دنوں وہ ربیکا بنی ہوئی تھی۔ اسے ربیکا کی ذہنی حالت کا اب اصل میں ادراک ہوا تھا۔ وہ کیوں ہر وقت عیسیٰ عیسیٰ کرتی رہتی تھی۔ اب وہ بھی ہر وقت میران میران کرنے لگی تھی۔ اس کی روح سے ملنے، اس سے بات کرنے، خدا کو عبادت کا لالچ دے کر صرف ایک ملاقات کے لیے راضی کرنے اور باطنی طور پر اس کے پاس جانے کے طریقے سوچنے لگی تھی۔

''ایسا مت کہو سبین۔۔۔''

''اس کے علاوہ اور کوئی حل بھی نہیں ہے ایڈم! میں خودکشی نہیں کرنا چاہتی۔۔۔ بس خود کو خدا کے آگے پیش کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ اپنی خودکشی اور میران سے جلد ملنے کی خواہش کو مثبت رنگ دینے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

''خود کو میرے سپرد کر دو۔۔۔'' ایڈم نے بے ساختہ ہی کہا۔ سبین نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ نجانے اس کی آنکھوں میں ایسا کیا تھا کہ ایڈم اٹھ کھڑا ہوا۔

''معافی چاہتا ہوں۔ لگتا ہے میں نے تمہارا دل دکھایا ہے۔'' ایڈم کہہ کر چلا گیا تھا۔ اور سبین اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔

موسم ایک بار پھر سے کروٹ لینے کی تیاری کر رہا تھا۔ سردیاں اگرچہ ابھی دور تھیں لیکن شام کے وقت ہوا میں خنکی در آتی تھی۔ نجانے یہ ایڈم کی بات کا اثر تھا کہ سبین کے اندر ہی کوئی انتشار ابل رہا تھا کہ وہ سرد ہواؤں کے باوجود خود پر شال اوڑھ کر باہر وسیع باغ میں نکل آئی۔

ملازموں نے تمام جانوروں کو اندر کر دیا تھا۔ گھوڑے، زیبرے، اصطبل میں بند ہو چکے تھے۔ اور اب دم سادھے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ بس باغ کے ایک کونے میں شور تھا جہاں زویا ملازموں کے ساتھ مل کر گولڈن پف مرغیوں کو پنجرے میں بند کرنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کوشش میں ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ تمام ملازم بھی ہنس رہے تھے۔ سبین سب دیکھ کر مسکرائی تھی۔ زویا زندگی میں پہلی بار اس طرح سے ہنس رہی تھی۔ نجانے یہ گھر کا اثر تھا کہ کس چیز کا کہ وہ یہاں آ کر بہت خوش تھی۔ ایڈم کے گھر آ کر۔۔۔

سبین جیسے زندگی میں آج پہلی بار زویا کو دیکھ رہی تھی۔

''زویا۔۔۔'' اس نے زویا کو پکارا تھا۔ زویا نے پلٹ کر پیچھے دیکھا اور اس کی ہنسی غائب ہو گئی۔ سبین کو دیکھتے ہی وہ نجانے کیوں چپ ہو جاتی تھی۔ شاید وہ یہ سوچتی تھی کہ اگر وہ سبین کے سامنے ہنسے گی تو سبین یہ نہ سمجھے کہ وہ اس کے غم میں شریک نہیں ہے۔ جبکہ سبین تو اب خود اس غم سے جلد از جلد نکلنا چاہتی تھی۔

''جی آپی۔۔۔''زویا اس کے پاس آئی تھی۔

''زویا۔۔۔؟''

''جی آپی۔۔۔''

''اپنی پریشانیوں میں مجھے تمھارا تو کوئی خیال ہی نہیں رہا زویا۔۔۔ایڈم نے تمھارا سارا بندوبست کر دیا ہے۔ چند دن بعد تمھاری کلاسز شروع ہو جائیں گی۔''

''جی آپی۔۔۔''

''وہاں دل لگا کر محنت کرنا۔۔۔''

''جی آپی۔۔۔''

''اپنی آپی کی طرح کی مت بن جانا۔۔۔''

''جی آپی۔۔۔''

زویا بس جی جی کی گردان کیے جا رہی تھی۔

سبین نے اس کی طرف دیکھا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے ہنسنے والی زویا کو وہ شاید باغ کے کونے میں ہی چھوڑ آئی تھی۔

''کیا کچھ کہنا چاہتی ہو زویا۔۔۔؟''

''جی آپی۔۔۔''

''کیا۔۔۔؟''

''آپ ایڈم راحل سے شادی کر لیں۔''زویا نے بے دھڑک کہا۔ سبین فق صورت لیے اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔

دن غروب ہو رہا تھا، اور سبین جانتی تھی کہ اس غروب ہوتے دن میں اسے ایک بار پھر سے ڈوب کر اُبھرنا پڑے گا۔ اپنے لیے۔۔۔زویا کے لیے۔۔۔ایڈم کے لیے۔۔۔ایڈم کے احسانوں کا بدلہ اُتارنے کے لیے۔۔۔

☆......☆......☆

''ہیلو مس سبین!''وہ قبرستان سے باہر نکل رہی تھی جب ایک شناسا چہرے نے اسے روکا۔

''جی بولیے۔۔۔''

''میرا نام رافے ہے۔ لوگ مجھے مسٹر رافے کہتے ہیں۔ میرا تعلق نیویارک پولیس سے ہے۔ یہ میرا کارڈ ہے۔ آپ تسلی کر سکتی ہیں۔''اس نے اپنا کارڈ سبین کے سامنے کیا تھا۔ مسٹر رافے کا طریقہ ملاقات شاید یہی تھا۔ وہ سب سے اپنے اسی انداز

میں ملتا تھا۔ سبین کو اس سے پہلی ملاقات کا منظر یاد آ گیا، جو ایڈم کی پارٹی والے دن ہال کے باہر ہوئی تھی۔

"یہ میرے ماتھے پر کٹ کا نشان دیکھ رہی ہیں آپ۔۔۔؟" اس نے اپنے ماتھے کے بال پیچھے کر کے وہاں پر پڑے کٹ پر انگلی رکھ کر سبین کو دکھایا۔

"میں نے آپ سے کہا تھا ناں کہ اسے یاد رکھیے گا۔ لوگ مجھے جلد بھول جاتے ہیں کیونکہ میری شکل عامیانہ ہے۔"

"جی یاد ہے مجھے سب یاد ہے مسٹر رافے۔۔۔ لیکن اب آپ میرے پاس کس لیے آئے ہیں۔ اب میرے پاس کوئی ایسی بات نہیں جو نیویارک پولیس سے چھپی ہوئی ہو۔۔۔ سب سامنے آ تو چکا ہے۔ میں لائم (چونے) کے ڈیکوریشن پیس کے ذریعے اسمگلنگ کرتی رہی ہوں۔۔۔ پیٹرسن گروپ کے لیے کام کرتی رہی ہوں۔ اسی وجہ سے میں نے اپنے بابا کے ہاتھوں کی بنی لوح اور اپنا بچہ کھو دیا۔۔۔

عدالت کی طرف سے مجھے معافی مل چکی ہے۔ پھر اب آپ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔ میرے خیال سے اب میرے پاس ایسا کچھ نہیں جسے جاننے کے لیے آپ میرے پاس آئے ہیں۔"

"تو میں آپ کو یاد ہوں۔" وہ ابھی تک پہلی بات پر ہی اڑا ہوا تھا اور اسی بات پر ہلکا سا مسکرایا بھی تھا۔ سبین کو کوفت ہوئی۔

"جی یاد ہیں۔ سب یاد ہے مجھے۔۔۔" وہ چڑ کر بولی۔

"میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں ایڈم راحل کی طرح انسانی دیوتا نہیں ہوں۔ کیا یہ بھی یاد ہے آپ کو۔۔۔" اب کی بار اس نے گہری نظروں سے سبین کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

سبین کے چہرے کے رنگ بدلے تھے۔ وہ سستا اور گھٹیا سا آفیسر آخر کس چیز کی کھوج میں تھا۔ وہ اپنی ترقی کے لیے کیا کرنا چاہتا تھا۔ کیا وہ ایڈم راحل پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا تو پھر بہتر تھا کہ وہ اپنی چھوٹی سی پوسٹ پر ہی تعینات رہے کیونکہ یہ کھوج اسے کوئی ایسا فائدہ نہیں دینے والی تھی جو اس کی ترقی کا باعث بنتی۔۔۔ بلکہ الٹا اس کے لیے نقصان دہ ہی ثابت ہونے والی تھی۔

"جی مجھے آپ کی یہ بات بھی یاد ہے۔" اس نے رکھائی سے جواب دیا۔

"اوہ۔۔۔ یعنی آپ کی یادداشت کمال کی ہے۔ یہ تو گڈ ہو گیا، بلکہ ویل ڈن۔۔۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور سبین کو بے حد برا لگا۔

"براہِ مہربانی کیا اب آپ اصل بات کی طرف آئیں گے کہ آپ کو مجھ سے کیا کام ہے؟"

"مس سبین جیسے کہ میری شکل عامیانہ ہے ویسے ہی میری جاب بھی عامیانہ ہے۔"

"مجھے اندازہ ہے۔" وہ تمسخر سے مسکرائی۔ اس کا اندازہ واقعی درست نکلا۔ رافے نے کمال مہارت سے سبین کی تمسخر والی مسکراہٹ کو نظر انداز کر دیا۔

"لیکن میں اپنی جاب کے علاوہ بھی ایک جاب کرتا ہوں۔ یہ میری ذاتی طور پر منتخب جاب ہے۔ اس کی مجھے کوئی تنخواہ نہیں ملتی۔۔۔ لیکن اُمید ہے کہ میں ایک دن اس کے بل بوتے پر اچھا مقام حاصل کر سکوں گا۔" رانے کھل کر عیاں ہو چکا، جو سبین پہلے ہی قیاس کر چکی تھی۔

"میں معاشرے کے ان لوگوں کی اصل حقیقت دنیا کے سامنے لانا چاہتا ہوں، جو حقیقت میں کچھ اور ہیں، لیکن انہوں نے اپنے چہرے پر کسی اور طرز کا نقاب چڑھا رکھا ہے۔ آپ اندازہ بھی نہیں کر سکتیں کہ اپنی اب تک کی اس سراسر ذاتی انویسٹی گیشن پر مجھے کیا کچھ دیکھنے کو ملا ہے۔ بڑے بڑے بزنس مین جو پے آرڈر اور ٹینڈر کی آڑ میں حکومت کو لوٹتے ہیں۔ اسٹاک ایکسچینج کے ذریعے ملکی کرنسی کو نقصان پہنچانے والے، خود کو دیوالیہ ظاہر کر کے قرض معاف کروانے والے۔۔۔ اصل بزنس کی آڑ میں کوئی گھناؤنا کام کرنے والے اور اس کے علاوہ میں کچھ ایسی لڑکیوں کو بھی جانتا ہوں جو کال گرل کے روپ میں سفاک اور ماہر قاتلہ ہیں۔" رانے نے آنکھ دبا کر کہا۔ سبین کے پاس برداشت کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے۔ جو آپ کہہ رہے ہیں سب سچ ہوگا، لیکن میرا ان سب باتوں سے کیا واسطہ۔۔۔؟"

"آپ جس کے گھر میں رہ رہی ہیں۔ ایڈم راہل۔۔۔"

"اوہ۔۔۔ تو آپ اصل بات پر اب پہنچے ہیں۔ اتنی دیر سے۔۔۔" سبین نے درمیان میں ہی اس کی بات کاٹی تھی۔

"ایک بات اچھی طرح سے جان لیں مسٹر رانے! ایڈم پر پہلے بھی بہت طرح کے الزامات لگ چکے ہیں لیکن وہ ہمیشہ ہر الزام سے سبکدوش ہی ہوئے ہیں۔ میں سب جانتی ہوں ان کے بارے میں۔۔۔"

"پھر یہ بھی جانتی ہوں گی کہ دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہوتی ہے۔ خواہ تھوڑی بہت ہی کیوں نہ ہو۔۔۔"

"مطلب۔۔۔؟"

"دائنا کو جانتی ہیں آپ۔۔۔؟ ایک حد تک وہ آپ کی دوست تھی۔"

سبین حیران ہوئی۔۔۔ رانے کی ذاتی انویسٹی گیشن کمال کی تھی۔

"جی۔۔۔"

"جہاں اس نے خودکشی کی وہاں تین جگہ پر ایڈم کا نام لکھا ہوا تھا۔ لکھا تو اور بھی بہت ساری جگہوں پر گیا تھا، لیکن باقی سب مٹا دیا گیا اور ان تین جگہوں کو جان بوجھ کر چھوڑ دیا گیا، تاکہ ایڈم پولیس کی پکڑ میں آجائے، اور یہ کام اس کے سب سے قریبی انسان نے کیا۔۔۔" مسٹر رانے کا اشارہ شاید جیفرسن کی طرف تھا، لیکن سبین مسٹر رانے کی پہلی بات کو ہی سوچے جا رہی تھی، ورنہ وہ اس بات پر چونکتی ضرور۔۔۔

”لیکن ایڈم نے اس سب کی اچھی طرح وضاحت دے دی تھی۔ اس نے وہ فوٹیج بھی دکھادی تھی، جس میں دائنا اس سے ملنے گئی تھی۔ پولیس کو اگر ایڈم پر کسی قسم کا شک ہوتا تو وہ یقیناً اپنی تفتیش جاری رکھتی۔۔۔“

”پولیس ایڈم پر کیسے شک کرتی۔۔۔ میں نے کہا ناں، اس نے بڑے طریقے سے خود کو دیوتا ثابت کر رکھا ہے۔ آپ کو پتا ہے جس ڈاکٹر نے دائنا کی پوسٹ مارٹم رپورٹ مرتب کی وہاں سے اسے اس خاندان کے ایک فرد کے خون کے نشان ملے جس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ ”کولونیل خاندان“ یہ آج سے دس سال پہلے ختم ہو چکا ہے۔ ویسے ”کولونیل“ کوئی خاندانی ”سرنیم“ نہیں ہے۔ یہ عمارتوں کی طرز تعمیر کا نام ہے لیکن اس خاندان کو کولونیل کا نام اس لیے دیا گیا ہے کیونکہ جس طرح کے بڑے سے گھر میں وہ لوگ رہ رہے تھے وہ کولونیل طرز تعمیر کا شاہکار تھا۔ جہاں بہت سے کمرے تھے اور بہت سی بالکونیاں۔۔۔ وہاں ایک لڑکی ہوتی تھی ایما۔۔۔ جس نے ولیم نامی ایک لڑکے سے شادی کر لی تھی۔ ولیم کی موت کار ایکسیڈنٹ میں ہوئی تھی اور ایما کی نشے میں بالکونی سے گر کر۔۔۔ دونوں کا ایک بچہ بھی تھا جو پانچ سال زندہ رہا اور پھر فوت ہو گیا۔ آپ کو اندازہ ہے کہ دائنا کی رپورٹ میں جو خون کے نشان ملے وہ کس کے تھے۔ اسی بچے کے جو پانچ سال کی عمر میں فوت ہو چکا تھا۔ یعنی جسے مرے ہوئے بھی پچیس سال گزر چکے ہیں۔ آپ خود سوچیے جو بچہ پچیس سال پہلے محض پانچ سال کی عمر میں مر چکا ہے وہ دائنا کی خودکشی والی جگہ پر پہنچ سکتا ہے۔“

”کیا آپ مجھے کوئی جاسوسی کہانی سنا رہے ہیں مسٹر رافے۔۔۔“

”آپ کو یہ سب کہانی لگتی ہے؟“

”جی ہاں۔۔۔ اور وہ بھی بوگس۔۔۔ ایک مرے ہوئے شخص کا خون آخر دائنا کے ناخنوں میں کیسے موجود ہو سکتا ہے۔“

”یہ ہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ یہ کہانی نہیں۔۔۔ پہیلی ہے جسے مجھے اور آپ کو حل کرنا ہے۔“

”میرے خیال سے میں اس پہیلی کو سمجھی ہی نہیں ہوں تو حل کیسے کر سکوں گی۔“

”میں آپ کو ایک سادہ سی بات بتاتا ہوں۔۔۔ وہ یہ کہ دائنا کا مجرم جیڈن۔۔۔ ہم جنس پرست ہے۔“

”کیا۔۔۔؟“ مسٹر رافے کے منہ سے یہ لفظ سن کر سبین سکتے میں آگئی تھی۔ میران نے بھی جیڈن کے بارے میں کچھ ایسا ہی کہا تھا۔ جو وہ تب سمجھ نہیں سکی تھی۔

”تو ایسے میں وہ دائنا سے محبت اور پھر اس کا ریپ کیوں کر سکتا ہے۔“

”مجھے آپ کی بات سمجھ میں نہیں آرہی مسٹر رافے!“ سبین نے اپنا سر پکڑ لیا۔

”دائنا کی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کو بڑے طریقے سے بدل دیا گیا اور اس ڈاکٹر کو بھی ٹھکانے لگا دیا گیا جس نے دائنا کا پوسٹ مارٹم کیا تھا۔ ڈاکٹر کی موت سوئمنگ پول میں ہوئی تھی، لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ قتل تھا۔ اصل قاتل کو بچانے کے لیے۔۔۔

خیر اس رپورٹ کی کاپی میرے پاس ہے۔ مگر افسوس کہ کاپی کسی کام کی نہیں۔۔۔ وہ بہت آسانی سے عدالت میں چیلنج ہو سکتی ہے لیکن تب ہی میرے پاس ایک اور رپورٹ آ گئی، دائنا کی جونکوں کے خون کی رپورٹ۔۔۔ اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دونوں رپورٹس میں خون ایک ہی فرد کا تھا۔ جونکوں والی رپورٹ میں بھی اور دائنا کے پوسٹ مارٹم والی رپورٹ کی کاپی میں بھی۔۔۔"

"یعنی آپ کہنا چاہ رہے ہیں کہ آپ نے دائنا کی جونکوں کا پوسٹ مارٹم کیا۔۔۔" سبین استہزیہ ہنسی تھی۔

"جی۔۔۔ میں نے ایسا کیا دائنا کی جونکوں کا ٹیسٹ لیا۔۔۔ پھر پتا ہے وہاں سے کس کا خون نکلا۔۔۔ ٹھیک پندرہ دن بعد۔۔۔ یعنی وہ جونکیں بے چاری دائنا کے ساتھ اتنی وفادار تھیں کہ انہوں نے اس کے مجرم کے خون کو اپنے جسم میں حفاظت سے رکھا ہوا تھا۔ جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ دائنا نے آخری بار کس کو جونکیں لگائیں۔۔۔ اور اس کے ساتھ دست درازی کرنے والا کون تھا۔"

"کون تھا وہ۔۔۔؟" سبین نے لڑکھڑاتی آواز میں پوچھا تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے اندازہ ہوا تھا کہ مسٹر رافے کوئی ایسا نام لے دے گا جو اس کی زندگی کو ایک بار پھر سے اتھل پتھل کر دے گا۔

"ایڈم راہل۔۔۔" مسٹر رافے نے بڑے آرام سے سبین کے پاس بم پھوڑا تھا۔

☆.......☆.......☆

تارکول کی وہ نئی سڑک بل کھاتے سانپ کی طرح جیسے ریت پر پھسل رہی تھی اور لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ تیز تیز بھاگنے سے سبین کا سانس پھول گیا تھا۔ حائک کے گھر تک آنے کے لیے اس نے ٹیکسی بھی نہیں لی تھی۔ اسے خدشہ تھا کہ ٹیکسی اسے دیر سے پہنچائے گی اور اب دیر وہ ہرگز نہیں کرنا چاہتی تھی۔ خود کی صلاحیتوں پر ایمان لاتی وہ بھاگی بھاگی اس جگہ تک آئی جہاں حائک رہتا تھا۔

"حائک کا گھر کہاں ہے؟" اس نے گلی میں داخل ہوتے ہی ایک عورت سے پوچھا تھا۔ جس کے سر پر کوڑے کی وضع کا کوئی بھرا ہوا شاپر دھرا تھا۔

"وہ رہا۔۔۔ اس طرف۔۔۔" عورت نے سمت کی طرف اشارہ بھی کیا، جہاں دیکھنے پر سبین کو کوئی گھر تو نظر نہیں آیا تھا البتہ ایک چار دیواری کے باہر ایک ٹاٹ کا پردہ لٹکتا ہوا نظر آیا تھا۔ وہ جو بھی تھا، حائک کا ہی گھر تھا۔

اس نے حائک کے گھر کا ٹاٹ کا پردہ پیچھے کیا۔ گھر کے اندر اندھیرا تھا۔ وہ باہر روشنی سے آ رہی تھی اس لیے چند لمحوں تک تو اسے اندر کچھ بھی نظر نہیں آیا بلکہ اسے ایسا لگا تھا جیسے ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر وہ کسی سرنگ میں داخل ہو گئی ہو۔۔۔ پھر چند لمحوں بعد جب اس کی بصارت نے کام کرنا شروع کیا تو اس پر گھر کا خالی پن آشکار ہوا۔ وہاں کوئی ایک بھی قابل قدر چیز موجود نہیں تھی۔ ماسوائے ایک بیڈ کے۔۔۔ جو اس قدر پرانا اور خراب حالت کا تھا کہ اسے بیڈ کہنا بھی اس کی توہین تھا۔ پھر اس بیڈ پر نہ تو کوئی گدا تھا اور نہ ہی

کوئی اور چیز۔۔۔اس کی خلازدہ سی لکڑیاں واضح نظر آ رہی تھیں۔فرش پر جو کچھ بھی بچھا ہوا تھا وہ حد سے زیادہ غلیظ تھا۔

اسی غلاظت پر ایک کونے میں حائنگ بیٹھا ہوا تھا اور اس نے اپنے جڑے ہوئے گھٹنوں میں اپنا سر دیے رکھا تھا۔

سبین بھاگ کر اس کے پاس پہنچی۔

''حائنگ۔۔۔!'' پہلے اس نے اسے پکارا، پھر یاد آنے پر کہ وہ گونگا بہرا ہے اسے کندھے سے ہلایا۔حائنگ نے چونک کر اپنا سر اٹھایا اور حائنگ کے چونکنے سے بھی کہیں زیادہ سبین ڈر گئی تھی۔

حائنگ کا چہرہ زرد تو پہلے ہی تھا اب تاریک بھی ہو رہا تھا۔اس کی چھوٹی چھوٹی شفاف آنکھیں اس حد تک اندر دھنس چکی تھیں کہ ایسا گمان ہوتا تھا جیسے وہاں کسی نے خنجر سے وار کر کے انہیں باہر نکال لیا ہو۔۔۔بڑھاپے کی عمر نہ ہونے کے باوجود بھی اس کے چہرے پر جھریاں اپنی چھاپ ڈال چکی تھیں۔ایک واحد چیز بھی جو ویسے کی ویسی تھی اور وہ تھا چائینز رسم الخط کا ٹیٹو۔۔۔جو اس کی گردن پر کندہ پہلے تو بھلا لگتا تھا لیکن اب وہ بھی کریہہ لگنے لگا تھا۔سبین کا دل کٹ کر رہ گیا۔اوپر سے مزید ستم یہ کہ اس وقت اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے، منہ سے رال اور ناک سے۔۔۔وہ تینوں، چاروں سمتوں سے نقاہت زدہ لگ رہا تھا۔

سبین نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور جب اسے وہاں کوئی صاف کپڑا نظر نہ آیا تو اس نے اپنے بیگ سے اپنا رومال نکال لیا۔یہ کام اگرچہ دل گردے والا تھا مگر اس نے کیا۔۔۔حائنگ کے آنسوؤں کے ساتھ ساتھ اس کی رال اور ناک کو بھی صاف کیا۔

خودکشی کی کوشش کے بعد وہ حائنگ سے اب ملی تھی۔وہ بری طرح سے نحیف ہو چکا تھا۔نجانے اس نے کتنے دنوں سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا، کہ بھوک اس کے جسم پر سوار ہو چکی تھی۔وہ تو اس دیوانے سے دائنا اور جیڈن کے عشق کے بارے میں کچھ پوچھنے آئی تھی، لیکن یہاں آ کر اسے اندازہ ہوا کہ حائنگ اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دے پائے گا۔پھر وہ گونگا تھا اور بہرا بھی۔۔۔اگر وہ اسے اپنا سوال سمجھا بھی دیتی تو اس کا جواب سمجھنے سے قاصر تھی۔پھر بھی اس نے اپنی سی کوشش کی تھی۔

''کیا جیڈن، دائنا کو پسند کرتا تھا؟'' سارے نظریوں کے باوجود اس نے اپنا سوال بیان کر دیا تھا۔پہلے زبان سے، پھر اشاروں سے۔۔۔اور اس کے اشارے اس قدر پیچیدہ تھے کہ انہیں اشاروں کا استاد بھی نہیں سمجھ سکتا تھا۔لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری تھی، اخبار کے وہ صفحے نکال نکال کر حائنگ کو دکھانے لگی جہاں دائنا اور جیڈن کی ساری خبر چھپی تھی۔

پہلے حائنگ غوں غاں کرتا رہا تھا، جو ظاہری بات ہے سبین کے سر پر سے گزر گئے تھے۔پھر اس نے سبین سے اخبار چھینا تھا، اور وہاں دائنا کی تصویر دیکھ کر ایک بار پھر سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔

سبین نے اپنا سر پکڑ لیا تھا۔اس نے یہ کیسے قیاس کر لیا کہ حائنگ پڑھنا لکھنا جانتا ہے۔پھر بھی وہ چیخ چیخ کر ایک ہی سوال دہراتی رہی کہ کیا جیڈن، دائنا کو پسند کرتا تھا؟ کیا حائنگ اس کے بارے میں کچھ جانتا ہے؟ اور حائنگ اسے دیکھتا ہوا ایسی حرکتیں

کرنے لگا تھا کہ اس کے پاگل ہونے پر کوئی شبہ نہیں رہ گیا تھا۔

تھک ہار کر اور اپنی کوشش میں ناکام ہو کر وہ واپس گھر آ گئی۔ مسٹر رافے کی ساری باتوں کو از سر نو سوچنے کا بس اتنا ہی فائدہ ہوا تھا کہ اس کے اعصاب مزید بری طرح سے چٹخنے لگے تھے۔ ایڈم نے تو کہا تھا کہ وہ لڑکی اس کے پاس مدد کے لیے آئی تھی۔ تو کیا دائنا کا ریپ ایڈم نے۔۔۔ نہیں۔۔۔ یہ نہیں ہو سکتا۔۔۔ ہرگز نہیں ہو سکتا۔۔۔ اس کا دماغ پھٹنے پر آ گیا تھا۔ جسے اب وہ اپنی زندگی کا ہم سفر بنانے کا ارادہ کر چکی تھی اس کے بارے میں ایسی بات۔۔۔؟ وہ پرسکون کیسے رہتی۔۔۔

رات میں کھانے کی ٹیبل پر اس نے ہمت کر کے ایڈم سے اس موضوع پر بات کرنا چاہی تھی۔

''تم دائنا کو کب سے جانتے تھے ایڈم؟''

ایڈم نے اس سوال پر چونک کر سبین کی طرف دیکھا تھا۔ کھانے کا چمچہ اس کے منہ میں نہیں جا سکا تھا، لیکن پھر کمال ہوشیاری سے اس نے خود کو لمحوں میں نارمل کیا تھا۔

''کیوں پوچھ رہی ہو۔۔۔؟''

''ویسے ہی۔۔۔'' نہ لہجہ سرسری ہو پایا تھا نہ چہرے کے تاثرات۔۔۔ اس کے چہرے پر بے چینی ہی بے چینی تھی۔

''بچپن سے جانتا ہوں میں اسے۔۔۔ میں اور جیفرسن ڈیڈ کے ساتھ وہاں اکثر جایا کرتے تھے۔ تب اُس کی ماں یہ کام کیا کرتی تھی۔ ڈیڈ اس سے سروس لیا کرتے تھے۔''

''موت سے پہلے وہ تمھیں آخری بار کب ملی تھی؟''

''ایک روز پہلے۔۔۔ اس نے فرمائش کی تھی کہ وہ میرے جسم پر جونکیں لگانا چاہتی ہے۔'' ایڈم نے بہت اطمینان سے جھوٹ بولا، سبین خاموش ہو کر رہ گئی۔

''لگتا ہے تم کسی صحافی سے ملی ہو سبین۔۔۔ یا کسی پولیس آفیسر سے۔۔۔''

سبین چونکی۔

''نہیں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' اور زندگی میں پہلی بار جیسے سبین سے ٹھیک سے جھوٹ نہ بولا گیا۔

''ٹھیک ہے تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں۔'' ایڈم نے ابھی کھانا ختم نہیں کیا تھا، لیکن اس نے کھانا چھوڑ کر نیپکن سے منہ صاف کیا اور اُٹھ کر اندر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ اس کے انداز میں سرد مہری تھی۔ زویا بھی یک ٹک سبین کو دیکھنے لگی تھی۔ سبین اپنے ان تمام سوالوں پر دل ہی دل میں شرمندہ ہوئی۔ اسے ایڈم جیسی شخصیت پر شک نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کیا پتا اس دن دائنا کی نیت ہی ایڈم پر خراب ہو گئی ہو۔۔۔ ایڈم کی قربت کے خواب کون لڑکی نہیں دیکھتی۔۔۔ جبکہ دائنا نے خود اپنے منہ سے کہا تھا کہ وہ

یہ کام کسی کے گھر جا کر کرتی ہے اور نہ کسی پارلر میں کر سکتی ہے۔ وہ یہ کام سنبل کے درختوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر ہی کر سکتی ہے۔ پھر وہ ایڈم کے فارم ہاؤس میں کیوں چلی آئی۔۔۔ یقیناً اپنی فرمائش کے پردے میں اُس نے ایڈم کو اپنی طرف راغب کرنا چاہا ہو۔۔۔ اور دائنا کے نامناسب رویے کے راز کا پردہ رکھتے ہوئے ایڈم نے کسی کو اصل بات نہ بتائی ہو۔۔۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ مسٹر رافے نے دائنا کو مہرہ بنایا ہو۔۔۔ ایڈم جیسی بلند پایہ شخصیت کو نیست و نابود کرنے کے لیے۔۔۔

ساری رات وہ یہ ہی باتیں سوچتی رہی تھی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ مسٹر رافے نے ابھی اسے صرف آدھی بات بتائی تھی، مزید آدھی بات کی جان کاری اسے پاگل کر دینے والی تھی۔ کیونکہ مسٹر رافے جس قدر مرضی سستا اور گھٹیا آفیسر تھا، اتنا تو جانتا ہی تھا کہ اگر اس نے پہلی ہی ملاقات میں ہیبن کو ساری بات بتا دی تو یہ لڑکی اپنے ہوش گم کر بیٹھے گی اور اس کے کسی کام کی نہیں رہے گی۔

☆......☆......☆

''کولونیل خاندان'' کا واحد بچ چکا فرد۔۔۔ پیٹرسن۔۔۔ اور ایڈورڈ گھرانے کا واحد فرد۔۔۔ جیفرسن۔۔۔ دونوں ہی اب نیویارک سے اُکتا چکے تھے۔ اس لیے تمام تر کاروبار کو ٹیکساس منتقل کیا جا رہا تھا۔ ساری ذمہ داری جیفرسن نے اٹھائی ہوئی تھی، کیونکہ نیویارک سے ٹیکساس منتقل ہونے کا خیال بھی اُسی کا تھا۔ وہ وہاں کے لیے نئی ٹیم کا بندوبست کر رہا تھا۔ نئے لوگوں کو شامل کر رہا تھا۔ پرانے لوگوں کو بلاوجہ نکالا جا رہا تھا۔ کچھ لوگ خود ہی گروپ چھوڑ رہے تھے۔ کچھ روپوش ہو رہے تھے۔ جیفرسن، پیٹرسن کو کسی بات کی خبر کیے بنا بھرتیاں کرتا جا رہا تھا۔ ٹیم کے جو خاص اراکین چنے گئے تھے وہ بھی جیفرسن کی پسند کے تھے۔ جب پیٹرسن نے ان کے بارے میں پوچھا تو جیفرسن نے یہ ہی کہا تھا کہ نئے لوگوں کے بارے میں اس کی ہر طرح کی تسلی ہے۔ پیٹرسن کو اب جیفرسن پر اتنا اعتماد تو تھا ہی کہ وہ اس کے انتخاب پر نکتہ چینی نہ کرے۔ اور شاید یہاں ہی پیٹرسن اپنی زندگی میں پہلی بار غلطی کر رہا تھا۔

ٹیکساس میں ایک بڑے پیمانے کا ہوٹل تعمیر کروایا جا رہا تھا۔ جو پیٹرسن کے خالص قانونی سرمائے کو ظاہر کرنے کے لیے تھا، لیکن پس پردہ اسی ہوٹل سے ساری دنیا کو چلائے جانے کی تیاری کی جا رہی تھی۔

جیفرسن جس طرح کے مرضی کاغذات لا کر پیٹرسن کے آگے کرتا تھا اور وہ اس پر دستخط کر دیتا تھا۔ پیٹرسن کو خبر ہوئے بنا جیفرسن سب کچھ اپنے نام پر منتقل کروا رہا تھا۔ ادارے، وش ہوم، تمام رفاعی اداروں کی اتارنی۔۔۔ سب بڑی خاموشی سے جیفرسن کے نام منتقل ہوتا جا رہا تھا۔ جیفرسن کو اس بات کا بھی ڈر نہیں تھا کہ اگر اچانک سے پیٹرسن کو کچھ علم ہو گیا تو اس کا کیا حال ہوگا۔ مسٹر رافے کا وعدہ معاف گواہ بننے کے بعد وہ کسی حد تک نڈر ہو چکا تھا۔ اب اسے کسی کا خوف نہیں رہ گیا تھا۔ صرف پیٹرسن کے منظر سے غائب ہونے کی دیر تھی، اور پھر سب اس کا تھا۔ وہ ایک بڑی جماعت کا بے تاج بادشاہ بننے والا تھا۔ اور آج کل اپنے شب و

روز ان ہی خوابوں کو دیکھتے ہوئے گزار رہا تھا۔

''رات میں حدانی کے ساتھ میٹنگ ہے۔ تم جانتے ہو ناں۔۔۔ وہ افریقہ کا ''پیٹرسن'' ہے، لیکن زیادہ وقت امریکا میں ہی گزارتا ہے۔''

''ہاں۔۔۔ یاد ہے۔ اسے اچھی طرح ویلکم کرنا، اپنے ہم مرتبہ لوگوں کو اتنی ہی عزت دینی چاہیے جتنی آپ اپنے لیے چاہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' اور جیفرسن تو خود حدانی سے ملاقات کے لیے حد سے زیادہ پر جوش تھا، کیونکہ حدانی کسی نئی طرز کے نشے کی آفر لے کر آنے والا تھا۔ جو جیفرسن کے خیال میں دنیا کا رخ بدل دینے والا تھا۔

رات میں حدانی مقررہ وقت پر پیٹرسن کے آفس میں موجود تھا۔ وہ پیٹرسن کی ہی کاپی تھا۔ چال ڈھال، رعب، انداز و گفتار میں وہ پورے کا پورا پیٹرسن تھا۔ جیفرسن اس سے مرعوب ہوا تھا۔ حدانی اپنی آفر کے سلسلے میں ساری بات چیت جیفرسن کے ساتھ کر چکا تھا، آفر اگرچہ اس کے قیاس کے مطابق کسی نشے کی تو نہیں تھی لیکن وہ جو بھی تھی جیفرسن کو اچھی لگی تھی۔ اس کے باوجود ختمی فیصلہ پیٹرسن نے ہی کرنا تھا۔

''مجھے اپنی آفر کے بارے میں بتاؤ حدانی!''

ضروری بات چیت کے بعد پیٹرسن اصل مدعا پر آیا تھا۔

''میری آفر۔۔۔ انسانی پارٹس کی اسمگلنگ کے بارے میں ہے۔'' حدانی نے بڑے تحمل سے دنیا کے سب سے قبیح گناہ کا ذکر کیا تھا۔ پیٹرسن اپنی کرسی پر آگے کو ہوا۔ حدانی نے اس چونکنے کو پیٹرسن کا دلچسپی لینا سمجھا۔

''ایشیا کے بہت سے غریب ممالک میں لاوارث بچوں کی تعداد حد سے زیادہ ہے۔ درحقیقت تمھاری اور میری سوچ سے بھی زیادہ۔۔۔ وہ بچے کیسے اغواء ￼ ہوں گے، کیسے ان کے جسم کے پارٹس الگ ہوں گے، کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوگی، کیونکہ ان بچوں کا کوئی وارث تو ہوگا نہیں۔۔۔ اور پھر یہ ایسا کام ہے کہ اس کا اسکوپ کبھی بھی کم نہیں ہو سکتا۔۔۔ چھوٹے بچوں کی ہڈیوں سے بنا ماسک، بیوٹی پراڈکٹ، کیمیکل۔۔۔ یہ سب چیزیں لاکھوں میں بکتی ہیں۔ بلکہ اب تو ان ہڈیوں کی انتہائی مہنگی شراب بھی بننے لگی ہے۔ تم یقیناً اس بارے میں مجھ سے زیادہ جانتے ہو گے، کیونکہ یورپ میں شراب کی کھپت افریقہ سے زیادہ ہے۔ اس کام کے لیے ایشیاء ￼ میں ہمارے سارے کارندے پھیل چکے ہیں۔ سب سے معاملات طے پا چکے ہیں۔ نیچے سے لے کر اوپر تک۔۔۔ وہ سب بس میرے ایک اشارے کے منتظر ہیں۔'' حدانی نے بات ختم کر کے عادتاً اپنی ٹائی کو درست کیا۔

''اگر سب کچھ طے ہے تو پھر میری کیا ضرورت ہے حدانی۔۔۔'' پیٹرسن اب حدانی کی آفر سے غیر دلچسپ ہو کر

پیپر ویٹ کو ٹیبل کی سطح پر گھمانے لگا تھا۔ جیفرسن سمجھ گیا تھا کہ پیٹرسن کے لیے حدانی کی آفر مرعوب کن ثابت نہیں ہوئی۔

''میں یہ کام صرف افریقہ تک ہی محدود نہیں رکھنا چاہتا ہوں، کیونکہ افریقہ ایک چھوٹی مارکیٹ ہے۔ یہ کام ایسا ہے کہ اسے یورپ جیسی بڑی مارکیٹ میں بھی آنا چاہیے۔ پھر دوسرا یہ کہ میں اس کام کو مزید مضبوطی سے کرنا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں ہم دونوں جب اس کام میں مل جائیں گے تو اتنے مضبوط ثابت ہوں گے کہ کوئی چٹان بھی ہمیں نہیں توڑ سکے گی۔'' حدانی نے صاف گوئی سے کہا۔

پیٹرسن کو اس کی صاف گوئی اچھی لگی تھی، لیکن حدانی کی آفر قبول کرنے میں اسے ہچکچاہٹ ہو رہی تھی۔ جیفرسن نے کہا تھا کہ وہ کسی نئی طرز کے نشے کی اسمگلنگ کی بات کرے گا، لیکن اب وہ بچوں کے اعضاء [] کی بات کر رہا تھا۔ جو بھی تھا پیٹرسن کی زندگی کے کچھ اُصول تھے۔ بے شک وہ ایک برے بطن سے، برے گھر میں پیدا ہوا تھا اور پھر اس کی تربیت بھی ایسی ہوئی تھی کہ وہ برائی اور اچھائی کی تمیز بھول گیا تھا۔ اس سب کے باوجود اس نے کچھ اُصول چن رکھے تھے۔ اپنے اوپر کچھ حدیں لاگو کر رکھی تھیں۔ اس نے ہر برا کام کیا تھا، اسمگلنگ، بردہ فروشی، جواء []، شراب، لیکن جو آفر حدانی اس کے پاس لے کر آیا تھا اس نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اسے اس کاروبار میں شراکت داری ایکائی کی مانند لگ رہی تھی۔

''میں تمھارا فیصلہ جاننا چاہتا ہوں پیٹرسن!''

''مجھے یہ آفر قبول نہیں۔۔۔'' بالآخر پیٹرسن نے فیصلہ کن انداز میں کہہ دیا۔ حدانی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''ففٹی ففٹی کی آفر کو بھی تم کم سمجھ رہے ہو؟''

''میں پیسوں کی بات نہیں کر رہا۔۔۔''

''تو پھر۔۔۔؟''

''مجھے یہ کام پسند نہیں۔۔۔''

''کیا۔۔۔؟'' حدانی ہنسا تھا۔ وہ کیسے نہ ہنستا، اس نے اسی کام کے لیے نیچے سے اوپر تک سب کو خرید رکھا تھا، اور کسی نے بھی یہ نہیں کہا تھا کہ اسے یہ کام پسند نہیں۔

''یہ کام تم نے اپنے ہاتھوں سے تھوڑی نہ انجام دینا ہے۔''

''جو بھی ہے، میرے کچھ اُصول ہیں۔ میں برا انسان ہوں۔ بہت برا۔۔۔ لیکن ایک حد سے آگے کی برائی میرے بس سے باہر ہے۔ تمھاری آفر اسی حد سے باہر کی ہے۔''

حدانی کو چند لمحے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ کیا سن رہا ہے اور پیٹرسن کیا بول رہا ہے۔ اس نے سوالیہ جیفرسن کی طرف دیکھا۔

جیفرسن نے اسے باہر ہی کہہ دیا تھا کہ پیٹرسن کو اس کی آفر بہت پسند آئے گی، اور وہ ففٹی ففٹی کی شق پر اس آفر پر کام کرنے پر راضی ہو جائے گا۔ لیکن اب جو پیٹرسن کہہ رہا تھا؟

پیٹرسن کی ہتک کے خیال سے حدانی اندر ہی اندر ہنسا۔ اسے ایسی باتیں پہلی بار سننے کا اتفاق ہو رہا تھا۔

''کیا تم اسمگلنگ، جوا، شراب کی غیر قانونی ترسیل، کرنسی ریٹ میں خرد برد۔۔۔ اس سب کو درست سمجھتے ہو؟''

''نہیں وہ بھی غلط ہے۔ لیکن بچوں کے اعضاء ۔۔۔ یہ تباہ کن ہے۔''

''دراصل میرے خیال سے تم سمجھ ہی نہیں پا رہے کہ میں تمھارے پاس کس قدر بڑی آفر لے کر آیا ہوں۔ نوزائیدہ بچوں کے وجود کے ماسک شہزادیاں، مادام اور ہیروئنز اپنی جاگیریں بیچ کر بھی خریدنے کو تیار ہوتی ہیں۔ یہ کام کم میٹریل کے بدلے میں بہت بڑی رقم کمانے والا ہے۔ تم میرے ساتھ پارٹنرشپ نہیں کرنا چاہتے تو سیدھی طرح سے انکار کرو۔۔۔ اس طرح سے گھما کر بات مت کرو۔۔۔''

''سیدھی بات یہ ہے مسٹر حدانی کہ میں تمھارے ساتھ یہ کام ہرگز نہیں کروں گا۔ باقی آگے تمھاری سوچ پر پہرا لگانے کا مجھے کوئی حق نہیں۔۔۔ تم جو چاہو سوچ سمجھ سکتے ہو۔''

اس سیدھی سادی بات کے بعد حدانی کے لیے وہاں بیٹھنا بیکار تھا۔ وہ اپنی سیٹ سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے انداز میں غصہ تھا۔

''ہم کسی اور آفر پر مل کر ایک ساتھ کام کر سکتے ہیں۔'' پیٹرسن نے حدانی کو یہ الفاظ اس پہلی ملاقات کی تلخی کم کرنے کے لیے کہے۔

''یہ کام جو میں نے تمھیں بتایا ہے اس میں اس قدر فائدہ ہے کہ باقی کے تمام کام اس کے سامنے چھوٹے لگنے لگتے ہیں۔ میں خود باقی سب کچھ چھوڑنے کی سوچ چکا ہوں۔ تم بھی اچھی طرح سوچ لو۔۔۔ مجھے جواب کی کوئی اتنی جلدی نہیں ہے۔''

حدانی کہہ کر چلا گیا، جیفرسن اسے باہر تک چھوڑنے گیا تھا۔ وہ واپس آیا تو اس کا ماتھا پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا اب اس سے سوال جواب ہوں گے۔ اس کا اندازہ درست تھا۔

''تم نے تو کہا تھا کہ حدانی کسی نئی طرز کے نشے کی بات کرنے آئے گا۔''

''اس نے نئی بات کی تو ہے۔ اگرچہ وہ نشے کے متعلق نہیں ہے۔''

''نہیں۔۔۔ ہم یہ کام نہیں کریں گے۔''

''اس میں واقعی کافی فائدہ ہے پیٹی۔۔۔''

''اس کے باوجود ہم یہ نہیں کریں گے۔''

''اچھی طرح سوچ لو بھائی۔۔۔''

''میں نے کہا ناں نہیں۔۔۔'' پیٹرسن نے اسے کڑی نظروں سے گھورا۔ وہ جیفرسن کی یہ ''بھائی'' والی ضد ہرگز نہیں مان سکتا تھا۔

رات میں جیفرسن اپنے گھر چلا گیا تھا۔ ساری رات وہ حدانی کی آفر کے بارے میں سوچ وبچار کرتا رہا تھا۔ وہ تو حدانی کی آفر کے بل بوتے پر ہی دنیا کو گھمانے کا تہیہ کر چکا تھا، لیکن پیٹرسن نے بات ہی ختم کر دی تھی۔ لیکن پھر رات کے نجانے کس پہر جیفرسن کو خیال آیا کہ اب جب پیٹرسن کے دن ہی کم رہ گئے تھے اور سب کام اس کے ذمے آنے والے ہیں تو وہ کیوں پیٹرسن کے کیے گئے فیصلوں کی وجہ سے خود کو نقصان پہنچائے۔ اسے اب آنے والے وقت کے فیصلے بھی خود ہی لے لینے چاہیے تھے۔

ساری رات سوچ بچار کرتے رہنے کے بعد صبح پہلے وقت اس نے حدانی کو کال کی تھی۔

''حدانی! مجھے تمھاری آفر قبول ہے۔''

''گڈ۔۔۔ٹھیک ہے پھر شام کو تم، میں اور پیٹرسن مل کر اس پر بات چیت کرتے ہیں۔''

''لگتا ہے تم نے ٹھیک سے میرے الفاظ پر غور نہیں کیا حدانی۔۔۔ میں نے کہا ''مجھے'' تمھاری آفر قبول ہے۔'' جیفرسن نے ''مجھے'' کے لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا تھا۔

اصل بات سمجھنے میں حدانی کو چند سیکنڈ ہی لگے تھے اور پھر فضا میں اس کا قہقہہ بلند ہوا تھا۔

☆......☆......☆

سیلین ان دنوں سخت پریشان دہ صورتحال سے گزر رہی تھی۔ شادی پر ایڈم کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا، زویا اسے کہہ رہی تھی کہ وہ ایڈم کو ''ہاں'' کیوں نہیں کہہ رہی اور وہ تھی کہ فیصلہ کر لینے کے باوجود نجانے کیوں تذبذب کا شکار تھی۔ کوئی چیز تھی جو اسے تنگ کر رہی تھی۔ کوئی بے چینی تھی جو اسے ''ہاں'' کہتے ہوئے گھیر لیتی تھی۔ کچھ اور سمجھ میں نہ آتا تو وہ میران کی روح سے بات کرنے لگتی۔ اس شادی پر اس کی مرضی پوچھنے لگتی، لیکن اس کے زندگی بھر کے کاموں کی طرح اس کا روحانی تصوف بھی بے ہنر تھا۔ آدھا کچا، آدھا پکا۔۔۔ نجانے میران کی روح اسے کوئی جواب نہ دیتا یا وہ ہی اسے سن نہ سکی۔۔۔

ایک روز میران سمیت اپنے ماضی کے دنوں کو یاد کرتے کرتے نجانے کیسے اسے ڈینی بھی یاد آ گیا۔ جس سے عرصہ ہوا اس کی کوئی بات نہیں تھی۔ ایسے ہی بلا وجہ اس نے ڈینی کو کال کر لی تھی۔ یہ جاننے کے لیے کہ اب وہ کن حالات سے گزر رہا ہے اور اگر اسے سیلین کی کوئی مدد درکار ہے تو اسے کر کے خوشی ہوگی۔

"کیسے ہو ڈینی۔۔۔؟"

"میں ٹھیک ہوں۔تم بتاؤ۔۔۔تم کیسی ہو؟ تمھارے بابا کے اور میران کے مرنے کا بہت دُکھ ہوا مجھے سبین۔۔۔"

جواب میں سبین نے گہرا سانس لیا تھا۔

"میں تمھیں فون کرنا چاہ رہا تھا، مگر پھر احساس ہوا کہ شاید تمھیں میرا فون کرنا اچھا نہ لگے۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ایسی کوئی بات نہیں ہے ڈینی۔۔۔تم ہمیشہ میرے لیے بہت مددگار ثابت ہوئے ہو۔۔۔تمھارا فون کرنا بھلا مجھے کیوں برا لگتا۔۔۔تم نے ہر مشکل میں میرا بہت ساتھ دیا ہے۔"

"کیا تم سمجھتی ہو کہ تم تمام مشکلات سے نکل آئی ہو۔۔۔" ڈینی نے بے اختیار ہی کہا تھا۔سبین کے لیے ڈینی کا یہ سوال بہت انوکھا اور حیران کن تھا۔

"کیا کہہ رہے ہو ڈینی۔۔۔؟"

"کچھ نہیں۔۔۔پہلے مجھے بتاؤ کہ تم ایڈم راہل کے گھر کیوں رہ رہی ہو۔۔۔؟"

"ایڈم ایک بہت مخلص انسان ہے ڈینی! اس نے میرے لیے بہت سی مشکلات کا سامنا کیا ہے۔تمھیں یاد ہوگا کہ تم ہی نے تو مجھے اس کے پاس بھیجا تھا،لیکن تم اپنی بات کی طرف آؤ۔۔۔تم کیا کہنا چاہ رہے تھے۔" وہ سخت گھبرا گئی۔

"میں چاہوں بھی تو تمھیں کچھ نہیں بتا سکتا سبین۔۔۔بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ اپنے ارد گرد نظر رکھو۔۔۔"

ڈینی کی یہ ادھوری سی بات سبین کو مزید اُلجھن میں مبتلا کر گئی تھی۔

"اس بات کا کیا مطلب ہے؟"

"نیویارک سے عجیب وغریب خبریں آ رہی ہیں۔کارندے بدلے جا رہے ہیں۔نئی بھرتیاں کی جا رہی ہیں۔پرانے کام کرنے والوں کو موت کے گھاٹ اُتارا جا رہا ہے۔کچھ لوگ گروپ کو خود ہی چھوڑ رہے ہیں۔کچھ ڈر کے مارے روپوش ہو رہے ہیں۔"

"تم یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو۔۔۔میرا اب ان سب سے کیا واسطہ رہ گیا ہے؟"

"ان ہی عجیب وغریب خبروں میں سے ایک خبر یہ بھی ہے کہ ڈان پیٹرسن اصل میں ایڈ۔۔۔"

اور اگلے ہی پل ڈینی کی کال منقطع ہو گئی تھی۔سبین نے جلدی سے پھر سے نمبر ملایا تھا،لیکن اب کی بار نمبر بند جانے لگا تھا۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ اس کی ڈینی سے آخری بات چیت تھی۔اس آخری بات چیت کے الفاظ سبین کو پریشان کر رہے تھے۔

"میں چاہوں بھی تو تمھیں کچھ نہیں بتا سکتا سبین! بس اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ اپنے ارد گرد نظر رکھو۔"

ڈینی آخر اس سے کیا کہنا چاہتا تھا۔سارا دن تذبذب میں گزار لینے کے بعد شام میں جب وہ میران کی قبر پر گئی تو ایک بار

پھر اس کا سامنا مسٹر رافے سے ہو گیا۔ سبین نے دانت پیسے۔۔۔ ایک تو وہ آگے ہی بہت پریشان تھی اوپر سے رافے کی باتیں اسے مزید بے سکون کر دیتی تھیں۔ نجانے یہ شخص اس سے چاہتا کیا تھا۔

''براہِ مہربانی آپ نے جو بھی کہنا ہو، مختصراً کہیے گا۔ آپ کی باتیں مجھے سمجھ میں نہیں آتیں۔۔۔ بلکہ مزیداً الجھن میں مبتلا کر دیتی ہیں۔''

''اور میں ہی تو آپ کو ساری الجھنوں سے نکالنا چاہتا ہوں۔'' وہ ہنسا۔ سبین کی برداشت جواب دیتی جا رہی تھی۔

''پہلی بات تو یہ کہ میں یہ کسی صورت نہیں مان سکتی کہ ڈائنا کا ریپ ایڈم نے کیا ہے اور دوسری۔۔۔''

''ڈائنا کا ریپ ایڈم نے کیا بھی نہیں۔۔۔ وہ اس کے چھوٹے بھائی جیفرسن نے کیا تھا۔'' رافے نے سبین کی بات درمیان سے کاٹ کر دھماکا کیا تھا۔

''کیا۔۔۔؟'' سبین کو بری طرح سے شاک لگا تھا۔

''کیا ایڈم یہ بات جانتا ہے؟''

''نہیں۔۔۔''

''تو پھر آپ ایڈم کے پیچھے کیوں پڑے ہیں؟ آپ جیفرسن کو پکڑیں۔''

''میں جیفرسن کو نہیں پکڑ سکتا۔۔۔ وہ میرا وعدہ معاف گواہ ہے۔ اور ویسے بھی ابھی اس کے ذمے بہت سے کام ہیں جو اس نے پایہ تکمیل تک پہنچانے ہیں۔''

''وعدہ معاف گواہ۔۔۔ بہت سے کام۔۔۔ مطلب۔۔۔؟'' سبین کی التجا کے باوجود رافے سیدھے سبھاؤ سے بات نہیں کر پا رہا تھا۔

''میں نے آپ کو ایک کہانی بھی تو سنائی تھی مس سبین۔۔۔ ایما اور ولیم کے ایک بچے کی۔۔۔ جو بلا کا ذہین تھا اور بلا کا خوبصورت۔۔۔ اور جو محض پانچ سال کی عمر میں فوت ہو گیا تھا۔''

''ہاں۔۔۔ لیکن مجھے اس بچے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''میران کے قاتل سے تو ہے؟'' اس نے سبین کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا تھا۔ سبین دھک سے رہ گئی تھی۔

''تو وہ بچہ درحقیقت فوت نہیں ہوا تھا، بلکہ اس کے نانا نے اس کے مرنے کا ڈرامہ رچا کر اسے ایک یتیم خانے میں جمع کروا دیا تھا۔ اس سب کا مقصد اس کی اصل شناخت کو دفن کرنا تھا، کیونکہ کولونیل خاندان بری طرح سے بدنام ہو چکا تھا۔ اس خاندان پر کتابیں بھی شائع ہو چکی تھیں اور اس خاندان کے لڑکے جرائم کی دنیا میں بہت نام کما کر بدنام ہو چکے تھے۔ جیلیں ان

سب کا دوسرا گھر تھیں۔ اس بچے کو نئی شناخت دینے کا مقصد یہ تھا کہ وہ بدنامی کی دنیا کو چھوڑ کر نیک نامی میں ایسا نام کمائے کہ اس کے گھناؤنے کاموں کی طرف کسی کی سوچ بھی نہ جا سکے۔۔۔اور حقیقتاً ایسا ہو بھی گیا۔ وہ بچہ جب بڑا ہوا تو جرائم کی دنیا میں اس نے اپنا ایک الگ ہی نام بنایا۔۔۔اور اس لڑکے کا نام ہے ڈان پیٹرسن۔۔۔"

سبین چند لمحے مسٹر رافے کی کہانی کے اس نئے کلائمکس پر خاموش رہی تھی۔

"یہ سب من گھڑت باتیں نہیں ہیں مس سبین! نہ ہی یہ کوئی کہانی ہے۔ یہ سب حقیقت ہے اور مجھے پیٹرسن کے چھوٹے بھائی نے بتائی ہیں۔ پیٹرسن کے ماضی کے ثبوت اس کے کمرے کی ایک الیکٹرک تجوری میں بند ہیں۔ وہ تجوری صرف دو افراد ہی کھول سکتے ہیں۔ ایک پیٹرسن خود اور ایک اس کا چھوٹا بھائی۔۔۔کوئی تیسرا اسے کھولنے کی کوشش کرے گا تو تجوری میں خودکار طریقے سے آگ لگ جائے گی۔ اور سارے ثبوت جل کر راکھ ہو جائیں گے۔ اور اگر وہ کسی طرح صحیح سلامت باہر آ بھی جائیں تو گھر سے باہر نہیں جا سکتے۔۔۔کمرے سے نکلتے ہی پورے گھر میں سائرن کا خوفناک شور گونج اٹھے گا۔

کیونکہ اس کے ایک ایک صفحے پر سنسر چپ لگی ہوئی ہے اور گھر سے باہر نکلنے کا تو تصور ہی نہیں۔۔۔کیونکہ پورا گھر دھماکوں سے تہس نہس ہو جائے گا۔۔۔"

"اگر آپ اتنا سب کچھ جانتے ہیں تو پھر اسے پکڑ کیوں نہیں لیتے۔۔۔"

"اس نے عوام کی نظروں میں اپنی عظمت کا اتنا اونچا بت بنا رکھا ہے کہ میرے جیسے آفیسر کے لیے اس پر ہاتھ ڈالنا تقریباً ناممکن ہے۔"

"میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟"

"تم میرے اور پیٹرسن کے بھائی کے لیے مہرا ہو سبین! ایک پیادہ۔۔۔جس پر ہمیں اپنی بساط جیتنی ہے۔"

"سوری۔۔۔میں آپ کا کوئی ساتھ نہیں دے سکتی۔"

"ساتھ تو تم دو گی۔۔۔اور اپنی خوشی سے دو گی۔"

"وہ کیوں۔۔۔؟"

"بہت پہلے میں نے ایک ہندو دیو مالائی کہانی سنی تھی۔ یقیناً تم نے بھی سن رکھی ہو گی، کیونکہ تم بھی اسی خطے کی ہو۔۔۔کہانی کچھ یوں ہے کہ اگر کوئی انسان غلطی سے یا جان بوجھ کر جوڑا بنا چکے سانپ کو مار دے تو اس کی مادہ ہر حالت میں اپنے محبوب کی موت کا بدلہ لیتی ہے۔" مسٹر رافے نے توقف کیا تھا۔ سبین سادہ سی بات بھی نہیں سمجھ سکی تھی۔

"ویسے اگر تم وہ ثبوت دیکھنا چاہو تو اس کا چھوٹا بھائی تمہیں دکھا دے گا۔ محض تمہاری تسلی کیلیے۔۔۔"

"میں وہ ثبوت کیوں دیکھنا چاہوں گی۔ مان لیتی ہوں کہ جو آپ کہہ رہے ہیں وہ سب ٹھیک ہے۔ وہ بچہ ڈان پیٹرسن بن گیا، لیکن ڈان پیٹرسن سے اب میرا کیا واسطہ۔۔۔ ایڈم نے اسے ایک بہت بڑی رقم دی ہے میری جان چھوڑ دینے کے لیے۔۔۔ اور اس دن کے بعد اس کے گروپ کے کسی لڑکے نے مجھے تنگ نہیں کیا۔۔۔ پھر اب میں اسے کیوں تنگ کروں؟"

"تم جانتی ہو کہ میران نیمر نے سے پہلے فرش پر اپنے خون سے جو لفظ لکھا تھا وہ کیا تھا؟"

"جانتی ہوں۔ پی (P)۔۔۔"

"پی سے کس کا نام بنتا ہے؟"

"اوہ ہو مسٹر رافے۔۔۔ ظاہری بات ہے کہ پیٹر۔۔۔ قاتل کا نام۔۔۔ میران یقیناً اس کا نام کسی بھی طرح سے جان گیا ہوگا، اس لیے اس نے مرنے سے پہلے وہاں اس کا نام لکھنے کی کوشش کی۔"

"پی سے صرف پیٹر ہی تو نہیں بنتا۔۔۔ اور بھی تو بہت سے نام بنتے ہیں۔ جیسے پف، پومر، پیران، پاؤل اور۔۔۔ جیسے پیٹرسن۔۔۔"

"کسی نے سبین کے اعصاب پر جیسے ہتھوڑا مارا تھا۔"

"تو کیا میران کا قتل پیٹرسن کے کہنے پر ہوا ہے؟ تو کیا گروپ نے میری جان نہیں چھوڑی تھی۔ جبکہ انہوں نے تو ایڈم سے کہا تھا کہ اب میں آزاد ہوں۔"

"کون ایڈم، کون پیٹرسن۔۔۔ آنکھیں کھولو اپنی پاگل لڑکی۔۔۔ تم اس وقت ڈان پیٹرسن کے گھر میں ہی تو رہ رہی ہو۔۔۔ ایڈم راحل اور ڈان پیٹرسن۔۔۔ دونوں ایک ہی شخصیت کے تو دو نام ہیں۔"

ایٹم بم کا دھماکا ہوا تھا اور سبین کے قدموں کی ساری دھرتی جل کر راکھ ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

سبین کا سر پھٹنے پر آ گیا تھا۔ اس نے سب دیکھ لیا تھا۔ جیفرسن نے اسے سارے ثبوت دکھا دیے تھے۔ ایڈم ہی پیٹرسن تھا۔ ڈان پیٹرسن۔۔۔ اب شک کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی۔ وہ کسی یتیم خانے کا لڑکا نہیں تھا۔ وہ ایما اور ولیم کا بیٹا تھا۔ کولونیل طرز تعمیر کی عمارت میں اپنے نانا کے ساتھ اس کی بہت سی تصویریں تھیں۔ اسے شوٹنگ سکھاتے ہوئے، اسے رننگ کرواتے ہوئے، تاش کے ٹرک سکھاتے ہوئے۔۔۔

نانا کی تین چار ڈائریاں بھی تھیں جو انہوں نے خاص طور پر پیٹرسن کے لیے ہی لکھی تھیں، جس میں انہوں نے اسے کامیاب ڈان بننے کے گر سکھائے تھے۔ مشکل حالات کے لیے لاتعداد نصیحتیں کی تھیں۔

پھر سب سے بڑی بات۔۔۔ وہاں دائنا کے پوسٹ مارٹم کی اصل رپورٹ موجود تھی، جس کے بارے میں مسٹر رافے نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا۔ اب مزید کوئی ابہام نہیں بچا تھا۔ ساری کڑیاں مل چکی تھیں۔ جنہوں نے ایک بھیانک تصویر ابھاری تھی۔

وہ کس خوب صورتی سے اپنے دونوں کرداروں کو لے کر چل رہا تھا۔ ایڈم کو جاننے والے تو تصور بھی نہیں کر سکتے کہ وہ کسی جرائم میں کبھی ملوث رہا ہے یا کبھی آنے والی زندگی میں ہوگا۔ کس قدر مضبوط بت بنا رکھا تھا اس نے لوگوں کے سامنے اپنا۔۔۔ جبکہ حقیقتاً وہ ایک مکروہ انسان تھا۔ اور اس مکروہ انسان کیلیے وہ بھی کام کرتی رہی تھی اور اب اسے اپنی زندگی سونپنے جا رہی تھی۔ وہ جو اس کے شوہر کا قاتل تھا۔ اب وہ اسے اپنا شوہر بنانے لگی تھی۔ وہ سوچ سوچ کر ہی پاگل ہونے والی ہو گئی تھی۔ اپنی بے وقوفی پر اسے رونے سے زیادہ غش آ رہا تھا۔ اس کا خون ابلنے لگا تھا۔ وہ اتنے دنوں سے میران کے قاتل کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اپنے شوہر کے قاتل کے ساتھ اور اس سے شادی کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ تف تھی اس پر۔۔۔ اس نے خود پر ہزار بار لعنت بھیجی۔۔۔ تب بھی اسے یہ کم لگا۔

کھڑکی سے باہر بڑے پورچ میں تین سیاہ کاریں آ کر رکی تھیں جن میں سے درمیان والی میں سے ایڈم اترا تھا۔

نہیں۔۔۔ پیٹرسن۔۔۔ وہ سب سے پہلے سبین کے کمرے میں ہی آتا تھا۔ اس سے حال چال پوچھتا تھا پھر اپنے کمرے میں جاتا تھا۔ سبین کو آج اس کی شکل سے اتنی نفرت محسوس ہوئی تھی کہ اس کا دل چاہا وہ اس کی شکل سمیت اس کو بھی کسی تیزاب کے ڈرم میں ڈبو دے۔ اسے نیست و نابود کر دے۔

اسے اب سمجھ میں آیا تھا کہ مسٹر رافے نے وہ ہندو دیومالائی کہانی اسے کیوں سنائی تھی کہ کوئی انسان جوڑا بنا چکے سانپ کو مار دے تو اس کی ناگن ہر صورت اپنے محبوب کا بدلہ لے کر رہتی ہے۔ اس راز کی آشکاری کے بعد وہ بھی ناگن ہی بن گئی تھی۔ اور اس کے اندر سو سے بھی زیادہ ناگوں کا زہر بننے لگا تھا۔

سبین نے کمرے میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔۔۔ وہ ایک لمحے کی دیر کیے بنا ہی پیٹرسن کو قتل کر دینا چاہتی تھی۔ یہ سوچے بنا کہ بعد میں اس کا یا اس کے ساتھ جڑے کسی کا بھی کیا بنتا ہے لیکن اسے کمرے میں کوئی ایسی چیز نہیں نظر آئی تھی جس سے وہ پیٹرسن کا قتل کر سکتی۔

پیٹرسن اس کے کمرے کی طرف ہی آ رہا تھا۔ اس نے اس کے قدموں کی چاپ سنی تھی۔ آج اسے یہ چاپ کی آواز بھی بھیانک لگی تھی۔ نفرت انگیز۔۔۔ یہ چاپ اس چاپ سے کہیں زیادہ اذیت ناک تھی جو اس نے کلیے کا طغرا توڑنے سے پہلے پولیس کے بھاری بوٹوں کی سنی تھی۔

اگلے ہی پل پیٹرسن نے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دے کر دروازہ ہلکے سے کھول دیا تھا۔ اندر کے منظر نے پیٹرسن کو اپنی ہی جگہ رک جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ سبین دور کھڑی اسے غضب ناک آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے ڈورے سرخ ہو رہے تھے۔ یا تو وہ بہت زیادہ رو چکی تھی یا رلا دینے کا تہیہ کر چکی تھی۔

''سبین۔۔۔کیا ہوا۔۔۔خیریت۔۔۔؟''

وہ پیار سے پوچھ رہا تھا اور سبین کے اندر نفرت کے لاوے ابل رہے تھے جو بس پل بھر میں باہر پھٹنے کو بے تاب تھے۔ اس کی سرخ آنکھیں وحشت سے بھری ہوئی تھیں۔

''سبین۔۔۔کیا ہوا پیاری۔۔۔؟'' اب کے کہتے ہوئے وہ ایک قدم قریب ہوا، اور اس کے سبین تک پہنچنے سے پہلے ہی سبین بھاگتے ہوئے خود اس تک پہنچ گئی۔

''میں تم سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں ایڈم!'' اس نے کہا اور پھر ایڈم کے مضبوط سینے پر اپنا سر رکھ دیا، اگلے ہی پل ایڈم کی آنکھوں میں محبت کی الوہی کرنیں پھوٹی تھیں اور سبین کی غضب ناک آنکھوں میں انتقام کے شعلے جل اٹھے تھے۔



ناول **شام رنگ سیاہ** ابھی جاری ہے۔ آخری قسط آپ اگلے ماہ کی **20** تاریخ کو پڑھ سکیں گے۔

آخری قسط نمبر 14

"میں تم سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں ایڈم......!" سبین نے کہا اور پھر ایڈم کے مضبوط سینے پر اپنا سر رکھ دیا۔ اگلے ہی پل ایڈم کی آنکھوں میں محبت کی الوہی کرنیں پھوٹی تھیں اور سبین کی غضب ناک آنکھوں میں انتقام کے شعلے جل اٹھے تھے۔

"کیا سچ میں......؟" وہ بے یقینی کا شکار تھا۔

"ہاں......سچ میں......تم یہی چاہتے تھے ناں...... مجھے پانا چاہتے تھے۔ مجھے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے تم نے کیا کچھ نہیں کیا......" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اپنی آنکھوں کی غضب ناکی چھپاتے ہوئے بولی تھی۔

"ہاں سبین......! میں ایسا ہی چاہتا تھا۔" ایڈم نے شاید سبین کا لہجہ نوٹ نہیں کیا تھا۔

"تو میں تمھاری ہو جانے کے لیے تیار ہوں ایڈم......" ایک قدم پیچھے ہو کر اس نے اپنا آپ جیسے ایڈم کو پیش کیا تھا۔ ایڈم نے آگے جھک کر ایک شرارت کی تھی جسے سبین نے زہر نگلنے والے انداز میں برداشت کیا۔

"لیکن میری ایک شرط ہے۔"

"مجھے تمھاری ہر شرط منظور ہے سبین......" وہ جذب سے بولا۔

"مجھ سے شادی سے پہلے تمھیں مسلمان ہونا ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔" دل ہی دل میں اپنے سینے پر صلیب بناتے ہوئے ایڈم نے اگلے ہی پل آمادگی دے دی اور مسکرایا۔

عورت کی تسلی کتنی معمولی چیز ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اسے دھوکا بھی دیا جائے تو اسے نہ بتایا جائے۔ ورنہ پھر اس کی انا کو ٹھیس لگتی ہے۔

سبین قدرے حیران ہوئی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ ایڈم اس بات پر جلدی راضی نہیں ہوگا اور بحث کرے گا، اور سبین کو اپنی محبت کے بدلے اسے مسلمان کرنا پڑے گا، لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ اس نے آسانی سے اس کی شرط مان لی تھی۔

☆......☆......☆

اس سیاہ لباس میں سینے پر بہت سے قیمتی نگ جڑے ہوئے تھے۔ اُس کی سیلف ڈیزائننگ پیچیدہ ہو جانے کے باوجود پورے لباس پر ایک مدھم سا تاثر دے رہی تھی۔ بازو کندھوں کے اوپر سے بھی عریاں تھے اور اس کا گلا گردن سے ذرا نیچے تھا۔ اس

کے سینے پر جو سفید ڈائمنڈ جیسا دکھتا کام تھا وہ نیچے دامن تک جاتے جاتے چھینٹے میں بدل رہا تھا۔ جیسے اوپر سے بارش کے قطرے نیچے زمین پر گر رہے ہوں۔

"یہ کیسا ہے ایڈم......؟" چینجنگ روم سے نکلتے ہوئے سبین نے ریمپ پر واک کرنے والی کسی ماڈل کا انداز اپناتے ہوئے اپنا آپ ایڈم کو دکھا کر اس سے رائے مانگی۔ ایڈم نے ایک بھرپور نظر سے اسے دیکھا تھا۔

"مجھے تو اب تک دیکھے گئے تمام ڈریسز میں تم بہت پیاری لگی ہو سبین...... لیکن نجانے کیوں تمھیں ہی کچھ پسند نہیں آ رہا......"

"ہاں...... میری تسلی نہیں ہو رہی......"

"کیا یہ بھی پسند نہیں آیا......؟"

"کچھ ایسا خاص نہیں...... کہ اسے میں اپنے نکاح والے دن پر پہنوں......" کہہ کر وہ ڈریس تبدیل کرنے ایک بار پھر سے چینجنگ روم میں چلی گئی۔ پھر تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی۔ ایڈم کو ستانا اسے اچھا لگ رہا تھا۔

"کسی اور شاپ پر چلتے ہیں۔"

"ہاں...... کیوں نہیں......"

دونوں کسی اور شاپ میں جانے کے لیے شاپ سے باہر نکلے تھے۔

وہ پورا مال ایڈم نے بک کروا رکھا تھا۔ پورے مال میں دکانداروں اور ان کے ملازموں کے علاوہ صرف دو لوگ موجود تھے۔ ایک ایڈم اور ایک سبین...... کسی اور فرد کا داخلہ بند تھا اور یہ داخلہ دوپہر سے اب رات ہونے تک مسلسل بند جا رہا تھا۔

"تم دنیا کے جس ڈیزائنر کو کہتیں ہم اس کو ہائر کر سکتے تھے سبین...... اس طرح خود سے ہلکان ہونے کی کیا ضرورت تھی۔"

"نہیں ایڈم......! مجھے اس طرح چل پھر کر شاپنگ کرنا پسند ہے۔ مجھے بہت سی چیزوں میں سے اپنے لیے کچھ منتخب کرنا پسند ہے۔"

"لیکن تمھیں تو یہاں سے کچھ پسند ہی نہیں آ رہا۔"

"پسند تو آ رہا ہے لیکن تسلی نہیں ہو رہی......"

"تم کیا چاہتی ہو......؟"

"بہت خاص...... کیونکہ میرے لیے وہ دن بھی بہت خاص ہے، جس دن تم مسلمان ہو کر میری زندگی میں شامل ہو جاؤ گے۔ میں خاص دنوں کو خاص اہتمام سے منانے کی عادی ہوں۔ ایسا میران کہا کرتا تھا۔"

میران کے نام پر ایڈم کے چہرے پر لمحے بھر کو ناگواری کی جھلک اُبھری تھی۔

''ہاں......ٹھیک ہے......جیسی تمھاری مرضی......''

اب وہ دونوں ایک اور مشہور برانڈ کی شاپ میں داخل ہوئے تھے۔

سبین نے بہت سے ڈریس دیکھنے کے بعد اب کے جس ڈریس کو چنا تھا وہ ایک ہلکے سرخ رنگ کا لباس تھا اور اس پر زری، مکیش، نگ اور نجانے کون کون سا کام ہوا تھا۔ اس کے باوجود ڈریس دیکھنے میں بہت سادہ لگ رہا تھا۔

''یہ کیسا ہے؟''

''پہن کر دکھاؤ......'' وہ پیار سے بولا۔

''نہیں...... یہ مجھے بنا پہنے ہی پسند آ گیا ہے۔''

''ریئلی......؟''

''ہاں......!''

''تھینکس گاڈ......!''

''اسے پیک کر دیں۔'' اس نے اس انداز میں ورکر سے کہا تھا جیسے وہ ایسی خریداری آئے دن کرتی رہتی ہے۔ عام دنوں میں اگر وہ اس بیش قیمت ڈریس کی صرف قیمت ہی پڑھ لیتی تو یقیناً بے ہوش ہو جاتی......

ڈریس کے بعد جوتوں پر بھی اس نے کم و بیش اتنا ہی وقت لگایا تھا۔ پھر اسے ایک جوتے پسند آ گئے تھے جس پر ڈائمنڈ سے کام کیا گیا تھا۔ البتہ جیولری جلدی خرید لی گئی تھی کیونکہ مال میں ڈائمنڈ جیولری کی شاپس ویسے بھی کم تھیں۔ اور ساری شاپس ایک گھنٹے کے اندر اندر گھوم لی گئی تھیں۔ میک کے لیے اس نے شہر کی سب سے بڑی بیوٹیشن کو ہائر کیا تھا۔

''تم نکاح پر اتنا سب کچھ کر رہی ہو......شادی پر کیا کرو گی؟''

''سوچ لو......چاہو تو ابھی بھی اس شادی سے پیچھے ہٹ سکتے ہو......''

''تمھیں پانے کے لیے تو اتنا کچھ کیا ہے سبین......اب پیچھے کیسے ہٹ سکتا ہوں۔'' ایڈم نے دل میں سوچا تھا اور پھر سبین کو دیکھتے ہوئے مسکرایا تھا۔ مسکرا تو سبین بھی رہی تھی۔

''تم مجھے کبھی حاصل نہیں کر سکتے ایڈم......نیا جنم لے کر آ جاؤ تب بھی یہ ممکن نہیں......'' سبین نے بھی دل میں سوچا۔

دونوں ہی ایک دوجے کے دل کے حال سے بے خبر......اس خاص دن کی خاص تیاری کر رہے تھے۔

ایڈم مسلمان ہو رہا ہے۔ یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیلی تھی۔ وہ جو سارے مذاہب کی پیروی کرتا تھا، بالآخر اس نے ایک مذہب کو چن لیا تھا۔ یہ بات وہاں کی مسلم کمیونٹی کے لیے ان دنوں کافی خوشی کا باعث بنی ہوئی تھی۔ وہ مسلمان ہو رہا تھا اور

ایک مسلمان لڑکی کے ساتھ نکاح بھی کر رہا تھا۔ ایک با اثر شخص کے ایسے اقدام نے سب کو حیرت میں مبتلا کیا ہوا تھا۔

☆......☆......☆

''چونے میں یہ خاصیت ہوتی ہے کہ یہ سب رنگوں کو نگل لیتا ہے۔ سارے رنگ اس کے اندر ایسے جذب ہو جاتے ہیں جیسے یہ ان کے لیے ہی بنا ہے۔ یہ ہر رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ ہر رنگ کے عیب چھپا لیتا ہے۔ چونا اس رنگ کو رد نہیں کرتا جو آپ اسے دیتے ہیں۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ اس کا پسندیدہ رنگ تو لال ہے یا پیلا...... یا شہابی رنگ، جو فتح سے مزین ہے۔ شیامی، جو وصل سے منسلک ہے۔ گسم...... جو اشارہ کرتا ہے کسی قتل کی طرف...... یا سیاہ رنگ...... جو ظاہر کرتا ہے کہ یہاں کوئی بھید ہے۔

بھید...... اچھا یا برا......

آپ تو اب سب جانتے ہیں ناں کہ اس چونے سے میں نے کیا کیا...... میں نے اس سے قرآنی طغرے بنائے، اور پھر اُن طغروں کے مقدس حروف تلے حشیش چھپا کر اسے ''ناپاک'' کر کے اپنے ہاتھوں کو ''غلیظ'' کیا۔ پھر اسے سالم ''شر'' بنا کر کسی ''خیر'' کی طرح خود سے لپیٹ لینا چاہا...... لیکن پھر دیکھا آپ نے میرے ساتھ کیا ہوا......؟ دیکھا ناں آپ نے......؟ آپ تو سب جانتے ہیں ناں......

اب ایک بار پھر میں اسی چونے سے کھیل رہی ہوں۔ اب کی بار میں اسے ''باوضو'' ہو کر ''پاکیزہ'' ہاتھوں سے ''مقدس'' کر کے اپنے لیے ''خیر'' بنانا چاہ رہی ہوں۔ اب آپ سے کیا چھپا ہوا ہے۔ آپ جانتے تو ہیں کہ مجھے چونے کے کام سے بچپن سے ہی بہت چڑ رہی ہے۔ اب جب میں ایک بار پھر چونا لے کر بیٹھی ہوں تو ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں کچھ غلط نہ ہو جائے...... ایک تاج محل تک تو مجھ سے کبھی زندگی میں ٹھیک سے بن نہیں سکا...... بابا کہتے تھے کہ میں تاج محل کے مقبرے کی خوبصورتی اُبھارنے کے بجائے اس کے اندر کی قبر کی وحشت کو ابھار دیتی ہوں۔ پھر اب اس چونے سے اتنا بڑا کام کیسے لوں گی۔ اور پھر اتنا عرصہ اس سے غلط کام لیا ہے کہ اب جب کچھ درست کرنے لگی ہوں تو ہاتھ اس طرح کانپ رہے ہیں جیسے کسی کا گلا دبا رہے ہوں۔ آپ دیکھیے ذرا میرے ہاتھوں کی لرزش...... جیسے مجھے رعشہ کا مرض ہو، یا جیسے میرے جسم سے جان کھینچ لی گئی ہو...... خیر جو بھی ہو جائے۔ میں مر ہی کیوں نہ جاؤں، آج کی رات یہ کام ختم کر کے ہی چین لوں گی۔

دیکھتے ہیں صبح کیا ہوتا ہے۔ صبح ایڈم نے مسلمان ہونا ہے اور پھر میرا اُس سے نکاح ہے۔

اُسی طرح میں بھی کل کے لیے بہت بے چین ہوں۔''

☆......☆......☆

''یہ کیا کر رہی ہو سبین......؟'' ایڈم نے سبین کے کمرے میں آ کر اس سے کہا۔ رات کافی بیت چکی تھی اور سبین کے کمرے

سے عجیب وغریب سی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ پریشان سا اس کے پاس آیا تھا۔ جب اس نے دیکھا تھا کہ سبین ریگ مال پکڑے دیوانگی کے انداز میں اُس کے مجسمے کی تراش خراش کر رہی تھی۔ اس طرح سے کہ اس کے ہاتھ اور سارا چہرہ چونے کے برادے سے اٹا ہوا تھا اور نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ بھرپور انداز میں مجسمے پر ریگ مال پھیرتی جا رہی تھی اور شدت سے کام کرنے کے باعث اس کا سارا چہرہ اور جسم سرخ ہو رہا تھا۔

''سبین......! کیا کر رہی ہو......؟'' ایڈم نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ تھام لیے۔ اس کے لیے سبین کا یہ انداز حیران کن تھا۔ آج سے پہلے کبھی اسے یہ لگا ہی نہیں تھا کہ سبین اپنے کام کو لے کر اتنی جنونی ہے۔

''تمھارا مجسمہ تیار کر رہی ہوں ایڈم......!'' ایڈم کی طرف دیکھتے ہوئے وہ معصومیت اور پیار سے بولی۔

''کیا ضرورت تھی۔ تمھیں آرام کر لینا چاہیے تھا۔ تم تو مال میں ہی کہہ رہی تھیں کہ تم کافی تھک چکی ہو...... گھر جاتے ہی سو جاؤ گی۔''

''ہاں...... لیکن پھر خیال آیا کہ زندگی موت کا کچھ پتا نہیں...... تو اپنے پیچھے کام ادھورے کیسے چھوڑ کر جاؤں۔ کچھ کاموں کو پایہ تکمیل تک پہنچائے بِنا موت بھی آسانی سے نہیں آتی ایڈم......''

''ایسی باتیں نہ کرو...... دکھاؤ...... کیسا بنا ہے مجسمہ......؟''

''نہیں...... ابھی نہیں...... اس مجسمے کی باقاعدہ رونمائی ہوگی ایڈم...... تم بھی اسے تب ہی دیکھو گے۔''

''کب......؟ کہاں......؟''

''کل...... ہال میں...... تمھارے مسلمان ہونے اور ہمارے نکاح سے پہلے......'' سبین نے خیال پیش کیا تھا۔ جو ایڈم کو بے حد اچھوتا اور خوش گوار لگا۔

''بالآخر تم نے اسے مکمل کر ہی لیا......'' وہ دیکھے بِنا مجسمے کی تعریف کر رہا تھا۔

وہ اسے کیا بتاتی کہ وہ اس کام میں کتنی ماہر ہو چکی تھی۔ اسی کام کے ذریعے اس نے اس کے لیے اسمگلنگ کی تھی اور اب اسی کام کے ذریعے......؟ وہ کیا کرنے جا رہی تھی؟

''لوگوں کو جب یہ پتا چلے گا کہ یہ تمھاری ہونے والی بیوی نے بنایا ہے تو حیران رہ جائیں گے۔'' وہ گیلے کپڑے سے اپنے ہاتھ اور چہرہ صاف کرتے ہوئے بولی۔

''واقعی...... بے شک......''

''یہ میرے فن کی پہلی رونمائی ہوگی۔ ابھی تک میرا فن دنیا کے سامنے گیا ہی نہیں...... تمھارا مجسمہ اس کی پہل ہوگی۔''

مکمل ہو چکے مجسمے پر سین نے سرخ ریشم کا تھان چڑھا کر اسے ڈھک دیا تھا۔

☆......☆......☆

سرخ ریشم کا تھان سین کے ہاتھوں اس ملائم مجسمے پر سے پھسلتا چلا گیا۔ اندر سے جو "شاہکار" نکلا تھا اس نے تمام لوگوں کو مبہوت کر دیا تھا۔ صحافی الرٹ ہوئے اور سین اور مجسمے، دونوں کی تصاویر بنانے لگے۔ کلک کلک کی آواز اور فلش لائٹ کی روشنی میں مجسمے کے پاس کھڑی سین مسکرا رہی تھی۔ اس کا لباس، اس کا ہیئر اسٹائل، اس کا میک اپ، جیولری، اور سب سے بڑھ کر اس کا انداز...... آج کے "خاص" دن کے لیے سب بے حد خاص اور دلکش تھا۔

پریس کانفرنس پر اس قدر رش تھا کہ وہ کانفرنس کم اور کوئی جلسہ زیادہ لگ رہی تھی۔ صحافیوں کے علاوہ ایڈم کے مداح بھی ان گنت تعداد میں وہاں موجود تھے جن میں زیادہ تعداد لڑکیوں اور مسلمانوں کی تھی۔ ایڈم بالآخر مسلمان ہو رہا تھا۔ ایک لڑکی کے ہاتھوں...... اور اس سے بھی بڑی بات...... ایک لڑکی کے لیے بھی...... کیمروں کے فوکس دونوں پر تھے۔ وہ ان کی ایک ایک جنبش کو نوٹ کر رہے تھے۔ ایڈم نے سیاہ پینٹ کوٹ پہن رکھا تھا، جس میں وہ کانفرنس ہال میں موجود لڑکیوں کے دلوں پر بم گرا رہا تھا۔ لڑکیاں سین کو رشک سے دیکھ رہی تھیں۔ جو مسلسل مسکرا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر آج بڑی الوہی کرنیں پھیلی تھیں۔ ایڈم بھی خوش تھا۔ سین اس کے پہلو میں موجود تھی۔ ساری زندگی کے لیے...... وہ خوش کیسے نہ ہوتا۔

بالآخر انتظار ختم ہوا تھا۔ مائیک اور لاؤڈ اسپیکرز کو کھول دیا گیا تھا۔ صحافیوں کے سوالات کا سلسلہ ایڈم کے مسلمان ہو جانے کے بعد کا طے کیا گیا تھا۔

"میں جو جو کہوں گی تمہیں میرے پیچھے کہنا ہوگا ایڈم......!" سین نے کہا۔ ایڈم نے ہلکے سے سر ہلایا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے کیا کہنا ہے، کلمے کے حروف اسے بہت اچھے سے آتے تھے۔

"کہو...... میں اعتراف کرتا ہوں کہ......"

"میں اعتراف کرتا ہوں کہ......"

"کہ میں ایڈم راہل نہیں...... ڈان پیٹرسن ہوں۔"

"کہ میں ایڈم راہل نہیں...... ڈ...... ا...... ن......"

ایڈم نے چونک کر سین کی طرف دیکھا۔ سین بھنوئیں اچکا کر ہلکا سا مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ میں طنز ہی طنز تھا۔

"کہو...... میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں دنیا کا بہروپیا ترین انسان ہوں۔ راہل کا نام اپنے ساتھ لگا کر میں نے لوگوں کے جذبات سے کھیلنا چاہا۔ تمام مذاہب کا راگ الاپتے ہوئے اصل میں میں نے تمام مذاہب کی مقدس چیزوں کے ذریعے

اسمگلنگ کروائی۔"

کانفرنس ہال میں کھلبلی سی مچ گئی تھی۔ صحافی تو پہلے سے ہی الرٹ تھے۔لوگ بھی حیران و پریشان یہ نیا تماشا دیکھنے لگے، جوان کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا۔وہ جو دیکھنے آئے تھے اس سے بھی بڑھ کر دیکھنے کو مل رہا تھا۔

ایڈم سخت شاک کی سی کیفیت میں سبین کو دیکھ رہا تھا جو غصے، نفرت اور انتقامی جذبات کی آگ میں جلتی ہوئی اپنی ہی رو میں بولتی چلی جا رہی تھی۔

"بولو...... میں اعتراف کرتا ہوں کہ میرا اصل نام پیٹرسن ہے۔ میں ولیم اور ایما کا بیٹا ہوں۔ بدنام زمانہ کولونیل خاندان کا فرد......"

ایڈم خاموش تھا، لیکن اس کی آنکھوں کے انگاروں کی حدت سبین کو دُور سے بھی محسوس ہو رہی تھی۔اور آج وہ کسی چیز سے بھلا کہاں ڈرنے والی تھی۔اسے یہ حدت مزید سکون اور اطمینان بخش رہی تھی۔

"اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے ہی دائنا سے دست درازی کرنے کی کوشش کی...... میں ہی P.360 کا بانی ہوں۔ جرائم کا سرغنہ......اور...... میں نے ہی میران کو قتل کروایا۔"

"اوہ......تو بات یہاں تک پہنچ چکی ہے۔" ساری بات سمجھ کر بالآخر وہ بولا۔

"بات تو اس سے بھی آگے پہنچ چکی ہے پیٹرسن......!" وہ اب اسے اس کے اصل نام سے پکار رہی تھی۔

"مجھے تو لگا تھا کہ تم مجھ سے سچی محبت کرتی ہو، لیکن تم بھی لوگوں کی باتوں میں آ گئیں سبین......! وہ ہی سب کہنے لگیں جو میرے دشمن میرے بارے میں سالوں سے کہتے چلے آ رہے ہیں۔"

"آج سے تم مجھے بھی اپنا دشمن ہی سمجھو پیٹرسن......!" وہ اپنی سیٹ سے اٹھی۔

"ایک ایسا دشمن جو تم سے ہر صورت جیت کر رہے گا۔" وہ اب مجسمے کے اردگرد ٹہلنے لگی تھی۔

"اس سب کا کوئی فائدہ نہیں ہونے والا سبین...... میرے ساتھ یہ کھیل پہلے بھی بہت بار کھیلا جا چکا ہے۔کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔تمہیں بھی نہیں ہوگا۔تم کیا سمجھتی ہو کہ تم مجھے نقصان پہنچا سکتی ہو......؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"لوگ تو تمھارے بارے میں اندازے لگاتے تھے لیکن میں نے اصل میں وہ سب دیکھا ہے پیٹرسن......! دائنا کی رپورٹ، گرینڈ فادر کے ساتھ تمھاری تصاویر...... ان کی تمھارے نام لکھی ڈائریاں...... سب...... سب دیکھا ہے میں نے...... جیفرسن نے مجھے سب دکھا دیا ہے۔"

پیٹرسن نے چونک کر جیفرسن کو دیکھا اور جیفرسن نے اسی وقت وہاں سے نکل جانے میں عافیت سمجھی۔

''جانتی ہو تب بھی کوئی فائدہ نہیں...... بس ایک منٹ...... ساٹھ سیکنڈ لگیں گے اور سب ختم ہو جائے گا۔ تم کسی کو کوئی ثبوت نہیں دے سکو گی، بلکہ خود بھی ایک تماشا بن کر رہ جاؤ گی۔ ابھی بھی وقت ہے بین......'' پیٹرسن اٹھ کر بین کے پاس گیا۔

''کہہ دو کہ یہ سب ایک عملی مذاق تھا۔ میں سب سنبھال لوں گا۔'' اور اس نے بین کا ہاتھ تھام لیا۔ بین نے جھٹکے اور نخوت سے اپنا ہاتھ چھڑوایا۔

''تم بہت عرصے سے سب سنبھالتے آئے ہو پیٹرسن...... دائنا کی خودکشی کو تم نے سنبھالا...... جس رپورٹ میں تمھارا نام تھا اسے تم نے سنبھالا...... میران کے قتل کو تم نے سنبھالا...... کیا کیا سنبھالو گے تم...... کچھ مجھے بھی کرنے دو۔''

پیٹرسن یک ٹک اس نئی بین کو دیکھنے لگا۔

''کارزل نے تمھیں بالکل ٹھیک نام دیا تھا۔ بیلا ڈونا...... (زہریلا پھول) لیکن اس پھول کا زہر تمھیں خود ہی پینا پڑے گا بین......! یاد رکھنا......''

''تمھیں کارزل کی بات یاد ہے اور مجھے ڈینی کی...... وہ پتا ہے میرے بارے میں کیا کہتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں ایسے کام کروں گی کہ ائیرپورٹ انتظامیہ کے فرشتوں کو بھی پتا نہیں چل سکے گا۔'' بین بات کرتے ہوئے ایک ادا سے مجسمے پر ہاتھ بھی پھیرتی جا رہی تھی۔

''بے کار...... سب بے کار جائے گا۔ کچھ حاصل نہیں کر سکو گی...... میں کہتا ہوں ابھی بھی وقت ہے، کہہ دو کہ یہ سب مذاق ہے۔ ورنہ کل تک کوئی تمھارا نام بھی نہیں یاد رکھے گا۔''

''تمھیں پتا ہے پیٹرسن! میرے بابا کیا کہا کرتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ چونے کا کام کرنے کے لیے دل کا صاف ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ چونا بھی صاف ہوتا ہے۔ لیکن میں نے ساری زندگی اس چونے سے نفرت کی...... میرا باپ چونے کو الماس برادہ کہا کرتا تھا۔ تم جانتے ہو ناں کہ الماس کے پاس بس دو ہی رشتے ہوتے ہیں...... دوست یا پھر دشمن...... یہ نہ باپ ہوتا ہے نہ بھائی نہ شوہر نہ ماں نہ بہن...... اسے ہر صورت اپنا دوست بنانا پڑتا ہے ورنہ یہ آپ کو اپنا دشمن مان لیتا ہے۔ تم تو جانتے ہی ہو گے، تمھارے پاس پوری دنیا کا علم جو ہے۔

ہاں تو میرے بابا کہتے تھے کہ اس الماس کو اپنا دوست بنا لینا چاہیے...... نہیں تو پھر یہ آپ کو اپنا دشمن مان لیتا ہے۔ لیکن میں اس الماس کے برادے کے ساتھ کبھی دوستی کر ہی نہیں سکی...... اور اس نے مجھے اپنا دشمن بنا لیا...... لیکن کل میں نے اس چونے کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس سے رو رو کر معافی مانگی...... ایک بے ضرر برادے سے...... تم تصور کر سکتے ہو گے کہ یہ کس قدر مضحکہ خیز ہو گا۔ میں نے اسے کہا کہ یہ میرا بن جائے۔ بس مجھے آخری موقع دے دے۔ مجھے معاف کر دے۔ کل رات بڑے جتنوں

سے اس الماس کو میں نے اپنا دوست بنایا ہے۔ صدیوں سے یہ میرا دشمن بنا ہوا تھا۔"

"کیا بکواس کیے جا رہی ہو سبین......؟"

"تمھیں کیا لگتا ہے کہ میں نے یہاں کوئی غلطی کی ہوگی۔ چوبیس گھنٹے بھی نہیں لگیں گے اور لوگ تمھاری اس گفتگو سمیت تمھیں بھی فراموش کر چکے ہوں گے۔ جیفرسن تمھارے ساتھ مل گیا ہے تب بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا...... میرے گرد جیفرسن سے زیادہ وفادار لوگ موجود ہیں۔" پیٹرسن سبین کے کان کے پاس اپنا منہ لایا۔

"اس الیکٹرک باکس تک پہنچنے کا خیال ذہن سے نکال دو...... پولیس وہاں تک نہیں پہنچ سکتی اور وہ ثبوت گھر سے باہر آ نہیں سکتے...... تمھیں جیفرسن نے اتنا تو بتا ہی دیا ہوگا۔ وہ سارا گھر تباہ ہو سکتا ہے، لیکن وہ سب منظر عام پر نہیں آ سکتا...... ایڈم کو توڑنا اتنا آسان نہیں......" اس نے سرگوشی کی تھی۔

"لیکن اس کے بت کو توڑنا تو آسان ہے ناں......" سبین نے کہا۔ پیٹرسن کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر پوری قوت سے بڑھ کر پیٹرسن کے مجسمے کو دھکا دے دیا۔ مجسمہ نیچے گرتے ہی پاش پاش ہو گیا۔ اندر سے جو کچھ نکلا تھا وہ سب کے لیے ایسے ہی تھا جیسے زمین سے لاوا ابل پڑا ہو...... کانفرنس ہال کا فرش بھی جیسے کانپنے لگا تھا۔ پیٹرسن حیرت سے ان سب چیزوں کو دیکھ رہا تھا جو اس کے اور جیفرسن کے علاوہ کوئی چھونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اب وہ سب کے درمیان فرش پر پڑی ہوئی تھیں۔ سبین نے چونے کے ذریعے انہی چیزوں کی اسمگلنگ کی تھی اور ایسے کی تھی کہ پیٹرسن کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہو سکی تھی۔ وہ بیلا ڈونا (زہریلا پھول) ہی ثابت ہوئی تھی، لیکن خود کے لیے نہیں بلکہ پیٹرسن کے لیے...... ہجوم جو اس ذو معنی، مبہم گفتگو کے کسی مثبت یا منفی نتیجے کا منتظر تھا، اب ان چیزوں کو دیکھتے ہوئے پیٹرسن کو غضب ناک نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ سب نے لمحے بھر میں سبین کی سچائی کے حق میں ووٹ دے دیا تھا۔

"یہ وہ ہی چونا ہے پیٹرسن جس کے ذریعے میں تمھارے لیے کام کرتی رہی ہوں۔ اب اسی چونے سے میں نے تمھاری قبر کھودی ہے۔"

مجسمہ ٹوٹنے سے چاروں طرف چونے کا برادہ پھیل گیا تھا۔ آج چونے کا یہ برادہ سبین کو برا نہیں لگا تھا۔

وہ پولیس جو پیٹرسن کی حفاظت کے لیے کھڑی تھی، مسٹر رافے کے آرڈر کے بعد اسی پولیس نے آگے بڑھ کر پیٹرسن کو گرفتار کر لیا تھا۔

"آپ کچھ کہنا چاہیں گے ڈان پیٹرسن......؟ اپنے کسی وکیل وغیرہ کو انفارم کرنا چاہیں گے یا اب صرف عدالت میں جا کر ہی اپنی صفائی دیں گے۔" مسٹر رافے نے پیٹرسن کی طرف دیکھ کر پوچھا تھا۔

پیٹرسن خاموش رہا۔ مسٹر رافے جیسے سستے آفیسر کے سامنے مزاحمت کرتے ہوئے وہ اسے مزید اوقات سے باہر ہونے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس کی خاموشی کو اس کی رضامندی سمجھتے ہوئے پولیس نے اس کے ہاتھ پیچھے کر کے باندھ دیئے اور اب وہ اسے لے کر جا رہے تھے۔

''یہ تھی میری آخری اسمگلنگ......'' سبین نے تیز آواز میں کہا تھا۔ پیٹرسن نے جاتے جاتے مڑ کر سبین کو دیکھا۔

''معاہدہ ''اب'' ختم ہوا ہے...... میرے دس چکر پورے ہوئے ڈان پیٹرسن......!'' اب کے وہ حلق پھاڑ کر چلائی تھی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

☆......☆......☆

''عجیب بات ہے ناں...... بعض منزلیں ان پہاڑوں کی مانند لگتی ہیں جنہیں آنکھیں بے حد نزدیک دکھا رہی ہوتی ہیں، لیکن درحقیقت وہ بہت دور ہوتے ہیں۔ میں آج تک سمجھ ہی نہیں سکی کہ وہ دھوکا آنکھیں انسان کو دیتی ہیں یا انسان کا نفس خود کو دیتا ہے۔ کیونکہ آنکھیں اتنی بے صبری ہرگز نہیں ہو سکتیں جتنا کہ نفس......

اگر سچائی سے اپنا احتساب کروں تو میری کبھی کوئی منزل رہی ہی نہیں...... میں نے چمکتی چیزوں کو پانا چاہا ہے اور اونچائی پر جانا چاہا ہے۔ میں نے آنکھوں کو دھوکا دینے کے لیے راضی کیا، اور پھر اپنی سوچ کو اپنی آنکھوں کا غلام کیا۔

اب زندگیاں گزار لینے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ یہ غلامی ایسی تھی جس سے مجھے بڑی دیر کے بعد آزادی نصیب ہوئی ہے۔ بڑی ہی دیر کے بعد......''

☆......☆......☆

''ڈریم لینڈ'' کی بند ہوا میں باسی پھولوں کی خوشبو گھلی ہوئی تھی اور تین ماہ کی غیر موجودگی میں وہاں خاموشی نے اپنا تسلط اس طرح قائم کر لیا تھا کہ سبین کو اپنے وجود کی آہٹیں ہی چنگھاڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ وہ اپنے کمرے میں آئی تھی، پہلے اس نے لائٹ آن کی تھی، لیکن جب وہ روشنی بھی اسے کم لگی تو اس نے کھڑکی کے پردے بھی کھسکا دیئے۔ اور بھیگی آنکھوں سے اپنے کمرے کو محبت کی نظروں سے دیکھنے کی ناکام کوشش کرنے لگی۔

ہر چیز ویسی ہی موجود تھی، لیکن صرف ایک شخص کے جانے سے اس کی حجلۂ عروسی ماتم کدہ کا منظر پیش کرنے لگی تھی۔

کھڑکی سے چھن چھن کر آتی دھوپ، سائیڈ ٹیبل پر رکھی میران کی تصویر پر پڑ رہی تھی، اور لمحاتی طور پر میران کا چہرہ پہلے سے زیادہ مسکراتا ہوا دکھنے لگا تھا۔ یہ تصویر ربیکا نے ان دونوں کو نئے گھر کی خوشی میں تحفہ کی تھی۔ میران کے ساتھ وہ بھی موجود تھی، لیکن اب میران کے ساتھ اپنی موجودگی سے وہ نظریں چرا جایا کرتی تھی۔ اس میں جیسے میران کے ساتھ اپنے وجود کا سامنا کرنے

کی ہمت نہیں رہی تھی۔

"میں نے تمھارے قاتل کو جیل میں بھجوا دیا ہے میران......!" ہر روز کی طرح اس نے پھر سے میران کو ساری بات بتانا شروع کی تھی۔ میران کو اس نے ایک طرح سے اپنی ڈائری بنایا ہوا تھا۔

"میں نے تمھارے قتل کا بدلہ لے لیا ہے، لیکن اب سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اپنے غم کا بدلہ کس سے لوں۔ تم دُور ہو تو کوئی بھی میرے پاس نہیں ہے۔ تم چپ ہو تو کوئی بیان نہیں ہے۔ تم سے تمھاری سانسیں چھین لی گئیں اور مجھ سے میری سانسیں بدظن ہو گئیں۔ میں نے زندگی بھر کے سپنے تمھارے ساتھ کے دیکھے تھے میران...... اکیلے جینے کا تصور بھی کبھی میرے ذہن میں نہیں آیا...... میں تو تمھارے ساتھ بوڑھا ہونا چاہتی تھی۔ تم نہیں جانتے کہ میں خود کو تمھارے ساتھ بوڑھی ہونے کے تصور سے کتنی خوش ہوا کرتی تھی۔ تمھاری بانہوں میں...... اپنے جھریوں زدہ چہرے کے ساتھ...... اور تم...... تمھیں تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ تم بوڑھے ہو کر کیسے دکھو گے...... یقیناً مجھ سے پیارے...... بے حد پیارے...... تم پر بڑھاپا بھی اپنی پوری وجاہت کے ساتھ آنا تھا، مجھے یقین ہے۔" سبین نے مسکراتے ہوئے پر یقین لہجے میں کہا۔

کمرے کی کھڑکی کا شیشہ جیسے بنا آواز کیے یا تو ٹوٹ گیا تھا یا کسی جادو کے زور پر غائب ہو گیا تھا۔ آفتابی کرنیں، سونے کے روشن ذرّوں کی طرح کمرے میں اتر کر گردش کرنے لگی تھیں۔ جب میران کی تصویر کو دیکھتے ہوئے، اس کے بڑھاپے کا تصور باندھتے باندھتے سبین ایک لمحے کو چونکی تھی اور میران کی تصویر اس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔

میران کے بڑھاپے کے تصور کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں ایک شخص گھوم گیا تھا۔ اس کے تخیلاتی تصور اور اس جیتے جاگتے شخص میں تباہ کن حد تک مماثلت تھی۔ سبین اس اتفاق پر لمحے بھر کو دم بخود رہ گئی تھی۔ میران اگر بوڑھا ہوتا تو اس نے ہو بہو اس شخص کا روپ دھار لینا تھا۔ اور وہ شخص جوانی میں، یقیناً پورے کا پورا میران رہا ہو گا۔

ایک شخص...... وہی جو لاہور کے ایک پرانے علاقے گن پت روڈ پر واقع سبین کے محلے کی گندی گلیوں میں ڈانگ کھڑکاتا ہوا آتا تھا۔ کٹی زبان، کٹی انگلیوں اور آنکھوں سے اندھا شخص...... جسے وہ خوشی خوشی روٹی کھلا کر دُعا لیا کرتی تھی۔

فقیر بابا......

☆......☆......☆

میران کی موت والے دن سے ربیکا پاگل خانے میں تھی۔ اس کی ذہنی حالت تو شاید کسی پاگل خانے میں رہنے سے بھی زیادہ بری تھی، لیکن اس کی ابتر حالت کی مطابقت کا کوئی ادارہ ملک میں کام نہیں کر رہا تھا۔ اس لیے اسے وہاں ہی رکھا گیا تھا۔

عالم صاحب سے اس نے بہت منتوں، فرمائشوں اور واسطوں کے بعد اعداد کا حساب لگوایا تھا۔ عالم صاحب اعداد کے

علم میں زیادہ ماہر تو نہیں تھے، لیکن انہیں اس کا جتنا بھی علم آتا تھا، اس کی روشنی میں انہوں نے ایک جواب لکھ کر ربیکا کو دے دیا تھا۔ انہیں نہیں پتا تھا کہ وہ کیا لکھ رہے ہیں۔ جو لکھ رہے ہیں وہ کیسے پورا ہوگا، لیکن ان کے حساب کے مطابق دونوں کے ستارے تین چاند کے بعد آپس میں مل رہے تھے۔ نجانے یہ سب کیسے ہونے والا تھا۔ ایک مرا ہوا شخص کیسے واپس آنے والا تھا، لیکن ان کا علم ان سے یہ ہی کہہ رہا تھا۔ اسی لیے انہوں نے یہ ہی بات لکھ کر ربیکا کو دے دی تھی۔ جسے پڑھ کر ربیکا خوشی کے مارے وہیں ائیر پورٹ پر بے ہوش ہو گئی تھی۔

اسے عالم صاحب کے علم پر اس قدر یقین تھا جتنا خود عالم صاحب کو بھی نہیں تھا۔ اور وہ اس حساب کتاب پر دل و جان سے ایمان لے آئی تھی۔ بڑے عرصے کے بعد اسے کہیں سے خوشی کی خبر سننے کو ملی تھی۔ تین چاند...... یعنی تین ماہ...... عیسیٰ آرہا تھا۔ وہ واپس آرہا تھا۔ عالم صاحب نے لکھا تھا کہ تین چاند کے بعد تم دونوں کے ستارے پھر سے مل جائیں گے۔ اس بات کا تو یہ ہی مطلب تھا ناں کہ عیسیٰ واپس آنے والا تھا یا...... یا وہ اس کے پاس جانے والی تھی۔ اسے دونوں ملاقاتیں منظور تھیں۔ عیسیٰ کے زندہ واپس آجانے والی بھی اور اپنی مرجانے والی بھی...... اسے بھلا اپنی موت کا کیا غم ہو سکتا تھا، وہ تو نجانے کب سے مرنے کی کوششیں کر رہی تھیں، لیکن اس کی موت سے پہلے کوئی اور مر چکا تھا۔

میران...... جس کی پیدائش پر ربیکا نے کہا تھا کہ اب اس کے پاس خدا کی دو دو رحمتیں ہیں۔

وہ پاگل کیسے نہ ہوتی...... اس کی ایک رحمت لاپتا تھی، دوسری خدا نے اپنے پاس واپس بلالی تھی۔

کیسی نوید دی تھی عالم صاحب نے...... کیا انہونی کی تھی۔ کیسا حساب کتاب لگایا تھا انہوں نے...... کس سے کس کی ملاقات کی بات کر رہے تھے وہ؟ کیا انہوں نے غلط حساب لگایا تھا...... یا...... کوئی غلط چلّہ کاٹ لیا تھا کہ عیسیٰ کو ربیکا کے پاس بھیجنے کی بجائے میران کو عیسیٰ کے پاس بھیج دیا تھا۔

تین ماہ بعد اپنے "سن شائن" واپس آ کر بھی وہ جیسے پاگل خانے میں ہی تھی۔ عیسیٰ کی جدائی پر وہ بہک گئی تھی۔ اب میران کی جدائی پر وہ جیسے لوٹ لی گئی تھی۔ اس کی روح سمیت اس کی ذات کے سارے اثاثے اس سے چھین لیے گئے تھے۔

سبین روز آجاتی تھی۔ ربیکا کے کپڑے بدلتی تھی۔ اسے کھانا کھلاتی تھی۔ گھر کے ضروری کام کر جاتی تھی۔ ربیکا کو پکارنے کی کوشش کرتی تھی۔ اسے بولنے کے لیے اکساتی تھی۔ سبین کو اس سب کی خوب مشق تھی۔ وہ زویا کو بھی روتے روتے بولنے کے لیے اکسایا کرتی تھی۔ اب وہ وہی سب کچھ ربیکا کے ساتھ کر رہی تھی۔ نجانے سبین کی تقدیر کو پرانے دنوں سے اتنی محبت کیوں تھی کہ وہ پلٹ پلٹ کر انہیں پھر سے واپس لے آتی تھی۔ سبین کی ساری کوششیں بے کار جارہی تھیں۔ ربیکا کا موم بت پگھلنے کی بجائے پتھر میں ڈھلنے لگا تھا۔

اس سنگی بت پر پہلا اثر سبین کی دو دن کی غیر موجودگی نے ڈالا تھا۔ وہ جو سمجھتی تھی کہ سبین کے بغیر بھی اس کی زندگی ایسے ہی

چلے گی۔ سبین کی غیر موجودگی نے اس کی یہ خام خیالی ختم کر دی تھی۔ ربیکا اس کی غیر حاضری کی وجہ سے مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ ربیکا پہلی بار سبین کے لیے، بلکہ عیسیٰ کے علاوہ کسی اور کے لیے فکر مند ہوئی تھی۔

''سبین کہاں ہے؟'' اس نے تین ماہ کے بعد پہلی بار یہ لفظ بولے۔

''پتا نہیں...... مجھے بھی کچھ بتا کر نہیں گئیں کہ کہاں جا رہی ہیں۔'' زویا نے ایک جملے میں بات ختم کر دی تھی۔

ربیکا بے چین ہوئی۔ اسے لگا تھا کہ سبین کے ساتھ بھی کچھ ہو چکا ہے جسے اب اس سے چھپایا جا رہا ہے۔ ایک ہفتے کے بعد اب دوسرا ہفتہ بھی آ لگا تھا اور سبین کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔ یونیورسٹی کھلنے کے بعد زویا بھی اپنے ہاسٹل واپس چلی گئی تھی اور ربیکا کے پاس اس کا فون نمبر بھی نہیں تھا۔ اس پر ایک ایک دن ایک ایک صدی بن کر گزر رہا تھا۔ راکنگ چیئر پر جھولتے جھولتے وہ ماضی کو کھوجتی رہتی تھی اور حال کے لیے فکر مند رہتی تھی اور مستقبل...... اس کی اسے کبھی کوئی پروا نہیں رہی تھی۔

وہ بھی ایک ایسا ہی دن تھا۔ آتش دان کے سامنے راکنگ چیئر پر بیٹھی وہ حسب معمول عیسیٰ کے خدا سے شکوے کر رہی تھی، جب کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ پھر اگلے ہی پل دروازہ کھل گیا تھا۔ باہر کی روشنی نے اندر آ کر اندھیرے میں ڈوبے کمرے کو اُجالے میں بدل دیا تھا۔ ربیکا نے فرش کو دیکھا...... وہاں اسے سبین کا سایہ نظر آیا تھا۔ اس سائے کے ساتھ ایک اور سایہ بھی تھا۔ اور وہ سایہ کسی مرد کا تھا۔

چیری کے پھولوں سے مہکتا ہوا جیسے سارا باغ اس کمرے میں اتر آیا تھا۔ اس باغ کی مہک ایسی تھی جس نے ربیکا کو دہکا دیا تھا۔ بھنے ہوئے پستے جیسا پہلے بوسہ کا ذائقہ اس کے لبوں پر وارد ہوا تھا۔ تڑپ کر وہ اٹھی تھی اور پھر کرب سے پلٹی۔

نابینا آنکھوں، لمبی داڑھی، سر کے بڑھے ہوئے بالوں اور عجیب و غریب سے کپڑوں میں ملبوس وہ آدمی کون تھا؟

''عیسیٰ......!'' ربیکا نے ایک چیخ ماری تھی اور پھر دیوانہ وار آگے بڑھ کر اپنے عیسیٰ سے لپٹ گئی تھی۔ آنسو، آہیں، سسکیاں، ہچکیاں...... ان سب نے مل کر وہاں وہ سماں باندھ دیا تھا کہ کوئی تعلق نہ ہونے کے باوجود سبین بھی رونے لگی۔

ربیکا عیسیٰ کے سراپے کو اجنبی نظروں سے دیکھتی جاتی تھی اور روتی جاتی تھی۔

''تم کہاں تھے۔ تم کہاں تھے میرے عیسیٰ......؟''

عیسیٰ کیا جواب دیتا کہ اس کی زبان تو کٹی ہوئی تھی۔ جواب میں وہ بھی رونے لگا تھا۔ ربیکا نے جیسے ایک لمحے میں جان لیا تھا کہ اس کے عیسیٰ کے ساتھ کیا کیا ظلم ہو چکا ہے۔ اور عیسیٰ کے ساتھ ظلم کب کب نہیں کیا گیا۔

پھر ان دونوں پر وہ وحی اترنے لگی جو عیسیٰ کے دل سے ادا ہو رہی تھی اور ربیکا کے دل پر نازل ہو رہی تھی۔

''تم...... تم آئے کیوں نہیں...... تم زندہ تھے تو تمہیں ہر صورت واپس آنا چاہیے تھا۔ تم نے مجھ سے وعدہ خلافی کیوں

کی......؟" اب وہ اس کی نابینا آنکھوں پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔

"تم نے ایسا کیوں سوچا کہ میں تمھیں اس حالت میں قبول نہیں کروں گی۔ تم نے ایسا کیونکر سوچا......"

"نہیں مجھے رونے دو...... مجھے چپ مت کرواؤ...... یہ پچھلے پچیس سالوں کا رونا ہے۔ اب مجھے تمھیں جی بھر کر دیکھ لینے دو......"

"ہاں...... مجھے پتا ہے ان لوگوں کو ان کے کیے کی سزا مل گئی تھی۔ وہ سب جل کر راکھ ہو گئے تھے۔ لیکن تم...... تمھیں واپس آنا چاہیے تھا عیسیٰ......! تمھیں ہر صورت واپس آنا چاہیے تھا......"

"ہاں......اب آ گئے ہو......لیکن بہت دیر سے آئے ہو...... خدا نے تمھیں دے کر مجھ سے تمھارے بچے کو چھین لیا ہے عیسیٰ......! خدا نے میرے ساتھ کبھی ایک ساتھ دو رحمتیں رہنے ہی نہیں دیں۔"

"مجھے کہہ لینے دو...... آج مجھے مت روکو...... خدا نے تمھاری رحمت دینے سے پہلے ہی اس رحمت کو مجھ سے چھین لیا عیسیٰ......! مجھ سے چھین لیا......"

"نہیں مجھے کہنے دو...... خدا کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا عیسیٰ......! اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

اور عیسیٰ کے سینے سے لگے وہ عیسیٰ کے خدا سے جی بھر کر شکوے کرنے لگی اور اپنا پچیس سالوں کا غبار نکالنے لگی۔

☆......☆......☆

"کہتے ہیں کہ انسان چار عناصر سے مل کر بنا ہے۔ مٹی، پانی، آگ، ہوا...... یہ چاروں عناصر کس قدر سادہ ہیں۔ اگر صرف انہی کے سہارے زندگی گزر جائے تو کوئی دکھ نہ ہو......لیکن جو عناصر انسان اپنے اندر پالتا ہے، وہ نہ صرف خود پیچیدہ ہوتے ہیں بلکہ انسان کو بھی گنجلک کر کے رکھ دیتے ہیں۔ خواہش، حسد، نفرت، جلن، غصہ، نافرمانی، بے صبری، ناشکری...... یہ سب ایسے پرپیچ عناصر ہیں کہ انسان ان کو اپنی ذات میں داخل کر کے اُن چار بنیادی عناصر کو بھی ضائع کر بیٹھتا ہے جو اس کے وجود کا اہم حصہ ہوتے ہیں۔ تب نہ سانس لینے کو ہوا ملتی ہے نہ منفی جذبات کو جلانے کے لیے آگ...... نہ مثبت کی بڑھوتری کے لیے پانی اور نہ جسم کی بود باش کے لیے مٹی......

ایسے وقت میں زندگی میں کسی اور چیز کی چاہ باقی نہیں رہ جاتی......بس موت کی آرزو ہوتی ہے، اور یہ آرزو میرے وجود پر اس طرح مسلط ہو گئی ہے کہ مجھے اب اس کے علاوہ اور کسی چیز کی خواہش نہیں رہ گئی۔

میں مرنا چاہتی ہوں۔"

☆......☆......☆

سورج کی طلا کاری کرنیں لہریں زدہ پانی میں تحلیل ہو رہی تھیں۔رش جھیل کا بھنور جو غیر مرئی تھا اس کے پاؤں ڈالتے ہی تیز ہو گیا تھا۔پیلی شعاعیں سطح آب سے منعکس ہو کر اس کی آنکھوں میں چبھ رہی تھیں۔اس کی پلکیں لرز کر رہ گئیں۔اس نے اپنا دوسرا صندلی پاؤں بھی پانی میں ڈالا......اب وہ مکمل طور پر جھیل میں اتر آئی تھی۔آنکھیں بند کر کے وہ چلتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔

''میں نے اپنی زندگی سے بہت نفرت کی ہے میران......اب میرے پاس اس نفرت کو نبھانے کی ہمت نہیں ہے۔مجھے جانا ہے۔اس دنیا سے دور......اور آنا ہے تمھارے پاس......میں طبعی موت کا انتظار نہیں کر سکتی......کیونکہ میں نے ساری زندگی بہت سی چیزوں کا بہت زیادہ انتظار کیا ہے۔اچھی چیزوں کا،اچھے کپڑوں کا،اچھے کھانوں کا،اچھے دنوں کا......اب میں اپنے ساتھ یہ انتظار والا ظلم نہیں ہونے دوں گی۔''

اس کا سفید باریک لباس جو پہلے ہوا میں آنچل کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا،گیلا ہو کر اس کی مخروطی پنڈلیوں کے ساتھ چپک گیا تھا۔الماس رنگی لباس......اس نے آج جانتے بوجھتے یہ رنگ منتخب کیا تھا۔طنز آلود مسکراہٹ اس کے لبوں پر ثبت ہو کر انہیں آلودہ کر رہی تھی۔

وہ خود پر مسکرائی تھی یا اس تقدیر پر جسے اس نے اپنے ہاتھوں سے لکھا تھا،سجایا تھا،سانچے میں ڈال کر ایک نیا قالب دیا تھا۔وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔پانی نے اس کے گھٹنے کو چھو لیا۔ٹھنڈے پانی کے باعث اندر ائن چھ لینے جیسی جھرجھری اس کے بدن میں سرائیت کر گئی اور عین اسی وقت اسے اپنے محبوب کا بوسہ یاد آیا تھا۔میران کا بوسہ......انتہائی قربت محبت اور انتہائی قربت مرگ کے احساسات ہمیشہ ایک جیسے کیوں ہوتے ہیں؟

''میں نے قبرستان کے گورکن سے بھی بات کر لی ہے۔وہ تمھاری قبر کے ساتھ میری قبر بنائے گا۔اس سے بڑھ کر مسکن میرے لیے بھلا اور کیا ہو گا۔''

پانی اب اس کے پیٹ تک آ گیا تھا۔دور سورج شام کے رنگوں میں نہا رہا تھا۔سیاہ رنگوں میں......صرف ایک غوطہ اور خاتمہ......زندگی کا بھی اور شام کا بھی......اس نے اب جانا تھا،جن شیامی رنگوں کے پیچھے بھاگ رہی تھی وہ تو اصل میں سیاہ تھے۔

کس چیز کی چاہت تھی اسے......وہ کیا حاصل کرنا چاہتی تھی......کیا وہ خود سے بدلہ لینا چاہتی تھی؟اس نے سورج سے آنکھیں چار کرنی چاہیں۔ڈوبتا سورج بے بس تھا۔ضیا ریزی دن کی ناند کے پیندے سے جا لگی تھی۔نظریں چار کر کے وہ سوچنے لگی تھی کہ وہ جیت گئی ہے۔کسی کی ہار کو وہ اپنی جیت سمجھ رہی تھی۔وہ زندگی بھر ایسی ہی بے وقوف رہی تھی۔ہاں ایسی جیت وہ جیت گئی تھی۔ویسی ہی زندگی جو وہ چاہتی تھی۔وہ سب کچھ جس کی اسے چاہت تھی۔اب جب چاہت مکمل ہوئی تھی تو وہ کیوں ختم ہونے جا رہی تھی۔

اس نے دکھ سے اپنے ماضی پر نظر ڈالی۔وہاں سوائے پچھتاوے کے اور کچھ نہیں تھا۔

ایک وہ پانی تھا جو اسے نیچے سے بھگو رہا تھا۔ ایک اس کے آنسوؤں کا پانی تھا جو اسے اوپر سے بھگو رہا تھا اور اندر سے بھی...... دونوں اطراف جھلسا دینے والی تپش تھی۔ پانی اس تپش کو بجھانے کی بجائے اور بھڑکا رہا تھا۔ وہ نیام چشم کے بجائے اس کمین گاہ سے پھوٹ رہا تھا، جہاں اس کی خواہشات، آرزوئیں، تقاضے اور نفرتیں آہن پوش ہو کر اس پر تیر برسا رہی تھیں۔

''میں خود کو ختم نہیں کر رہی اے خدا......! میں اپنا آپ تیرے حوالے کر رہی ہوں۔ میں موت تک کا انتظار نہیں کر سکتی...... مجھے میرے گناہوں کی سزا جلد مل جانی چاہیے۔ میں حرام موت مر کر ایک بار پھر تیری نافرمانی نہیں کر سکتی...... میں تو خود کو بس تیرے حوالے کر رہی ہوں۔'' وہ کہتے ہوئے خدا کے آگے اپنی خودکشی کی مناسب اور حقیقی توجیہہ پیش کر رہی تھی۔ ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہونا تھا۔ اسے اب اپنی جان خدا کے حوالے ہی کرنی پڑے گی۔ یہ ہی اس کے کرم کا پھل ہے۔ یہ ہی وہ رنگ ہے جسے وہ حاصل کرنا چاہتی تھی۔

پانی اس کے سینے سے آ لگا تھا۔ اس کے مشک فامی بالوں کے کنارے پانی کو اپنے اندر جذب نہ کر سکے اور الجھتے ہوئے اوپر کو اٹھنے لگے۔ سورج مکھی کے پھول کی طرح وہ اپنے ہی بالوں میں بے حد خوش کن لگ رہی تھی۔ اتنی کہ اس سنسان گوشے میں اگر کسی کو خبر ہو جاتی کہ ایک بنت البحر لڑکی خود کو ختم کرنے جا رہی ہے تو دنیا اپنے سارے کام چھوڑ کر اسے تلاش کرنا شروع کر دیتی......

''خدارا میری سانسوں کی نذر کو قبول کر...... میرے پروردگار میری جان تیرے حضور پیش ہے...... اسے دوزخ کی بھٹی میں جلا یا جنت کے پھول دے...... لیکن اسے سکون دے......'' اور اب...... اس کا سر بھی پانی میں ڈوب چکا تھا۔ اب وہ مکمل طور پر جھیل کے پانی کے سپرد ہو چکی تھی۔ پانی اسے لے کر آگے بڑھنے لگا تھا۔ آخری سانسیں لیتی وہ یہ ہی سب بڑبڑا رہی تھی جب پانی کے تلاطم میں اسے کچھ سنائی دیا تھا۔ نمکین بھارے پانی کے شور میں اس نے دھیان لگانے کی کوشش کی تھی اور جلد ہی آواز کی ساخت کو پا لیا تھا۔ دُور کہیں سے ہلکے سر بج اٹھے تھے جو اب آہستہ آہستہ اس کی سماعت میں واضح ہونے لگے تھے۔ ساز کی پانیوں میں سے سانسوں کی امر وہی آ رہی لپک رہی تھی۔

جل دیوتا کا راگ بج اٹھا تھا۔

''لیکن یہ سب تو صرف قصے کہانیاں نہیں تھیں کیا......؟''

وہ سوچنے لگی اور بالکل بھی خوفزدہ نہیں ہوئی، بلکہ کسی حد تک خوشی سے کھلکھلا اٹھی تھی۔ قصہ تھا یا حقیقت اسے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کے لیے یہ اہم تھا کہ خدا نے اس کی سانسوں کی امانت کو واپس لے لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ہاں شاید واقعی...... جل دیوتا کا راگ اب پوری آن بان سے بج رہا تھا۔ وہ اس راگ کو بہت واضح سن سکتی تھی۔ تو خدا کے فرشتے اپنا کام بخوبی کر رہے ہیں۔ اس کی جان جل دیوتا قبض کرے گا؟ موت کی وادیوں میں جاتے ہوئے وہ مسکرا رہی تھی۔

اسے اپنے ہاتھ میں کسی کی گرفت محسوس ہوئی تھی۔جل دیوتا نے اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔وہ بھی چپکے سے اس کے سینے سے جا لگی تھی۔وہ خوش تھی۔وہ میران کے پاس جا رہی تھی۔زندگی میں ایک لمبے عرصے کے بعد وہ اتنی خوش ہوئی تھی......اور مسکرا اٹھی تھی۔

جل دیوتا کا راگ سنتے سنتے وہ میٹھی اور ابدی نیند میں گم ہونے لگی تھی۔

لیکن وہ جل دیوتا نہیں تھا۔نہ ہی وہ راگ سرگم کا راگ تھا۔وہ تو ماؤتھ آرگن کا راگ تھا۔حائک کے ماؤتھ آرگن کا راگ......جسے اب وہ روتے ہوئے،بہتی ہوئی ناک کے ساتھ بجایا کرتا تھا۔اس دیوانے کا اب دنیا میں یہ ہی کام رہ گیا تھا۔

سبین کو اس نے خودکشی کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا،اور پھر اگلے ہی پل پانی میں چھلانگ لگا دی تھی۔جیسے ایک بار اسے بچانے کے لیے میران نے کوشش کی تھی۔آج وہ بھی ویسے ہی کوشش کرنے والا تھا۔جبکہ اسے تیرنا نہیں آتا تھا۔

☆......☆......☆

زمردی گھاس پر پڑے سبین کے پورے وجود نے ایک جھٹکا کھایا تھا۔جھیل کا بہت سا پانی بھی اس کے منہ سے نکلا تھا۔حائک اس کے سینے پر دباؤ ڈال کر سارا پانی باہر نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔نجانے اس نے یہ طریقہ کہاں سے سیکھا تھا،کسی فلم کے منظر سے......یا......حقیقت کے پس منظر میں۔

دوسرے جھٹکے کے بعد تیسرے پر سبین نے کھانستے ہوئے اپنی آنکھیں کھول دی تھیں۔سبین کو ہوش میں آتا دیکھ کر حائک مسکرایا تھا۔سبین جو اپنے آپ کو آسمانوں میں تحلیل ہو جانے کا گماں کیے ہوئے تھی جب اس نے اپنے اوپر حائک کو جھکے پایا اور جب ساری بات اسے سمجھ میں آئی تو وہ ایکدم سے ہی رونے لگی۔

''تم نے مجھے کیوں بچایا حائک......تم نے مجھے کیوں بچایا......؟'' روتے ہوئے وہ اس بہرے سے شکوہ کرتے ہوئے خود گونگی ہونے لگی تھی۔

''مجھے ڈوب کیوں نہیں جانے دیا......مجھے مر جانے دیا ہوتا۔''

حائک کی مسکراہٹ غائب ہوئی تھی اور وہ بت سا بنا روتی ہوئی سبین کو دیکھ رہا تھا۔

''مجھے مرنا ہے......مجھے مر جانے دو......کیا اس دنیا میں مرنا بھی اتنا مشکل ہو گیا ہے۔'' بے بسی سے وہ روئے چلی جا رہی تھی۔حائک حواس باختہ ہو گیا۔اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔سبین کو کیا دلاسا دے۔اسے نہ تو وہ اپنے اشارے سمجھا سکتا تھا اور نہ وہ دلاسا دینا جانتا تھا۔ایسے میں بس ایک ہی کام تھا جو وہ کر سکتا تھا۔جو سبین اس کے ساتھ کر چکی تھی۔اسے وہ منظر یاد آ گیا تھا جب دانا کی موت کے بعد وہ خودکشی کر رہا تھا اور جب اس کا رونا کم نہیں ہو رہا تھا تو سبین نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا۔

قریب ہی کہیں اس نے وہ پھول تلاش کیا تھا۔ جو بین نے کبھی اس کے لیے توڑا تھا...... ثعلب مصری کا پھول......

ثعلب مصری کے بہت سے پھول توڑ کر حائک نے سبین کے اوپر لا پھینکے تھے۔ پھر ایک پھول کو سختی سے سبین کے ہاتھوں میں تھمایا تھا اور پھر سبین کی بند مٹھی پر اپنی گرفت اتنی سخت کر لی تھی کہ سبین چاہ کر بھی اپنی بند مٹھی نہیں کھول سکی تھی۔ وہ حیرت سے حائک کو یہ سب کرتے ہوئے دیکھنے لگی تھی۔ اس کا رونا ختم ہو گیا تھا۔ حائک نے اس کے ساتھ وہی کیا تھا جو وہ حائک کے ساتھ کر چکی تھی۔ تب حائک بھی چپ ہو گیا تھا، اب بدلے کے طور پر سبین کو بھی چپ ہو جانا چاہیے تھا۔ اپنے فعل کا مان رکھتے ہوئے، اپنے عمل کی شرم نبھاتے ہوئے، بابا کی بتائی بات کو سچ مانتے ہوئے اور...... سب سے بڑی بات...... ثعلب مصری کی لاج رکھتے ہوئے......

سبین نے ایک آنسو بھی مزید نہ بہایا...... اسے اپنی حرکت کا بھرم بھی رکھنا تھا اور حائک کا بھی......

حائک نے سبین کو چپ ہوتا دیکھا تو اس کے گیلے چہرے سے آنسو صاف کرنے لگا۔ ٹھنڈے یخ پانی کے باعث جس کی اپنی ناک بری طرح بہہ رہی تھی وہ اس کے آنسو صاف کر رہا تھا۔ چپ اور بت بنی سبین یک ٹک حائک کو دیکھے گئی۔ جسے خود تیرنا نہیں آتا تھا اس نے نجانے کیسے سبین کو بچا لیا تھا۔ کیا یہ اللہ کی مدد تھی یا اللہ کا پیغام......؟

سبین نجانے کتنی دیر ڈوبتے سورج، جھیل کے ساکت پانی اور حائک کو دیکھے گئی۔

اور یہ تیسری بار تھا۔

ایک سازشی سا جھونکا وہاں وارد ہوا تھا۔ جس نے وہاں کھلے ہوئے سارے ثعلب مصری کے پھولوں کی مہک کو سمیٹ کر سبین کے گرد طواف کرنا شروع کر دیا تھا۔ کسی نے جیسے اسے کوئی تنبیہ کی تھی۔ کوئی راز کی بات بتانے کی کوشش میں سکون کی حیات عیاں کی تھی۔ کان میں سرگوشی کرتے ہوئے آنے والی زندگی کا لائحہ عمل بتایا تھا۔ یہ جیسے کوئی الہام تھا۔ کوئی وحی تھی جو ہوا کے اس جھونکے میں قید تھی۔

ٹھنڈے یخ پانی سے نکلا ہوا حائک اب تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ سبین نے اٹھ کر کنارے پر پڑی اپنی شال اٹھا کر حائک کے گرد لپیٹ دی تھی۔ اس کی کپکپی لحہ بہ لحہ شدید ہوتی جا رہی تھی۔

ایک بار پھر سے فیصلہ کرنے والی گھڑی نے اپنے گجر بجائے تھے۔ جس پر سبین نے "لبیک" کہہ دی تھی۔

اس نے خود کو خدا کے سپرد کرنا چاہا تھا، اور خدا نے اسے کس کے سپرد کر دیا تھا؟ وہ سمجھ گئی تھی کہ خدا اب اس سے کیا چاہتا ہے۔

کانپتے ہوئے حائک کو خود سے لگا کر وہ اس جگہ سے باہر نکلنے والے راستوں پر گامزن ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

گوتم بدھ نے کہا تھا۔

''جس لمحے مجھے گیان حاصل ہوا، میں حیران رہ گیا۔ ساری کی ساری ہستی گیان پائے ہوئے ہے۔ صرف لوگوں کو اس کا ادراک نہیں......''

یعنی لوگوں کو گیان کی نہیں...... ادراک کی ضرورت ہے۔ اور اگر واقعی ایسا ہے تو مجھے یہ ادراک اس وقت ہوا جس وقت میں خودکشی کرتے ہوئے خود کو خدا کے حضور پیش کر رہی تھی۔ مجھے ادراک ہوا کہ میں تو کندن تھی، اور جل کر سونا بننا چاہتی تھی، لیکن کندن سو سال بھی کٹھالی میں جلتا رہے تو سونا نہیں بن سکتا...... مجھے گیان ہوا کہ مجھے سونا بننے کے لیے جلنے کی ضرورت نہیں...... صرف اپنی ''دھات'' بدلنے کی ضرورت ہے۔ تب ہی میری ''ذات'' بدلے گی۔

☆......☆......☆

ایک سال بعد...... چار موسموں کے آنے اور جانے کے بعد......

ربیکا اور عیسیٰ کے لکڑی سے بنے گھر ''سن شائن'' پر سورج اپنی پوری آب وتاب سے چمک رہا تھا۔ مہینہ ہوا بہار کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہر طرف پھول کھلنے، درختوں پر نئے پتے آنے اور پھولوں کے بور کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ یہ ایک ''نئی صبح'' تھی جو اب ان کے ہر دن کو روشن کرنے لگی تھی۔

سبین گھر میں داخل ہوئی تو بن عیسیٰ گھر کے باہر چھوٹے سے باغ میں آتش دان کے لیے لکڑیاں کاٹ رہے تھے۔ اور ربیکا اس باغ میں لگی تاروں پر چادریں تان رہی تھی۔ وہ ابھی بھی اپنے عیسیٰ کو سب سے چھپا کر رکھنا چاہتی تھی۔ نہیں دیکھ رہی تھی کہ اب تو نجانے کتنی رُتیں بدل گئی ہیں۔ اس کی جوانی کے درخت بوڑھے ہو گئے ہیں۔ اس کی اور اس کے عیسیٰ کی حالت بدل گئی ہے۔ اس کا عیسیٰ اب اتنا خوب صورت نہیں رہ گیا کہ کوئی عورت کپڑے سکھانے کے بہانے اسے تا کے......اس کا جسم ڈھلک گیا ہے۔ جس میں صرف ربیکا کے لیے ہی خوب صورتی رہ گئی ہے اور کسی کے لیے نہیں......

''سلام بابا......!'' سبین نے آگے بڑھ کر عیسیٰ کو سلام کیا تھا۔ انہوں نے پیار سے سبین کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ یہ ہاتھ پھیرنا ہر بار ایسا ہی ہوتا تھا جیسے وہ لاہور کے گن پت روڈ پر اس کے سر پر پھیرا کرتے تھے۔ سبین نہال ہی ہو جاتی تھی۔ آگے بڑھ کر سبین نے ہر بار کی طرح ان کی آنکھیں چوم لی تھیں۔ یہ میران کی آنکھیں تھیں جو اس نے فلاحی ادارے کو عطیہ کی تھیں۔ یہ آنکھیں عیسیٰ کو لگ گئی تھیں۔ عیسیٰ نے اپنے بیٹے کی آنکھوں سے دنیا کو دیکھنے کا آغاز کیا تھا۔ ان آنکھوں کو سبین بھی چومتی تھی اور ربیکا بھی......

ان دو آنکھوں میں دونوں کا ''میران'' تھا۔ وہ دونوں انہیں کیسے نہ چومتیں......

بن عیسیٰ کی ہاتھوں کی انگلیاں بھی لگ چکی تھیں اور پاؤں کی بھی...... یہ سب کام سبین نے اپنا اور میران کا گھر بیچ کر کیا تھا۔ اس کے پاس جو کچھ تھا اس نے عیسیٰ کے علاج کے لیے لگا دیا تھا۔ پاکستان والا گھر جو بکا تھا اس کے پیسے اور بھی جتنے پیسے اس کے پاس تھے اس نے سب لگا دیئے تھے۔ اس کے باوجود وہ ربیکا کے سامنے نظریں نہیں اُٹھا پاتی تھی۔ وہ اس کے بیٹے کی قاتلہ تھی۔ اب عیسیٰ کے ساتھ یہ سب کر کے وہ اپنے طور پر جیسے کفارہ ادا کر رہی تھی۔

زبان کا مسئلہ حل نہیں ہو سکا تھا۔ بن عیسیٰ ابھی بھی بولنے سے قاصر تھے، لیکن یہ مسئلہ ربیکا اور سبین کے لیے اس لیے بھی مسئلہ نہ رہا تھا کہ انہوں نے عیسیٰ کی زبان سیکھ لی تھی۔ ربیکا تو خاموشی میں ہی عیسیٰ سے ڈھیروں باتیں کر لیتی تھی۔ اسے اشاروں کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

''سلام آنٹی......!'' اس نے آگے بڑھ کر ربیکا کو بھی سلام کیا تھا، اور پھر دونوں ہاتھوں میں پکڑے گروسری کے شاپر انہیں تھما دیئے تھے۔

''اس کی کیا ضرورت تھی سبین......! ابھی تمھارا لایا پچھلا سامان بھی ختم نہیں ہوا......'' ربیکا نے کہا۔

دونوں میں اب تکلف آ چکا تھا۔ سبین نے اپنے طور پر دونوں کی ذمہ داری اٹھا رکھی تھی۔ جس پر ربیکا اسے بار بار منع بھی کرتی تھی لیکن اس منع کرنے میں شدت نہیں ہوتی تھی۔ ربیکا اور عیسیٰ دونوں کی ذہنی اور جسمانی حالت ایسی نہیں رہی تھی کہ اب وہ اپنی ضروریات کے لیے خود مشقت کرتے۔

سبین نے اپنی چادر اتار کر اسے سائیڈ پر رکھا، پھر کچھ خیال آنے پر اسے دوبارہ سے کھول کر اپنے وجود پر پھیلا لیا تھا۔ پچھلے کافی دنوں سے اس کے وجود میں پنپتا ایک اور وجود اپنا آپ واضح کرنے لگا تھا۔ سبین کو بن عیسیٰ کے سامنے اس حالت میں بے جھجک ہو کر آنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

''تھکی ہوئی لگ رہی ہو......'' ربیکا نے سبین کے ماتھے پر پسینے کے قطرے دیکھتے ہوئے کہا۔

''جی...... جاب سے سیدھا ادھر ہی آ رہی ہوں۔ میران کی قبر پر جانا تھا تو سوچا آپ سے بھی مل لوں۔''

''زویا کا کیا حال ہے......؟'' ربیکا نے بات بدلی......

وہ میران کے موضوع پر ہر بار ایسے ہی کیا کرتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ وہ میران کا نام لے کر رونے لگی تو اس کا دل پھٹ جائے گا۔ یہ غم ابھی اس کے دل میں ہی کہیں قید تھا۔ جسے وہ آزاد نہیں کرنا چاہتی تھی اور نہ ہی سبین کو اداس کرنا چاہتی تھی۔

''جی ٹھیک ہے۔ پڑھائی اچھی جا رہی ہے اس کی...... نیا ہوسٹل بھی بہت اچھا ہے اور نئی یونیورسٹی بھی...... کہہ رہی تھی کہ اگلے ہفتے ایک دو روز کے لیے آؤں گی۔''

''وہ آئے تو اسے ضرور لانا...... ہم سب ایک ساتھ کھانا کھائیں گے۔''

''جی...... کیوں نہیں...... میں آپ کے ساتھ مل کر کھانا بناؤں گی۔''

''اپنے شوہر کو بھی ساتھ لانا......'' ربیکا نے نظریں چراتے ہوئے کہا تھا۔

''جی......'' سبین کی آواز مدھم ہو گئی۔ یہ ''جی'' دراصل ''نہیں'' تھی۔ وہ ربیکا کے گھر کبھی اپنے شوہر کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ربیکا اس کا اپنے شوہر کے ساتھ رویہ دیکھ کر اسے جج کرے کہ وہ میران کے ساتھ زیادہ محبت کرتی تھی یا اب اپنے اس شوہر سے...... دوسرا وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ ربیکا کسی بھی حوالے سے میران کو یاد کرے...... عیسیٰ کی جدائی کے غم میں رو رو کر وہ پہلے ہی اندھی ہو چکی تھی۔ اب جب خدا خدا کر کے اس کی بینائی واپس آئی تھی تو کیا سبین اس کے دل کی دھڑکنیں بھی اس سے چھین لیتی۔

''تم ہر بار کہتی ہو...... اور پھر اسے نہیں لاتیں......''

''بس...... کبھی وہ مصروف ہوتا ہے اور کبھی مجھے اسے پہلے سے بتانا یاد نہیں رہتا......'' سبین نے بھونڈا جواز گھڑا۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ وہ ہم سے ملنا پسند ہی نہیں کرتا......''

''نہیں آنٹی......! ایسی بات نہیں ہے۔ آپ کو پتا تو ہے کہ اسے گیدرنگ زیادہ پسند نہیں...... پھر بھی اس بار میں کوشش کروں گی کہ وہ آجائے......''

''مجھے اچھا لگے گا...... میں اس کے لیے اس کی پسند کا کھانا بناؤں گی۔''

''اچھا آنٹی...... اب میں چلتی ہوں۔ شام ہونے والی ہے اور موسم بھی بدل رہا ہے۔''

''قبرستان کل چلی جانا...... آج تو بارش کا موسم لگ رہا ہے۔ اس حالت میں ویسے بھی تمھارا اتنا چلنا پھرنا ٹھیک نہیں......'' ربیکا نے اس کے وجود کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ سبین مدھم سا مسکرائی تھی۔

''ویسے ہونے والے بچے کا نام کیا سوچا ہے تم نے سبین......؟'' جاتے جاتے ربیکا نے پوچھا تھا۔

سبین پلٹی۔

''اگر لڑکی ہوئی تو دائنا...... اور اگر لڑکا ہوا تو...... میران......'' سبین نے کہا۔

اور ربیکا کو بھی سو فی صد یقین تھا کہ سبین لڑکے کے حوالے سے ''میران'' ہی کہے گی۔

☆......☆......☆

اس سفید روشنی والے سیل (جیل خانے) کی چمکتی دیواروں پر اُس کا عریاں جسم نمایاں تھا۔ اس کی چوڑی چھاتی ڈھلک رہی تھی۔ اس کا کسرتی بدن جو نوجوانی کی بھرپور نمائش تھا اب اپنی آب کھو رہا تھا۔ چوڑا دہن، جبڑے کی ہڈی کا نمایاں پن، گلابی ہونٹ، رنگ بدلنے والی آنکھیں...... کچھ بھی پہلے جیسا نہیں رہنے والا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب سب بہت جلد تباہ ہو جانے والا تھا۔ اب اس کے سینے کا سنہری رواں، بھنویں اور سونے کی تاروں جیسی پلکیں مرجھا رہی تھیں۔ جن میں وہ سورج دیوتا ''اپالو'' لگا کرتا تھا۔ اب اس سب میں عنقریب فرعون کی ممی لگنے والا تھا۔

اس کی کرنجی آنکھیں...... جن میں کسی کو بھی اپنے قریب کھینچ لینے کی پوری طاقت موجود تھی، اب خود کو خود ہی ترسی نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔ غصے اور بے بسی سے پیٹرسن نے المونیم کی دیوار پر نظر آتے اپنے ہی عکس پر ہاتھ دے مارا۔

''آپ نے مجھے زندگی بھر کے اُصول سکھائے، مجھے موت کا طریقہ کیوں نہیں بتایا گرینڈ فادر...... میں ایسے مرنا نہیں چاہتا جیسا یہ لوگ سوچ رہے ہیں۔ میری جان پر صرف دو لوگ اختیار رکھتے ہیں۔ ایک میں خود اور ایک خدا کا فرشتہ...... میں یہ گوارا نہیں کروں گا گرینڈ فادر کہ یہ لوگ میری جان کے ساتھ کھیلیں...... مجھے برقی کرسی پر بٹھائیں یا میرے جسم میں زہر آلود انجیکشن

اتاریں...... میں اپنے جسم کے ساتھ ان کو کھیلنے نہیں دوں گا۔ ہرگز نہیں......" پیٹرسن چلایا تھا۔ پچھلے کافی روز سے عدالت میں چلتے اس کے مقدمے پر جب ایک ایک کر کے ساری اُمیدیں ختم ہونے لگی تھیں اور پیٹرسن کو اپنی موت کا یقین ہونے لگا تھا تو وہ روز اسی طرح گرینڈ فادر، ایما، ولیم، جیفرسن اور خود پر چلایا کرتا تھا۔

پھر ایک دن اسے المونیم کی دیوار پر گرینڈ فادر کا وجود نظر آیا تھا۔ پتا نہیں یہ پیٹرسن کی روز کی پکار کا جواب تھا، یا اس کا تصور......

"ایک ڈان کی موت عام آدمی کے جیسی نہیں ہونی چاہیے...... اس کی موت بھی ایسی ہی شاہانہ ہونی چاہیے جیسی کہ اس کی زندگی...... لوگوں کو خود پر ہنسنے کا موقع کبھی مت دینا پیٹرسن...... ! کبھی بھی نہیں......"

گرینڈ فادر کا عکس لمحے بھر میں یہ بات کر کے غائب ہو گیا تھا۔

کیا یہ کوئی پیغام تھا، نصیحت یا...... حکم......؟

پیٹرسن کو یاد آیا، یہ ہی الفاظ گرینڈ فادر نے اپنی ڈائری میں بھی لکھے ہوئے تھے۔ اس نے جلدی سے سیل میں ہی موجود گرینڈ فادر کی ڈائریوں کو الٹ پلٹ کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ ڈائریاں پیٹرسن کے ساتھ رعایت کرتے ہوئے اسے فراہم کی گئی تھیں۔

ایک ایک صفحے کو دیکھتے ہوئے کافی دیر کے بعد پیٹرسن کو بالآخر وہ صفحہ مل گیا تھا جہاں گرینڈ فادر نے یہ تحریر رقم کی تھی۔

"ایک ڈان کی موت عام آدمی کے جیسی نہیں ہونی چاہیے...... اس کی موت بھی ایسی شاہانہ ہونی چاہیے جیسی کہ اس کی زندگی...... لوگوں کو خود پر ہنسنے کا موقع کبھی مت دینا پیٹرسن...... ! کبھی بھی نہیں......"

اس سارے صفحے پر ماسوائے اس بات کے اور کچھ نہیں لکھا تھا۔ پیٹرسن نے اس تحریر کو چھوا تھا اور تب ہی اپنے ہاتھوں پر کچھ سفوف سا محسوس کیا تھا۔ انگلیاں ناک کے قریب لا کر اس نے اس سفوف کو سونگھا تھا۔ اس کا شک ٹھیک تھا۔ وہ زہر ہی تھا جس سے وہ سارا صفحہ تر کیا گیا تھا۔ تو گرینڈ فادر نے اس کی پرسکون اور پر اطمینان زندگی کے ساتھ ساتھ اس کی شاہانہ موت کا انتظام بھی کر رکھا تھا۔ پیٹرسن سوچ کر مسکرایا۔

اگلے ہی پل پیٹرسن نے اس صفحے کو ڈائری سے بڑی احتیاط کے ساتھ الگ کر لیا تھا، اور پھر اس کی بہت سی تہ لگا لینے کے بعد اسے چھوٹا سا کرتے ہوئے چند لمحے اپنی آنکھوں کے آگے لا کر دیکھا۔

"میں اپنے جسم کے ساتھ کسی اور کو من مانی نہیں کرنے دوں گا۔ اور میں اپنی "ڈان" کی شان کی بے حرمتی بھی نہیں ہونے دوں گا۔ آپ بھی یہ ہی چاہتے تھے ناں گرینڈ فادر اور میں بھی ایسی ہی خواہش رکھتا ہوں۔" پیٹرسن نے خود سے کہا اور پھر اگلے ہی پل زہر آلود صفحے کو اپنے منہ میں رکھ لیا۔

سیلز (جیل خانوں) میں لگے کیمرے کی فوٹیج جس روم میں دیکھی جاتی تھی وہاں اتفاق سے اس وقت مسٹر رافے بھی موجود تھا۔ رافے، پیٹرسن کی ان ساری حرکات کو عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر جب اس کی چھٹی حس نے الارم بجایا تو وہ تیزی سے پیٹرسن کے سیل کی طرف بھاگا۔

پیٹرسن نے پہلے خود کو زمین پر چت لٹایا تھا۔ پھر اپنے بازوؤں کو اپنے سینے پر باندھا تھا۔ آنکھیں بند ہونے سے پہلے اس نے اپنے آپ کو ایک پانچ سال کا بچہ بنتے محسوس کیا تھا اور اپنے گالوں پر ایما اور ولیم کے بوسے محسوس کیے تھے۔ اس کے لبوں پر بے اختیار ہی مسکراہٹ آ گئی تھی۔

رافے نے بڑی عجلت میں پیٹرسن کا سیل اوپن کروایا تھا۔ لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی۔

پیٹرسن بڑے شاہانہ انداز میں موت کو گلے سے لگا چکا تھا۔

رافے اپنا سر پکڑ کر وہیں بیٹھ گیا تھا۔ اسے لگا تھا اس کی ساری جیت ایک ڈان کے اصولوں کے آگے خاک میں مل گئی ہے۔

☆......☆......☆

وارڈروب میں سے ایک آف وائٹ رنگ کا پینٹ کوٹ نکال کر اس نے اسے اپنے سامنے پھیلایا تھا۔ پھر وائٹ شرٹ اپنے بدن پر چڑھا کر اس نے شرٹ پر گولڈن نفیس ٹائی کی گرہ باندھی...... شرٹ کے کفوں پر کف لنک لگائے جو کہ بیش قیمت ہیرے سے مزین تھے۔ ٹائی پن خالص سونے کی تھی۔ گردن کے اطراف ''ٹام فورڈ'' پرفیوم کا اسپرے کر کے اس نے اپنی ہی گردن پر کسی نازک اندام حسینہ کی طرح ہاتھ پھیرا تھا اور خود کو آئینے میں دیکھ کر مسکرا اٹھا۔ نجانے کس بات سے......

دراز کھول کر اس نے ''رائل اوک'' کی قیمتی گھڑی نکال کر پہنی...... اور سگار کیس نکالا۔ سگار کیس سونے کا تھا جس کے اندر ''کنگ آف ڈنمارک'' کے انتہائی مہنگے سگار موجود تھے۔ اس نے (BERLUTI) برلوٹی کے لائٹر سے سگار سلگایا تھا اور ایک لمبا کش لے کر دھواں آئینے میں نظر آتے اپنے ہی عکس پر چھوڑا تھا، اور کچھ یاد کرتے ہوئے مسکرا اٹھا تھا۔ کتنا انتظار کیا تھا اس نے اس دن کا...... کتنے سالوں کی منصوبہ بندی تھی جو آج مکمل ہوئی تھی۔ اب وہ ہر لحاظ سے مطمئن تھا۔

جیمز...... پیٹرسن کا ''خاص'' ملازم، جو پیٹرسن کے بعد ساری وفاداریاں جیفرسن کے ساتھ نبھانے کا عہد دے چکا تھا، باہر سے اسے ایک دوبار آواز دے چکا تھا اور جسے جیفرسن نے اپنے ''مالکانہ حقوق'' اور اپنے ''رتبے'' کی برتری کے غرور میں سن کر بھی ان سنا کر دیا تھا۔ جیمز اسے تلاش کرتا ہوا اندر آیا تھا۔

''سر آپ یہاں ہیں......؟'' جیمز نے غیر ارادی طور پر کہا۔ جیفرسن نے آئینے پر سے اپنی نظریں ہٹائی تھیں اور جیمز کی طرف دیکھا۔ اس کی نیچے والی پلک نے ذرا سی جنبش کی۔ یہ جنبش سوال تھی کہ سوال کیا ہے؟ اور پیٹرسن کی نقل کرتا ہوا جیفرسن، جیمز کو اس قدر

برا لگا تھا کہ اس کا دل چاہا کہ اس گدھ کا منہ نوچ لے، لیکن ابھی اسے بہت کچھ برداشت کرنا تھا۔ یہ بدل چکے وقت کا تقاضا تھا۔

''حدانی آپ سے بات کرنا چاہتا ہے، اس نے پیغام دیا ہے کہ جیفرسن آئے تو اسے کہنا کہ......''

جیمز کے الفاظ اس کے منہ میں ہی قید ہو کر رہ گئے تھے۔ جیفرسن نے ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے منہ پر مارا تھا۔ جیمز کا منہ دوسری طرف کروٹ بدل گیا تھا۔

''ڈان جیفرسن......'' اس نے ''ڈان جیفرسن'' کے لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ڈان جیفرسن کہو مجھے...... سمجھ گئے......؟''

''اوکے ڈان جیفرسن......!'' جیمز نے ہلکے سے مسکرا کر کہا۔ ابھی مسکرانا اس کی مجبوری تھی۔ جیسے کسی وقت میں جیفرسن کی رہی تھی۔ ورنہ اندر ہی اندر وہ اس کتے کو نیست و نابود کرنے کی ساری منصوبہ بندی کر چکا تھا، لیکن اس سب کے لیے کچھ سال درکار تھے۔

جیمز نفرت سے اسے دیکھتا ہوا منظر سے غائب ہو گیا۔

جیفرسن کے گروپ کا نام J.360 تھا۔ پچھلے ایک سال سے وہ حدانی کے ساتھ شراکت داری پر کام کر رہا تھا۔ اس کا کام دن بدن پھیل رہا تھا۔ ٹیم کے افراد کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ حدانی کی آفر اچھی تھی۔ اس میں اس قدر پیسہ تھا کہ دونوں ہاتھوں سے لٹاتے لٹاتے بھی ختم نہیں ہونے والا تھا۔ جیفرسن اپنی دنیا کا ''ڈان'' بن چکا تھا۔ لیکن وہ اتنی سادہ سی بات ہی نہیں جانتا تھا کہ ڈان نہ تو کسی کا ''ماتحت'' ہوتا ہے اور نہ ہی ''شراکت دار''...... وہ تو بس ''ڈان'' ہوتا ہے۔ پورے جنگل کا اکیلا شیر......

جیفرسن ان باتوں میں اناڑی تھا اور اناڑی ہی رہنے والا تھا۔ وہ ان باتوں کو کبھی نہیں سمجھ سکتا تھا جو گرینڈ فادر نے پیٹرسن کے لیے ڈائری میں نہیں لکھی تھیں، بلکہ اس کی فطرت میں منتقل کی تھیں اور جیفرسن کی یہی ناسمجھی اسے، بہت جلد لے کر ڈوبنے والی تھی۔

☆......☆......☆

وہ شہر کی سب سے بڑی اور مشہور آرٹ گیلری تھی جو دیکھتے ہی دیکھتے رفتہ رفتہ لوگوں کے رش سے اس قدر بھرتی جا رہی تھی کہ شہر کی وہ سب سے بڑی آرٹ گیلری بھی چھوٹی پڑنے لگی تھی۔ وہ نمائش ہی اس قدر شاندار تھی کہ جو وہاں موجود تھے وہ باہر نہیں جا رہے تھے۔ جو باہر تھے وہ اندر آنے کے لیے بے چین تھے۔ صبح کے افتتاح کے بعد نجانے کیسے اس نمائش کی خبر شہر کے ان تمام لوگوں تک پہنچ گئی تھی جو آرٹ سے خاص رغبت رکھتے تھے اور جواب جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔

آرٹ گیلری کے ڈائریکٹر نے صحافیوں سے کہا تھا کہ اس کی گیلری میں پچھلے چالیس سالوں میں پوری دنیا کا کام نمائش کے لیے لگایا جا چکا ہے۔ وہاں بے شمار نمائشیں ہو چکی ہیں پر اتنا زبردست کام اور نمائش پر اتنا مثبت رسپانس اس نے آج تک نہیں دیکھا...... آج تک ایسا نہیں ہوا کہ کسی نمائش کے پہلے ہی روز سارے فن پارے خرید لیے گئے ہوں۔

نمائش کے اُن سارے نمونوں پر کام اس قدر باریک بینی اور نفاست سے کیا گیا تھا کہ دیکھنے والے ورطۂ حیرت میں مبتلا

ہو چکے تھے۔ ہر نیا پیس پہلے سے بڑھ کر تھا۔ ہر دوسرا پیس اپنی کاملیت اور اپنے بنانے والے کے فن کی محبت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ وہ تھے تو چونے کے نمونے......لیکن نوادرات سے کم نہیں لگتے تھے۔

فن پارے دیکھ دیکھ کر لوگوں کا دل نہیں بھر رہا تھا۔ لوگ جو نمونے خرید چکے تھے ان سے نمائش ختم ہونے تک صبر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ اصرار کر رہے تھے کہ نمائش ختم ہونے سے پہلے ہی ان کو ان کی خریدی ہوئی چیزیں دے دی جائیں......لیکن اصولاً ایسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔

سفید چونے سے بنے وہ سارے فن پارے......اپنے تخلیق کار کے ہنر کا شاہکار تھے۔ ان میں سے کوئی ایک چیز بھی دوسری سے کم نہیں تھی۔

ایک چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز اپنے آپ میں کمال تھی۔ ان کی باریکیوں پر اس طرح سے کام کیا گیا تھا کہ لگتا تھا کہ تخلیق کار نے ساری زندگی صرف ایک اسی نمائش پر لگا دی ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ یہ سب تخلیق کار کی محض ایک سال کی محنت تھی۔

اور اس تخلیق کار کا نام سبین تھا......سبین قطب الدین......جو گیلری کے ایک کونے میں کھڑی ہجوم میں گھری، لوگوں اور صحافیوں کو ان کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔ زویا اس کے پاس ہی کھڑی تھی اور وہ سبین سے بھی زیادہ خوش تھی۔ اس کی آپی نے بالآخر وہ کر دکھایا تھا جو انہیں بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا اور جس کا بابا خواب دیکھتے تھے۔

''آپ کی پہلی نمائش پر آپ کو اس قدر پذیرائی ملی......اس حوالے سے آپ کیا کہنا چاہیں گی؟''

''پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ میری پہلی نمائش نہیں تھی۔ اپنے فن کی پہلی نمائش میں ایک آرٹ کالج کے پرنسپل کے سامنے کر چکی ہوں۔''

''یقیناً انہیں آپ کا کام بہت پسند آیا ہوگا۔''

سبین چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئی تھی۔

صحافی کے سوال کے ساتھ ہی اسے پرنسپل کا ہتک آمیز رویہ یاد آیا تھا۔

''جی......بہت......'' اس نے جھوٹ بولا، کیونکہ بعض سچ بتانے کے لیے نہیں، صرف سہنے کے لیے ہوتے ہیں۔

''آپ اپنی دوسری نمائش کی پذیرائی سے کافی خوش ہوں گی؟''

''جی......بے تحاشا......'' اس نے سچے دل سے کہا تھا۔

''آپ کے اُستاد کون ہیں؟'' کسی ایک نے پوچھا تھا۔

''میرے بابا......میں نے ان ہی سے یہ کام سیکھا ہے۔''

''آپ کو یہ کام سیکھنے میں کتنی دیر لگی......؟''

''زندگیاں...... مجھے زندگیاں گزار لینے کے بعد لائم (چونے) کا کام کرنا آیا۔''

''لوگوں کو یقین نہیں آ رہا کہ یہ سب فن پارے لائم (چونے) سے بنائے گئے ہیں۔ آپ بتانا پسند کریں گی کہ آپ نے اپنے فن کے اظہار کے لیے لائم (چونے) کو ہی کیوں منتخب کیا؟''

سبین چھت کی طرف دیکھنے لگی تھی۔ بچپن میں سنی ہوئی بابا کی باتیں اس کے ذہن میں گردش کرنے لگی تھیں اور صحافی کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے اسے ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے وہ نہیں بلکہ اس کے اندر سے بابا بول رہے ہوں۔

''پتھروں میں الماس کو ''کورا پتھر'' کہا جاتا ہے۔ الماس کی کوئی خاصیت نہیں ہوتی۔ یہ ویسا ہی اثر اپنا لیتا ہے جیسا ہم اس سے چاہتے ہیں۔ یہ بد کے پاس بد ہوتا ہے اور نیک کے پاس نیک...... یہ منفی پکار کو منفی جواب دیتا ہے اور مثبت کو مثبت...... یہ ہر اک کی انگلی میں اس کی جنم گھٹی کو چکھ لیتا ہے۔ یہ اس فطرت کے مطابق چلتا ہے، جس کے تحت ہم اسے چلانا چاہتے ہیں۔ نہ یہ باغی ہے اور نہ سرکش...... یہ اپنے اثر پر حرف نہیں آنے دیتا ہے۔

میں نے اپنے فن کے اظہار کے لیے چونے کو اس لیے منتخب کیا کیونکہ چونا بھی الماس کی ہی قسم ہے۔ سالم حالت میں یہ بھی پتھر ہوتا ہے۔ الماس زمین کی آگ میں جل کر الماس بنتا ہے۔ چونا انا میں ٹوٹ کر چونا بنتا ہے۔ اس کے برادے میں بجز ہے۔ مشتاق ہاتھ اسے اپنی مرضی سے موڑ کر الماس سے بھی زیادہ قیمتی بنا دیتے ہیں۔''

سب بتا کر وہ بے اختیار ہی مسکرائی تھی۔ بابا کی باتوں کو ان کے لہجے میں ہی بتانا اسے اچھا لگا تھا۔

زویا نے سبین کی طرف دیکھا اور دونوں ایک دوسرے کے دل کا بھید پا کر کھلکھلا کر ہنسی تھیں۔

''آپ کا کام اس قدر شاندار ہے کہ لوگ آپ کے اس لائم (چونے) کو ڈائمنڈ ڈسٹ (الماس برادہ) سے تشبیہ دے رہے ہیں۔ کیا آپ بھی ایسا ہی سمجھتی ہیں۔'' ایک اور سوال پوچھا گیا تھا جس پر وہ ایک دم سے ہی دُکھی ہو گئی تھی۔

''جی...... میرے بابا بھی چونے کو ڈائمنڈ ڈسٹ (الماس برادہ) ہی کہا کرتے تھے۔'' اور بتاتے ہوئے نجانے کیوں ایک آنسو اس کی آنکھ سے لڑھک کر اس کے گال تک پھسلتا چلا گیا تھا۔

☆......☆......☆

اس کی دوسری نمائش پہلی سے بھی زیادہ کامیاب رہی تھی اور پھر تیسری نے تو اسے شہرت کی بلند ترین سطح پر پہنچا دیا تھا۔ اب ایک سال پورا ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی چوتھی نمائش کے دن بھی قریب آ رہے تھے۔ یہ نمائش امریکا میں نہیں ہو رہی تھی اور نہ ہی کسی اور یورپی ملک میں...... بلکہ یہ نمائش پاکستان میں ہو رہی تھی۔ اور اس کا سارا انتظام ڈینی نے سنبھالا ہوا تھا۔

جیفرسن کے ''ڈان'' بننے سے پہلے ہی ڈینی نے گروپ چھوڑ دیا تھا اور اب وہ سبین کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ وہ اپنی زندگی سے مطمئن تھا اور پرسکون بھی...... اور وہ اس بات پر سبین کا بہت شکر گزار تھا کہ اچھے اور بہتر دن آنے پر سبین اپنے پرانے تعلق والوں کو نہیں بھولی تھی۔

''میں تو چاہ رہا تھا کہ تمھاری نمائش شہر کی سب سے بڑی گیلری میں ہو...... یا الحمراء سینٹر میں...... لیکن ایک کالج والے میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ میڈم سبین کے آرٹ کی نمائش ان کے کالج میں ہو۔'' ڈینی نے اسے فون پر بتایا تھا اور سبین کا ماتھا ٹھنکا۔

''کون سے کالج والے......؟''

''ایک آرٹ کالج ہے، گن پت روڈ پر...... تمھارے پرانے گھر کے ساتھ......''

سبین لمحے بھر کو خاموش ہو گئی تھی۔ اس کا شک ٹھیک نکلا تھا۔

''بولو سبین...... کیا جواب دوں میں انہیں...... وہ بہت پرجوش ہیں تمھاری نمائش کو لے کر...... اور لاکھوں کی آفر کر رہے ہیں۔'' ڈینی نے اسے خوش ہو کر بتایا تھا اور سبین کو پرنسپل کا وہ سو کا نوٹ یاد آ گیا تھا جو دیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا کہ یہ بہت زیادہ ہیں۔ اس ماڈل کی حیثیت سے بھی اور تمھاری اوقات سے بھی...... اب وہ ہی پرنسپل اسے لاکھوں کی آفر کر رہا تھا۔ اس لیے کہ اب وہ پاکستانی نژاد امریکن تھی، اور اس کی شہرت یورپ کی حدود سے باہر نکل کر پوری دنیا میں پھیلنے لگی تھی۔

''تم شاید نہیں جانتی سبین کہ یہاں تم کس قدر مشہور ہو چکی ہو...... تمھاری نمائش سے پہلے ہی یہاں کے اخبارات میں تمھارے چرچے ہو رہے ہیں۔ تمھارے فن پر کالم لکھے جا رہے ہیں۔ لوگ تمھاری نمائش کو اپنے اپنے اداروں میں کروانے کے لیے میرے آگے پیچھے ایسے گھوم رہے ہیں جیسے میں کوئی بادشاہ وقت ہوں۔ پر یہ آرٹ کالج والے تو سب کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ بہت ضد کر رہے ہیں، بلکہ اگر میں اسے منت سماجت کہوں تو بھی غلط نہ ہو گا۔ تم سوچ کر بتاؤ کہ میں انہیں کیا جواب دوں۔ اگر دل مانتا ہے تو بتاؤ میں انہیں ہاں کہہ دیتا ہوں ورنہ آفرز تو بے تحاشا موجود ہیں۔''

''انہیں ''ہاں'' کہہ دو ڈینی......!'' اس نے فیصلہ کن کہا تھا۔

''لیکن اس شرط پر کہ نمائش کے آدھے نمونے پرنسپل کے آفس میں رکھے جائیں گے۔''

''کیا......'' ڈینی سبین کی اس انوکھی شرط پر حیران ہوا تھا۔ پھر جیسے وہ خود ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ بھی سبین کا کوئی پرانا قرض ہے جسے وہ چکانا چاہتی ہے۔

''ٹھیک ہے میں کہہ دوں گا۔ جتنا وہ لوگ میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، پرنسپل کا آفس کیا...... اگر تم یہ شرط رکھو کہ نمائش پرنسپل کے گھر میں ہو گی تو وہ تمھاری یہ بات بھی مان جائیں گے۔'' ڈینی نے ہنستے ہوئے بتایا۔

''تمہارا بہت شکریہ ڈینی......!''

ہنستے ہنستے ڈینی سنجیدہ ہوا تھا۔

''دوبارہ یہ لفظ کہا تو میں تم سے کبھی بات نہیں کروں گا۔''

''اس نمائش کا سارا منافع تمہارا ہوگا ڈینی......اور اگر آئندہ کے بعد تم نے مجھے کسی کا پیغام دیتے ہوئے بھی ''میڈم'' کہا تو پھر میں بھی تم سے کبھی بات نہیں کروں گی۔''

اور اس بات پر دونوں کی آنکھیں خلوص، چاہت اور جذبات کی شدت سے بھر آئی تھیں۔

☆......☆......☆

مزید ایک سال بعد......مزید چار موسموں کے آنے اور جانے کے بعد......

آسمان کے شکم میں ایک بار پھر سے ''شام'' انڈیلی جانے لگی تھی۔ یہ شام دوسری شاموں سے مختلف تھی۔ ٹھنڈی اور میٹھی سی یہ شام جیسے سبین کی زندگی میں مدتوں کے بعد آئی تھی۔

میران کی قبر پر گلاب کے سفید پھول کھل آئے تھے۔ یہ پھول سبین نے ہی وہاں لگائے تھے۔ میران کو گلاب میں یہ رنگ بہت پسند تھا۔ اسی لیے سبین اپنے بیڈروم میں بھی انہی پھولوں کو لگایا کرتی تھی۔ اسے ان پھولوں سے میران کی قربت کی خوشبو آیا کرتی تھی۔

لیکن اب تو وقت بدل چکا تھا۔ وہ کسی اور کی بیوی تھی۔ کسی اور کے بچے کی ماں تھی۔ حسرت سے وہ ان پھولوں کی دلکشی کو دیکھے گئی جواب اس کی زندگی میں کوئی رنگ نہیں بھر سکتے تھے۔ ان کی خوشبو اس کی زندگی میں کوئی بھونچال نہیں لا سکتی تھی۔

وہ میران کو بتا رہی تھی کہ اس کی چوتھی نمائش نے بھی کتنی کامیابی سمیٹی ہے۔ اس کی شہرت بلندیوں کو چھونے لگی ہے۔ پیسہ تو اس پر بارش کی طرح برس رہا ہے۔ آخر وہ چونے سے اتنا زیادہ پیسہ کمانے میں کامیاب ہو ہی گئی ہے۔ اس فن کو سیکھ ہی گئی ہے۔ وہ اپنی زندگی سے مطمئن ہے لیکن بس ایک بات کی خلش اس کے دل سے نہیں جاتی تھی کہ جب اس نے چونے سے ہی کامیابی حاصل کرنی تھی تو اس نے اس کو اپنا دشمن کیوں سمجھ لیا......؟ کیوں غلط راستہ چن لیا......جس نے اسے تھکا تو دیا، لیکن پھر چلنا بھی سکھا دیا۔ اگر اس کی ساری کامیابیاں چونے سے ہی لکھی گئی تھیں تو بلاوجہ کی نفرت اور بے صبری پال کر اس نے اپنے لیے اتنی مشکلات کیوں اکٹھی کر لیں۔ شاید اس لیے اسے قانع ہونا کبھی آیا ہی نہیں تھا اور قانع ہو جانا ہی تو اصل کامیابی ہوتی ہے۔

اس کی ساری باتوں کے جواب میں میران مسکرا رہا تھا۔ وہ جانتی تھی، کیونکہ اس کا میران سے رشتہ عالم ارواح سے شروع ہو چکا تھا۔ اس لیے اسے عالم برزخ میں موجود میران سے ہم کلام ہونے میں کوئی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔ وہ صبح سے یہاں بیٹھی اپنی زندگی میں ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں میران کو آگاہ کر رہی تھی۔ ہفتے میں ایک دن وہ میران کی قبر پر گزارتی تھی اور اپنے

بچے "میران" کے ساتھ وہاں آتی تھی۔ ننھے میران کو بھی جیسے یہاں آ کر سکون ملتا تھا۔ وہ نہ تو روتا تھا اور نہ سبین کو تنگ کرتا تھا۔

اب شام ہونے آئی تھی۔ دن کی طرح موسم نے بھی کروٹ بدل لی تھی۔

دفعتاً فضا میں ایک آواز گونجی...... حائک کے ماؤتھ آرگن کی آواز...... اور یہ دھن آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی۔ حائک قبرستان کی طرف ہی آ رہا تھا۔ اُس نے سبین کو دور سے ہی دیکھ لیا تھا۔

قبرستان کے دروازے پر ہی حائک نے ماؤتھ آرگن بجانا بند کر دیا تھا۔ قبرستان کے احترام میں......

پچھلے کافی دنوں سے اس میں کافی شعور سما چکا تھا اور یہ سب سبین کی بدولت ہوا تھا۔ وہ اب بہت پر تحمل اور باوقار نظر آنے لگا تھا۔ یا کم از کم ایسا لگنے کی کوشش ضرور کیا کرتا تھا۔ وہ روز نہاتا تھا، روز کپڑے بدلتا تھا۔ طریقے سے کھانا کھانے کی کوشش کرتا تھا۔ کم گو تو وہ پہلے ہی تھا اب تو وہ بالکل ہی ضرورت کے وقت اُشاروں میں بات کرتا تھا، اور یہ بات چیت وہ بہت تمیز اور ادب سے کرنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ تھوڑے سے علاج کے بعد اس کی رات کو سوتے میں بستر پر پیشاب کر دینے کی عادت بھی چھوٹ چکی تھی۔

اس کے شب و روز میں بھی اس کی شخصیت کی طرح واضح تبدیلیاں آئی تھیں۔ اب وہ سارا سارا دن آوارہ گردوں کی طرح شہر کی سڑکوں کو ناپا ہوا ہر وقت ماؤتھ آرگن نہیں بجایا کرتا تھا۔ صبح کے وقت وہ ایک ایسے اسکول میں پڑھنے کے لیے بھی جاتا تھا جو گونگے بہرے افراد کو خاص طریقوں سے تعلیم دینے میں بہت مشہور تھا۔ اس کی فیس اگرچہ بہت زیادہ تھی، لیکن سبین کو ادا کرتے وقت خوشی محسوس ہوتی تھی، سبین کو امید تھی کہ پڑھ کر حائک یقیناً کوئی معرکہ سر کرے گا۔ خدا نے ایسے ہی تو نہیں اس کا ذہن اتنے عرصے سے بند رکھا تھا۔ یقیناً اس کے ذہن نے ابھی بہت بڑے بڑے کام کرنے تھے۔ سبین کو اپنے قیاس پر کامل یقین تھا۔

حائک سبین کے پاس پہنچا تو سبین نے دیکھا کہ اس کی ناک بہہ رہی تھی۔ سبین نے اپنے ہینڈ بیگ سے رومال نکال کر اس کی ناک صاف کی تھی۔ وہ اگرچہ بہت کچھ سیکھ چکا تھا، لیکن ابھی بھی بہت سا سیکھنا باقی تھا۔ اسے ناک کے بہنے کا ہوش کم ہی رہتا تھا، اور یہ کام ہر بار سبین کو ہی کرنا پڑتا تھا جس پر آگے سے وہ شرمندہ سا ہو جاتا تھا، اور ایسے وقت میں سبین کا دل کرتا تھا کہ وہ اسے ایک ماں کی طرح اپنی بانہوں میں سمیٹ لے...... وائنا کی موت کے بعد محبت کی تلاش میں مارا مارا پھرتا وہ زمانے کا دھتکارا ہوا انسان بن چکا تھا۔

غوں غاں کرتے ہوئے حائک نے سبین کو اشارے میں کچھ کہا تھا۔

"نہیں...... میرا ابھی گھر جانے کو دل نہیں کر رہا......" سبین نے اس کا اشارہ سمجھ کر جواب دیا۔ اگلا اشارہ حائک نے شاید موسم کے خراب ہونے کی طرف کیا۔

"خراب موسم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا حائک......! تم کیا جانو میں کیسے کیسے طوفانوں میں سے گزر کر آ رہی ہوں۔" سبین نے دل میں سوچا تھا اور پھر ننھے میران کو حائک کے حوالے کر دیا۔

''اسے لے کر گھر چلے جاؤ...... میں ابھی تھوڑی دیر میں آجاؤں گی۔'' سین نے بچہ حائنگ کو تھماتے ہوئے اشاروں میں کہا۔

حائنگ نے مزید کوئی سوال و جواب نہیں کیا تھا۔ خاموشی سے اس نے ننھے میران کو تھاما، اس کے گال پر پیار کیا اور پھر وہاں سے جانے کے لیے چل پڑا، قبرستان کے گیٹ سے باہر نکل کر اس نے اپنا ماؤتھ آرگن ایک بار پھر سے اپنے منہ میں رکھا تھا اور اسے بجانا شروع کر دیا تھا۔ نجانے کون سی دھن...... جو خوش کن تھی یا اُداس...... مہینوں اس دھن کو سنتے رہنے کے باوجود بھی سین ابھی تک اس بات کا فیصلہ ہی نہیں کر سکی تھی۔

میران کی قبر کے کتبے سے ٹیک لگائے اس نے ایک نظر خراب موسم کو دیکھا تھا اور پھر وہ دور جاتے ہوئے حائنگ کو دیکھنے لگی تھی۔

حائنگ...... سین کا شوہر...... اس کے بچے کا باپ......

☆......☆......☆

سین...... بذاتِ خود......

''بچپن میں ''الماس براوے'' کے ساتھ کھیلتے ہوئے میں نے ''سورج پرستی'' کی کہانی سنی...... لیکن اس کہانی سے کچھ سبق نہ سیکھتے ہوئے میں نے اپنی ذات پر ''تال کی کائی'' کی تہ جمالی...... پھر جب مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ میرا اندر تعفن سے بھرتا جا رہا ہے تو میں نے ''ثعلب مصری'' کے پھولوں کو تلاش کیا کہ شاید وہ مجھ میں کچھ خوشبو بھر دیں...... لیکن میں نے جس بھی پھول کو سونگھا مجھے سب میں سے ''کافور ریزی'' ہی پھوٹتی ہوئی محسوس ہوئی......

جس نے میری آنکھوں کو اس طرح اندھا کر دیا کہ مجھے ہر ''شام کا رنگ سیاہ'' لگنے لگا۔

عیسیٰ بابا کہتے ہیں کہ بعض غلطیوں کا ازالہ ہوتا ہے، بعض کوتاہیوں کی معافی ہوتی ہے، لیکن بعض گناہوں کی نہ تو توبہ ہوتی ہے نہ بخشش...... ہاں ان کا کفارہ ضرور ہوتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں کہ میرے گناہ بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ ان کا ازالہ ہی یہ تھا کہ ان کا کفارہ ادا کیا جائے۔ حائنگ سے شادی کر کے میں نے یہ کفارہ ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ میری وجہ سے ایک شخص میران کی جان گئی۔ اب حائنگ کی زندگی کو ''سمجھ'' دیتے ہوئے میں اس ذات کا قرض اُتارنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

ہاں...... میں نے واپس پاکستان جانے کے بارے میں بھی سوچا تھا۔ وہاں جا کر مجھے ''چکی'' سے معافی مانگنی تھی۔ میں یہ عمل چونے کے ساتھ تو کر چکی تھی، لیکن چکی کے ساتھ کرنا ابھی باقی تھا۔ تب عیسیٰ بابا نے کہا کہ چکی کو چلانا تو آسان ہوتا ہے، لیکن اسی چکی کا قطب بن جانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ چکی سے معافی مانگنے سے بہتر ہے کہ تم اس چکی کا قطب بن جاؤ...... اور میں نے ان کی بات مان لی...... اپنے بابا کی بہت سی نافرمانیوں کے بعد میں اب ان کی باتیں من و عن ماننے لگی ہوں۔

ربیکا آنٹی......عیسیٰ بابا......حانک...... میں ان سب کا قطب بن چکی ہوں۔ میں اس چکی کو روز چلاتی ہوں اور یقین جانیے کہ بالکل نہیں تھکتی......

''گھوگھو......گھوگھو......''

مجھے اس چکی کی آواز سے نفرت نہیں ہے، بلکہ اس چکی کی آواز پر میرے اعصاب سکون محسوس کرتے ہوئے نیند کی آغوش میں جانے لگے ہیں۔

''گھوگھو......گھوگھو......''

دیکھیے......ایک بار پھر سے مجھے نیند آنے لگی ہے......ایک پرسکون نیند......ویسی ہی نیند جو میں برسوں سے چاہتی تھی۔

''گھوگھو......گھوگھو......''

شب بخیر......''

☆......☆......☆

ختم شد